

سَتَوَلَّوْا أَوَّلَىٰ لِأَهْلِهِمْ

سلسلہ مطبوعات مسئلہ خلافت

نمبر (۱)

# مسئلہ خلافت و جزیرہ عرب

یعنی

مولانا ابوالکلام کا خطبہ صدارت جو انھوں نے پراونشیل خلافت کانفرنس بنگال  
سنقرہ ۲۸-۲۹- فروری ۱۹۲۰ء کلکتہ میں دیا۔ اب آل انڈیا خلافت کمیٹی کے شعبہ تبلیغ  
و اشاعت (کلکتہ) کی جانب سے رسالہ کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔

تم مسلمان جو ایک زمانے میں اللہ اور اُس کے دین برحق کے لئے سب کچھ کر سکتے  
تھے، کیا اب اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اُس کے احکام اُس کے غافل بندوں تک  
پہنچا دو؟ تم کو چین سے نہیں بیٹھا چاہیے جب تک کم از کم دس مسلمانوں تک وہ  
سارے حکم نہ پہنچا دو جو اس رسالہ میں درج ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کو  
وصیت کرو کہ اسی طرح دس آدمیوں تک شریعت کے یہ احکام پہنچا دے۔ فلبیلغ  
الشاهد الغائب فان الشاهد عسی ان یبلغ من ہوا و عی لہ منہ!

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الْمَيَّانَ الَّذِينَ آمَنُوا، ان تَخْشَعْ قُلُوبُهُمْ لَذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ  
مِنْ الْحَقِّ؛ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ،  
فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ، فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ (١٦: ٥٤)  
کیا مسلمانوں کے لئے اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل  
اللہ اور اس کے حکموں کے آگے جھک جائیں اور غفلت و نافرمانی سے  
باز آئیں؟ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو مسلمانوں ہی  
کی طرح کتاب الہی دی گئی تھی (یعنی یہود) لیکن جب ایک بڑی مدت  
گزر گئی تو غفلت میں رہتے رہتے ان کے دل سخت ہو گئے۔ احساس  
جاتا رہا غیرت و حمیت مٹ گئی۔ سچے دلوں کی وہ نرمی اور اثر پذیری  
نہ رہی جو صدائے حق سنتے ہی چونک اٹھتی ہے۔ فہل من مذكر؟





# مقدمہ

طبع ثانی

الحمد لله وحده - چار مہینے ہوئے ، یہ رسالہ خطبہ صدارت کی صورت میں شائع ہوا تھا - اب مزید تہذیب و ترتیب اور اضافہ فصول و مطالب کے ساتھ بار دوم شائع کیا جاتا ہے -

پچھلے ایڈیشن سے تقریباً ایک تہائی مطالب اس میں زیادہ ہیں - وہ تقریر کی شکل میں تھا - اس لیے ابواب و فصول منضبط نہ تھے - اب یہ کمی پوری کر دی گئی ہے - اس ایڈیشن کے حسب ذیل اضافات خصوصیت کے ساتھ

قابل ذکر ہیں :

( ۱ ) آية كريمه اطيعوا الله و اطيعوا الرسول و اولى الامر منكم میں تحقیق معنی ” اولی الامر “ جسکی طرف پہلے سرسری اشارہ کیا گیا تھا -  
( ۲ ) شرح حدیث حارث اشعری مندرجہ مسند و ترمذی اور نظام و قوام جماعت -

( ۳ ) اشتراط قرشیة کا مبحث اب بالکل مکمل و مختتم کر دیا گیا ہے - حتی الوسع مسئلہ کا کوئی ضروری پہلو بحث و نظر سے باقی نہیں رہا - پہلے ایڈیشن میں حدیث امامت قریش کے بعض طرق و سلاسل غیر ضروری سمجھکر چھوڑ دیے تھے ، لیکن اب ان پر بھی نظر ڈال لی ہے ، تاکہ بحث بالکل مکمل ہو جائے - دعوتی اجماع پر بھی بعض نئے مباحث ملینگے جو پہلے ایڈیشن میں نہ تھے - امید ہے کہ اصحاب نظر و بصیرت کے لیے یہ حصہ خاص طور پر موجب انشراح خاطر ، و رفع اضطراب ، و دفع شکوک و ارتیاب ہوگا -

( ۴ ) مسئلہ ” حمل سلاح علی المسلم “ کی طرف پہلے سرسری طور پر اشارہ کر دیا تھا - اب ایک مستقل باب برہا دیا ہے ، اور اصولی طور پر مسئلہ کے تمام اطراف و جوانب صاف ہو گئے ہیں -

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

المریان للذین آمنوا، ان تخشع قلوبهم لذكر الله وما نزل

من الحق؛ ولا يكونوا كالذين اوتوا الكتاب من قبل،

فطال عليهم الامد، فقست قلوبهم وكثير منهم فاسقون (۱۶:۵۴)

کیا مسلمانوں کے لئے اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل

اللہ اور اس کے حکموں کے آگے جھک جائیں اور غفلت و نافرمانی نہ

باز آئیں؟ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو مسلمانوں ہی

کی طرح کتاب الہی دی گئی تھی (یعنی یہود) لیکن جب ایک بڑی مدت

زرگئی تو غفلت میں رہتے رہتے ان کے دل سخت ہو گئے۔ احساس

باتارہا غیرت و حمیت مٹ گئی۔ سچے دلوں کی وہ نرمی اور اثر پذیری

بچ رہی جو صدائے حق سننے ہی چونک اٹھتی ہے۔ فہل من مدکر؟

( ج )

باب

( جزیرہ عرب و بلاد مقدسہ )

۱۷۰ فصل - مرکز ارضی

۱۷۳ فصل - احکام شرعیہ

۱۷۸ صل - جزیرہ عرب کی تحدید

۱۸۶ فصل - مسجد اقصیٰ

باب

خاتمہ سخن

۱۸۲ فصل - نتائج بحث

فصل - خلیفۃ المسلمین اور

۱۸۶ گورنمنٹ برطانیہ

فصل - موجودہ و آئندہ حالت اور

۱۹۰ احکام شرعیہ

باب

ترک و اختیار

۱۹۵ فصل - ترک موالات

فصل - واقعہ حاطب بن ابی بلتعہ ۱۹۷

فصل - هل للامام ان يمنع

۲۰۰ المتخلفین و القاعدین الخ

۲۰۲ فصل - ایک شبہ اور اسکا ازالہ

فصل - گورنمنٹ کیلیے اصلی

۲۰۴ سوال

باب

نظام عمل

فصل - مسلمانان ہند اور نظام

۲۰۶ جماعت

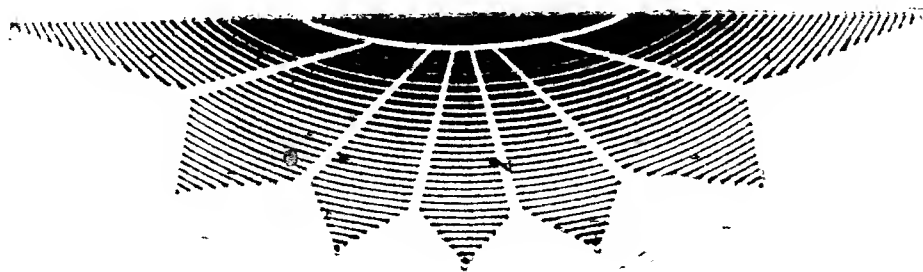
فصل - زبان ز نکتہ فرر ماند و

۲۱۱ راز من باقیست

ضمیمہ - جدول سنین خلافت

۲۱۴ اسلامیہ

۲۱۸ ضمیمہ (۲) - مواعید و عہود





رَبَّنَا اجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ وَنَجِّنَا

بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ! (٨٧ : ١٠)

رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأْتَ زِينَتَهُ وَق

أَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَن

سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ

عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّى يَرَوُا الْعَذَابَ

الْأَلِيمَ !! (٨٨ : ١٠)

( د )

میں - اس کے لیے توفیق الہی کا شکر گزار ہوں - بے شمار اصحاب نے جن میں ایک بڑی تعداد علماء کی ہے ' مولف کو مطلع کیا ہے کہ مسئلہ خلافت کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات عارض تھے مگر اس رسالہ کے مطالعہ کے بعد وہ پوری طرح مطمئن ہو گئے - واللہ یہدی من یشاء الی سواء السبیل -

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مولف نے گذشتہ فروری کے اجلاس خلافت کانفرنس بنگال میں جب اس رسالہ کے مطالب پر تقریر کی ' تو بیان کیا تھا کہ اگر موجودہ حالات میں تبدیلی نہ ہوئی تو مسلمانوں کیلئے ضروری ہو جائیگا کہ اُس حکم شرعی پر عمل پیرا ہو جائیں جسکو مولف " ترک موالات " کے نام سے موسوم کرتا ہے - پھر اُس کی تشریح بھی کر دی تھی ' اور بتلایا تھا کہ از روئے نص قرآنی مسلمانوں کا اولین عمل فریق محارب کے مقابلے میں یہی ہونا چاہیے -

اگرچہ اُس وقت بجز مہاتما گاندھی جی کے تمام ارباب کار نے اس مسئلہ سے سرد مہری برتی اور طرح طرح کے عذرات پیش کرتے رہے ' تاہم حکم قرآنی کی الہامی و ربانی صداقت بالاخر فتح یاب ہوئی ' اور رفتہ رفتہ تمام اصحاب کار کو طوعاً و کرہاً اس پر متفق ہو جانا پڑا :

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

اب ملک کی سیاسی جماعتیں بھی اس اعتراف میں ہمارے ساتھ شریک ہیں ' اور یقین کرتی ہیں کہ ملک کی نجات کیلئے اسکے سوا کوئی راہ نہیں - یہ یقیناً کار فرمائے غیب ہی کی کار سازی ہے کہ اُس نے ملک کی ایک راست باز غیر مسلم ہستی یعنی مہاتما گاندھی جی کے صداقت اندیش دل کو بھی خود بخود اس حقیقت کے علم و فہم کیلئے کھول دیا ' اور انہوں نے بھی چارہ کار دیکھا تو رہی تھا جو تیرہ سو برس پہلے مسلمانوں کو بتلادیا گیا ہے -

۲۰ - جنوری سنہ ۲۰ - کو جب دہلی میں خلافت ڈیپوٹیشن کی ایک صحبت مشورۃ منعقد ہوئی اور سب سے پہلی مرتبہ " نان کو اپریشن " کی تجویز بحث میں آئی ' تو اسوقت صرف مسٹر گاندھی اور مولف رسالہ ہی کے دل رزبان پر تھے - باقی یا متردد تھے یا مخالف - لیکن

الحمد لله - رسالہ علی عبادہ الذین اصطفیٰ -

مسئلہ ۱ - نسبت و بلاد مقدسہ کی نسبت مسلمانوں کے مطالبات کی تمام تر بنیاد احکام شرعیہ پر ہے - اسلیئے سب سے مقدم کام یہ تھا کہ ایک مبسوط تحریر اس موضوع پر شائع کی جاتی ' جسمیں تمام احکام شرعیہ کی بروری طرح شرح و تحقیق ہوتی ' اور جسقدر شبہات اس بارے میں پیدا ہو سکتے ہیں ' ان سب کا کما حقہ ارالہ کر دیا جاتا -

مسئلہ ۲ - بعض اطراف نہایت نازک ہیں - نظر کی ذرا سی کجی اور بصیرت کی تھوڑی سی کمی بھی طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا کر دے سکتی ہے - چنانچہ یہ رسالہ اسی عرض سے شائع کیا جاتا ہے - ۲۸ - ۲۹ - فروری ۲۰۲۰ کو بنگال خلافت کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا - اس اجلاس کدلبے مولانا ابوالکلام نے یہ رسالہ بطور خطبہ صدارت کے صفحہ ۹۱ - تک لکھا تھا - بعد کو بقیہ مباحث بھی انہوں نے پڑھا دیے تاکہ اس موضوع پر ابک مکمل تحریر مرتب ہو جائے - جلسہ میں مولانا نے اپنی عادت کے مطابق محض زبانی تقریر کی تھی ' اور اسی کے ضمن میں احکام و دلائل کا خلاصہ بھی آگیا تھا - چنانچہ تمہید اور خانمہ کا حصہ رہی ہے جو اس زبانی تقریر سے قلمبند کیا گیا تھا - البتہ انحرار سے بعض ایسے حصے نکال دیے گئے ' جو مسئلہ کے سیاسی و ملکی پہلو سے تعلق رکھتے تھے - مثلاً ہندو مسلمانوں کا اتحاد ' اور دنیا کا مستقبل عالمگیر امن - تاکہ یہ رسالہ صرف احکام شرعیہ کی بحث و تحقیق کیلئے خاص ہو جائے ' اور ان مباحث کو علیحدہ رسالوں کی شکل میں شائع کیا جائے -

اس رسالہ کی اشاعت سے تبلیغ و اشاعت کا پہلا کام انجام پا گیا - یعنی مسئلہ پر شرح و بسط کے ساتھ ایک مکمل بحث ہوگئی جسکا خطاب زیادہ تر حضرات علماء سے ہے -

نیز ایک ایسا جامع رسالہ طیار ہوگیا ' جسمیں مسئلہ کا تمام ضروری مواد موجود ہے اب جو ارباب قلم اور کارکنان مجالس خلافت تبلیغ و اشاعت کیلئے مضامین شائع کرنا چاہیں ' وہ اس مواد کو پیش نظر رکھ کر مختلف پیرایوں اور شکلوں میں متعدد رسالے مرتب کر لے سکتے ہیں - ضرورت ہے کہ کثرت کے ساتھ ایسے رسالے جلد شائع کیے جائیں

( ۵ ) حکم دفاع کا حصہ بھی پہلے سے زیادہ مشرح و مکمل ہے ۔

مسئلہ خلافت تاریخ اسلام کے اُن نہایت نازک اور منزلہ اقدام مسائل میں سے ہے جو میدانِ تقاتل و تزاحم سے کہیں زیادہ صفحات کتب اور مجالس بحث و نظر میں معرکہ الارا رہ چکے ہیں ، اور بعض اندرونی فرق و طوائف کی نزاعات اور مختلف عہدوں کے پولیٹکل اثرات کی آمیزش و احاطہ نے مسئلہ کی صاف و سہل الفہم صورت کو طرح طرح کی مشکلوں اور پیچیدگیوں سے غبار آلود کر دیا ہے ۔ علی الخصوص نصوص سنت کی تشریح ، بے شمار اور بظاہر مختلف احادیث کی تطبیق و توفیق ، اُنکے فقہ و حکم کی معرفت و تحقیق ، اور ہر حکم کو اُسکے صحیح محل پر وارد و محمول کر دینے کا معاملہ نہایت غور و فکر اور وسعت نظر و رسوخ علم کا محتاج ہے ۔ فکر کی ذرا سی لغزش اور نظر کی تھوڑی سی کوتاہی بھی نہایت سخت غلطیوں کا موجب ہو جاسکتی ہے ۔

با ایں ہمہ مسئلہ کی تمام مشکلات جس طرح حل ہو گئی ہیں ، اور ضمناً جابجا متعدد اصولی مسائل و مباحث کی نزاعات قدیمہ کا جس طرح بکلی خاتمہ کر دیا گیا ہے ، اُسکا اندازہ صرف وہی اصحاب علم و بصیرت کر سکتے ہیں جنکو بحث و نظر کی اِن رادیوں میں قدم رکھنے کا اتفاق ہوا ہے ، اور جو ان مسائل کو اُنکے اصلی مصادر و موارد اور متدارل کتب قوم میں دیکھ چکے ہیں ، اور مشکلات کار کے اندازہ شناس ہیں ۔ ر قلیل ما ہم ۔

معہذا اختصار مانع تشریح و تفصیل رہا ، اور اکثر مقامات میں اس طرح اشارات کرنے پڑے ، گویا مخاطبین کی نظر و معلومات بطور مقدمہ کے فرض کر لی ہے ۔ بد قسمتی سے یہ مقدمہ محل نظر ہے ، مگر بغیر اس کے چارہ بھی نہ تھا ۔ افسوس کہ اُن مباحث کی نسبت خود مدعیان علم پر بھی عام طور پر راعظانہ و خطیبانہ رنگ غالب ہے ۔ نظر و تحقیق سے ذوق رکھنے والے ناپید ہیں ۔ اور ہمارے حصہ میں ایک ایسا عہد آیا ہے کہ اگر اس سے بھی زیادہ خیرہ مذاقی و کم نظری کا ماتم پیش آ جائے تو گلہ مند نہ ہونا چاہیے :

کم اردنا ذاک الزمان بمدح  
فشغلنا بذم هذا الزمان !

البتہ اس رسالہ کے طبع اول کی اشاعت سے مسئلہ کے تسلیم و اعتراف کا جو اقبال عام طور پر ظہور میں آیا ۔ علی الخصوص طبقہ علماء کرام



# فہرست

|                                   |    |                                   |     |
|-----------------------------------|----|-----------------------------------|-----|
| فصل تمہید -                       | ۱  | فصل ترکمان عثمانی اور عالم        | ۴   |
| فصل مسئلہ خلافت -                 | ۵  | فصل اسلامی                        | ۶   |
| فصل خلافت خاصہ و خلافت ملوکہ      | ۹  | فصل فربضۃ عظیمۃ دفاع              | ۱۰  |
| فصل جمع و تفرقة قوی و مہاسب -     | ۱۸ | فصل عہد نبوت کا ایک واقعہ         | ۰۲  |
| فصل اطاعت خلیفہ و التزام جماعت    | ۲۳ | فصل ایک عام غلط فہمی              | ۰۶  |
| فصل شرائط امامت و خلافت           | ۳۲ | فصل احکام قطعۃ دفاع               | ۰۹  |
| فصل نصوص سنیہ و اجماع امت         | ۴۰ | فصل جزیرۃ عرب و بلاد مقدسہ        | ۱۱۹ |
| فصل: اذا برع الخلیفتین فاقتلوا    | ۴۷ | فصل احکام شرعیہ -                 | ۱۲۲ |
| ۱۰ اخر ہما -                      |    | فصل جزیرہ عرب کی تحدید            | ۱۲۶ |
| فصل اجماع امت و جمہور فقہاء اعلام | ۴۷ | فصل مسجد اقصی و ارض مقدس          | ۱۳۰ |
| فصل سنی ازر شیعہ دونوں متفق ہیں   | ۴۹ | فصل خاتمہ سخن و نتائج بحث         | ۱۳۲ |
| فصل بعض کتب مشہورۃ عقائد و فقہ    | ۵۰ | فصل خلیفۃ المسلمین اور گورامنٹ    |     |
| فصل من حمل علیہا السلاح فلیس منہا | ۵۲ | برطانیہ                           | ۱۳۴ |
| فصل واقعۃ امام حسین علیہ السلام   | ۵۳ | فصل موجودہ و آئندہ حالت اور احکام |     |
| فصل شرط قرشیۃ                     | ۵۴ | شرعیہ                             | ۱۳۸ |
| فصل دعویٰ اجماع                   | ۶۵ | فصل ترک موالات                    | ۱۴۱ |
| فصل چند لمحات تاریخہ              | ۷۰ | فصل واقعہ حاطب بن ابی بلتعہ       | ۱۴۳ |
| فصل خلافت و امامت سلاطین          |    | فصل گورنمنٹ کیلیے اصلی سوال       | ۱۴۶ |
| عثمانیہ -                         | ۷۳ | فصل راہ عمل                       | ۱۴۷ |
| فصل قرآن متوسط و اخیرہ مبین       |    | فصل - آل اندبا خلافت کمیٹی        |     |
| مرکزی حکمرانی -                   | ۸۴ | اور فراہمی زر اعانۃ               | ۱۵۱ |
|                                   |    | فصل اتباعون اہدکم سبیل الرشاد     | ۱۵۳ |

( ح )

## مقدمہ

( طبع اول )

مسئلہ خلافت و بلاد مقدسہ کی نسبت مسلمانوں کے مطالبات کی تمام تر بنیاد احکام شرعیہ پر ہے ۔ اسلیے سب سے مقدم کام یہ تھا کہ ایک مبسوط تحریر اس موضوع پر شائع کی جاتی جس میں تمام احکام شرعیہ کی پوری طرح شرح و تحقیق ہوتی ، اور جس قدر شبہات اس بارے میں پیدا ہو سکتے ہیں ، ان سب کا کماحقہ ازالہ کر دیا جاتا ۔  
یہ رسالہ اسی غرض سے شائع کیا جاتا ہے ۔

۲۸ - ۲۹ - فروری سنہ ۲۰ کو بنگال خلافت کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا ۔ اس اجلاس کیلئے مولانا ابوالکلام نے یہ رسالہ بطور خطبہ صدارت کے صفحہ ۹۱ - تک لکھا تھا ۔ بعد کو بقیہ مباحث بھی انہوں نے برہا دیے تا کہ اس موضوع پر ایک مکمل تحریر مرتب ہو جائے ۔ جلسہ میں مولانا نے اپنی عادت کے مطابق محض زبانی تقریر کی تھی ، اور اسی کے ضمن میں احکام و دلائل کا خلاصہ بھی آگیا تھا ۔ چنانچہ تمہید اور خاتمہ کا حصہ بھی ہے جو اس زبانی تقریر سے قلمبند کیا گیا تھا ۔ البتہ تحریر سے بعض ایسے حصے نکال دیے گئے ، جو مسئلہ کے سیاسی و ملکی پہلو سے تعلق رکھتے تھے ۔ مثلاً ہندو مسلمانوں کا اتحاد ، اور دنیا کا مستقبل عالمگیر امن ۔ تا کہ یہ رسالہ صرف احکام شرعیہ کی بحث و تحقیق کیلئے خاص ہو جائے ، اور ان مباحث کو علاحدہ رسالوں کی شکل میں شائع کیا جائے ۔

اس رسالہ کی اشاعت سے تبلیغ و اشاعت کا پہلا کام انجام پا گیا ۔ یعنی مسئلہ پر شرح و بسط کے ساتھ ایک مکمل بحث ہو گئی جس کا خطاب زیادہ تر حضرات علماء سے ہے ۔

نیز ایک ایسا جامع رسالہ طیار ہو گیا ، جس میں مسئلہ کا تمام ضروری مواد موجود ہے ۔ اب جو ارباب قلم اور کارکنان مجالس خلافت تبلیغ و اشاعت کیلئے مضامین شائع کرنا چاہیں ، وہ اس مواد کو پیش نظر رکھ کر مختلف پیرایوں اور شکلوں میں متعدد رسالے مرتب کر لے سکتے ہیں ۔

محمد اکرم خان

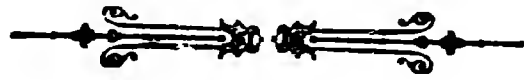
کلکتہ

آفریدی سکریٹری خلافت کمیٹی بنگال ۔

مئی سنہ ۱۹۲۰ء



# بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



الحمد لله نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ و نترک علیہ - و نعوذ  
باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا - من ینہدی اللہ فلا مضل لہ  
و من یضللہ فلا ہادی لہ - و نشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ -  
و نشہد ان سیدنا محمد عبدہ و رسولہ - صلی اللہ علیہ و علی آلہ و اصحابہ وسلم

برادران و بزرگان ملک و ملت !

آپکے صوفے کی نہ پہلی خلافت کانفرنس ہے جسکی صدارت کی عزت  
مجھے دی گئی ہے - آپکی کمیٹی کے معزز ارکان میں سے ہر رکن یقیناً اس  
دلت سے رافف ہوگا کہ اس قسم کی رؤسائے اور رسمی جدیدیت کا اختیار کرنا  
میری زندگی میں سب سے پہلا رافعہ ہے ، از اس طریق عمل سے مجھے  
زرگردان و مدحرف ثابت کرتا ہے جس برنہایت اصرار کے ساتھ قائم رہنے  
کی ہمیشہ کوشش کرتا رہا ہوں - سہ ۱۹۱۱ء میں جبکہ میری موجودہ  
زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا ، مجھے موقع ملا کہ اپنی آئندہ زندگی  
کبلیے ایک ” مذہب عمل “ قرار دے لوں - خدمت ملک و ملت کے  
دست نا پیدا کنار کی طرف قدم اٹھانے ہوئے اصول عمل کی مختلف راہیں  
میرے سامنے تھیں ، از میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانشمند مسافر کی  
طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ و منزل کے سارے مرحلوں پر غور کر لیا ہے -  
اس طوفانی کشتی کی طرح ، جس نے ہوا کے جھونکوں اور سمندر کی  
موجوں پر اپنے سفر کے رخ اور کنارے کی حسنجو چھوڑ دی ہر - اسوقت  
اپنے مذہب عمل کی نسبت جن اصولی مسائل کا میں نے قطعی فیصلہ  
کر لیا تھا ، ان میں ایک خاص مسئلہ یہ بھی تھا کہ اپنی زندگی کے ہر  
حصہ میں ہمیشہ مجلسوں کی صدارت ، انجمنوں کے عہدوں ، اور اسی طرح  
کے تمام رؤسائے اور رسمی منصوبوں سے یکقام کنارہ کش رہوں گا - یہ فیصلہ  
در اصل میرے ایک بنیادی اور دینی اعتقاد کا قدرتی نتیجہ تھا - میں نے  
اپنے لیے جو راہ عمل منتخب کی تھی ، وہ دعوت و تبلیغ کی راہ تھی -  
موجودہ زمانے کی مصطلحہ لیڈر شپ کی راہ نہ تھی - میرے سامنے اتباع

( ز )

الحمد لله کہ آج ملک کے تمام مسلم و غیر مسلم ارباب عمل و صفا کا متفقہ اعلان یہی ہے !

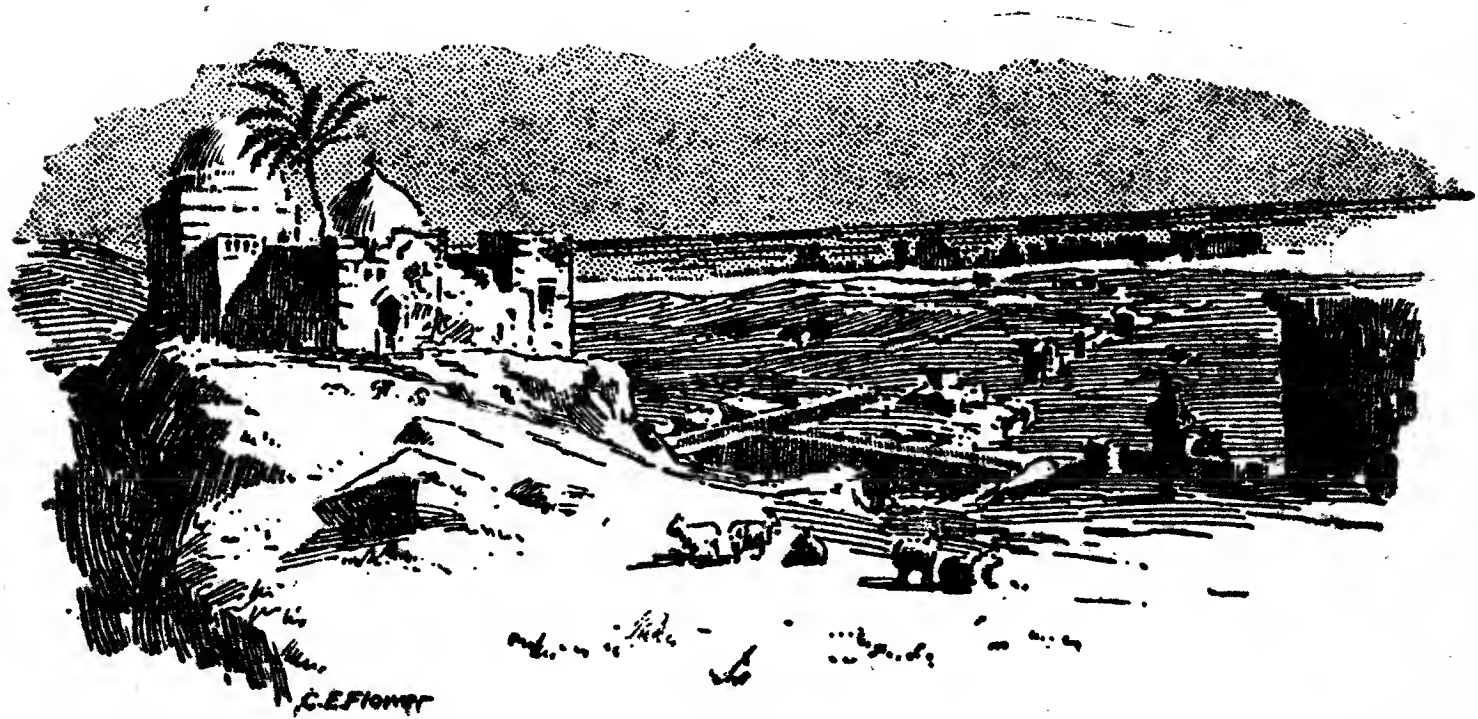
یہاں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس رسالہ میں مسلمانان ہند کے فرائض و اعمال کی نسبت جو کچھہ بصیغۂ استقبال لکھا گیا تھا ، وہ اشاعت کے بعد حال کے حکم میں آ گیا ہے ۔ موجودہ صورت حال یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں پر کیا کیا فرائض عائد ہو جائیں گے ؟ بلکہ یہ ہے کہ جو کچھہ عائد ہونا تھا ہو چکا ۔ اب سوال جستجوئے احکام کا نہیں ہے ۔ اداء فرض کا درپیش ہے ۔ رسالہ کے آخری ابواب میں مختصراً اس طرف اشارات کیے گئے ہیں ۔ تفصیل دوسرے حصہ میں ملیگی جو ” ترک موالات “ کے نام سے ( مع مفصل طریق عمل و ترتیب کار ) خلافت کمیٹی کی جانب سے شائع ہونے والا ہے اور جسکو آجکل قلمبند کر رہا ہوں ۔ فان اعش ، فسا بینہا لکم ، و ان امت ، فما انا بصحبہکم بحریص ۔ والحمد لله اولاً و آخراً ۔

احمد

۹ - محرم سنہ ۱۳۳۹

کان اللہ لہ

( پنجاب میل - اسٹیشن کانپور )





( ب )

اب اس کے بعد دلائل و مباحث کا نہیں بلکہ مجرد احکام شرعیہ کی دعوت و تبلیغ کا کام سامنے آتا ہے ۔ یعنی عوام کی آگاہی کیلئے چھوٹے چھوٹے رسالے نہایت آسان اور سہل عبارت میں شائع کیے جائیں ۔ ان میں صرف احکام و فرائض کی توضیح ہو ۔ دلائل و مباحث نہ ہوں ۔

مسئلہ کے آرر متعدد اہم پہلو بھی باقی ہیں ۔ ضروری ہے کہ وہ بھی اسی شرح و بسط کے ساتھ لکھے جائیں ۔

شعبہ تبلیغ و اشاعت کے اس بارے میں ایک پورا سلسلہ اشاعت و مطبوعات طیار کر لیا ہے ۔ اس سلسلہ کا یہ پہلا نمبر ہے ۔ پریس کی دقتوں کی وجہ سے اس کی اشاعت میں تاخیر ہو گئی ۔ اب لیتھو پریس کا مستقل انتظام ہو گیا ہے ۔ ارر انشاء اللہ یکے بعد دیگرے تمام نمبر شائع ہوتے رہیں گے جنکا بڑا حصہ مولانا ابوالکلام ہی کے قلم سے نکلا ہے ۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہر ہفتہ اس سلسلہ کا ایک نمبر ضرور شائع ہو جاوے ۔

اس رسالہ کا بھی درسرا ایڈیشن اضافہ و نظر ثانی کے بعد لیتھو پریس میں زیر طبع ہے ۔

ان مطبوعات سے مقصود محض تبلیغ و اشاعت ہے ۔ رسالوں کی قیمت جو رکھی گئی ہے ، وہ شعبہ اشاعت کی اعانت کیلئے ہے ۔ لیکن تمام علماء و مشائخ کرام اور غیر مستطیع حضرات میں بلا قیمت تقسیم کیے جائیں گے ۔ تمام خلافت کمیٹیوں اور اسلامی انجمنوں کے ناظموں کو چاہیے کہ فوراً اپنے نام اور پتہ سے ہمیں مطلع فرمائیں جو ایک رجسٹر میں درج کر لیے جائیں گے اور جو نمبر طیار ہوگا ، فوراً ان کی خدمت میں بھیج دیا جائیگا ۔ شعبہ تبلیغ و اشاعت نے انہی اغراض سے ایک روزانہ اخبار ” زمانہ “ بھی جاری کر دیا ہے ۔

تمام خلافت کمیٹیوں کو چاہیے کہ تبلیغ و اشاعت کے معاملہ میں ہم سے خط و کتابت جاری رکھیں ۔ اس بارے میں ہر طرح کی خدمت و اعانت کیلئے ہم طیار ہیں ۔ خود مولانا ابوالکلام کی سرپرستی و نگرانی اس شعبہ کو حاصل ہے ۔

**محمد اکرم خان**

آئیوری سکریٹری خلافت کمیٹی بنگال ۔ شعبہ تبلیغ و اشاعت ۔  
ہرن باڑی لین ۔ کلکتہ

راہ تھی - موجودہ زمانے کی مصالحوہ لیڈر شپ کی راہ نہ تھی - میرے سامنے اتباع و اقتداء کیلئے نوع انسانی کے اُن مخصوص افراد کا نمونہ تھا جو دنیا میں خدا کے رسولوں اور پیغمبروں کے نام سے پکارے گئے ہیں، اور جنکے طریق عمل کو اسلام کی اصطلاح میں ”حکمت“ اور ”سنۃ“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے - میں اپنی راہ طلبی کا ہاتھ ابراہیم و محمد (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کے رہنما ہاتھوں میں دیدینے کیلئے مضطر تھا - گریبالدی، میزینی، یا گلید اسٹن اور پارنل بننے کا عشق میرے اندر نہ تھا - پس یہ تو ضروری تھا کہ میرا وجود کسی گوشۂ فقر و نامرادی میں خدمت و محنت کا ایک غیر دلچسپ منظر ہوتا، یا انسانوں کے کسی ہجوم میں ایک پکارنے والے کی بے پروا پکار - لیکن یہ بالکل ناممکن تھا کہ بیسویں صدی کے فراموش کردہ عہد نبوت و مذاہب کا ایک دلدادہ، انجمنوں کا عہدہ دار اور مجلسوں کا باقاعدہ پریسیدنٹ ہو - خدا کے رسولوں کا طریق خدمت و دعوت، اور بیسویں صدی کے لیڈروں کا طریق ریاست و حکومت، ایک زندگی میں جمع نہیں ہوسکتے !

حضرات! مذہب عمل کے اس بنیادی اعتقاد نے میرے لیے قدم قدم پر مشکلات پیدا کر دیں - باوجود کارکن رفیقوں کی موجودگی کے مجھے ہمیشہ اپنی راہ میں صحرا کے درخت کی طرح بے مونس و رفیق اور صرف اپنے سایہ ہی پر قانع رہنا پڑا - یہ مدنیۃ زار عالم جو اپنے ہر گوشہ میں معیتوں اور رفاقتوں کے راحت افزا جلوؤں سے معمور ہے، میرے لیے ہمیشہ سمندر رہی یا ایک صحرائے ریگ زار، لیکن کبھی ایک آبادی اور بستی کا اُس نے کام نہیں دیا، اور نہ کبھی میں اپنے تئیں اس قابل بنا سکا کہ اُسکی رفاقتوں کا ساتھ دے سکوں - تاہم آپ حضرات کیلئے یہ عرض کرنا ضروری نہیں ہے کہ جہاں تک ایک ناچیز انسانی ہستی ارادہ کے ساتھ عمل کو جمع کرسکتی ہے، میں اپنے اصولوں پر قائم رہنے کیلئے ہمیشہ سخت رہا ہوں، اور موجودہ زمانے کی لیڈر شپ کی دلفریب سے دلفریب نمائشیں اور ابناء عصر کی رفاقت و معیت کی صبر آزما دلچسپیاں بھی کبھی اس بارے میں میرے لیے موثر نہیں ہوئی ہیں -

اسی بنا پر جب آپکے لائق اور سرگرم سکرٹری کا تار مجھے بنارس میں ملا اور انہوں نے لکھا کہ کانفرنس کی صدارت تم کو منظور کر لینی چاہیے تو میں نے اداء تشکر و امتنان کے بعد اپنے آپکو اس سے معذور ظاہر کیا -

لہٰذا جب میں ملکیت پہنچا اور اس بارے میں ربانی گفتگو ہوئی تو کچھ عرصہ کی روکد کے بعد میں نے منظور کر لیا۔ میں اعتراف کرنا ہوں کہ نہ بقیداً اپنے دستور العمل سے ایک کھلا انحراف ہے، لیکن اب یقین کیجئے کہ اس انحراف کیلئے جس چیز کے مجھے مجبور کیا، اس کی حفاظت بھی میرے لئے تمام اصولوں اور فائدوں سے زیادہ ضروری تھی۔ دعویٰ اصول کی نہیں بلکہ جس مقصد کیلئے تمام اصول ہیں، ان کی حفاظت۔ اصول مقاصد کیلئے ہیں۔ مقاصد اصول کیلئے نہیں ہیں۔ پس دہا کے اس سچے اور قدرتی قانون کی بنا پر کہ ہر برتری حیرت انگیز جھوٹی چیزوں اور ہمیشہ مقاصد کیلئے وسائل کو قربان کر دینا چاہیے، میں طیار ہو گیا کہ مقصد کی راہ میں مقصد کے انک وسیلے یعنی اے طریق عمل کو خرد دہدوں، اور اس مجلس کی صدارت منظور کر کے سے انکار نہ کروں۔

حشرات! میں دہا ہوں کہ نہایت صفائی کے ساتھ بے پردہ وہ اصلی سبب بھی عرض کروں جس کے مجھے امکان اپنے طریق عمل کے برخلاف اس بات کیلئے آمادہ کر دیا۔ اب تو معلوم ہے کہ مجھے نظر بدی کے گوشہ و مدد و عزت سے نکلے ہوئے مشکل ابھی دورے دو مہینے ہوئے ہوئے۔ لیکن اس نہوڑے عرصے کے اندر ہی میں نے پوری طرح اندازہ کرایا ہے کہ موجودہ اسلامی مملکت کی نسبت کام کرنے والوں کے طریق عمل کا کیا حال ہے؟ مجھے صاف صاف عرصہ کر دیا دیا ہے کہ ملک کے ہر مہمہ طلقہ کی نسبت اب سے سات سال پہلے حورائیں میں نے قائم کی ہیں، اور جبکہ وجہ سے اس اوقات نہایت قیمتی اور محدود فوائد سے بھی مجھے دست بردار ہو جانا پڑا تھا، بدقسمتی سے اندک اُن میں تبدیلی کا روت نہیں آتا ہے۔ متضاد مبادی کا کچھ عجیب عالم ہے جسے اپنے چاروں طرف پانا ہوں۔ ابک طرف ملک کی عام پیدلک ہے، اور سورج کی روشنی سے بھی زیادہ بغینہ صورت میں ہے، رہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر حالات میں وہ کسی صحیح ریل پر چل کھڑے ہوئے کیلئے مددگار و مستعد ہے۔ دوسری طرف کام کرنے والوں کی جماعت ہے، اور جس جس پہلو سے دیکھتا ہوں، اس پر اب تک وہی نڈبذب و اضطراب اور نوازل و انتشار کا عالم طاری نظر آتا ہے جو تمام پچھلے دوروں میں طاری رہ چکا ہے۔ اب تک مقاصد سے اعراض ہے اور رسائل میں انہماک۔ اب تک حقیقی مصلحت بینی، اور حیلہ جوئی و بہانہ سازی

# بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله نحمده و نستعينه و نستغفره و نومن به و نتوكل عليه - و نعوذ بالله من شرور انفسنا و من سيئات اعمالنا - من يهدي الله فلا مضل له ، و من يضلله فلا هادي له - و نشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له - و نشهد ان سيدنا محمد عبده و رسوله - صلى الله عليه و على اله و اصحابه و سلم -



برادران و بزرگان ملک و ملت !

آپکے صوبے کی یہ پہلی خلافت کانفرنس ہے جسکی صدارت، کی عزت مجھے دی گئی ہے - آپکی کمیٹی کے معزز ارکان میں سے ہر رکن یقیناً اس بات سے واقف ہوگا کہ اس قسم کی رئیسانہ اور رسمی حیثیت کا اختیار کرنا میری زندگی میں سب سے پہلا واقعہ ہے ، اور اُس طریق عمل سے مجھے روگردان و منحرف ثابت کرتا ہے جس پر نہایت اصرار کے ساتھ قائم رہنے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہا ہوں - سنہ ۱۱۹۱ ع میں جبکہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا، مجھے موقع ملا کہ اپنی آئندہ زندگی کیلئے ایک ”مذہب عمل“ قرار دے لوں - خدمت ملک و ملت کے دشت ناپیدا کنار کی طرف قدم اُٹھاتے ہوئے اصول عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں ، اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اُس دانشمند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ و منزل کے سارے مرحلوں پر غور کر لیا ہے - اُس طوفانی کشتی کی طرح نہر جس نے ہوا کے جھونکوں اور سمندر کی موجوں پر اپنے سفر کا رخ اور کنارے کی جستجو و چہر ز دی ہے - اُس وقت اپنے مذہب عمل کی نسبت جن اصولی مسائل کا میں نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا ، اُن میں ایک خاص مسئلہ یہ بھی تھا کہ اپنی زندگی کے ہر حصہ میں ہمیشہ مجلسوں کی صدارت ، انجمنوں کے عہدوں ، اور اسی طرح کے تمام رئیسانہ اور رسمی منصبوں سے یکقلم کنارہ کش رہونگا -

یہ فیصلہ دراصل میرے ایک بنیادی اور دینی اعتقاد کا قدرتی نتیجہ تھا - میں نے اپنے لیے جو راہ عمل منتخب کی تھی ، وہ دعوت و تبلیغ کی



و اقتداء کیلئے نوع انسانی کے اُن مخصوص افراد کا نمونہ تھا جو دنیا میں خدا کے رسولوں اور پیغمبروں کے نام سے پکارے گئے ہیں ، ا ج کے طریق عمل کو اسلام کی اصطلاح میں ” حکمت “ اور ” سنۃ “ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ۔ میں اپنی راہ طلبی کا ہاتھ ابراہیم و محمد ( علیہما الصلوۃ والسلام ) کے رہدہا ہانہوں میں دینے کیلئے مضطر تھا گریبالذی ، مدنی ، باگلد استن اور بارنل بدنے کا عشق میرے اندر نہ تھا پس یہ تو ضروری تھا کہ میرا وجود کسی گوشۂ فقر و نیازانی میں خدمت و محنت کا ایک غیر دلچسپ مضطر ہونا ، نا انسانوں کے کسی ہجوم میں ایک پکارے والے کی بے پروا پکار ۔ لیکن نہ بالکل ناممکن تھا کہ بدسور صدی کے فراموش کردہ عہد ندوۃ و مذاہب کا ایک دلدادہ ، انجمنوں عہدہ دار اور مجلسوں کا نافعہ پرپسیدنت ہر ۔ خدا کے رسولوں کا طریق خدمت و دعوت اور بدسور صدی کے لیڈروں کا طریق ریاست و حکومت ، ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتے ۔

حصرات ! مذہب عمل کے اس بیدادی اعتقاد کے میرے لیے قدم قدم پر مشکلات پیدا کر دے ۔ باوجود کارکن رفیوں کی موجودگی کے مجھے ہمیشہ اپنی راہ میں صحرا کے درخت کی طرح بے مونس و رویق اور صرف اپنے سایہ ہی پر فاع رہنا پڑا ۔ بہ مدنیہ رار عالم جو اپنے ہر گوشہ میں معیتوں اور رفاقتوں کے راحت افزا حلروں سے معمور ہے ، میرے لیے ہمیشہ سمندر رہی نا ایک صحرائے رنگ رار ، لیکن کبھی ایک آدمی اور بستنی کا اُس بے کام نہیں دتا ، اور نہ کبھی میں اپنے بڈیں اس وابل دتا سکا کہ اُسکی رفاقتوں کا سانہ دے سکوں ۔ ناہم آف حصرات کیلئے بہ عرص کرنا ضروری نہیں ہے کہ چہاں تک ایک راجپر انسانی ہستی ارادہ کے ساتھ عمل کو جمع کر سکتی ہے ، میں اپنے اصولوں پر قائم رہنے کیلئے ہمیشہ سخت رہا ہوں ، اور موجودہ زمانے کی لیڈر شب کی دلغرب سے دغرب نمائندوں اور ابداء عصر کی وقت و معیت کی صبر آرمہا دلچسبیاں بھی کبھی اس بارے میں میرے لیے موثر نہیں ہونی ہیں ۔ اسی بنا پر جب آپکے لائق اور سرگرم سکریٹری کا تار مجھے بذارس میں ملا اور انہوں نے لکھا کہ کانفرنس کی صدارت تم کو منظور کر لینی چاہیے تو میں نے اداء تشکر امتنان کے بعد اپنے آپکو اس سے معذور ظاہر کیا ۔

( گ )

بینی ' از حیلہ جوئی و بہانہ سازی میں امتیاز کی راہ مسدود ہے ' اور غم و یقین کی جگہ ظن و شک اور خوف و ہراس کی حکومت قائم ہے ۔  
 زبانوں کی لکنت گودور ہو چکی ' اور شاید چہروں کا ہراس بھی جاتا رہا ۔  
 لیکن دلوں کی دہشت بدستور باقی ہے ' اور ایمان کی کمزوری نے اب تک  
 ررحوں کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے ۔ زبانیں جسقدر تیز ہیں ' قدم میں اتنی تیزی  
 نہیں ہے ۔ اور اعلان جسقدر بلند آہنگی اور رعد آسانی رکھتا ہے ' عمل میں  
 آسقدر بلند پیمائی نظر نہیں آتی ۔ نیند گوتوت چکی ' اور شاید خفتگان  
 بستر غفلت کر رہیں بھی بدل چکے ' لیکن آنکھوں میں خمار بدستور باقی  
 ہے ' اور دھواں بڑھتا جاتا ہے لیکن شعلوں کی چمک کہیں نظر نہیں آتی ۔  
 اگرچہ خدا کے مقدس نام کی تقدیس سے اب کوئی زبان نا آشنا نہیں رہی ' لیکن  
 دلوں میں خدا کے ساتھ انسانوں کا در اور ایمان کے ساتھ نفس کا  
 عشق بھی باقی ہے : ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا ( ۴ : ۱۴۹ ) اور  
 چاہتے ہیں کہ ان دونوں راہوں کے بین بین کوئی تیسری راہ اختیار کریں ۔  
 حالانکہ تیسری راہ اس آسمان کے نیچے کوئی نہیں ۔ راہیں صرف دو ہی  
 ہیں ۔ فمن شاء فلیؤمن ' ومن شاء فلیکفر ۔ حضرت مسیح نے کہا ہے :  
 " ایک نوکر دو آقاؤں کو خوش نہیں کرسکتا " قرآن کا بھی فیصلہ یہی ہے :  
ما جعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ ( ۳۳ : ۴ ) یعنی :

سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے !

حضرات ! مجھے ملامت کرنے میں جلدی نہ کیجیے اگر میں حقیقت  
 کو اس سے بھی زیادہ بے نقاب دیکھنا چاہوں ۔ افسوس کہ وقت کی جلدی  
 اور قانون قدرت کی بے صبری نے ہماری غفلتوں کا ساتھ نہیں دیا ۔ وہ  
 اپنی ازلی بے پروائی کے ساتھ نتائج و عواقب کی آخری منزل تک بڑھتا  
 چلا آیا ہے ۔ اب موت و حیات ' بقاؤ فدا ' ایمان و کفر ' اور خدا اور ماسوی  
 اللہ کی منزل ہمارے سامنے ہے ' اور اسلیے میں قابل ملامت نہیں ہوں  
 اگر حسن بیان اور بلاغت اظہار کے پریچ آداب و قواعد کو موت و حیات کی  
 کشمکش میں سنبھال نہیں سکتا ۔ یہ حالات دیکھ کر میں نے ارادہ کر لیا کہ  
 اگر مجھکو ایک مجلس کے صدر کی حیثیت سے اظہار مطالب کا موقعہ  
 ملتا ہے تو میں اس سے انکار نہ کروں ' اور اگر صدارت کے حقوق و اختیارات  
 کو اصل مقصد کیلیے استعمال کرسکتا ہوں تو اسکو ایک مفید فرصت تصور

اُٹھ سکے جسکو بارہ سال سے اپنے سامنے رکھتا ہوں لیکن رفیقان طریق نے ہمیشہ اس سے اعراض کبا ہے اور آج بھی جبکہ اُس اعراض کے نتائج سامنے ہیں، بذبذب و اضطراب عمل عزم و ایمان کے استحکام پر غالب نظر آ رہا ہے۔ حضرات! صرف یہی ایک خیال تھا جس نے مجھے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اپنے اپنی محبت اور مہربانی سے حو عزت مجھے دیدی چاہی ہے، اُس سے گریز نہ کروں۔ میں آپکا شکر گزار ہوں، اور آپکی دلی رفاقت و اعانت کا طلبگار۔ ہم سب کو اللہ کے فضل و توفیق پر اعتماد ہے جسکے بغیر کائنات ہستی کا کوئی ارادہ اور کوئی عمل کامیابی اور فلاح نہیں پاسکتا۔

امیر جمع ہیں احباب، درد دل کہلے

بہر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے!

و ما یوفیقی الا باللہ - علیہ توکلت و الہہ انیب -

( مسئلہ خلافت )

حضرات! اب میں اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ہم تمام باشندگان ہند کے سامنے کرۂ ارضی کی ایک کثیر آبادی کی طرح اس وقت خلافت اسلامہ اور مقامات مقدسہ کا مسئلہ درپیش ہے۔ ”خلافت“ عربی کی ایک مصدر ہے۔ اُسکا مادہ ہے ”خلف“۔ اور اسی سے ہے ”خلیفہ“۔ خلیفہ کے لغوی معنی نایب اور قائم مقامی کے ہیں ”من قواک خلف فلاں فلاں فی هذا الامر اذا قام مقامه فیہ بعدہ“ (ابن فارس) یعنی اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کے بعد کسی ایک معاملہ میں یا کسی طاقت و اختیار میں اُسکا نائب و قائم مقام ہوا تو یہ خلافت ہوئی، اور لغۃ میں اسکو خلیفہ یعنی بعد کو آنے والا اور قائم مقام کہہ دیے۔ خواہ یہ نایب سابق کی موت و عزل کی وجہ سے ہوئی ہو، یا غیبت کی وجہ سے، یا اپنا اختیار اور منصب سدر کر دینے کی وجہ سے۔ معررات امام راغب میں ہے ”الخلافة، النیابة عن الغیر إما بالغیبة المذوب عنہ؛ و إما لموتہ؛ و إما لعجزہ؛ و إما لتشربف المستخلف“ (صفحہ ۱۵۵)

یہ لفظ بھی فران حکیم کے اختیارات لغوہ میں سے ہے۔ یعنی عربی زبان کے اُن لفظوں میں سے ہے جسکو لغۃ میں عام معانی کیلئے استعمال کیا جاتا تھا مگر فران حکیم نے اپنے خاص مصطلحۃ شرع معانی کیلئے اختیار کر لیا۔ جیسے ایمان، غیب، تقدیر، بعث، صلوٰۃ وغیر ذلک۔ ایمان کے

( ی )

لیکن جب میں کلکتہ پہنچا اور اس بارے میں زبانی گفتگو ہوئی تو کچھ عرصہ کی رد و رک کے بعد میں نے منظور کر لیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ یقیناً اپنے دستور العمل سے ایک کھلا انحراف ہے، لیکن آپ یقین کیجیے کہ اس انحراف کیلئے جس چیز نے مجھے مجبور کیا، اُسکی حفاظت بھی میرے لیے تمام اصولوں اور قاعدوں سے زیادہ ضروری تھی۔ اصول مقاصد کیلئے ہیں۔ مقاصد اصول کیلئے نہیں ہیں۔ پس دنیا کے اس سچے اور قدرتی قانون کی بنا پر کہ ہر برتری چیز کیلئے چھوٹی چیز کو اور ہمیشہ مقاصد کیلئے رسائل کو قربان کر دینا چاہیے، میں طیار ہو گیا کہ مقصد کی راہ میں مقصد کے ایک وسیلے یعنی اپنے طریق عمل کو خیر باد کہوں، اور اس مجلس کی صدارت منظور کرنے سے انکار نہ کروں۔

حضرات! میں چاہتا ہوں کہ نہایت صفائی کے ساتھ بے پردہ رہ اصلی سبب بھی عرض کروں جس نے مجھے یکایک اپنے طریق عمل کے برخلاف اس بات کیلئے آمادہ کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے نظر بندی کے گوشہ قید و عزلت سے نکلے ہوئے بمشکل ابھی پورے دو مہینے ہوئے ہونگے۔ لیکن اس تھوڑے عرصے کے اندر ہی میں نے پوری طرح اندازہ کر لیا ہے کہ موجودہ اسلامی و ملکی مسائل کی نسبت کام کرنے والوں کے طریق عمل کا کیا حال ہے؟ مجھے صاف صاف عرض کر دینا پڑتا ہے کہ ملک کے کار فرما طبقہ کی نسبت اب سے سات سال پہلے جو رائیں میں نے قائم کی تھیں، اور جنکی وجہ سے بسا اوقات نہایت قیمتی اور محبوب رفاقتوں سے بھی دست بردار ہو جانا پڑتا تھا، بدقسمتی سے اب تک اُن میں تبدیلی کا وقت نہیں آیا ہے۔

متضاد مناظر کا کچھ عجیب عالم ہے جسکو اپنے چاروں طرف پاتا ہوں۔ ایک طرف ملک کی عام پبلک ہے، اور سورج کی روشنی کی طرح بالکل یقینی صورت میں دیکھ رہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر حالت میں وہ کسی صحیح راہ عمل پر چل کھڑے ہونے کیلئے منتظر و مستعد ہے۔ دوسری طرف کام کرنے والوں کی جماعت ہے، اور جس جس پہلو سے دیکھتا ہوں، اسپر اب تک وہی تذبذب و اضطراب اور تزلزل و انتشار کا عالم طاری نظر آتا ہے جو تمام پچھلے دوروں میں طاری رہ چکا ہے۔ اب تک مقاصد سے اعراض ہے اور رسائل میں انہماک۔ اب تک حقیقی مصلحت



میں امتدار کی راہ مسدود ہے اور عزم و بقیں کی جگہ طن و شک اور خوف و ہراس کی حکومت قائم ہے - زبانوں کی لکنت گودور ہو چکی ' اور شاید چہروں کا ہراس بھی جانا رہا لیکن دلوں کی دھشت بدستور باقی ہے اور ایمان کی کمزوری نے اب تک ساتھ نہیں چھوڑا ہے - زبانیں جسقدر نبڑھیں ' قدم میں اُبدی تیزی نہیں ہے - اور اعلان جسقدر بلند آہنگی اور وعد آسانی رکھتا ہے ' عمل میں اُسقدر بلند ہدائی - نظر نہیں آتی - نیند گوتوت چکی اور شاید خفنگان دستر غفلت کر رہیں بھی بدل حکے ' لیکن آنکھوں میں خمار انک باقی ہے ' اور دھواں بڑھتا جاتا ہے لیکن شعلوں کی چمک کہیں نظر نہیں آتی - اگرچہ خدا کے مقدس نام کی تغدیس سے اب کوئی زبان نا آشنا نہیں رہی لیکن دلوں میں خدا کے ساتھ انسانوں کا در اور نفس کا عشق بھی باقی ہے ' درودن ان بدحدرا بین دالک سیدلا ( ۴ : ۱۴۹ ) اور اگر حضرت مسیح نے سچ کہا ہے کہ " انک نوکر در آواؤں کو خوش نہیں دوسکتا " اور اگر قرآن بہ فیصلہ کردینے میں سچا ہے کہ ما جعل اللہ لرجل من فلین فی جوفہ ( ۳۳ : ۴ ) بعدی

" سینے میں کسی شخص کے در دل نہیں ہوئے "

تو یقین کرنا چاہیے کہ ہمارے دلوں کی بستی اب تک سچی خدا پرستی کی عبادت گاہ سے خالی ہے -

حضرات ! مجھے ملامت کرے میں جلدی بہ کیجئے اگر میں حقیقت کو اس سے بھی زیادہ بے نقاب دیکھتا ہوں - افسوس کہ رقت کی جلدی اور قانون قدرت کی بے صبری نے ہماری غفلتوں کا ساتھ نہیں دیا - وہ اپنی ازلی بے پرورائی کے ساتھ نذائج و عوایب کی آخری منزل تک بڑھتا چلا آتا ہے - اب موت و حیات ' بقاء و فنا ' ایمان و کفر ' اور خدا اور ماسوی اللہ کی منزل ہمارے سامنے ہے ' اور اسلیئے میں وابل ملامت نہیں ہوں اگر حسن بیان اور بلاغت اطہار کے پر پیچ آداب و قواعد کو موت و حیات کی کشمکش میں سندھال نہیں سکنا - بہ حالات دیکھ کر میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر مجھ کو ایک مجلس کے صدر کی حیثیت سے اظہار مطالب کا موقع ملتا ہے تو میں اس سے انکار نہ کروں ' اور اگر صدارت کے حقوق و اختیارات کو اصل مقصد کیلیئے استعمال کر سکنا ہوں تو اسکو ایک مفید فرصت تصور کروں - شاید اس طرح اس صحیح راہ عمل کی طرف کوئی قدم

# بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله و كفى - و سلام على عباده الذين اصطفى

## بَاب

— : \* : —

## فصل

( خلافة )

” خلافة “ عربی کی ایک مصدر ہے - اُسکا مادہ ہے ” خلف “ - اور اسی سے ہے ” خلیفہ “ - خلیفہ کے لغوی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں ” من قولک خلف فلان فلانا فی هذا الامر اذا قام مقامه فیہ بعدہ “ [ ابن فارس ] یعنی اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کے بعد اُسکا نائب و قائم مقام ہوا تو یہ خلافت ہوئی ، اور لغۃ میں اسکو خلیفہ یعنی بعد کو آنے والا اور قائم مقام کہینگے - خواہ یہ نیابت سابق کی موت و عزل کی وجہ سے ہوئی ہو ، یا غیبت کی وجہ سے ، یا اپنا اختیار اور منصب سپرد کر دینے کی وجہ سے - مفردات امام راغب میں ہے ” الخلافة “ النيابة عن الغير ، اما بالغیبة المنوب عنه ، و اما لموته ، و اما لعجزه ، و اما لتشریف المستخلف “ ( صفحہ ۱۵۵ )

یہ لفظ بھی قرآن حکیم کے اختیارات لغویہ میں سے ہے - یعنی عربی زبان کے اُن لفظوں میں سے ہے جنکو لغۃ میں عام معانی کیلئے استعمال کیا جاتا تھا مگر قرآن حکیم نے اپنے خاص مصطلحۃ شرع معنی کیلئے اختیار کرلیا - جیسے ایمان ، غیب ، تقدیر ، بعث ، صلوٰۃ وغیرہ ذلک - ایمان کے لغوی معنی یقین و طمانیۃ اور زوال خوف و شک کے تھے ، لیکن قرآن حکیم نے اسکو ایک خاص طرح کے یقین و اقرار اور عمل کیلئے استعمال کیا ، اور اب ایمان قرآن کی بولی میں عام لغوی معنی کے خلاف ایک خاص اصطلاح قرار

رہی پروردگار عالم ہے جس نے تم کو زمین  
میں خلافت دی -

اگر تم نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو اللہ تمہاری  
جگہ کسی دوسری قوم کو تمہاری جگہ دیدیگا -  
پھر اُن قوموں کے بعد ہم نے تم کو اُنکی  
جگہ دی تاکہ دیکھیں تمہارے کام کیسے  
ہوتے ہیں ؟

اور یاد کرو جب تم کو قوم نوح کے بعد اُنکا  
جانشین بنایا -

اے داؤد ! ہم نے زمین میں تم کو  
خلیفہ بنایا -

وہو الذی جعلکم  
خلائف الارض ( ۶ : ۱۶۵ )

وہو الذی جعلکم  
خلائف الارض ( ۱۱ : ۵۷ )

ہم جعلناکم خلائف  
فی الارض من بعدہم لننظر  
کیف تعملون ؟ ( ۱۰ : ۱۴ )

واذکرا ان جعلکم خلفاء من  
بعد قوم نوح - ( ۷ : ۶۸ )

یا داؤد انا جعلناک  
خليفة فی الارض ( ۳۸ : ۲۶ )

اسی چیز کو زمین کی وراثت سے بھی تعبیر کیا گیا :

واقعد کتبنا فی الزبور اور زبور میں بھی ہمارا اعلان یہی تھا کہ  
من بعد الذکر ان الارض برئها یقیداً زمین کی حکومت ہمارے صالح بندوں  
عبادی الصالحون ( ۲۱ : ۱۰۵ ) ہی کی وراثت میں آتی ہے -

یہی چیز زمین کی ” تمکین ” اور ” تمکن ” یعنی طاقت و عظمت کا  
جماؤ اور پیام بھی ہے جو سر زمین فراعنہ میں کنعان کے ایک اسرائیلی  
نوجوان نے حاصل کی تھی جبکہ وہ غلامی کی حالت میں وہاں فروخت  
کیا گیا اور پھر اپنے عمل حق و صالح کی قوت سے ایک دن مصر کے  
ناج و تخت کا مالک ہو گیا :

کذا لک مکنا لیوسف - اس طرح ہم نے یوسف کی عظمت مصر  
میں قائم کر دی - ( ۱۲ : ۵۶ )

اور اسی کا مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا :

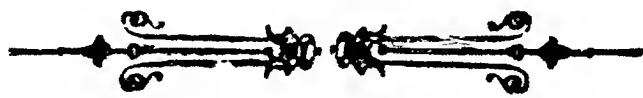
الذین ان مکنا ہم فی الارض وہ لوگ کہ اگر ہم انکی طاقت زمین  
افاموا الصلوة و آتوا الزکوة میں قائم کر دیں تو اُنکا کام یہ ہوگا کہ نماز  
و امروا بالمعروف و نہوا عن المنکر کریں گے ، زکوٰۃ ادا کریں گے ، نیکی کا  
حکم دیں گے ، اور برائی سے دنیا کو روکیں گے -  
الامور - ( ۲۲ : ۴۳ )

( ل )

کروں - شاید اس طرح اس صحیح راہ عمل کی طرف کوئی قدم اٹھ سکے جسکو بارہ سال سے اپنے سامنے رکھتا ہوں لیکن رفیقان طریق نے ہمیشہ اس سے اعراض کیا ہے ' اور آج بھی جبکہ اُس اعراض کے نتائج سامنے ہیں ' تذبذب و اضطراب عمل ' عزم و ایمان کے استحکام پر غالب نظر آ رہا ہے - حضرات ! صرف یہی ایک خیال تھا جس نے مجھے اس بات پر آمادہ کر دیا کہ اپنے اپنی محبت اور مہربانی سے جو عزت مجھے دینی چاہی ہے ' اُس سے گریز نہ کروں - میں آپکا شکر گزار ہوں ' اور آپکی دلی رفاقت و اعانت کا طلبگار - ہم سب کو اللہ کے فضل و توفیق پر اعتماد ہے جسکے بغیر کائنات ہستی کا کوئی ارادہ اور کوئی عمل کامیابی اور فلاح نہیں پاسکتا -

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہائے  
پھر التفات دل درستان رہے نہ رہے !

وما توفیقی الا باللہ - علیہ توکلت و الیہ انیب -





لغوي معني بقیں و طمانیة اور زوال خوف و شک کے تیے ، لیکن قرآن حکیم نے اسکو ایک خاص طرح کے یقین و اقرار اور عمل کیلیے استعمال کیا ، اور اب ایمان قرآن کی بولی میں عام لغوي معنی کے خلاف ایک خاص اصطلاح قرار پاگئی - قرآن کی زبان میں خلافة اور ” استخلاف فی الارض “ اور ” وراثت و تمکن فی الارض “ سے مقصود زمین کی فومی عظمت و رباست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت و سلطنت ہے - قرآن حکیم اسکو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے جو اچھے یقین اور اچھے کاموں کے بدلے افوام عالم کو دنیا میں مل سکتی ہے - قرآن کے نزدیک اس خلافت ارضی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی ہدایت و سعادت کیلیے ایک خاص ذمہ دار قوم و حکومت قائم ہو - وہ اللہ کی عدالت کو دنیا میں قائم کرے ، ظلم و جور اور انسان کی ابلیسی ضلالت و طغیان سے اُس کی زمین پاک ہو جائے ، ایک عام امن و سکون اور راحت و طمانیة دنیا میں پھیل جائے ، اور اللہ کا وہ ہمہ گیر قانون عدل جو تمام کائنات ہستی میں سورج سے لیکر زمین کے اندر کے حشرات تک کیلیے نافذ و قائم ہے ، اور جسکو قرآن اپنی زبان میں صراط مستقیم کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور جس سے صرف انسان ہی روگردانی کرنے والا ہے ، زمین کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں جاری و ساری ہو کر کرۂ ارضی کو سعادت و امنیت کی ایک بہشت بنادے !

لغة کے اعتبار سے بہ اطلاق اسلیے ہوا کہ سب سے پہلے جو قوم اور قوم کا جو فرد خلیفہ ہوا ، وہ زمین پر اللہ کی عدالت قائم رکھنے میں ، اللہ کی نیابت اور قائم مقامی رکھتا تھا ، اور اسکے بعد رالی قوم اپنے سابق کی نائب تھی ، اور ہر خلیفہ سابق کا قائم مقام - ظہور اسلام کے بعد جب ارضی خلافة کے وارث مسلمان ہوئے ، تو اس سلسلہ کا پہلا خلیفۃ اللہ صاحب و شارع اسلام تھا - یعنی محمد الرسول اللہ صلعم - اور پھر انکے بعد جن لوگوں کے ہاتھ اسلام کی مرکزی حکومت آئی ، وہ اس خلیفۃ اللہ کے نائب اور قائم مقام ہوئے - اسلیے اُن پر خلیفہ کا اطلاق ہوتا رہا اور اب تک ہو رہا ہے -

یہ زمین کی وراثت و خلافت یکے بعد دیگرے مختلف قوموں کے سپرد ہوتی رہی اور وہ دنیا میں اللہ کی طرف سے دیں حق کے خدمت گزار رہے - آیات ذیل میں اسی خلافت کا ذکر ہے :

ثم جعلناكم في الارض من بعدكم لننظر كيف تعملون ؟ ( ۱۴ : ۱۰ )  
 پھر اُن قوموں کے بعد ہم نے تم کو اُنکی جگہ دی تاکہ دیکھیں تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں ؟  
 واذکروا ان جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح - ( ۷ : ۶۸ )  
 اور یاد کر جب تم کو قوم نوح کے بعد اُنکا جانشین بنایا -  
 يا داؤد انا جعلناک خلیفة فی الارض ( ۲۶ : ۳۸ )  
 اے داؤد ! ہم نے زمین میں تم کو خلیفہ بنایا -

اسی چیز کو زمین کی وراثت سے بھی تعبیر کیا گیا :  
 ولقد کتبنا فی الزبور اور زبور میں بھی ہمارا اعلان یہی تھا کہ  
 من بعد الذکر ان الارض یرثها یقیناً زمین کی حکومت ہمارے صالح بندوں  
 عبادی الصالحون ( ۱۰۵ : ۲۱ ) ہی کی وراثت میں آئیگی -

یہی چیز زمین کی ” تمکین “ یعنی طاقت و عظمت کا جماؤ اور قیام بھی ہے جو سر زمین فراعنہ میں کذعان کے ایک اسرائیلی نوجوان نے حاصل کی تھی جبکہ وہ غلامی کی حالت میں وہاں فروخت کیا گیا اور پھر اپنے عمل حق و صالح کی قوت سے ایک دن مصر کے تاج و تخت کا مالک ہو گیا :  
 کذا لک مکننا لیوسف - اس طرح ہم نے یوسف کی عظمت مصر  
 ( ۵۶ : ۱۲ ) میں قائم کر دی -

اور اسی کا مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا تھا :  
 الذین ان مکننا ہم فی الارض وہ لوگ کہ اگر ہم انکی طاقت زمین  
 اقاموا الصلوة و آتوا الزکوة میں جمادیں تو اُنکا کام یہ ہوگا کہ نماز کو  
 و امروا بالمعروف و نہوا قائم کریں گے ، زکوٰۃ ادا کریں گے ، نیکی کا  
 عن المنکر ، و لله عاقبة حکم دیں گے ، اور برائی سے دنیا کو روکیں گے  
 الامور - ( ۲۲ : ۴۳ )

اس آیت کریمہ سے صاف طور پر یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ تمکین فی الارض یعنی حکومت کا مقصد اصلی قرآن حکیم کے نزدیک کیا ہے ؟  
 معلوم ہو گیا کہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی عبادت دنیا میں قائم کی جائے ،  
 نیکی اور راستی کا اعلان و ظہور ہو ، برائی سے نوع انسانی کے دلوں اور  
 ہاتھوں کو روک دیا جائے !

دوسری آیت میں اسکو خلافت کے لفظ سے تعبیر کیا :

و تسلط - پس اسلام کا خلیفہ ہو نہیں سکتا جب تک اس آیت نے بموجب زمین پر کامل حکومت و اختیار آئے حاصل نہ ہو - وہ مسیحیت کے پوپ کی طرح محض ایک آسمانی و دینی اقتدار نہیں ہے جسکے لیے دلوں کا اعتقاد اور پیشانیوں کا سجدہ کافی ہو - وہ کامل معذوں میں سلطنت و فرمانرانی ہے - اسلام کے قانون میں دینی و روحانی اقتدار خداؤ رسول کے سوا کوئی انسانی وجود نہیں رکھتا - ایسے اقتدار کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے - اسکا مٹانا اُس کے ظہور کا پہلا کام تھا : اتخذوا احبارہم و رہبانہم ارباباً

من دن اللہ - ( ۹ : ۳۲ ) اور ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب و الحکم

و النبوة ' ثم یقول للذاس کنوا عباداً لی من دن اللہ ' و لکن کنوا ربانیین

بما کدتم تعلمون الکتاب و بما کدتم تدرسون - ( ۲ : ۷۹ )

اللہ کے تمام وعدوں کی طرح یہ وعدہ بھی پورا ہوا - آتھہ نو سال بعد جب داعی اسلام دنیا سے تشریف لیگئے تو تمام جزیرہ عرب مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا اور رومیوں کے مقابلہ کیلئے اسلامی فوجیں مدینہ سے نکل رہی تھیں - اس سلسلہ خلافت اسلامیہ کا پہلا خلیفہ اللہ خود حضرت داعی اسلام ( صلی اللہ علیہ وسلم ) کا وجود مقدس تھا - اور آپ اپنے بعد کے جانشینوں کو خود لفظ خلفاء سے تعبیر فرما کر واضح کر دیا تھا کہ وہ آپکے نائب اور قائم مقام ہونگے - " علیکم بسنتی و سنتہ خلفاء الراشدین " ( ابن ماجہ عن العریاض بن ساریہ ) و امثالہا - آپکے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب جانشین ہوئے تو وہ خلیفہ رسول اللہ تھے -

( خلافت خاصہ و خلافت ملوکی )

آنحضرت کے بعد خلافت آپ کے خصال و نتائج کے اعتبار سے دو بڑے سلسلوں میں منقسم ہوگئی - خود آنحضرت نے نہ صرف ان دو سلسلوں کی پیشتر سے خبر ہی دیدی تھی بلکہ انکے تمام علائم و خصائص صاف صاف بیان کر دیے تھے - اس بارے میں جو احادیث موجود ہیں وہ کثرت طرق و شہرت متن و قبول طبقات کی بنا پر حد تو اتر تک پہنچ چکی ہیں - پہلا سلسلہ خلافت خلفاء راشدین مہدیین کا تھا جنکی خلافت منہاج نبوت پر تھی - وہ صحیح و کامل معنوں میں منصب نبوت کے جانشین اور جامعیت شخص رسالہ کے قائم مقام تھے - یعنی انکا طریق کار ٹھیک ٹھیک طریق نبوت کے مطابق تھا اور اسلیے گویا عہد نبوت کا ایک آخری جزء - اور جس طرح وجود

پاگلی ہے ۔ قرآن کی زبان میں خلافت اور ”استخلاف فی الارض“ اور ”وراثت و تمکن فی الارض“ سے مقصود زمین کی قومی عظمت و ریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت و سلطنت ہے ۔ قرآن حکیم اسکو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے جو اچھے یقین اور اچھے کاموں کے بدلے اقوام عالم کو دنیا میں مل سکتی ہے ۔ قرآن کے نزدیک اس خلافت ارضی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی ہدایت و سعادت کیلئے ایک خاص ذمہ دار قوم و حکومت قائم ہو ۔ وہ اللہ کی عدالت کو دنیا میں نافذ کرے ، ظلم و جور اور ضلالت و طغیان سے اُس کی زمین پاک ہو جائے ، ایک عام امن و سکون اور راحت و طمانینہ دنیا میں پھیل جائے ، اور اللہ کا وہ ہمہ گیر قانون عدل جو تمام کائنات ہستی میں سورج سے لیکر زمین کے ذرات تک نافذ و قائم ہے ، اور جسکو قرآن اپنی زبان میں صراط مستقیم کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے ، زمین کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں جاری و ساری ہو کر کرۂ ارضی کو سعادت و امنیت کی ایک بہشت زار بنادے !

لغة کے اعتبار سے یہ اطلاق اسلیے ہوا کہ سب سے پہلے جو قوم اور قوم کا جو فرد خلیفہ ہوا ، وہ زمین پر اللہ کی عدالت قائم رکھنے میں ، اللہ کی نیابت اور قائم مقامی رکھتا تھا ، اور اس کے بعد والی قوم اپنے سابق کی نائب تھی ، اور ہر خلیفہ ، سابق کا قائم مقام ۔ ظہور اسلام کے بعد جب ارضی خلافت کے وارث مسلمان ہوئے ، تو اس سلسلہ کا پہلا خلیفۃ اللہ صاحب و شارع اسلام تھا ۔ یعنی محمد الرسول اللہ صلعم ۔ اور پھر ان کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ اسلام کی مرکزی حکومت آئی ، وہ اس خلیفۃ اللہ کے نائب اور قائم مقام ہوئے اسلیے اُن پر خلیفہ کا اطلاق ہوا اور اب تک ہو رہا ہے ۔

یہ زمین کی وراثت و خلافت یکے بعد دیگرے مختلف قوموں کے سپرد ہوتی رہی اور وہ دنیا میں اللہ کی طرف سے دین حق کے خدمت گزار رہے ۔ آیات ذیل میں اسی خلافت کا ذکر ہے :

|                      |  |
|----------------------|--|
| وہو الذی جعلکم       | وہی پروردگار عالم ہے جس نے تم کو زمین          |
| خلائف الارض (۶: ۱۶۵) | میں خلافت دی ۔                                 |
| و یتخلف ربی قوما     | اگر تم نے اپنا فرض ادا نہ کیا تو میرا پروردگار |
| غیر کم ۔ ( ۵۷: ۱۱ )  | تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو دیدیگا ۔           |



اس آیت کریمہ سے صاف طور پر یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ تمکین فی الارض یا حکومت کا مقصد اصلی قرآن حکیم کے نزدیک کیا ہے ؟ معلوم ہوگیا کہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی عبادت دنیا میں قائم کی جائے ، نیکی اور راستی کا اعلان و ظہور ہو ، برائی سے نوع انسانی کے دلوں اور ہاتھوں کو روک دیا جائے !

دوسری آیت میں اسکو خلافت کے لفظ سے تعبیر کیا :

وعد الله الذين آمنوا  
ممن وعملوا الصالحات  
ليستخلفنهم في الارض كما  
استخلف الدين من قبلهم  
وليمكن لهم ديدهم الذي  
ارتضى لهم ، وليبدلهم  
من بعد خوفهم امنا -  
يعبدونني لا يشركون بي شيئا  
ومن كفر بعد ذلك فاولئك  
هم العاصرون ( ۲۴ : ۵۵ )

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل انجام دیے ، اللہ کا انسے وعدہ ہے کہ انہیں زمین کی خلافت دیگا ۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح پچھلی قوموں کو دی جا چکی ہے ۔ اور ایسا کریگا کہ انکے لیے اُن کا دین حق قائم ہو جائیگا اور خوف کی گھڑیاں دائمی امن کی خوشحالی سے بدل دی جائیں گی ۔

یہ آیت اسوقت نازل ہوئی جب ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی زندگی جاروں طرف دشمنوں سے گھری ہوئی تھی اور قلت تعداد و بے سر سامانی حال کے ساتھ دشمنوں کے بے درجہ حملوں کا یہ حال تھا کہ کسی دوت بھی ہتیار اپنے جسم سے دور نہیں کر سکتے تھے ۔ اسوقت بعض مسلمانوں کی زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا ” ما باتي علينا يوم نأمن فيه و نضع عنا السلاح “ انک دن ” بھی ہم پر ایسا نہیں آبا کہ اس دے خوی کے ساتھ صبح سام بسر کرنے اور ہتیار اپنے جسم سے الگ کر سکنے ۔ ابو العالیہ زاری ہیں کہ اسدر مدرجہ صدر آیت نازل ہوئی اور اللہ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ ایمان و عمل صالح کا پھل عنقریب ملے والا ہے جبکہ خوف کی جگہ امن ہوگا ، مظلومی و بیچارگی کی جگہ قیام و فرمانروائی ہوگی ، اور سب سے ترہکرا کہ زمین کی خلافت انہی کے قبضہ اقتدار میں آ جائیگی ۔ ( تفسیر طبری جلد ۱۸ صفحہ ۱۲۲ )

اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ قرآن حکیم کے نزدیک جو چیز ” خلافت “ ہے ، وہ خلافت فی الارض ہے ۔ یعنی زمین کی حکومت

ہے، اور اسکا مٹانا اُس کے ظہور کا پہلا کام تھا : اتخذوا احبارہم و رہبانہم ارباباً  
 من دن اللہ ( ۹ : ۳۲ ) اور ماکن لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب و الحکم  
 و النبوة، ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دن اللہ، و لکن کونوا ربانیین  
 بما کنتم تعلمون الکتاب و بما کنتم تدرسون - ( ۲ : ۷۹ )

اللہ کے تمام وعدوں کی طرح یہ وعدہ بھی پورا ہوا۔ آٹھ نو سال  
 بعد جب داعی اسلام دنیا سے تشریف لیگئے تو تمام جزیرۂ عرب مسلمانوں  
 کے قبضہ اقتدار میں آچکا تھا اور رومیوں کے مقابلہ کیلئے اسلامی فوجیں  
 مدینہ سے نکل رہی تھیں۔ اس سلسلۂ خلافت اسلامیہ کا پہلا خلیفۃ اللہ خود  
 حضرت داعی اسلام ( صلی اللہ علیہ و سلم ) کا وجود مقدس تھا، اور اپنے اپنے  
 بعد کے جانشینوں کو خود لفظ خلفاء سے تعبیر فرما کر راضی کر دیا تھا کہ وہ  
 آپکے نائب اور قائم مقام ہونگے۔ ” علیکم بسنتی و سنتہ الخلفاء الراشدین “  
 ( ابن ماجہ عن العریاض بن ساریہ ) و امثالہا۔ آپکے بعد حضرت ابوبکر  
 رضی اللہ عنہ جب جانشین ہوئے تو وہ خلیفۃ رسول اللہ تھے۔

## فصل

( خلافت خاصہ و خلافت ملوکی )

آنحضرت کے بعد خلافت اپنے خصائص و نقائص کے اعتبار سے دو بڑے  
 سلسلوں میں منقسم ہوگئی۔ خود آنحضرت نے نہ صرف ان کی پیشتر  
 سے خبر ہی دیدی تھی، بلکہ تمام علائم و خصائص صاف صاف بیان  
 کر دیے تھے۔ اس بارے میں جو احادیث موجود ہیں، وہ کثرت طرق،  
 شہرت متن، قبول طبقات، کی بنا پر حد تو اترا تک پہنچ چکی ہیں۔  
 پہلا سلسلۂ خلافت خلفاء راشدین مہدیئین کا تھا جنکی خلافت منہاج نبوت پر  
 تھی۔ یعنی وہ صحیح و کامل معنوں میں منصب نبوت کے جانشین اور  
 جامعۂ شخص رسالۃ کے قائم مقام تھے۔ انکا طریق کار تھیک تھیک طریق  
 نبوت کے مطابق تھا، اور اسلیئے گویا عہد نبوت کا ایک آخری جزء تھا۔  
 اور جس طرح وجود نبوت میں مختلف حیثیتوں کا اجتماع تھا، اسی طرح  
 انکی شخصیت بھی جامع و حارمی تھی۔ دینی دعوۃ اور شرعی اجتہاد  
 و امر، حکومت و فرمانروائی اور قوام و نظام شرع، نظام شریعت اور نظام

کالخصیر عوداً عوداً ، جو حضرت عثمان کی شہادت سے شروع ہوئی ، اور جسقدر عہد نبوت سے دوری بڑھتی گئی ، اتنی ہی عہد نبوت اور خلافت رحمت کی سعادتوں سے امت محروم ہوتی گئی ۔ یہ محرومی صرف امامت و خلافت کبریٰ کے معاملہ ہی میں نہیں ہوئی ، بلکہ قوام امت کی ارنچی اور اصولی باتوں سے لیکر حیات شخصی و انفرادی کی اعتقادی و عملی جزئیات تک ، ساری باتوں کا یہی حال ہوا ۔ فتنہ و فساد کے اس سیلاب کو صرف ایک دیوار روکے ہوئے تھی جو بقول حضرة حذیفہ ( اعلم الصحابة بالفتن ) حضرة عمر ( رض ) کا وجود تھا ۔ جونہی یہ بنیان مرموص ہتی ، وہ سیلاب عظیم آمدنا ، اور پھر کوئی سد و بند اسکی راہ نہ روک سکا ۔ اسی سیلاب کو حضرة حذیفہ کی روایت میں ” التي تموج كموج البحر “ سے تعبیر کیا گیا تھا ۔ یعنی سمندر کی موجوں کی طرح اسکی موجیں اٹھینگی ۔ سورافعی اٹھیں ، اور دور خلافت و رحمت اور ” خلافة على منهاج النبوة “ کی عظیم الشان عمارت اسکے طلاطم و طغیان میں آنا فنا بہہ گئی ۔

احادیث میں نہایت کثرت کے ساتھ اسلام کے ایک آخری دور کی بھی خبر دی گئی ہے جو اپنے برکات کے اعتبار سے دور اول کے خصائص تازہ کر دیگا ، اور جسکا حال یہ ہوگا کہ ” لا یدری اولہا خیر ام آخرہا “ نہیں گہا جاسکتا کہ امت کی ابتدا زیادہ کامیاب تھی یا اسکا اختتام ؟ بھی وہ آخری زمانہ ہوگا جب اللہ کا اعلان اپنے کامل معذوں میں پورا ہوکر رہیگا کہ :

لیظہرہ علی الدین کلہ دین اسلام اور اسکا رسول اسلیے آیا تاکہ تمام ولوکرہ المشرکون ( ۹:۶۱ ) دیدوں اور قوموں پر بالآخر غالب ہر کر رہے

( کیونکہ آخری غلبہ صرف اصلح کیلیے ہے اور

تمام دینوں میں اصلح صرف اسلام ہی ہے )

بھی وجہ ہے کہ مایوسیوں اور نامرادیوں کی اس عالمگیر تاریکی میں بھی جو آج چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے ، ایک مومن قلب کیلیے فتح و اقبال کی روشنیاں برابر چمک رہی ہیں ۔ بلکہ جسقدر تاریکی بڑھتی جاتی

ہے ، اُنہی زیادہ طلوع صبح کا رقت قریب آتا جاتا ہے : الا ، ان نصر اللہ ہی قریب !

تفارت ست میان شنیدن من و تو  
تو بستن درو من فتح باب می شوم !

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل انجام دیے، اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ انہیں زمین کی خلافت دیگا۔ تھیک اسی طرح جس طرح پچھلی قوموں کو دی جا چکی ہے۔ اور ایسا کریگا کہ ان کے لیے ان کا دین حق قائم ہو جائیگا اور خوف کی گھڑیاں امن کی خوشحالی و کامرانی سے بدل دی جائیں گی۔

وعد الله الذين آمنوا  
منكم وعملوا الصالحات  
ليستخلفنهم في الارض كما  
استخلف الذين من قبلهم  
وليمكنن لهم دينهم الذي  
ارتضى لهم وليبدلنهم  
من بعد خوفهم امنا -  
يعبدونني لا يشركون بي شيئا  
ومن كفر بعد ذلك فاراك  
هم الفاسقون ( ۲۴ : ۵۵ )

یہ آیت اسوقت نازل ہوئی جب ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کی زندگی دشمنوں سے گھری ہوئی تھی اور قلت تعداد و بے سروسامانی حال کے ساتھ دشمنوں کے پے درپے حملوں کا یہ حال تھا کہ کسی وقت بھی ہتیار اپنے جسم سے دور نہیں کرسکتے تھے۔ اسوقت بعض مسلمانوں کی زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا ”ما یأتی علینا یوم نأمن فیہ و نضع عنا السلاح“ ایک دن بھی ہم پر ایسا نہیں آیا کہ امن و بے خوفی کے ساتھ صبح و شام بسر کرتے اور ہتیار اپنے جسم سے الگ کرسکتے۔ ابو العالیہ رازی ہیں کہ اسپر مندرجہ صدر آیت نازل ہوئی اور اللہ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ مضطرب نہوں، ایمان و عمل صالح کا پھل عنقریب ملنے والا ہے جبکہ خوف کی جگہ امن ہوگا، مظلومی و بیچارگی کی جگہ فرمانروائی و کامرانی ہوگی، اور سب سے بڑھکر یہ کہ زمین کی خلافت انہی کے قبضہ اقتدار میں آجائیگی۔ ( تفسیر طبری جلد ۱۸ صفحہ ۴۲۲ )

اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ قرآن حکیم کے نزدیک جو چیز ”خلافت“ ہے، وہ خلافت فی الارض ہے۔ یعنی زمین کی حکومت و تسلط۔ پس اسلام کا خلیفہ ہو نہیں سکتا جب تک بموجب اس آیت کے زمین پر کامل حکومت و اختیار اسے حاصل نہ ہو۔ وہ مسیحیت کے پوپ کی طرح محض ایک آسمانی و دینی اقتدار نہیں ہے جسکے لیے دلوں کا اعتقاد اور پیشانیوں کا سجدہ کافی ہو۔ وہ کامل معذوں میں سلطنت و فرمانروائی ہے۔ اسلام کے قانون میں دینی و روحانی اقتدار خداؤ رسول کے سوا کوئی انسانی وجود نہیں رکھتا۔ ایسے اقتدار کو قرآن نے شرک قرار دیا



نبوة میں مختلف حیثیتوں کا اجتماع تھا ، اسی طرح انکی شخصیت بھی جامع و حارہ تھی - دینی دعوت اور شرعی اجتہاد و امر ، حکومت و فرمانروائی اور فوام و نظام شرع ، نظام شریعت اور نظام سیاست ، یہ سب انکی ذات میں اکٹھے تھے - انکی حکومت سچے اور حقیقی اسلامی نظام پر تھی - یعنی حکومت شوری ، جسکو آجکل کی زبان میں ایک ناقص تشبیہ کے ساتھ ہی بدلتے ہوئے ہیں - یہ سلسلہ حضرة علي عليه السلام پر ختم ہو گیا -

دوسرا سلسلہ خلافت منہاج نبوت سے الگ مجرد حکومت و پادشاہت کا تھا ، جبکہ عجمی بدعتیں خالص اسلامی و عربی تمدن سے ملکر ایک نیا دور شروع کر رہی تھیں - یہ سلسلہ خلافت اگرچہ بعد کی خلافتوں کے مقابلے میں پہلے سلسلے سے اورب تھا ، لیکن خلافت راشدہ کے حقیقی خصائص ناپید ہو گئے تھے - خلفاء بذراعت سے لکر آجنگ جو سلسلہ خلافت اسلامیہ جاری ہے ، وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہے - احادیث میں پہلے سلسلہ کو بوجہ غلط طریق ہدایت و نبوة خلافت کے لفظ سے اور دوسرے کو بوجہ غلبہ سیاست و شخصیت پادشاہت کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے ” الخلافة بعدی ثلاثون عاماً ثم ملک بعد دلتک “ اور حدیث ابو ہریرہ ” الخلافة بالمدنیہ و الملک بالشام “ انک دوسری حدیث میں بالترتیب تین دور بنلائے گئے ہیں ” نبوة و رحمة “ ثم خلافة و رحمة “ و فی لفظ ” خلافة علی منہاج النبوة ثم لكون ملک عضوص “ امد معارفہ نے اس کی نسبت کہا تھا - ہم نے عہد ملوکی پر فصاحت کر لی -

آخری حدیث کے مطابق تین دور ہوئے - عہد نبوت و رحمت ، خلافت و رحمت ، بادشاہی و اسبندادی ، فرمانروائی - پہلا دور آنحضرت صلعم کی وفات پر ختم ہو گیا - دوسرا دور فی الحقیقت عہد نبوت کا ایک ذمہ اور لارمی جزو تھا ( حتماً کہ سلسلہ دعوت و ظہور نبوت اور تکمیل کاروبار شرائع میں ہمیشہ سبذ اللہ رہی ہے ) جو حضرة امیر علیہ السلام پر ختم ہو گیا - اسکے بعد سے مجرد عہد بادشاہی و اسبندادی شروع ہوا جو آجنگ جاری ہے - اس دور کی بھی بہت سی مختلف شاخیں علاحدہ علاحدہ احادیث میں بنلائی گئی ہیں ، اور وہ سب ٹھیک ٹھیک ظہور میں آئیں - نبوت و رحمت کی برکت کی معرومی و فغان کا ایک تدریجی تنزل تھا ، اور بدعات و فتن کے ظہور و احاطہ کی ایک تدریجی ترقی تھی ،

رحمت کی سعادتوں سے امت محروم ہوتی گئی - یہ محرومی صرف امامت و خلافت کبریٰ کے معاملہ ہی میں نہیں ہوئی ، بلکہ قوام و نظام امت کے مبادیات و اساسات سے لیکر حیات شخصی و انفرادی کی اعتقادی و عملی جزئیات تک ، ساری باتوں کا یہی حال ہوا - فتنہ و فساد کے اس سیلاب کو صرف ایک دیوار روکے ہوئے تھے جو بقول حضرت حذیفہ ( اعلام الصعابة بالفتن ) حضرت عمر (رض) کا وجود تھا - جونہی یہ بنیان مرصوص ہٹی ، وہ سیلاب عظیم اُمنڈا ، اور پھر کوئی سد زبند اُسکی راہ نہ روک سکا - اسی سیلاب کو حضرت حذیفہ کی روایت میں ” التي تموج كموج البحر “ ( رواہ البخاری ) سے تعبیر کیا گیا تھا - یعنی سمندر کی موجوں کی طرح اُسکی موجیں اُٹھینگی - سو واقعی اُنہیں ، اور دور خلافت و رحمت اور ” خلافة على منهاج النبوة “ کی عظیم الشان عمارت اُسکے طلاطم و طغیان میں اُنّا فانّا بہ گئی -

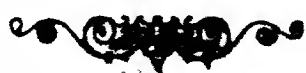
احادیث میں نہایت کثرت کے ساتھ اسلام کے ایک آخری دور کی بھی خبر دی گئی ہے جو اپنے برکات کے اعتبار سے دُزارل کے خصائص تازہ کر دیگا ، اور جسکا حال یہ ہوگا کہ ” لا یدری ازلہا خیرام آخرہا “ نہیں کہا جاسکتا کہ امت کی ابتدا زیادہ کامیاب تھی یا اُسکا اختتام ؟۔ یہی وہ آخری زمانہ ہوگا جب اللہ کا اعلان اپنے کامل معذوں میں پورا ہوکر رہیگا کہ :

ليظهره على الدين كله دين اسلام اور اُسکا رسول اسليہ آيا تاکہ تمام ولو کرہ المشرکون - دینوں اور قوموں پر بالآخر غالب ہوکر رہے ( کیونکہ آخری غلبہ و بقاء صرف اصلح کیلئے ہے اور تمام دینوں میں اصلح صرف اسلام ہی ہے )

یہی وجہ ہے کہ مایوسیوں اور فامرادیوں کی اس عالمگیر تاریکی میں بھی جو آج چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے ، ایک مومن قلب کیلئے فتح و اقبال کی روشنیاں برابر چمک رہی ہیں - بلکہ جسقدر تاریکی بڑھتی جاتی ہے ، اتنا ہی زیادہ طلوع صبح کا رقت قریب آتا جاتا ہے : ان موعدهم

الصبح ، اليس الصبح بقرب !

تفاوت ست میان شنیدن من و تو  
تو بستن در من فتح باب می شنوم !



کی زبان میں ”عمل صالح“ اور ”حسنات“ کہتے ہیں۔ جب جسم انسانی پر طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں ”تندرستی“ سے تعبیر کی جاتی ہے اور حکیم کہتا ہے کہ یہ ”زندگی“ ہے۔ اور پھر یہی حالت ہے کہ جب قومی و ملی زندگی کی قوتوں اور عملوں پر طاری ہو جاتی ہے تو اُسکا نام ”حیات قومی و اجتماعی“ ہوتا ہے، اور اُسکا ظہور قومی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط کی شکل میں دنیا دیکھتی ہے۔ الفاظ بہت سے ہیں مگر معنی ایک ہے۔ مظاہر گو مختلف ہیں مگر تمام کارخانہ کائنات میں اُس حکیم یگانہ و واحد کی ذات کی طرح، اُسکا قانون حیات و وجود بھی ایک ہی ہے:

عبارة تنا شتی و حسنک واحد

رکل الی ذاک الجمال یشیر!

اس حالت کا ضد ”اشتات و انتشار“ ہے۔ ”اشتات“ ”شتت“ سے ہے جسکے معنی لغۃ میں ”تفریق“ اور الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔ ”یقال شت جمعہم شتا و شتاتاً“ و جاؤا اشتاتاً۔ ای متفرقی النظام“۔

( مفردات : ۲۵۶ ) قرآن حکیم میں ہے : یومئذ یصدر الناس اُشتاتاً ( ۶:۹۹ )

اور من نبات شتی ( ۵۳:۲۰ ) اور و قلوبہم شتی ( ۱۴:۵۹ ) ”ای مختلفہ۔ انتشار“ ”نشر“ سے ہے۔ اسکے معنی بھی الگ الگ ہو جانے کے ہیں۔

یعنی تفرق کے۔ سورہ جمعہ میں ہے : فاذا قضیت الصلوة فانتشروا۔ یعنی تفرقوا۔ ”اشتات و انتشار“ سے مقصود یہ حالت ہے جب اجتماع و ائتلاف کے برعکس ہر بات میں الگ الگ ہو جانے، منفرق اور پراگندہ ہونے، اور باہم دگر علیحدگی و بیگانگی کی حالت طاری ہو جائے۔ مواد میں، قوی میں، اعمال میں، افراد میں، ہر بات میں پہلی حالت سے ضد اور عکس کی حالت پیدا ہو جائے۔ یہ حالت جب مادہ پر طاری ہوتی ہے تو ”تکوین“ کی جگہ ”فساد“ اور ”رجو“ کی جگہ ”عدم و فنا“ کا اُسپر اطلاق ہوتا ہے۔ جسم پر طاری ہوتی ہے تو اُسکا نام پہلے ”بیماری“ اور پھر ”موت“ ہے۔ اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اُسی کو قرآن حکیم اپنی اصطلاح میں ”عمل سوء“ اور ”عصیان“ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور پھر یہی چیز ہے کہ جب قوموں اور امتوں کی اجتماعی زندگی پر طاری ہو جاتی ہے تو دنیا دیکھتی ہے کہ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عظمت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومیت، اور بالآخر زندگی کی جگہ موت اُس پر چھا گئی ہے!

سیاست‘ یہ تمام قوتیں اُنکی ذات واحد میں جمع تھیں۔ اُنکی حکومت سچے اور حقیقی اسلامی نظام پر تھی۔ یعنی حکومت شوریٰ‘ جسکو آجکل کی زبان میں ایک ناقص تشبیہ کے ساتھ رمی پبلک کہہ سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت علی علیہ السلام پر ختم ہو گیا۔

دوسرا سلسلہ خلافت منہاج نبوت سے الگ مجرد حکومت و پادشاہت کا تھا‘ جبکہ عجمی بدعتیں خالص اسلامی و عربی تمدن سے ملکر ایک نیا دور شروع کر رہی تھیں۔ یہ سلسلہ خلافت اگرچہ بعد کی خلافتوں کے مقابلے میں پہلے سلسلے سے اقرب تھا‘ لیکن خلافت راشدہ کے حقیقی خصائص ناپید ہو گئے تھے۔ خلفاء بنو امیہ سے لیکر آج تک جو سلسلہ خلافت اسلامیہ جاری ہے‘ وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہے۔ احادیث میں پہلے سلسلہ کو بوجہ غلبہ طریق ہدایت و نبوة خلافت کے لفظ سے اور دوسرے کو بوجہ غلبہ سیاست و شخصیت پادشاہت کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے ”الخلافة بعدی ثلاثون عاما ثم ملک بعد ذلک“ [آخر جہ اصحاب السنن] اور حدیث ابو ہریرہ۔ ”الخلافة با لمدنیہ و الملک با لشام“ ایک دوسری حدیث میں بالترتیب تین دور بتلائے گئے ہیں ”نبوة و رحمة“ ثم خلافة و رحمة“ و فی لفظ ”خلافة علی منہاج النبوة ثم یكون ملک عضوض (رواہ البزار و قال السیوطی حسن) امیر معاویہ نے اسیکی نسبت کہا تھا۔ ہم نے عہد ملوکی پر قناعت کر لی۔

آخری حدیث کے مطابق تین دور ہوئے۔ عہد نبوت و رحمت‘ خلافت و رحمت‘ پادشاہی و فرمانروائی۔ پہلا دور آنحضرت صلعم کی وفات پر ختم ہو گیا۔ دوسرا دور فی الحقیقت عہد نبوت کا ایک تلمہ اور لازمی جز تھا (جیسا کہ سلسلہ دعوت اور تکمیل کار و بار شرائع میں ہمیشہ سنۃ اللہ رہی ہے) جو حضرت امیر علیہ السلام پر ختم ہو گیا۔ اسکے بعد سے مجرد عہد پادشاہی و استبدادی شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔ اس دور کی بھی بہت سی مختلف شاخیں علحدہ علحدہ احادیث میں بتلائی گئی تھیں‘ اور وہ سب ٹھیک ٹھیک ظہور میں آئیں۔ نبوت و رحمت کی برکات کی محرومی و فقدان کا ایک تدریجی تنزل تھا‘ اور بدعات و فتن کے ظہور و احاطہ کی ایک تدریجی ترقی تھی‘ کالعصیر عوداً عوداً‘ جو حضرت عثمان کی شہادت سے شروع ہوئی‘ اور جسقدر عہد نبوت سے دوری بڑھتی گئی‘ اُنہی ہی عہد نبوت اور خلافت



( عہد اجتماع وائتلاف ' ودر اشتات و انتشار )

آپ آزرده خاطر نہوں اگر موضوع کی وسعت چند لمحوں کیلئے مجمعہ اپنے اطراف و جوانب کی طرف بے اختیار مائل کر لے - اس مقام کی مزید وضاحت کیلئے بہتر ہوگا کہ در خاص اصطلاحی لفظوں کے معانی پر آپ پہلے غور کر لیں - ایک " اجتماع " اور " ائتلاف " ہے - دوسرا " اشتات " اور " انتشار " ہے - نہ صرف امتہ اسلامیہ بلکہ تمام اقوام و امم عالم کی موت و حیات، ترقی و تنزل، اور سعادت و شقارت کے جو اصولی اسباب و مراتب قرآن حکیم نے بیان کیے ہیں، انکی سب سے زیادہ اہم حقیقت انہی الفاظ کے اندر پوشیدہ ہے - " اجتماع " کے معنی ہیں " ضم الشيء بتقريب بعضه من بعض " ( مفردات امام راغب : ۹۵ ) یعنی مختلف چیزوں کا باہم اکٹھا ہو جانا - اور ائتلاف " الف " سے ہے - اسکے معنی ہیں " ما جمع من اجزاء مختلفہ " ورتب ترتیباً، قدم فیہ ما حقہ أن يقدم، و آخر فیہ ما حقہ أن يؤخر " ( مفردات : ۱۹ ) یعنی مختلف چیزوں کا اس تناسب اور ترتیب کے ساتھ اکٹھا ہو جانا کہ جس چیز کو جس جگہ ہونا چاہیے وہی جگہ آئے ملے - جو پہلے ہونے کی حقدار ہے وہ پہلے رہے - جسکو آخری جگہ ملنی چاہیے، وہ آخری جگہ پائے - " عہد اجتماع و ائتلاف " سے مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، ایک مرکز، ایک سلسلے، ایک وجود، ایک طاقت، اور ایک فرد واحد میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ اکٹھی ہو جاتی ہیں، اور تمام مواد، قوی، اعمال، اور افراد پر ایک اجتماعی و انضمامی دور طاری ہو جاتا ہے - بعدیکہ ہر قوت اکٹھی، ہر عمل با ہمدگر جزا اور ملا ہوا، ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی، ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہوتا ہے - کسی چیز، کسی گوشے، کسی عمل میں علیحدگی، جدائی، انتشار، اور الگ الگ، جزء جزء، فرد فرد، ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی - مادہ میں جب یہ اجتماع و انضمام پیدا ہو جاتا ہے، تو اسی سے تخلیق و تکوین اور وجود و ہستی کے تمام مراتب ظہور میں آتے ہیں - اسی کو قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں مرتبہ " تخلیق " و " تسوہ " سے بھی تعبیر کیا ہے : الذی خلق فسوی ( ۸۶ : ۲ ) پس زندگی اور وجود نہیں ہے مگر اجتماع و ائتلاف، اور موت و فنا نہیں ہے مگر اسکا ضد - یہی حالت جب افعال و اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اخلاق کی زبان میں اسکو " خیر " اور شریعت

ہے : الذی خلق فسی ( ۲ : ۸۶ ) پس زندگی اور وجود نہیں ہے مگر اجتماع و ائتلاف اور موت و فنا نہیں ہے مگر اسکی ضد - یہی حالت جب افعال و اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اخلاق کی زبان میں اسکو ”خیر“ اور شریعة کی زبان میں ”عمل صالح“ اور ”حسنات“ کہتے ہیں - جب جسم انسانی پر طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں ”تندرستی“ سے تعبیر کی جاتی ہے اور حکیم کہتا ہے کہ یہ ”زندگی“ ہے - اور پھر یہی حالت ہے کہ جب قومی و جماعتی زندگی کی قوتوں اور عملوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام ”حیات قومی و اجتماعی“ ہوتا ہے ، اور اسکا ظہور قومی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط کی شکل میں دنیا دیکھتی ہے - الفاظ بہت سے ہیں - معنی ایک ہے - مظاہر گو مختلف ہیں مگر اس حکیم یگانہ و واحد کی ذات کی طرح ، اسکا قانون حیات و وجود بھی اس کائنات ہستی میں ایک ہی ہے - و لنعم ما قیل :

عبارتنا شتی و حسنک واحد

وکل الی ذاک الجمال یشیر !

اس حالت کی ضد ”اشتات و انتشار“ ہے - اشتات ”شتت“ سے ہے جسکے معنی لغۃ میں ”تفریق“ اور الگ الگ ہو جانے کے ہیں - ”یقال شت جمعہم شتا و شتاتاً“ و جاؤا اشتاتاً - ای متفرقی النظام ( مفردات : ۲۵۶ ) قرآن حکیم میں ہے : یومئذ یصدر الناس اشتاتاً ( ۶ : ۹۹ ) ارزمن نبات شتی ( ۵۳ : ۲۰ ) اور و قلوبہم شتی ( ۱۴ : ۵۹ ) ای مختلفہ - انتشار ”نشر“ سے ہے - اسکے معنی بھی الگ الگ ہو جانے کے ہیں - یعنی تفرق کے - سورۃ جمعہ میں ہے : فاذا قضیت الصلوة فانتشروا - یعنی تفرقوا - ”اشتات و انتشار“ سے مقصود یہ حالت ہے جب اجتماع و ائتلاف کی جگہ الگ الگ ہو جانے ، متفرق اور پراگندہ ہونے ، اور باہمدگر علیحدگی و بیدگاری کی حالت طاری ہو جائے - مردانہ میں ، قوی میں ، اعمال میں ، افراد میں ، ہر بات میں پہلی حالت سے بالکل متضاد حالت پیدا ہو جائے - یہ حالت جب مادہ پر طاری ہوتی ہے تو ”تکوین“ کی جگہ ”فساد“ اور ”رجوع“ کی جگہ ”عدم و فنا“ کا اسپر اطلاق ہوتا ہے جسم پر طاری ہوتی ہے تو اسکا نام پلے ”بیماری“ اور پھر ”موت“ ہے - اعمال پر طاری ہوتی ہے تو اسی کو قرآن حکیم اپنی اصطلاح میں ”عمل سوء“ اور ”عصیان“ سے تعبیر کرتا ہے - اور پھر یہی چیز ہے کہ جب

لو انفق ما فی الارض  
 جمیعاً، ما الفت بین  
 قلوبہم - ولکن اللہ الف  
 بینہم - انہ عزیز حکیم  
 ( ۶۸ : ۸ )

اگر تم زمین کا سارا خزانہ بھی خرچ کر ڈالو  
 جب بھی ان بکھرے ہوئے اور اختلاف و تفریق  
 میں دوبے ہوئے دلوں کو محبت و اتحاد  
 کے ساتھ جوڑ نہیں سکتے تھے - یہ اللہ ہی کا  
 فضل ہے جس نے متفرق دلوں کو اکٹھا کر دیا -

اور اسی لیے قرآن حکیم ظہور شریعت و نزول وحی کا پہلا نتیجہ اجتماع  
 وائتلاف قرار دیتا ہے، اور بار بار کہتا ہے کہ تفرقہ و انتشار شریعت و اسلام کے  
 کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے - اور اس لیے یہ نتیجہ شریعت سے بغی و عدوان  
 اور اسکو بالکل ترک کر دینے کا ہے : فما اختلفوا حتی جاء ہم العلم (۱۳ : ۹۳)

و آتیذا ہم بینات من الامر، فما اختلفوا الا من بعد ما جاء ہم العلم بغیاً بینہم  
 ( ۱۶ : ۴۵ ) ولا تکنوا کالذین تفرقوا من بعد ما جاء ہم البینات (۲ : ۱۰۴)

اور اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام ”جماعت“  
 رکھا ہے، اور جماعت سے علیحدگی کو ”جاهلیۃ“ اور ”حیۃ جاہلی“ سے  
 تعبیر کیا ہے، جیسا کہ آگے بالتفصیل آئیگا : ”من فارق الجماعۃ، فمات،  
 فمیتۃ جاہلیہ“ وغیر ذلک، اور اسی بنا پر کثرت کے ساتھ رہ احادیث و آثار  
 موجود ہیں جن میں نہایت شدت کے ساتھ ہر مسلمان کو ہر حال میں  
 التزام جماعت اور اطاعت امیر کا حکم دیا گیا، اگرچہ وہ غیر مستحق ہو،  
 نا اہل ہو، فاسق ہو، ظالم ہو، کوئی ہو، بشرطیکہ مسلمان ہو اور نماز قائم رکے  
 ( ما اقاموا الصلوۃ ) اور ساتھ ہی بتلادیا گیا کہ جس شخص نے جماعت سے  
 علیحدگی کی راہ اختیار کی تو اُس نے اپنے تئیں شیطان کے حوالے کر دیا -  
 یعنی گمراہی اور تھوکر اس کے لیے ضروری ہے - زنجیر کا توڑنا مشکل ہے، لیکن  
 کوئی کڑی زنجیر سے الگ ہوگئی ہو تو ایک چھوٹا سا حلقہ ہے جسکو  
 انگوٹھے سے مسل دیا جاسکتا ہے - بندھے ہوئے جہاز کو کون زور آور ہے جو ایک زور  
 میں دو کر دے ؟ لیکن اسی کی الگ الگ سینک کو تکرے تکرے کر دینے  
 کیلئے طفل شیر خوار کی انگلیاں بھی پوری طرح مضبوط ہیں -  
 حضرة عمر اپنے خطبوں میں بار بار آنحضرتہ صلعم سے روایت کرتے ”علیکم  
 بالجماعۃ فان الشیطان مع الفذۃ و هو من الاثنین ابعء“ دوسری روایت  
 میں ہے ”فان الشیطان مع الواحد“ یعنی جماعت سے الگ نہو - ہمیشہ  
 جماعت بنکر رہو - کیونکہ جب کوئی تنہا اور الگ ہوا تو شیطان اسکا ساتھی  
 ہے - وہ انسان بھی ملکر رہیں تو شیطان اُنسے دور ہے - اتحادی

# فصل

( عہد اجتماع و ائتلاف ' و دور اشتات و انتشار )

آپ آزرده خاطر نہوں اگر موضوع کی وسعت چند لمحوں کیلئے مجھے اپنے اطراف و جوانب کی طرف بے اختیار مائل کر لے۔ اس مقام کی مزید وضاحت کیلئے بہتر ہوگا کہ در خاص اصطلاحی لفظوں کے معانی پر آپ پہلے غور کر لیں۔ ایک "اجتماع" اور "ائتلاف" ہے۔ دوسرا "اشتات" اور "انتشار"۔ نہ صرف امتہ اسلامیہ بلکہ تمام اقوام عالم کی موت و حیات، ترقی و تنزل، اور سعادت و شقارت کے جو اصولی اسباب و مراتب قرآن حکیم نے بیان کیے ہیں، انکی سب سے زیادہ اہم حقیقت انہی الفاظ کے اندر پوشیدہ ہے۔ "اجتماع" کے معنی ہیں "ضم الشيء بتقريب بعضه من بعض" (مفردات امام راغب: ۹۵) یعنی مختلف چیزوں کا باہم اکٹھا ہو جانا۔ اور ائتلاف "الف" سے ہے۔ اس کے معنی ہیں "ما جمع من اجزاء مختلفة، ورتب ترتیباً، قدم فیہ ما حقہ ان یقدم، و اخر فیہ ما حقہ ان یؤخر" (مفردات: ۱۹) یعنی مختلف چیزوں کا اس تناسب اور ترتیب کے ساتھ اکٹھا ہو جانا کہ جس چیز کو جس جگہ ہونا چاہیے وہی جگہ اُسے ملے جو پہلے ہونے کی حقدار ہے وہ پہلے رہے۔ جسکو آخری جگہ ملنی چاہیے، وہ آخری جگہ پائے۔ "عہد اجتماع و ائتلاف" سے مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، ایک مرکز، ایک سلسلے، ایک وجود، ایک طاقت، اور ایک فرد واحد میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ اکٹھی ہو جاتی ہیں، اور تمام مواد، قوی، اعمال، اور افراد پر ایک اجتماعی و انضمامی دور طاری ہو جاتا ہے۔ بعدیکہ ہر قوت اکٹھی، ہر عمل باہم دگر جزا اور ملا ہوا، ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی، ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو جاتا ہے۔ کسی چیز، کسی گوشے، کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ جدائی، انتشار، اور الگ الگ، جزء جزء، فرد فرد، ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی۔ مادہ میں جب یہ اجتماع و انضمام پیدا ہو جاتا ہے، تو اسی سے تخلیق و تکرین اور وجود و ہستی کے تمام مراتب ظہور میں آتے ہیں۔ اسی کو قرآن حکیم نے اپنی اصطلاح میں مرتبہ "تخلیق" و "تسویہ" سے بھی تعبیر کیا



یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جابجا ”اجتماع و ائتلاف“ کو قومی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد، اور اسلیئے انسان کیلیئے اللہ کی جانب سے سب سے بڑی رحمت و نعمت قرار دیا ہے، اور اسکو ”اعتصام بحبل اللہ“ اور اسی طرح کی تعبیرات عظیمہ سے موسوم کیا ہے۔ مسلمانوں کے اولین مادہ تکریم امت یعنی اہل عرب کو مخاطب کر کے اور پھر تمام عرب و عجم سے فرمایا :

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً  
ولا تفرقوا ! واذکروا  
نعمت اللہ علیکم ان کنتم  
اعداء فالف یدین قلبکم  
فاصبحتم بدعۃ اخوانا -  
سب مل جلکر اور پوری طرح اکٹھے ہوکر  
اللہ کی رسی مضبوط پکڑلو۔ سب کے  
ہاتھ اسی ایک حبل اللہ سے وابستہ ہوں۔  
اللہ کے اس احسان و رحمت کو نہ بھولو  
کہ کیسی عظیم الشان نعمت ہے جس سے  
تم سرفراز کیے گئے ؟ تمہارا حال یہ تھا کہ بالکل

( ۲ : ۱۰۳ )

بکھرے ہوئے اور ایک دوسرے سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ باہمدگر دشمن و مخالف۔  
لیکن اللہ نے اپنے رسول اور اپنی تعلیم حق کے ذریعہ تم سب کو باہم ملا دیا  
اور اکٹھا کر دیا۔ پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اب بھائی بھائی ہو گئے !

اسکے بعد فرمایا کہ اشتات و انتشار کی زندگی کو بقاؤ قیام نہیں ہوسکتا۔  
وہ ہلاکی کی ایک آگ ہے جسکے دھکتے ہوئے شعلوں کے اوپر کبھی قومی  
زندگی نشو و نما نہیں پاسکتی :

وکنتم علی شفا حفرة من النار  
فانقذکم منها - کذلک یدین  
اللہ لکم آیاتہ لعلکم تهتدون -  
اور تمہارا یہ حال تھا کہ آگ کے دھکتے  
ہوئے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، پر اللہ  
نے تمہیں بچا لیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے  
فضل و رحمت کی نشانیاں اسی طرح

( ۲ : ۱۰۳ )

تم پر کھولتا ہے تاکہ تم کامیابی کی راہ پالو !

یہ بھی جا بجا بتلادیا کہ قوموں اور ملکوں میں اس اجتماع و ائتلاف کی  
صالح و حقیقی زندگی کا پیدا کر دینا محض انسانی و ارضی تدبیر و سعی سے  
ممکن نہیں۔ دنیا میں کوئی انسانی تدبیر امت نہیں پیدا کرسکتی۔ یہ  
بات صرف اللہ ہی کی توفیق و رحمت اور اُسکی وحی و تنزیل کی آسمانی  
طاقت پر موقوف ہے کہ بکھرے ہوئے ٹکروں کو جوڑ کر ایک بنادے :

لو انفقتم ما في الارض جميعا، ما الفت بين قلوبهم - ولكن الله الف بينهم - انه عزيز حكيم  
 اگر تم زمین کا سارا خزانہ بھی خرچ کر دالتے  
 جب بھی ان بکھرے ہوئے دلوں کو محبت  
 و اتحاد کے ساتھ جوڑ نہیں سکتے تھے -  
 یہ اللہ ہی کا فضل ہے جس نے متفرق دلوں کو  
 اکٹھا کر دیا - ( ۹۹ : ۸ )

اور اسیلیدے قرآن حکیم ظہور شریعت و نزول وحی کا پہلا نتیجہ یہ قرار دیتا  
 ہے کہ اجتماع و ائتلاف پیدا ہو، اور بار بار کہتا ہے کہ تفرقہ و انتشار شریعت  
 و وحی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ اور اسیلیدے یہ نتیجہ شریعت سے بغی و عدوان  
 اور اسکو بالکل ترک کر دینے کا ہے : فما اختلفوا حتی جاءهم العلم (۱۳ : ۹۳)  
 و آتیناهم بینات من الامر فما اختلفوا الا من بعد ما جاءهم العلم بغیا بینهم  
 (۴۵ : ۱۶) و لا تكونوا كالذین تفرقوا من بعد ما جاءهم البینات (۲ : ۱۰۴)  
 اور اسی بنا پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام ”جماعت“  
 رکھا ہے، اور جماعت سے علحدگی کو ”جاهلیۃ“ اور ”حیاۃ جاہلی“ سے  
 تعبیر کیا ہے، جیسا کہ آگے بالتفصیل آئیگا : ”من فارق الجماعة فمات“  
 فمیتۃ جاہلیہ“ وغیر ذلک، اور اسی بنا پر بکثرت وہ اجادیت و آثار  
 موجود ہیں جن میں نہایت شدت کے ساتھ ہر مسلمان کو ہر حال میں  
 التزام جماعت اور اطاعت امیر کا حکم دیا گیا، اگرچہ امیر غیر مستحق ہو،  
 نا اہل ہو، فاسق ہو، ظالم ہو، کوئی ہو، بشرطیکہ مسلمان ہو اور نماز قائم رکھے  
 (ما اقاموا الصلوۃ) اور ساتھ ہی بتلادیا گیا کہ جس شخص نے جماعت سے  
 علحدگی کی راہ اختیار کی تو اُس نے اپنے تئیں شیطان کے حوالے کر دیا -  
 یعنی گمراہی اور تھوکر اسکے لیے ضروری ہے - زنجیر کا توڑنا مشکل ہوتا ہے،  
 لیکن کوئی کڑی زنجیر سے الگ ہو گئی ہو تو ایک چھوٹے سے حلقہ کا حکم  
 رکھتی ہے جسکو انگوٹھے سے مسل دیا جاسکتا ہے - حضرة عمر اپنے خطبوں میں  
 بار بار آنحضرتہ صلعم سے روایت کرتے ”علیکم بالجماعۃ فان الشیطان مع  
 الفذۃ و هو من الاثنین ابعدا“ دوسری روایت میں ہے ”فان الشیطان  
 مع الواحد“ یعنی جماعت سے الگ نہو - ہمیشہ جماعت بنکر رہو - کیونکہ  
 جب کوئی تنہا اور الگ ہوا تو شیطان اسکا ساتھی ہو گیا - ہر انسان بھی  
 ملکر رہیں تو شیطان اُنسے دور ہے - یعنی اتحادی و جماعتی قوت اُن  
 میں پیدا ہو گئی - اب وہ راہ حق سے نہیں بہتک سکتے - یہ الفاظ مشہور

گئی ہے ، اور فرد کا وجود اور اعمال بھی صرف اسی لیے ہیں تاکہ اُنکے اجتماع و تالیف سے ہدیۃ اجتماعیہ پیدا ہو ۔ اسی لیے اس دعا میں کہ حاصل ایمان ، و خلاصۃ قرآن ، و عصائر اسلام ہے ، ضمیر متکلم جمع آئی ، نہ کہ واحد ۔ اور اسی لیے مسلمانوں کی باہمی ملاقات کے وقت جو امتیازی دعا قرار دی گئی ، رہ بھی بصیغۃ جمع آئی اگرچہ مخاطب واحد ہو ۔ یعنی ” السلام علیکم “ ۔ ” السلام علیک “ نہیں قرار دیا گیا ۔ اسی طرح نماز سے باہر آنے کیلئے بھی ” السلام علیکم “ بصیغۃ جمع رکھا گیا ۔ واحد کا صیغہ استعمال نہیں کیا گیا ۔

اور اسی بنا پر شریعت نے نہ صرف قومی زندگی کیلئے جماعت کی پابندی بنیاد حیات قرار دی ، بلکہ احکام و اعمال کے ہر گوشے اور ہر شاخ میں بھی یہی اجتماعی و ائتلافی حیثیت بطور اصل و اساس کے رکھی گئی ۔ نماز کی جماعت خمسہ اور جمعہ و عیدین کا حال ظاہر ہے ۔ حج بجز اجتماع کے آرکچہ نہیں ۔ زکوٰۃ کی بنیاد ہی اجتماعی زندگی کا قیام اور ہر فرد کے مال و اندوختہ میں جماعت کا ایک حصہ قرار دیدینا ہے ۔ علامہ بریس اسکی ادائیگی کا نظام بھی انفرادی حیثیت سے نہیں رکھا گیا ۔ بلکہ جماعتی حیثیت سے ۔ یعنی ہر فرد کو اپنی زکوٰۃ خود خرچ کر دینے کا اختیار نہیں دیا گیا جیسا کہ بدقسمتی سے آج مسلمان کر رہے ہیں اور جو صریح غیر شرعی طریقہ ہے ، بلکہ مصارف زکوٰۃ متعین کر کے حکم دیا گیا کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ کی رقم امام و خلیفۃ وقت کے سپرد کر دے ۔ پس اسکے خرچ کی بھی اصلی صورت جماعتی ہے نہ کہ انفرادی ۔ یہ امام کا کام ہے کہ اسکا مصرف تجویز کرے اور مصارف منصوبہ میں سے جس کام میں زیادہ ضرورت دیکھے خرچ کرے ۔ ہندوستان میں اگر امام کا وجود نہ تھا ، تو جس طرح جمعہ و عیدین وغیرہ کا انتظام عذر کی بنا پر کیا گیا ، زکوٰۃ کا بھی کرنا تھا ۔ اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے جب اُن تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے جن میں مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تصویر کھینچی گئی ہے : ” مثل المومنین فی تواضع و تراحمہم و تعاطفہم کمثل الجسد الواحد ۔ اذا اشتکی مدہ عضو ، نداعی لہ سائر الجسد بالسر و الحمی “ اور ” المسلم للمسلم کالبذبان شد بعضہ بعضا “ ۔ یعنی مسلمانوں کی قومیت ایسی ہے جیسے ایک جسم اور اسکے مختلف اعضا ۔ ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم محسوس کرتا ہے ، اور اسکی بے چینی اور تکلیف میں

قوموں اور امتوں کی اجتماعی زندگی پر طاری ہرجاتی ہے تو دنیا دیکھتی ہے کہ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عظمت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومیت، اور بالآخر زندگی کی جگہ موت اُس پر چھا گئی ہے !

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا ”اجتماع رائتلاف“ کو قومی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد، اور اس لیے انسان کیلئے اللہ کی جانب سے سب سے بڑی رحمت و نعمت قرار دیا ہے، اور اسکو ”اعتصام بحبل اللہ“ اور اسی طرح کی تعبیرات عظیمہ سے موسوم کیا ہے۔ مسلمانوں کے اولین مادۂ تکوین امت یعنی اہل عرب کو مخاطب کر کے اور پھر تمام عرب و عجم سے فرمایا:

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً  
ولا تفرقوا ! واذکر  
نعمت اللہ علیکم اذ کنتم  
اعداء فالف بین قلوبکم  
فاصبحتم بنعمۃ اخر انا -  
سب مل جل کر اور پوری طرح اکٹھے ہو کر  
اللہ کی رسی مضبوط پکڑ لو۔ سب کے ہاتھ  
اسی ایک حبل اللہ سے رابستہ ہوں۔ اللہ کا  
یہ احسان یاد کر کہ کیسی عظیم الشان  
نعمت ہے جس سے سرفراز کیے گئے؟ تمہارا  
حال یہ تھا کہ بالکل بکھرے ہوئے اور ایک  
(۱۰۳:۲)

دوسرے کے دشمن تھے۔ اللہ نے تم سب کو باہم ملا دیا اور اکٹھا کر دیا۔ پہلے ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اب بھائی بھائی ہو گئے !

اس کے بعد فرمایا کہ اشتات و انتشار کی زندگی کو بقاؤ قیام نہیں ہو سکتا۔ وہ ہلاکی کی ایک آگ ہے جسکے دھکتے ہوئے شعلوں کے اوپر کبھی قومی زندگی نشو و نما نہیں پاسکتی :

وکنتم علی شفا حفرة من النار  
فانقذکم منها کذلک یدین اللہ  
لکم آیاتہ لعلکم تهتدون -  
اور تمہارا حال یہ تھا کہ آگ کے دھکتے  
ہوئے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، پر  
اللہ نے تمہیں بچالیا۔ اللہ اپنے فضل  
و رحمت کی نشانیاں اسی طرح کھولتا  
(۱۰۳:۶)

ہے تاکہ کامیابی کی راہ پالو !

یہ بھی جا بجا بتلادیا کہ قوموں اور ملکوں میں اس اجتماع وائتلاف کی صالِح و حقیقی زندگی پیدا کر دینا محض انسانی تدبیر سے ممکن نہیں دنیا میں کوئی انسانی تدبیر امت نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ کام صرف اللہ ہی کی توفیق و رحمت اور اُسکی رُحی و تنزیل کا ہے کہ بکھرے ہوئے ٹکروں کو جوڑ کر ایک بنادے

جماعتی قوت اُن میں پیدا ہوگئی - اب انپر شیطان کا داؤ نہیں چل سکتا -  
یہ الفاظ مشہور خطبہ جاہلیہ کے ہیں جو عبد اللہ بن دینار، عامر بن سعد،  
سلیمان بن یسار، وغیرہم سے مرئی ہے، اور بیہقی نے امام شافعی کے  
طریق سے نقل کیا کہ انہوں نے اجماع کے اثبات میں اسی روایت کو  
پیش کیا تھا - اسی طرح حدیث متواتر بالمعنی ”علیکم بالسواد الاعظم“  
اور ”فانہ من شذ شذ فی الذار“ اور ”ید اللہ علی الجماعہ“ اور ”لا یجمع  
اللہ امتی علی الضلالہ“ (ارکما قال) اور خطبہ حضرت امیرکہ ”وایاکم  
و الفرقة“ فان الشاذ من الناس للشیطان، کما ان الشاذ من الغنم للذئب -  
الا، من دعا الی هذا الشعار فاقتلوه ولو کان تحت عمامتی هذا“ وغیر ذلک  
اس بارے میں معلوم و مشہور ہیں - آخری قول دیگر روایات میں بطریق  
- مرفوع بھی منقول ہے -

اسی طرح نماز کی جماعت کی نسبت ہر حال میں التزام پر  
زور دینا، اور اگرچہ امام نا اہل ہو لیکن سعی قیام اہل کے ساتھ التزام جماعت  
کو بھی جاری رکھنا، حتیٰ کہ ”صلوا خلف کل بر وفاجر“ تو اسمیں بھی یہی  
حقیقت مضمر ہے کہ زندگی جماعتی زندگی ہے - انفرادی فرقہ ہر حال میں  
بربادی و ہلاکت ہے - پس جماعت سے کسی حال میں باہر نہ ہونا چاہیے  
اور نہ بجز کفر ظاہر و صریح کے امام کی اطاعت سے منحرف ہونا چاہیے -  
یہی وجہ ہے کہ ارائل عہد بنو امیہ میں جبکہ صحابہ کرام کی جماعت ہر  
ناحیہ ملک میں موجود تھی، تمام صحابہ نے اس پر اجماع کیا کہ گوامراء  
بنو امیہ خلافت کے اہل نہیں، طریق ہدی و سنت سے منحرف ہوگئے، نظام  
شرعی درہم برہم ہوگیا، بدعت و احداث اور صریح ظلم و جور اُنکا شیوہ ہے -  
با ایں ہمہ انپر خروج جائز نہیں - انہی کی اطاعت کرنی چاہیے - انہی  
کے پیچھے نماز پڑھنی چاہیے - انہی کو زکوٰۃ دینی چاہیے - حفظ ملک  
و ملت کی راہ میں نکلیں تو انہی کے جہاد کے نیچے سمع و طاعت کے  
ساتھ جمع ہو جانا چاہیے - کما سیاتی تفصیلہ عنقریب -

اور یہی سبب ہے کہ سورہ فاتحہ میں جو قومی دعا ہر مومن قلب  
و لسان کو سکھلائی گئی، اسمیں متکلم واحد نہیں قرار دیا گیا بلکہ جمع،  
حالانکہ وہ دعا فرداً فرداً ہر مومن کی زبان سے نکلنے والی تھی : اهدنا الصراط  
المستقیم - فرمایا - ”اهدنی“ نہیں کہا گیا - یہ اسلیئے ہے کہ قرآن کے نزدیک  
فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے - ہستی صرف اجتماع اور جماعت



” السلام علیکم “ - ” السلام علیک “ نہیں قرار دیا گیا - اسی طرح نماز سے باہر آنے کیلئے بھی ” السلام علیکم “ بصیغۂ جمع رکھا گیا - واحد کا صیغہ استعمال نہیں کیا گیا - علت اسکی یہی ہے - نہ وہ جو لوگوں نے سمجھی -

اور اسی بنا پر احکام و اعمال شریعت کے ہر گوشے اور ہر شاخ میں یہی اجتماعی و ائتلافی حقیقت بطور اصل و اساس کے نظر آتی ہے - نماز کی جماعت خمسہ اور جمعہ و عیدین کا حال ظاہر ہے - حج بجز اجتماع کے اور کچھ نہیں - زکوٰۃ کی بنیاد ہی اجتماعی زندگی کا قیام اور ہر فرد کے مال و اندوختہ میں جماعت کا ایک حصہ قرار دیدینا ہے - علامہ بریل اسکی ادائیگی کا نظام بھی انفرادی حیثیت سے نہیں رکھا گیا بلکہ جماعتی حیثیت سے - یعنی ہر فرد کو اپنی زکوٰۃ خود خرچ کر دینے کا اختیار نہیں دیا گیا جیسا کہ بد قسمتی سے آج مسلمان کر رہے ہیں اور جو صریح غیر شرعی طریقہ ہے ، بلکہ مصارف زکوٰۃ متعین کر کے حکم دیا گیا کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ کی رقم امام و خلیفہ رقت کے سپرد کر دے - پس اسکے خرچ کی بھی اصلی صورت جماعتی ہے نہ کہ انفرادی - یہ امام کا کام ہے کہ اسکا مصرف تجویز کرے اور مصارف منصوبہ میں سے جو مصرف زیادہ ضروری ہو ، اسی کو ترجیح دے - ہندوستان میں اگر امام کا رجوع نہ تھا ، تو جس طرح جمعہ و عیدین وغیرہ کا انتظام عذر کی بنا پر کیا گیا ، زکوٰۃ کا بھی کرنا تھا -

اور پھر یہ حقیقت کس قدر واضح ہو جاتی ہے جب ان تمام مشہور احادیث پر غور کیا جائے جن میں مسلمانوں کی متحدہ قومیت کی تصویر کھینچی گئی ہے ” مثل المومنین فی تواہم و تعاطفہم کمثل الجسد الواحد - اذا اشتکی منہ عضو تداعی لہ سائر الجسد بالسہر والحمی “ ( صحیحین ) اور ” المسلم للمسلم کالبنیان - یشد بعضہ بعضا “ ( بخاری )

یعنی مسلمانوں کی قومیت ایسی ہے جیسے ایک جسم اور اسکے مختلف اعضا - ایک عضو میں درد ہو تو سارا جسم محسوس کرتا ہے ، اور اسکی بے چینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ لیتا ہے جیسے خود اسکے اندر درد اُٹھ رہا ہو - اور انکی مثال دیوار کی سی ہے - ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی اور سہارا دیتی ہے - پھر تشبیک اصابع کر کے اسکی تصویر بتلا دی - یعنی ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں رکھ کر دکھلا دیا کہ اس طرح ایک دوسرے سے جڑا ہوا اور متصل ہے - سو ان تمام تصریحات میں بھی اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اسلام کی قومیت متفرق

موسوم کرتے ہیں ، حالانکہ دراصل قرآن و سنۃ اور عقلیات صادقہ کے نزدیک تنزل کے تمام فسادات و نتائج صرف اسی ایک چیز کا نتیجہ ہیں ۔ اس ایک حقیقت کو کتنے ہی مختلف ناموں سے پکار لو ، مگر اصلی علت اسکے سوا کوئی نہیں ہے ۔

قوتوں کے انتشار کا دور ساری چیزوں پر طاری ہوا ، لیکن یہاں صرف ایک ہی پہلو واضح کرنا مقصود ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اسلامی طاقت کی اصلی شخصیت تھی ۔ آپ جب دنیا سے تشریف لیگئے تو صرف ایک داعی شریعت یا حامل وحی ہی کی جگہ خالی نہیں ہوئی ، بلکہ اُن ساری قوتوں ، سارے منصبوں ، ساری حیثیتوں ، اور ہر طرح کے نظری و عملی اختیارات و قوی کی ، جو آپ کی شخصیت مقدسہ میں اکٹھی تھیں ، اور جنکا آپکے تنہا وجود مقدس میں جمع ہونا اسلام کی شرعی و دینی خصوصیات میں سے تھا ۔ اسلام کا داعی مسیحیت کے مقدس پہاڑی واعظ کی طرح صرف ایک اخلاقی معلم ہی نہ تھا ، اور نہ دنیا کے فاتح حکمرانوں کی طرح محض ایک جہانگیر اور عالم ستان شہنشاہ ۔ اسلام نے دین کو دنیا سے اور شریعت کو حکومت و جہانبانی سے الگ نہیں رکھا ۔ وہ تو یہ سکھلانے آیا تھا کہ دین اور دنیا دو نہیں ایک ہی چیز ہیں ، اور شریعت سے حکومت و سلطنت الگ نہیں ہے ، بلکہ سچی حکومت اور خدا کی مرضی کے مطابق سلطنت رہی ہے جسکو شریعت نے خود پیدا کیا ہو ، خود اپنی گودوں میں پالا ہو ، اور اُسکے تاج و تخت کے اندر بیتھکر جسم کیلیے رزق کی طرح کام کر رہی ہو ۔ پس اسلام کے داعی اول کا وجود ایک ہی وقت میں اُن تمام حیثیتوں اور منصبوں کا جامع تھا ، جو ہمیشہ دنیا کی صدها مختلف شخصیتوں کے اندر منقسم رہی ہیں ۔ وہ اللہ کا پیغامبر تھا ، شریعت کا مقنن تھا ، امت کا بانی تھا ، ملکوں کا حاکم اور سلطنت کا مالک تھا ۔ وہ پتوں اور چہال سے پتئی ہوئی مسجد کے ممبر پر وحی الہی کا ترجمان اور انسانی سعادت و ہدایت کا واعظ تھا ، تو اُسی کے صحن میں یمن کا خراج تقسیم کرنے والا اور فوجوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کیلیے طیار کرنے والا بھی تھا ۔ وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زندگی میں جبکہ گھرونکا نظام معاشرت دوست کرتا اور نکاح و طلاق کے قوانین نافذ کرتا تھا ، تو ساتھ ہی بدر کے کنارے دشمنوں کا حملہ بھی روکتا ، اور مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک فاتح حکمران کی طرح گزرتا تھا ۔ غرضکہ اُسکی ایک شخصیت

خطبہ جابیہ کے ہیں جو عبد اللہ بن دینار، عامر بن سعد، سلیمان بن یسار، وغیرہم سے مروی ہے، اور بیہقی نے امام شافعی کے طریق سے نقل کیا کہ انہوں نے اجماع کے اثبات میں اسی روایت سے استدلال کیا۔ اسی طرح حدیث متواتر بالمعنی ”علیکم بالسواد الاعظم“ اور ”فانہ من شذ شذ فی النار“ اور ”ید اللہ علی الجماعۃ“ اور ”لا یجمع اللہ امتی علی الضلالة“ ارکما قال۔ اور خطبہ حضرت امیر کہ ”وایاکم و الفرقۃ“ فان الشاذ من الناس الشیطان، کما ان الشاذ من الغنم للذئب۔ الا، من دعا الی هذا الشعار فاقتلوه ولو کان تحت عمامتی هذا“ وغیر ذلک اس بارے میں معلوم و مشہور ہیں۔ آخری قول دیگر روایات میں بطریق مرفوع بھی منقول ہے۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ ہمیشہ جماعت کے ساتھ ہو کر رہو۔ جو جماعت سے الگ ہوا اسکا ٹھکانا درخ ہے۔ افراد تباہ ہو سکتے ہیں مگر ایک صالح جماعت کبھی تباہ نہیں ہو سکتی۔ اسپر اللہ کا ہاتھ ہے۔ اللہ کبھی ایسا ہونے نہ دیگا کہ پوری امت گمراہی پر جمع ہو جائے۔

اسی طرح نماز کی جماعت کی نسبت ہر حال میں التزام پر زور دینا، اور اگرچہ امام نا اہل ہو لیکن سعی قیام اہل کے ساتھ التزام جماعت کو بھی جاری رکھنا، حتیٰ کہ ”صلوا خلف کل بر وفاجر“ تو اسمین بھی یہی حقیقت مضمحل ہے کہ زندگی جماعتی زندگی ہے۔ افراد و فرقہ ہر حال میں بربادی و ہلاکت ہے۔ پس جماعت سے کسی حال میں باہر نہ ہونا چاہیے۔

اور یہی سبب ہے کہ سورۃ فاتحہ میں جو قومی دعا مسلمانوں کو سکھلائی گئی، اسمیں متکلم واحد نہیں ہے بلکہ جمع، حالانکہ وہ دعا فرداً فرداً ہر مومن کی زبان سے نکلنے والی تھی ”اهدنا الصراط المستقیم“ فرمایا۔ ”اهدنی“ نہیں کہا گیا۔ یہ اسلیئے ہے کہ قرآن کے نزدیک فرد اور فرد کی ہستی کوئی شے نہیں ہے۔ ہستی صرف اجتماع اور جماعت کی ہے، اور فرد کا وجود اور اعمال بھی صرف اسی لیے ہیں تاکہ اُنکے اجتماع و تالیف سے ہئیۃ اجتماعیہ پیدا ہو۔ اسی لیے اس دعا میں کہ حاصل ایمان، و خلاصۃ قرآن، و عصارۃ اسلام ہے، متکلم جمع کا صیغہ آیا نہ کہ واحد کا۔ اور اسی لیے مسلمانوں کی باہمی ملاقات کے وقت جو امتیازی دعا سکھلائی گئی، وہ بھی بصیغۃ جمع آئی اگرچہ مخاطب واحد ہو۔ یعنی

اس طرح حصہ لیتا ہے جیسے خود اسکے اندر درد اُٹھ رہا ہو۔ اور انکی مثال دیوار کی سی ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا پاتی اور سہارا دیتی ہے۔ پھر تشبیک اصابع کر کے اسکی تصویر بتلا دی۔ یعنی ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں رکھ کر دکھلا دیا کہ اس طرح ایک دوسرے سے جڑا ہوا اور متصل ہے۔ سو ان تمام تصریحات میں بھی اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اسلام کی قومیت متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے۔ دیوار کا نام ہے۔ الگ الگ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ تو اجتماعی وجود ہے۔ یعنی دیوار کا ایک جزء ہے، اور انہی اجزاء کے ملنے سے دیوار متشکل ہوتی ہے۔

اور یاد رہے کہ یہ جو نماز میں تسبیۃ صفوف پر سخت زور دیا گیا۔ یعنی صف بندی پر، اور سب کے سروں، سینوں، پانوں کے ایک سیدھے میں ہونے پر۔ ”لتسرون صفوفکم أریخالفن اللہ دین وجوہکم“ (بخاری) اور روایت انس کہ ”سورا صفوفکم فان تسویۃ الصفوف من اقامة الصلوۃ“ (بخاری) و فی لفظ ”من تمام الصلوۃ“ تو اسمیں بھی یہی بھید ہے اور تشریح کا یہ موقعہ نہیں۔ قرآن و سنت کی تصریحات و حکمیات اس بارے میں اسقدر کثرت سے اور محتاج تفسیر و کشف ہیں کہ ایک ضخیم مجلد مطلوب۔ تفسیر البیان میں مفصل لکھ چکا ہوں۔

( جمع و تفرقہ قری و مناصب )

حضرات ! اس قانون الہی کے مطابق مسلمانوں کی قومی زندگی و عروج کا اصلی دور رہی تھا، جب انکی قومی و انفرادی، مادی و معنوی، اعتقادی و عملی زندگی پر اجتماع و ائتلاف کی رحمت طاری تھی، اور انکے تنزل و ادبار کی اصلی بنیاد اُسی دن پڑی، جب اجتماع و ائتلاف کی جگہ اشتات و انتشار کی نحوست چھانی شروع ہو گئی۔ ابتدا میں ہر مادہ مجتمع تھا، ہر طاقت سمٹی ہوئی تھی، ہر چیز بندھی ہوئی تھی، لیکن بہ تدریج تفرقہ و انتشار کی ایسی ہوا چلی کہ ہر بندھن کھلا، ہر جماؤ میں پھیلاؤ ہوا، ہر ملی جلی اور اکٹھی طاقت الگ الگ ہو کر منتشر اور تتر بتر ہو گئی۔ قرآن حکیم کے بتلائے ہوئے قانون تنزل اقوام کے مطابق یہ حالت ہر چیز اور ہر گوشۂ وجود و عمل پر طاری ہوئی، اور ایک ہزار برس پر تین صدیاں گزر چکی ہیں کہ برابر طاری ہو رہی اور بڑھتی جاتی ہے۔ لوگ اسباب تنزل امت پر بحث کرتے اور پھر طرح طرح کی علتیں ٹھراتے اور طرح طرح کے ناموں سے

قوتوں کے انتشار کا دور ساری چیزوں پر طاری ہوا ، لیکن یہاں صرف ایک ہی پہلو واضح کرنا مقصود ہے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اسلامی طاقت کی اصلی شخصیت تھی - آپ جب دنیا سے تشریف لیگئے تو صرف ایک داعی شریعت یا حامل وحی ہی کی جگہ خالی نہیں ہوئی ، بلکہ اُن ساری قوتوں ، سارے منصبوں ، ساری حیثیتوں ، اور ہر طرح کے نظری و عملی اختیارات و قوی کی ، جو آپکی شخصیت مقدسہ میں اکٹھی تھیں ، اور جنکا آپکے تنہا وجود مقدس میں جمع ہونا اسلام کی شرعی و دینی خصوصیات میں سے تھا - اسلام کا داعی مسیحیت کے مقدس پہاڑی واعظ کی طرح صرف ایک اخلاقی معلم ہی نہ تھا ، اور نہ دنیا کے فاتح حکمرانوں کی طرح محض ایک جہانگیر اور عالم ستاں شہنشاہ - اسلام نے دین کو دنیا سے اور شریعت کو حکومت و جہانبانی سے الگ نہیں رکھا - وہ تو یہ سکھلانے آیا تھا کہ دین و دنیا دو نہیں ایک ہی چیز ہیں ، اور شریعت سے حکومت و سلطنت الگ نہیں ہے ، بلکہ سچی حکومت اور خدا کی مرضی کے مطابق سلطنت وہی ہے جسکو شریعت نے خود پیدا کیا ہو ، پس اسلام کے داعی کا وجود ایک ہی وقت میں اُن تمام حیثیتوں اور منصبوں کا جامع تھا ، جو ہمیشہ دنیا کی صدہا مختلف شخصیتوں کے اندر منقسم رہی ہیں - وہ اللہ کا پیغمبر تھا ، شریعت کا مقذن تھا ، اُمت کا بانی تھا ، ملکوں کا حاکم اور سلطنت کا مالک تھا - وہ اگر پتوں اور چہال سے پتئی ہوئی مسجد کے ممبر پر وحی الہی کا ترجمان اور انسانی سعادت و ہدایت کا واعظ تھا ، تو اُسی کے صحن میں یمن کا خراج تقسیم کرنے والا اور فوجوں کو میدان جنگ میں بھیجنے کیلئے سپہ سالار لشکر بھی تھا - وہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زندگی میں گھرونکا نظام معاشرت درست کرتا اور نکاح و طلاق کے قوانین نافذ کرتا اور ساٹھ ہی بدر کے کنارے دشمنوں کا حملہ بھی روکتا ، اور مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک فاتح حکمران کی طرح نمایاں بھی ہوتا تھا - غرضکہ اُسکی ایک شخصیت کے اندر مختلف حیثیتیں اور منصب جمع تھے ، اور اسلام کا نظام دینی یہی تھا کہ یہ ساری قوتیں ایک ہی فرد میں جمع رہیں -

جب آپ دنیا سے تشریف لیگئے تو خلفاء راشدین کی خلافت خاصہ اسی اجتماع قوی و مناصب پر قائم ہوئی ، اور اسی لئے اُسکو ” منہاج نبوة “ سے تعبیر کیا گیا - یعنی یہ نیابت تھیک تھیک ہر لحاظ اور ہر پہلو سے شخص جامع نبوة کی سچی قائم مقامی اپنے اندر رکھتی تھی -



و خلافت بھی تھے، صاحب اجتہاد و قضاء بھی تھے، اور صاحب سیاست و نظم احکام و بلاد بھی تھے۔ اصلاً ”امامت کبریٰ“ کا مقام اجتہاد دینی اور سیاست ملکی، دونوں پر حاری ہے۔ اس لیے انکی امامت میں یہ دونوں قسمیں اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اکٹھی تھیں۔ حضرت عمر مسجد کے دارالشرعی میں مسائل شرعیہ کا بہ حیثیت ایک مجتہد کے فیصلہ کرتے تھے، عدالت میں مقدمات سنتے تھے، اور دیوان فوجی میں فوجوں کو تنخواہ بھی بانٹتے تھے۔ اگر وہ نماز جنازہ کی معین تکبیرات پر صحابہ کا اجماع کراتے تھے، تو راتوں کو شہر میں گشت لگا کر احتساب کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔ میدان جنگ میں احکام بھی بھیجتے، اور روم کے سفیر کو بہ حیثیت شہنشاہ اسلام اپنے سامنے بھی بھی بلاتے۔

اسی طرح نبوت کا مقام، تعلیم و تربیت امت کی مختلف قوتوں سے مرکب تھا۔ قرآن حکیم نے انکو تین اصولی قسموں میں بانٹ دیا ہے:

يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَ يُزَكِّيهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ (۲۲ : ۳) تِلَاوَتِ آيَاتِ - تَزْكِيَةُ نَفُوسِ - تَعْلِيمُ كِتَابٍ وَ حِكْمَتِ - خُلَفَاءُ رَاشِدِينَ ان تینوں منصبوں میں وجود نبوت کے نائب تھے۔ وہ منصب اجتہاد و قضاء شرع کے ساتھ قوت ارشاد و تَزْكِيَةُ و تربیت بھی رکھتے تھے۔ وہ ایک صاحب رُحی کی طرح خدا کے کلام کی منادی کرنے والے، ایک نبی کی طرح دلوں کا تزکیہ اور روحوں کو پاک کر دینے والے، اور ایک رسول کی طرح تعلیم کتاب اور حکمت سنت سے امت کی تربیت و پرورش کرنے والے تھے۔ وہ ایک ہی وجود میں ابو حنیفہ و شافعی بھی تھے (رح) اور جنید و شبلی بھی (رح)۔ نخعی و حماد بھی تھے، اور ابن معین و ابن راہویہ بھی (رح)۔ جسموں کا نظام بھی انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ دلوں کی حکمرانی بھی انہی کے قبضہ میں تھی۔ یہی حقیقی اور کامل معنی منصب نبوت کی نیابت کے ہیں۔ اور اسی لیے اُنکا وجود اور انکے اعمال بھی اعمال نبوت کا ایک آخری جزء تھے کہ ”علیکم بسنتی و سنت الخلفاء الراشدين“ اور اسی لیے ”وعضوا علیہا بالنواجذ“ کے حکم میں نہ صرف سنت عہد نبوت، بلکہ خلافت راشدہ و خاصہ کی سنت بھی داخل ہوئی، اور شرح اس سر الہی کی بہت طولانی ہے۔ یہاں محض اشارات مطلوب۔

اینٹوں کا نام نہیں ہے - دیوار کا نام ہے - الگ الگ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے - تو اجتماعی وجود ہے - یعنی دیوار کا ایک جزء ہے ' اور انہی اجزاء کے ملنے سے دیوار متشکل ہوتی ہے -

اور یاد رہے کہ یہ جو نماز میں تسویۃ صفوف پر سخت زور دیا گیا - یعنی صف بندی پر ' اور سب کے سرور ' سیدوں ' پانوں کے ایک سیدہ میں ہونے پر - " لتسون صفوفکم اریخالفن اللہ بین وجوہکم " ( بخاری ) اور روایت انس کہ " سورا صفوفکم فان تسویۃ الصفوف من اقامة الصلوة " ( بخاری ) و فی لفظ " من تمام الصلوة " تو اسمیں بھی یہی بھید ہے اور تشریح کا یہ مرقعہ نہیں - قرآن و سنت کی تصریحات و حکمیات اس بارے میں اسقدر کثرت سے اور محتاج تفسیر و کشف ہیں کہ ایک ضخیم مجلد مطلوب - تفسیر البیان میں مفصل لکھ چکا ہوں

## فصل

( جمع و تفرقہ قومی و مذاہب )

اس قانون الہی کے مطابق مسلمانوں کی قومی زندگی و عروج کا اصلی دور رہی تھا ' جب انکی قومی و انفرادی ' مادی و معنوی ' اعتقادی و عملی زندگی پر اجتماع وائتلاف کی رحمت طاری تھی ' اور انکے تنزل و ادبار کی اصلی بنیاد اسی دن پڑی ' جب اجتماع وائتلاف کی جگہ اشتات و انتشار کی نحوست چھانی شروع ہو گئی - ابتدا میں ہر مادہ مجتمع تھا ' ہر طاقت سمٹی ہوئی تھی ' ہر چیز بندھی ہوئی تھی ' لیکن بہ تدریج تفرقہ و انتشار کی ایسی ہوا چلی کہ ہر بندھن کھلا ' ہر جماؤ پھیلا ' ہر ملی جلی اور اکٹھی طاقت الگ الگ ہو کر منتشر اور تتر بتر ہو گئی - قرآن حکیم کے بتلاے ہوئے قانون تنزل اقوام کے مطابق یہ حالت ہر چیز اور ہر گوشہ وجود و عمل پر طاری ہوئی ' اور ایک ہزار برس پر تین صدیاں گزر چکی ہیں کہ برابر طاری ہو رہی اور بڑھتی جاتی ہے - لوگ اسباب تنزل امت پر بحث کرتے اور پھر طرح طرح کی علتیں ٹھراتے اور طرح طرح کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں ' حالانکہ قرآن و سنت اور عقلیات صادقہ کے نزدیک تنزل کے تمام فسادات و نتائج صرف اسی ایک چیز کا نتیجہ ہیں - اس ایک حقیقت کو کتنے ہی مختلف ناموں سے پکار لو ' مگر اصلی علت اسکے سوا کوئی نہیں -

کے اندر مختلف حیثیتیں اور منصب جمع تھے اور اسلام کا نظام دینی یہی تھا کہ یہ ساری قوتیں ایک ہی فرد میں جمع رہیں۔ جب آپ دنیا سے تشریف لیگئے تو خلفاء راشدین کی خلافت خاصہ اسی اجتماع قوی و مناصب کی نیابت کاملہ پر قائم ہوئی اور اسی لیے اُسکو ”منہاج نبوة“ سے تعبیر کیا گیا۔ یعنی یہ نیابت تھیک تھیک ہر لحاظ اور ہر پہلو سے شخص جامع نبوة کی سچی قائم مقامی اپنے اندر رکھتی تھی۔ منصب نبوة مختلف اجزاء نظر و عمل سے مرکب ہے۔ ازاں جملہ ایک جزء وحی و تنزیل کا مورد ہونا اور شریعت میں تشریع و تاسیس قوانین کا اختیار رکھنا ہے۔ یعنی قانون وضع کرنا اور اس کے وضع و قیام کی معصومانہ و غیر مسئلوانہ قوت۔ اس جزء کے اعتبار سے تو نبوت آپ کے وجود پر ختم ہو چکی تھی اور قیامت تک کیلئے شریعت و قانون کے وضع و قیام کا معاملہ کامل ہو چکا تھا۔ جب نعمت کامل ہو گئی تو پھر کامل چیز ہی کو ہمیشہ باقی رہنا چاہیے۔ اسکی جگہ کسی دوسری چیز کا آنا نقص کا ظہور ہوگا نہ کہ تکمیل کا : الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی رضیت لکم الاسلام دینا (۵ : ۴) لیکن منصب نبوت اس اصلی جزء کے ساتھ بہت سے تبعی اجزاء پر بھی مشتمل تھا، اور ضرور تھا کہ اُنکا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے۔ امت کے قیام اور سعادت و ہدایت کے بقاء کیلئے اُنکا سلسلہ تا قیامت جاری رہنے والا تھا اور جاری رہا۔ اس چیز کو مختلف احادیث میں مختلف تعبیرات سے موسوم کیا ہے۔ حضرت عمر کیلئے ”محدث“ (بالفتح) کا مقام بتلایا گیا۔ علماء کو انبیاء کا وارث کہا گیا۔ انبیاء بنی اسرائیل سے تشبیہ دی۔ مبشرات صادقہ کو نبوت کا چالیسواں جزء قرار دیا۔ ”لم یبق الا المبشرات“ حدیث تجدید بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے۔ پس خلفاء راشدین کو جو نیابت پہنچی، اُس میں وحی و تشریع کی قائم مقامی تو نہیں ہو سکتی تھی، لیکن اور تمام اجزاء و خصائص نبوت کی نیابت داخل تھی۔ پھر چونکہ داعی اسلام کا وجود نبوت کے ساتھ خلافت ارضی، حکومت و سلطنت، نظام و قوام سیاست، قیادۂ فوج و حرب، فتح و عمران ممالک، ریاست مجالس شوریٰ، وغیرہ، جہاں بانی و حکمرانی کے تمام منصب تنہا اپنی شخصیت ہی کے اندر رکھتا تھا، اسیلئے تھیک تھیک اسی طرح خلافت خاصہ میں بھی خلفاء راشدین کا تنہا وجود ان ساری نظری و عملی قوتوں اور تمام منصبوں کا جامع ہوا۔ وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحب امامت

تھے ' تو راتوں کو شہر میں گشت لگا کر احتساب کا فرض بھی ادا کرتے تھے میدان جنگ میں احکام بھی دہی بھی بھیجتے اور روم کے سفیر کو بہ حیثیت شہنشاہ اسلام اپنے سامنے بھی دہی بلاتے !

اسی طرح نبوت کا مقام ' تعلیم و تربیت امت کی مختلف قوتوں سے مرکب تھا - قرآن حکیم نے انکو تین اصولی قسموں میں بانٹ دیا ہے :

یتلو علیہم آیاتہ ' و یزکیہم ' و یعلمہم الکتاب و الحکمة ( ۳ : ۶۲ ) تلاوت آیات - تزکیۃ نفوس - تعلیم کتاب و حکمت - خلفاء راشدین ان تینوں منصبوں میں وجود نبوت کے نائب تھے - وہ منصب اجتہاد و قضاء شرع کے ساتھ قوت ارشاد و تزکیۃ و تربیت بھی رکھتے تھے - وہ ایک صاحب رحي کی طرح خدا کے کلام کی منادی کرتے ایک نبی کی طرح دلوں اور رگوں کو پاکی بخشتے ' اور ایک رسول کی طرح تعلیم کتاب اور حکمت سنۃ سے امت کی تربیت و پرورش کرنے والے تھے - وہ ایک ہی وجود میں ابوحنیفہ و شافعی بھی تھے ( رح ) اور جنید و شبلی بھی ( رح ) - نخعی و حماد بھی تھے ' اور ابن معین و ابن راہویہ بھی ( رح ) جسموں کا نظام بھی انہی کے ہاتھوں میں تھا - دلوں کی حکمرانی بھی انہی کے قبضہ میں تھی - یہی حقیقی اور کامل معنی منصب نبوت کی نیابت کے ہیں ' اور اسی لیے انکا وجود اور انکے اعمال بھی اعمال نبوت کا ایک آخری جزء تھے کہ " علیکم بسنتی و سنتہ الخلفاء الراشدین " اور اسی لیے " رعضوا علیہا بالنواجذ " کے حکم میں نہ صرف سنۃ عہد نبوت ' بلکہ خلافت راشدہ و خاصہ کی سنۃ بھی داخل ہوئی ' اور شرح اس سرالہی کی بہت طولانی ہے - یہاں محض اشارات مطلوب -

لیکن جیسا کہ پہلے سے خبر دیدی گئی تھی ' اجتماع و ائتلاف کی یہ حالت حضرۃ علی علیہ السلام پر ختم ہوگئی - اسکے بعد سے اشتات و انتشار کا دور شروع ہوا - از انجملہ مرکزی قوتوں اور منصبوں کا انتشار و اشتات تھا ' جس نے فی الحقیقت امت کا تمام نظام شرعی و اصلی درہم و برہم کر دیا - خلافت خاصہ کے بعد یہ ساری یکجا قوتیں الگ الگ ہوگئیں - ایک وجود کی جگہ مختلف وجودوں میں انکا ظہور اور نشو و نما ہوا - حکومت و فرماں ررانی کا ٹکرہ الگ ہوکر مجرد پادشاہی کی شکل میں آگیا - اسی کی طرف اشارہ تھا " الخلافة بعدی ثلاثون سنۃ ثم ملک " سوراقعی اسکے

غرضکہ خلافت راشدہ کے بعد جو سلسلہ خلافت قائم ہوا، وہ خواہ قرشی رہا ہو یا غیر قرشی، مجرد ملوکی و پادشاہی کا سلسلہ تھا، اور بجز چند مستثنیٰ اوقات کے (جیسا کہ عہد حضرت عمر بن عبد العزیز) یہ نیابت نبوت کے آر تمام اجزاء سے یکقلم خالی تھا۔ منصب بت چکے تھے اور قوتیں منتشر ہو چکی تھیں۔ البتہ جو انقلاب سلطان عبد الحمید خان کے زمانے میں ہوا اور جس کا نتیجہ سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا طریق استبدادی و شخصی سے طریق شوریٰ میں تبدیل ہو جانا ہے اور جس دور کے اولین خلیفہ سلطان محمد خاں خامس اعلیٰ اللہ مقامہ تھے، سر بلا شبہ یہ خلافت راشدہ کی طرف عود و رجعت کا ایک مبارک قدم تھا، جس کے لیے شوریٰ اور پارلیمنٹ کا ہونا سب سے پہلی شرط ہے۔ لیکن ان جزئی مستثنیات کے علاوہ عام حالات و خصائص ہر دور اور ہر سلسلے کے رہی رہے جو ایک جامع لفظ ”ملک عضو“ میں بتلا دیے گئے تھے، اور اسمیں کبھی کوئی نمایاں اور پائنداز تبدیلی نہ ہوئی۔

#### ( اطاعت خلیفہ و التزام جماعة )

اس اجمالی تمہید کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یعنی اسلام کا وہ نظام شرعی جو ہر مسلمان کو خلیفہ وقت کی معرفت اور اطاعت پر اسی طرح مجبور کرتا ہے، جس طرح اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر، جب تک کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف کوئی حکم نہ دے۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی قدر وضاحت کے ساتھ اس مسئلہ کی تشریح کر دوں۔ اسلام کا قانون اس بارے میں اپنی تمام شاخوں اور تعلیموں کی طرح فی الحقیقت کائنات ہستی کے قدرتی نظام کا ایک جزء اور قرام ہستی کی زنجیر فطرۃ کی ایک قدرتی کڑی ہے۔ کائنات کے ہر حصہ اور ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی قدرت و سنۃ ایک خاص نظام پر کار فرما ہے جس کو قانون ”مرکزیت“ یا قانون ”دائر“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یعنی قدرت نے خلقت و نظام خلقت کے بقا و قیام کیلئے ہر جگہ اور ہر شاخ وجود میں یہ صورت اختیار کر رکھی ہے کہ کوئی ایک وجود تو بمنزلۃ نقطۃ مرکز کے ہوتا ہے، اور بقیہ اجسام ایک دائرہ کی شکل میں اس کے چاروں طرف وجود پاتے ہیں، اور پورے دائرہ کی زندگی اور بقا صرف اُس مرکزی وجود کی زندگی اور بقا پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک چشم زدن کیلئے بھی دائرہ کے اجسام اپنے مرکز سے الگ ہو جائیں، یا مرکز کی اطاعت و انقیاد سے باہر ہو جائیں، تو معاً نظام



مب رة مختلف اجزاء نظر و عمل سے مرکب ہے - ازان جملہ ایک جزء وحی و تنزیل کا مورد ہونا اور شریعت میں تشریع و تاسیس قوانین کا اختیار رکھنا ہے - یعنی قانون وضع کرنا اور اسکے وضع و قیام کی معصومانہ و غیر مسئلوانہ قوت - اس جزء کے اعتبار سے نبوت آپکے وجود پر ختم ہو چکی تھی اور قیامت تک کیلئے شریعت و قانون کے وضع و قیام کا معاملہ کامل ہو چکا تھا - جب نعمت کامل ہو گئی تو پھر کامل چیز ہی کو ہمیشہ باقی رہنا چاہیے - اسکی جگہ کسی دوسری چیز کا آنا نقص کا ظہور ہوگا نہ کہ تکمیل کا : الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ' رضیت لکم الاسلام دینا ( ۵ : ۴ )

لیکن منصب نبوت اس اصلی جزء کے ساتھ بہت سے تبعی اجزاء پر بھی مشتمل تھا ' اور ضرور تھا کہ انکا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے - اس چیز کو مختلف احادیث میں مختلف تعبیرات سے موسوم کیا ہے - حضرة عمر کیلئے " محدث " ( بالفتح ) کا مقام بتلایا گیا - علماء کو انبیاء کا وارث کہا گیا - مبشرات صادقہ کو نبوت کا چالیسواں جزء قرار دیا - " لم یبق الا المبشرات " حدیث تجدید بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے - پس خلفاء راشدین کو جو نیابت پہنچی ' اُس میں وحی و تشریع کی قائم مقامی تو نہیں ہو سکتی تھی ' لیکن اور تمام اجزاء و خصائص نبوت کی نیابت داخل تھی - داعی اسلام کا وجود نبوت کے ساتھ خلافت ارضی ' حکومت و سلطنت ' نظام و قوام سیاست ' قیادۂ فوج و حرب ' فتح و عمران ممالک ' ریاست مجالس شوری ' وغیرہ ' جہاں بانی و حکمرانی کے تمام منصب تنہا اپنی شخصیت کے اندر رکھتا تھا ' اسلیئے ٹھیک ٹھیک اسی طرح خلافت خاصہ میں بھی خلفاء راشدین کا تنہا وجود ان ساری نظری و عملی قوتوں اور تمام منصبوں کا جامع ہوا - وہ ایک ہی وجود کے اندر صاحب امامت و خلافت بھی تھے ' صاحب اجتہاد و قضاء بھی تھے ' اور صاحب سیاست و نظم احکام و بلاد بھی - اصلاً " امامت کبریٰ " کا مقام اجتہاد دینی اور سیاست ملکی ' دونوں سے مرکب ہے - اسلیئے انکی امامت میں یہ دونوں قسمیں اپنی تمام شاخوں کے ساتھ اکٹھی تھیں - حضرة عمر مسجد کے دار الشوری میں مسائل شرعیہ کا بہ حیثیت ایک مجتہد کے فیصلہ کرتے تھے ' عدالت میں مقدمات سنتے تھے ' اور دیوان فوجی میں فوجوں کو تنخواہ بھی پانچتے تھے - اگر وہ نماز جنازہ کی معین تکبیرات پر صحابہ کا اجماع کراتے

لیکن جیسا کہ پہلے سے خبر دیدی گئی تھی، اجتماع و ائتلاف کی یہ حالت حضرت علی علیہ السلام پر ختم ہوگئی، اور اسکے بعد سے اشتات و انتشار کا دور شروع ہوا۔ از انجملہ مرکزی قوتوں اور منصبوں کا انتشار و اشتات تھا، جس نے فی الحقیقت امت کا تمام نظام شرعی و اصلی درہم برہم کردیا۔ خلافت خاصہ کے بعد یہ ساری یکجا قوتیں الگ الگ ہوگئیں۔ ایک وجود کی جگہ مختلف وجودوں میں انکا ظہور اور نشو و نما ہوا۔ حکومت و فرماں روائی کا تکرر الگ ہوکر مجرد پادشاہی کی شکل میں آگیا۔ اسی کی طرف اشارہ تھا ”الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم ملک“ سوراقعی اسکے بعد صرف پادشاہی ہی رہگئی۔ اجتہاد اور قضاء شرعی کا جزء خلافت سے الگ ہوا تو مجتہدین و فقہاء کی ایک الگ جماعت پیدا ہوگئی۔ انہوں نے یہ کام سنبھالا۔ اسی طرح تعلیم و تربیت روحانی کے کاروبار سے نظام حکومت بالکل الگ ہوگیا۔ پہلے خلافت کی ایک ہی بیعت تمام مقاصد کی کفیل تھی۔ اب خلیفہ کا وجود محض پادشاہی کیلئے اور فقہاء کا وجود مجرد استنباط احکام و مسائل کیلئے رہگیا، تزکیۃ نفوس اور ارشاد قلوب کیلئے ایک دوسری بیعت مستقلاً قائم ہوئی، جو بیعت توبہ و ارشاد ہوئی، اور اس طرح اصحاب طریقت و تصوف کی بنیاد پڑی۔ پہلے صرف ایک وجود تھا۔ وہ پادشاہ، مجتہد، مرشد و ہادی، قاضی القضاۃ، سپہ سالار جنگ، میر عدل و احتساب، سب کچھ تھا۔ اب یہ ساری قوتیں الگ الگ ہوگئیں۔ حکومت و فرمانروائی الگ ایک وجود میں آئی۔ اجتہاد و تفقہ کیلئے دوسرا وجود مرکز بنا۔ قضاء کیلئے تیسرا۔ ارشاد و تزکیۃ قلوب کیلئے چوتھا۔ و ہلم جرا۔ اس طرح عہد اجتماع قوی و مناصب کے بعد دور انتشار قوی و مناصب شروع ہوکر رفتہ رفتہ کمال ظہور و بلوغ تک پہنچ گیا۔ حتیٰ کہ یہ تمام قوتیں اس طرح ایک دوسرے سے بیگانہ و مخالف ہوگئیں کہ یا تو ایک ہی وجود میں جمع تھیں، یا اب مختلف وجودوں میں بت کر بھی متفق نہ رہسکیں۔ صرف اختلاف تعدد و تنوع ہی نہیں رہا، بلکہ اختلاف تضاد کی شکل پیدا ہوگئی۔ یہی سب سے بڑی مصیبت و ہلاکت تھی جو امت پر طاری ہوئی۔ مسلمانوں کے تنزل و ادبار کی اصلی علت یہ ہے۔ وہ افسانے نہیں ہیں جن میں تم سر مست ہو۔ افسوس کہ سطحی و جزئی حالات کے استغراق نے اصلی اسباب و علل پر غور کرنے کی تمہیں کبھی مہلت نہ دی، اور نہ بحث و نظر میں یورپ کی تقلید سے آزاد ہوسکے کہ خالص اسلامی نظریے اسباب ترقی و تنزل پر تدبر کرتے!

خلافت راشدہ کی طرف عود و رجعت کا یہ ایک مبارک قدم تھا، جسکے لیے شوریٰ اور پارلیمنٹ کا ہونا سب سے پہلی شرط ہے۔ لیکن ان جزئی مستثنیات کے علاوہ عام حالات و خصائص ہو دور اور ہر سلسلے کے رہی رہے جو ایک جامع لفظ ”ملک عضو“ میں بتلا دیے گئے تھے، اور اس میں کبھی کوئی نمایاں اور پائدار تبدیلی نہ ہوئی۔

## فصل

( اطاعت خلیفہ و التزام جماعت )

اس اجمالی تمہید کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یعنی اسلام کا وہ نظام شرعی جو ہر مسلمان کو خلیفہ وقت کی معرفت اور اطاعت پر اسی طرح مجبور کرتا ہے، جس طرح اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر۔ جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف کوئی حکم نہ دے۔ اسلام کا قانون اس بارے میں اپنی تمام شاخوں اور تعلیموں کی طرح فی الحقیقت کائنات ہستی کے قدرتی نظام کا ایک جزء اور قوام ہستی کی زنجیر فطرۃ کی ایک قدرتی کڑی ہے۔ کائنات کے ہر حصہ اور ہر گوشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی قدرت و سنۃ ایک خاص نظام پر کار فرما ہے جسکو ”قانون مرکز“ یا ”قانون دائر“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یعنی قدرت نے خلقت و نظام خلقت کے بقا و قیام کیلئے ہر جگہ اور ہر شاخ وجود میں یہ صورت اختیار کر رکھی ہے کہ کوئی ایک وجود تو بمذللہ مرکز کے ہوتا ہے، اور بقیہ اجسام ایک دائرہ کی شکل میں اس کے چاروں طرف وجود پاتے ہیں، اور پورے دائرہ کی زندگی اور بقاء صرف اُس مرکزی وجود کی زندگی اور بقا پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک چشم زدن کیلئے بھی دائرہ کے اجسام اپنے مرکز سے الگ ہو جائیں، یا مرکز کی اطاعت و انقیاد سے باہر ہو جائیں، تو معاً نظام ہستی درہم برہم ہو جائے اور دائرہ کی اکیلی ہستیاں مرکز سے الگ رہ کر کبھی قائم و باقی نہ رہ سکیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسکو بعض اصحاب اشارات نے یوں تعبیر کیا کہ ”الحقیقۃ کا لکڑہ“ اور صاحب فتوحات نے کہا کہ ”دائرۃ قاب قوسین“ ہے۔

جو تم میں آباد ہے - ہر جسم کا فعل ہے اور ایک خاصہ - لیکن دیکھو، یہ ساری آبادی کس طرح ایک ہی مرکز کے آگے سر بسجود ہے ؟ سب کی حیات کا مرکز صرف قلب ہے - اس سے الگ رہکر ایک عضو بھی زندہ نہیں رہسکتا ” اذا صلحت ، صلحت کلہا ، و اذا فسدت ، فسدت کلہا “

اسلام فی الحقیقت سنۃ اللہ اور فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے اگر نوع انسانی کی سعادت و ارتقاء کیلئے قانون اسلام اسی فاطر السموات و الارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کی زندگی کیلئے ایک خاص نظام بنایا ، تو ضرور ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو، بلکہ پہلا قانون پچھلے قانون عام کا ایک ایسا قدرتی جزء نظر آئے، جیسے کسی زنجیر کی ایک کڑی - پس اسلام کا نظام شرعی بھی ٹھیک ٹھیک اسی قانون مرکزیہ پر قائم ہوا - قرآن نے یہ حقیقت جابجا واضح کی ہے کہ جس طرح اجسام و اشیاء کی زندگی اپنے اپنے مراکز سے وابستہ ہے، اسی طرح نوع انسانی اور اس کی جماعت و افراد کا جسمانی و معنوی بقاء بھی قانون مرکزیہ پر منحصر ہے - جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز و محور سورج کا وجود ہے - اسی طرح نوع انسانی کا بھی مرکز سعادت انبیاء کرام کا وجود ہے - پس ان کی اطاعت و انقیاد بقاء و حیات کیلئے ناگزیر تھری :

بأن اللہ (۴ : ۶۸) اور اسی لیے فرمایا : فلا وربک لا یؤمنون حتی یتکلموک فیما شجر بینہم ، ثم لا یجحدوا فی انفسہم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً (۴ : ۶۹) اور لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوة حسہ - پھر قوم و ملت کے بقاء کیلئے ہر طرح کے دائرے اور ہر طرح کے مرکز فرار دیے - اعتقاد میں اصلی مرکز عقیدہ توحید کو ٹھہرایا جس کے گرد تمام عقائد کا دائرہ قائم ہے : ان اللہ لا یغفران یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء (۴ : ۵۲) عبادات میں صلوٰۃ مرکز قرار پایا جس کے ترک کے بعد تمام دائرہ اعمال منہدم ہو جاتا ہے - ” فمن اقامہا اقام الدین ، و من ترکہا فقد ہدم الدین “ - اور اسی لیے یہ بات ہوئی کہ ” کان اصحاب رسول اللہ صلعم لا یرون شئیا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوۃ (ترمذی) اسی طرح تمام قوموں اور ملکوں کا ارضی مرکز سعادت وادی حجاز کا کعبۃ اللہ قرار پایا : جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس - اور چونکہ یہ مرکز ٹھہرا ، اس لیے تمام دائرہ کارخ اسی طرف ہوا - خواہ دنیا کی کسی جہت میں مسلمان ہوں، لیکن انکا منہ اسی طرف ہونا چاہیے :

و حیث ما کنتم فولوا و جوهکم شطرہ (۲ : ۱۴۵)

بعد صرف پادشاہی ہی رہ گئی - اجتہاد اور قضاء شرعی کا جزء خلافت سے الگ ہوا تو مجتہدین و فقہاء کی ایک الگ جماعت پیدا ہو گئی - انہوں نے یہ کام سنبھالا - اسی طرح تعلیم و تربیت روحانی کے کار و بار سے نظام حکومت بالکل الگ ہو گیا - پہلے خلافت کی ایک ہی بیعت تمام مقاصد کی کفیل تھی - اب خلیفہ کا وجود محض پادشاہی کیلئے اور فقہاء کا مجرد استنباط احکام و مسائل کیلئے رہ گیا ، تو تزکیۂ نفوس اور ارشاد قلوب کیلئے ایک دوسری بیعت مستقلاً قائم ہوئی ، جو بیعت توبہ و ارشاد ہوئی ، اور اس طرح اصحاب طریقت و تصوف کی بنیاد پڑی - پہلے صرف ایک وجود تھا - وہ پادشاہ ، مجتہد ، مرشد ، قاضی القضاۃ ، سپہ سالار جنگ ، میر عدل و احتساب ، سب کچھ تھا - اب یہ ساری قوتیں الگ الگ ہو گئیں - حکومت و فرمانرانی الگ ایک وجود میں آئی - اجتہاد و تفقہ کیلئے دوسرا وجود مرکز بنا - قضاء کیلئے تیسرا - ارشاد و تزکیۂ قلوب کیلئے چوتھا - و ہلم جرا - غرضکہ عہد اجتماع قومی و مناصب کے بعد در انتشار قومی و مناصب شروع ہو کر رفتہ رفتہ کمال ظہور و بلوغ تک پہنچ گیا - حتیٰ کہ یہ تمام قوتیں اس طرح ایک دوسرے سے بیگانہ و مخالف ہو گئیں کہ یا تو ایک ہی وجود میں جمع تھیں ، یا اب مختلف وجودوں میں بت کر بھی متفق نہ رہ سکیں - صرف اختلاف تعدد و تنوع ہی نہیں رہا ، بلکہ اختلاف تضاد کی شکل پیدا ہو گئی - یہی سب سے بڑی مصیبت و ہلاکت تھی جو امت پر طاری ہوئی - مسلمانوں کے تنزل و ادبار کی اصلی علت یہ ہے - وہ افسانے نہیں ہیں جنہیں تم سرمست ہو - افسوس کہ سطحی و جزئی حالات کے استغراق نے اصلی اسباب و علل پر غور کرنے کی تمہیں کبھی مہلت نہ دی ، اور نہ بحث و نظر میں یورپ کی تقلید سے آزاد ہو سکے کہ خالص اسلامی فکر و نظر اسباب ترقی و تنزل پر تدبیر کرتے !

غرضکہ خلافت راشدہ کے بعد جو سلسلۂ خلافت قائم ہوا ، وہ خواہ قرشی رہا ہو یا غیر قرشی ، مجرد ملوکی و پادشاہی کا سلسلہ تھا ، اور بجز چند مستثنیٰ اوقات کے ( جیسا کہ عہد حضرت عمر بن عبد العزیز ) یہ نیابت نبوت کے اور تمام اجزاء سے یکقلم خالی رہا - منصب بت چکے تھے - قوتیں منتشر ہو چکی تھیں - البتہ جو انقلاب سلطان عبد الحمید خان کے زمانے میں ہوا اور جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلاطین عثمانیہ کی خلافت طریق استبدادی و شخصی سے طریق شوریٰ میں تبدیل ہو گئی ، سو بلا شبہ



ہستی درہم برہم ہو جائے اور دائرہ کی اکیلی ہستیاں مرکز سے الگ رہ کر کبھی قائم و باقی نہ رہ سکیں - مرکز سے مفارقت اور تغلف کے ساتھ ہی فنا و ہلاکت اُنپر طاری ہو جائے - یہی وہ حقیقت ہے جسکو بعض اصحاب اشارات و کشف نے یوں تعبیر کیا کہ ”الحقیقہ کا لکڑہ“ یہ قانون مرکزی و دائرہ نظام ہستی کے ہر جز اور ہر حصہ میں صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے - یہ نظام شمسی جو ہمارے اوپر ہے، ستاروں کی یہ گنجان آبادی، کروں کا یہ صحرا بے کنار، زندگی اور حرکت کا یہ محیر العقول طلسم، کیا ہے؟ کس نظام پر یہ پورا کارخانہ چل رہا ہے؟ اسی قانون مرکزی پر - متحرک سیاروں کے حلقے اور دائرے ہیں، اور ہر دائرہ کا نقطہ حیات و بقا سورج کا مرکزی نقطہ ہے - تمام ستارے اپنے اپنے کعبہ مرکز کا طواف کر رہے ہیں اور ہر دائرہ کی ساری زندگی اور بقا صرف مرکز شمسی کی اطاعت و انقیاد پر موقوف ہے : ذلک تقدیر العزیز العلیم - خرد ہماری زمین بھی ایک ایسے ہی دائرہ کی ایک کڑی ہے اور شب و روز اپنے مرکز کے طواف و انقیاد میں مشغول ہے - ہر ستارے کے طواف و دوران کیلئے حکمت الہی نے ایک خاص راہ اور ایک خاص زمانہ قرار دیدیا ہے - اور وہ اُس سے باہر نہیں جاسکتا -

سب بحکم ولہ اسلم من فی السموات والارض (۲ : ۸۳) اور ان اللہ یسجدلہ من فی السموات ومن فی الارض والشمس والقمر والنجوم (۲۲ : ۱۹)

خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اپنی اپنی جگہوں میں کام کر رہے ہیں :

لاالشمس ینبغی لہا ان تدرك القمر ولا الیل سابق الذہار وکل فی فلک یسبحون (۳۶ : ۴۱)

قانون مرکزی کا یہ پہلا اور بلند ترین نظارہ تھا - اب اس کے بعد جس قدر نیچے اترتے آئیں گے، اور بلند سے بلند گوشوں سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے گوشوں تک نظر ڈالیں گے، ہر جگہ زندگی اور بقا اسی قانون سے وابستہ نظر آئیگی - عالم نباتات میں درخت کو دیکھو - اس کی ایک مجتمعہ وحدہ کتنی وسیع کثرت سے مرکب ہے؟ ڈالیاں ہیں، شاخیں ہیں، پتے ہیں، پھول ہیں - لیکن سب کی زندگی ایک ہی مرکز یعنی جڑ سے وابستہ ہے - جڑ سے جہاں کوئی شاخ الگ ہوئی، موت و فنا اُسپر طاری ہوگئی - آفاق کو چھوڑ کر عالم انفس کی طرف آؤ، اور خود اپنے وجود کو دیکھو جس کے دیکھنے کیلئے نظر اُٹھانے کی بھی ضرورت نہیں - تمہارا وجود کتنے مختلف ظاہری و باطنی اعضاء سے مرکب ہے؟ جسموں اور وجودوں کی ایک پوری بستی ہے

جو تم میں آباد ہے - ہر جسم کا فعل ہے اور ایک خاصہ - لیکن دیکھو! یہ ساری آبادی کس طرح ایک ہی مرکز کے آگے سر بسجود ہے؟ سب کی حیات کا مرکز صرف قلب ہے - اس سے الگ رہکر ایک عضو بھی زندہ نہیں رہسکتا ” اذا اصلحت ، صلحت کلھا ، و اذا فسدت ، فسدت کلھا “

اسلام فی الحقیقت سنۃ اللہ اور فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے - اگر نوع انسانی کی سعادت و ارتقاء کیلئے قانون اسلام اُسی فاطر السموات و الارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کیلئے قانون حیات بنایا ، تو ضرور ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو بلکہ پہلا قانون پچھلے قانون عام کا ایک ایسا قدرتی جزء نظر آئے ، جیسے زنجیر کی ایک کڑی - پس اسلام کا نظام شرعی بھی ٹھیک ٹھیک اسی قانون مرکزیہ پر قائم ہوا - قرآن نے یہ حقیقت جا بجا واضح کی ہے کہ جس طرح اجسام و اشیاء کی زندگی اپنے اپنے مرکوزوں سے وابستہ ہے ، اسی طرح نوع انسانی اور اسکی جماعت و افراد کا جسمانی و معنوی بقاء بھی قانون مرکزیہ پر موقوف ہے - جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز و محور سورج کا وجود ہے - اسی طرح نوع انسانی کا بھی مرکز سعادت انبیاء کرام کا وجود ہے - پس انکی اطاعت و انقیاد بقاء و حیات کیلئے ناگزیر تھری : و ما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (۶۸: ۴) دنیا میں کوئی نبی نہیں آیا مگر اسلیئے کہ اسکی اطاعت کی جائے ، اور اسی لیے فرمایا : فلا ربک لا یؤمنون حتیٰ یحکموا فیما شجر بینہم ، ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجاً مما قضیت و یسلموا تسلیماً (۶۹: ۴) اور لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ - پھر قوم و ملت کے بقاء کیلئے ہر طرح کے دائرے اور ہر طرح کے مرکز قرار دیے - اعتقاد میں اصلی مرکز عقیدہ توحید کو ٹھہرایا جسکے گرد تمام عقائد کا دائرہ قائم ہے : ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء (۵۲: ۴) عبادات میں نماز کو مرکز عمل ٹھہرایا جسکے ترک کردینے کے بعد تمام دائرہ اعمال منہدم ہو جاتا ہے - ” فمن اقامہا اقام الدین “ و من ترکہا فقد ہدم الدین “ اور اسی لیے یہ بات ہوئی کہ ” کان اصحاب رسول اللہ صلعم لا یرون شئیا من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوۃ “ (ترمذی) یعنی صحابہ کرام کسی عمل کے ترک کردینے کو کفر نہیں سمجھتے تھے مگر نماز کے ترک کو - اسی طرح تمام قوموں اور ملکوں کا ارضی مرکز سعادت رادی حجاز کا کعبۃ اللہ قرار پایا : جعل اللہ الکعبۃ البیت

و اطيعو الرسول و اولی الامر منکم في عبد الله بن حذافہ بن قیس بن عدی السہمی، بعثہ النبی صلعم في سرية " تاریخ اسلام کے سب سے بڑے فقیہ امام بخاری کا بھی مذہب یہی ہے۔ کتاب الاحکام میں اسی آیت کریمہ کو ایک باب کا عنوان قرار دیا ہے اور اسمیں حضرت ابوہریرہ کی مشہور روایت لائے ہیں: " من اطاع امیري فقد اطاعني و من عصی امیري فقد عصانی " اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں " اولو الامر " کی اطاعت سے مقصود امیر کی اطاعت ہے۔

" فان تنازعتم " الخ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اسلامی خلیفہ کا وجود مسیحیت کے پوپ سے کس درجہ مختلف ہے جو اسلام کے نزدیک اربابا من درن اللہ میں داخل ہے۔ مسیحیت کا خلیفہ " ارضی خلیفہ " نہیں ہے۔ آسمانی و دینی فرمانرا ہے جو مذہب کی آخری طاقت اپنے قبضہ میں رکھتا ہے۔ برخلاف اسلامی خلیفہ کے جسکے وجود کی اصلی بنا خلافت ارضی یعنی حکومت و سلطنت ہے۔ وہ صرف شریعت اور امت کی حفاظت کرنے والا اور احکام شریعت نافذ کرنے والا ہے۔ یعنی محض ایک قوت نافذہ ہے۔ نہ کہ مقننہ۔ اسکی ذات کو اصل شریعت اور اسکے احکام میں کوئی دخل نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فردہ الی اللہ و الرسول نہ فرمایا جاتا۔ یعنی اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے جسمیں نزاع و اختلاف پیدا ہو، تو پھر اسکے آخری فیصلہ کی قوت خلیفہ کا حکم نہیں ہے بلکہ مرکز اولی و حقیقی کا۔ یعنی قرآن و سنت کا۔ اور خود خلیفہ بھی اسکی اطاعت پر اسی طرح مجبور ہے جس طرح جماعت امت کا ہر عام فرد۔

احادیث صحیحہ سے اسکی مزید توضیح ہوگئی ہے۔ اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ احادیث و آثار موجود ہیں، اور عہد صحابہ سے لیکر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات روات و حفاظ میں اسقدر انکی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدہ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی اور چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہوگی۔ سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کرونگا جسمیں بالترتیب اسلام کا جماعتی نظام بیان کیا گیا ہے " قال صل اللہ علیہ وسلم : انا امرکم بخمس " اللہ امرني بہن : الجماعة " و السمع و الطاعة " و الهجرة " و الجهاد في سبيل اللہ - فانه من خرج من الجماعة قيد شبر، فقد خلع ربة الاسلام من عنقه الا ان يراجع " و من دعا بدعوي جاهلية فهو من جثي جهنم - قالوا يا رسول اللہ و ان صام و صلی ؟

یہ قانون مرکزیہ و دائرہ نظام ہستی کے ہر جزء اور ہر حصہ میں صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ نظام شمسی جو ہمارے اوپر ہے، ستاروں کی یہ گنجائش آبادی، کروں کا یہ صحرائے بے کنار، زندگی اور حرکت کا یہ محیر العقول طلسم، کیا ہے؟ کس نظام پر یہ پورا کارخانہ چل رہا ہے؟ اسی قانون مرکزیہ پر۔ متحرک سیاروں کے حلقے اور دائرے ہیں، ہر دائرہ کا نقطہ حیات و بقا سورج کا مرکزی نقطہ ہے۔ تمام ستارے اپنے اپنے کعبہ مرکز کا طواف کر رہے ہیں اور ہر دائرہ کی ساری زندگی اور بقا صرف مرکز شمسی کی اطاعت و انقیاد پر موقوف ہے: ذلک تقدیر العزیز العظیم۔ خود ہماری زمین بھی ایک ایسے ہی دائرہ کی ایک کڑی ہے اور شب و روز اپنے مرکز کے طواف و انقیاد میں مشغول ہے۔ ہر ستارے کے طواف و دوران کیلئے حکمت الہی نے ایک خاص راہ اور ایک خاص زمانہ قرار دیدیا ہے۔ رہ اس سے باہر نہیں جاسکتا۔ سب بحکم ولہ اسلم من فی السموات والارض (۲: ۸۳) اور ان اللہ یسجد لہ

من فی السموات و من فی الارض و الشمس و القمر و الذہر (۲۲: ۱۹)  
خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق اپنی اپنی جگہوں میں کام کر رہے ہیں: لا الشمس یذبغی لہا ان تدرك القمر، و لا الیل سابق الذہار، و کل فی فلک یسبحون (۳۶: ۴۱)

قانون مرکزیہ کا یہ پہلا اور باندہ ترین نظارہ تھا۔ اب اس کے بعد جس قدر نیچے اترتے آئینگے، اور حرکت و حیات کی بلندیوں سے لیکر زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے گوشوں تک نظر ڈالینگے، ہر جگہ زندگی اور بقا اسی قانون سے وابستہ نظر آئیگی۔ عالم نباتات میں درخت کو دیکھو۔ اسکی ایک مجتمعہ وحدہ کتنی وسیع کثرت سے مرکب ہے؟ دالیاں ہیں، شاخیں ہیں، پتے ہیں، پھول ہیں۔ لیکن سب کی زندگی ایک ہی مرکز یعنی جڑ سے وابستہ ہے۔ جڑ سے جہاں کوئی شاخ الگ ہوئی، موت و فنا اسپر طاری ہوگئی۔ آفاق کو چھوڑ کر عالم انفس کی طرف آؤ، اور خود اپنے وجود کو دیکھو جس کے دیکھنے کیلئے نظر اٹھانے کی بھی ضرورت نہیں۔ تمہارا وجود کتنے مختلف ظاہری و باطنی اعضاء سے مرکب ہے؟ جسموں اور وجودوں کی ایک پوری بستی ہے

پھر جس طرح شخصی اور اعتقادی و عملی زندگی کیلئے مراکز قرار پائے، ضرور تھا کہ جماعتی اور ملی زندگی کے بقاء کیلئے بھی ایک مرکزی وجود قرار پاتا۔ لہذا وہ مرکز بھی قرار دیا گیا۔ تمام امت کو اس مرکز کے گرد بطور دائرہ کے تھرایا۔ اُسکی معیت، اُسکی رفاقت، اُسکی اطاعت، اُسکی حرکت پر حرکت، اُسکے سکون پر سکون، اُسکی طلب پر لبیک، اُسکی دعوت پر اتفاق جان و مال، ہر مسلمان کیلئے فرض کر دیا گیا۔ ایسا فرض جسکے بغیر جہلیہ کی ظلمت سے نکل کر اسلامی زندگی کی روشنی میں آ نہیں سکتا۔ اسلام کی اصطلاح میں اسی قومی مرکز کا نام ”خلیفہ“ اور ”امام“ ہے، اور جب تک یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ہے، یعنی کتاب و سنت کے مطابق اُسکا حکم ہے، ہر مسلمان پر اُسکی اطاعت و اعانت اُسی طرح فرض ہے جس طرح خود اللہ اور اُسکے رسول کی :

|                                |   |
|--------------------------------|---|
| یا ایہا الذین آمنوا طیعوا اللہ | مسلمانو! اطاعت کرو اللہ کی، اُسکے       |
| و اطیعوا الرسول و اولی         | رسول کی، اور تم میں جو اولو الامر ہو،   |
| الامر منکم۔ فان تنازعتم        | اُسکی۔ پھر اگر کسی معاملہ میں تم        |
| فی شیء فردہ الی اللہ           | مختلف ہو جاؤ تو چاہیے کہ اللہ اور اُسکے |
| و الرسول، ان کنتم تومنون       | رسول کی طرف لوٹو اور اُسکے فیصلہ پر     |
| باللہ و الیوم الآخر۔ ذلک       | متفق ہو جاؤ۔                            |
| خیر و احسن تاولا۔              |   |

( ۴ : ۶۳ )

صحابہ کی مستند تفسیر بالاتفاق یہ ہے کہ ”اولی الامر“ سے مقصود خلیفہ و امام ہے۔ البتہ تبعاً امراء و مجتہدین اور اصحاب حل و عقد بھی اسمیں داخل ہو سکتے ہیں جنسے اسلام کی حکومت شوری مرکب ہوتی ہے۔ خود قرآن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اسی سورۃ نساء میں آگے چل کر ہے : و لوردہ الی الرسول و الی اولی الامر منہم، بعلمہ الذین یستنبطونہ منہم ( ۴ : ۸۶ ) ظاہر ہے کہ یہاں ”اولو الامر“ سے مقصود بجز حاکم و امیر کے اور کوئی نہیں ہے۔ عالم یا مجتہد و فقیہ نہیں ہو سکتا۔ ملکی اور جنگی معاملات کا ذکر ہے۔ سیاق و سباق بتلا رہا ہے کہ معاملہ فقہ و مسائل کا نہ تھا۔ جنگ کا تھا۔ علاوہ اُسکے احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ خود یہ آیت جس واقعہ کی نسبت اُتری، وہ امیر و امام کی اطاعت ہی کا معاملہ تھا۔ صحیح مسلم میں ہے ”قال ابن جریر : نزل یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ



اولاً ، بحکم ” القرآن یفسر بعضہ بعضا ” اولوالامر کی تفسیر خود قرآن ہی کے اندر تلاش کرنی چاہیے ۔ اسی سورت میں آگے چلکر یہ لفظ دوبارہ آیا ہے :

و اذا جاء ہم امر من الامن  
ار الخوف اذاعوا به ، ولوردہ  
الی الرسول و الی اولی الامر  
منہم ، لعلمہ الذین یستنبطونہ  
منہم - ( ۸۶ : ۴ )  
اور جب کوئی امن یا خوف کی خبر آن  
تک پہنچتی ہے ، تو بلا سوچے سمجھے  
لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں ۔ حالانکہ اگر وہ  
اللہ کے رسول کی طرف اور ان لوگوں کی  
طرف رجوع کرتے جو ان میں ” اولوالامر “  
ہیں ، تو فوراً اصلیت کھل جاتی اور وہ اُس خبر کے سچے جھوٹے ہونے کا  
پتہ لگا لیتے ۔

اس آیت میں ایسے وقتوں کا ذکر کیا گیا ہے جب امن و خوف یعنی  
صلح و جنگ اور فتح و شکست کی افواہیں ملک میں پھیلتی ہیں اور  
بے اصل خبروں کی اشاعت سے لوگوں میں اضطراب و غلط فہمی پیدا  
ہو جاتی ہے ۔ ایسی صورتیں منافقین اور بعض ضعیف القلب مسلمانوں کی  
رجہ سے عہد نبوی میں بھی پیش آ جاتی تھیں ۔ پس فرمایا کہ جب کوئی  
افواہ سنو تو پہلے اللہ کے رسول اور اپنے ” اولوالامر “ تک پہنچاؤ ۔ تاکہ وہ اس  
کی صحت و عدم صحت کی تحقیق کر لیں اور خبر کی نوعیت اور رازداریوں  
کی حالت پر غور کر کے صحیح نتائج کا استنباط کریں ۔ ایسا نہ کر کہ جہاں  
کوئی افواہ سنی ، فوراً اسپر یقین کر لیا اور لوگوں میں پھیلا نا شروع کر دیا ۔  
اب غور کرنا چاہیے کہ اس آیت میں ” اولوالامر “ سے مقصود کون  
لوگ ہو سکتے ہیں ؟ یہ ظاہر ہے کہ ذکر امن و خوف کے حالات کا ہے ۔ یعنی  
صلح و جنگ اور فتح و شکست کا ۔ ان حالات کا تعلق صرف حکام و امراء  
ملک ہی سے ہو سکتا ہے ۔ علما اور فقہاء سے نہیں ہو سکتا ۔ معاملہ نظم ملک و  
قیام امن کا ہے ۔ استنباط مسائل اور حلال و حرام کا نہیں ہے ۔ پس لامحالہ  
تسلیم کرنا پڑیگا کہ اولوالامر سے مقصود وہی لوگ ہیں جنکے سپرد ملک  
کا انتظام اور جنگ و امن کا نظم و نسق ہوتا ہے ، اور جو ان خبروں کی  
تحقیق کر سکتے ہیں جنکا اثر ملک کے امن و خوف پر پڑ سکتا ہے ۔ یعنی  
ارباب حکومت و امارت ۔

ثانیاً ، کتاب و سنۃ اور صدر اول کے آثار عربیۃ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا  
ہے کہ لفظ ” امر “ جب ایسی ترکیب کے ساتھ بولا جائے جیسی کہ یہاں ہے ،

ترک کرنے میں اہل رعیال ، مال و متاع ، دوست و احباب ، ہر طرح کے علاقوں کو ترک کر دینا پڑتا ہے ، اور اسکی محبت و الفت کی زنجیر اور ساری زنجیروں سے بہاری ہے ، اسلیئے ترک وطن کی ہجرت اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہوئی ، اور زیادہ تر اطلاق مہاجرۃ کا تارکین وطن ہی پر کیا گیا ۔ ” ولکل امری ما نوي ۔ فمن کانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ ، فہجرتہ الی اللہ ورسولہ ۔ ومن کانت ہجرتہ لدنیا یصیبہا ، ارا مرأۃ یتزرعہا ، فہجرتہ الی ما ہاجر الیہ “ (بخاری عن عمر رض) مفردات راغب میں ہے ۔ ” الہجر والہجران مفارقة الانسان غیرہ ، اما بالبدن او باللسان او بالقلب ۔ و المہاجرۃ ، مصارمۃ الغیر و متارکتہ “ ( ۵۵۸ )

پانچویں چیز ” جہاد فی سبیل اللہ “ ہے ۔ ” جہاد “ جہد سے ہے جسکے معنی ” استفراغ الرسع فی مدافعة العدر ظاہراً و باطناً “ ہیں ( مفردات راغب ) یعنی دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کے دفع کرنے میں انتہا درجہ کی کوشش کرنا ۔ یہ کوشش زبان سے بھی ہوتی ہے ۔ مال سے بھی ہوتی ہے ۔ جان سے بھی ہوتی ہے ۔ جس قسم کی کوشش کی ضرورت ہو ۔ ہر قسم جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے ۔ ” و جاهدوا المشرکین باموالکم و انفسکم و السننکم “ ( رواہ ابوداؤد و احمد و نسائی و ابن حبان عن انس )

یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہی پانچ چیزیں دنیا میں قوموں اور ملکوں کے بقاؤ قیام کی اصلی بنیاد ہیں ۔ دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جسکی قومی ہستی ان پانچ عنصروں سے مرکب نہ ہو ۔ سعی و عمل کا کوئی گوشہ ہو ، کامیابی بغیر ان اصول خمسہ کے ممکن نہیں ۔ ایک مٹھی گہیروں کے حصول سے لیکر قطب شمالی کی تحقیق تک ، اور چاندی سونے سے لیکر خدا اور اسکی محبت تک ، کوئی چیز بغیر جماعت ، اطاعت ، ہجرت ، اور جہاد کے حاصل نہیں ہو سکتی ۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے اور نوع انسانی نے جسقدر بھی حاصل کیا ہے ، غور کر گئے تو وہ سب انہی پانچ سچائیوں کے ثمرات و نتائج ہیں ۔ ایک ہی چیز مختلف بھیسوں اور ناموں میں آکر عقلوں کو الجھا دیتی ہے ، رنہ حقیقت ہر حال میں ایک ہی ہے ۔ دنیا ان پانچ بنیادی حقیقتوں کو مختلف ناموں سے پکارتی اور مانتی ہے ۔ دنیا میں کوئی عقل نہیں جو انکی منکر ہو سکے ۔ البتہ نام کے اختلاف نے معانی پر پردہ ڈال دیا ہے ۔ اگر ان کی تشریح کروں تو پوری ایک کتاب بن جائے ۔ مسلمانوں نے جو کچھ پایا تھا انہی پر عمل کر کے ، اور جسقدر کھویا انہی کو چھوڑ کر ۔

الحرام قیاماً للناس - ” قیاماً للناس “ پر غور کرو - اور چونکہ یہ مرکز تھرا ، اس لیے تمام دائرہ کا رخ بھی اسی طرف ہوا - خواہ دنیا کی کسی جہت میں مسلمان ہوں ، لیکن انکا منہہ اسی طرف ہونا چاہیے : و حیث ما کنتم فولوا وجوهکم شطرہ ( ۲ : ۱۴۵ )

پھر جس طرح شخصی اور اعتقادی و عملی زندگی کیلئے مراکز قرار پائے ، ضرور تھا کہ جماعتی اور ملی زندگی کیلئے بھی ایک مرکزی وجود قرار پاتا - لہذا وہ مرکز بھی قرار دیدیا گیا - تمام امت کو اس مرکز کے گرد بطور دائرہ کے تھرایا - اُسکی معیت ، اُسکی رفاقت ، اُسکی اطاعت ، اُسکی حرکت پر حرکت ، اُسکے سکون پر سکون ، اُسکی طلب پر لبیک ، اُسکی دعوت پر انفاق جان و مال ، ہر مسلمان کیلئے فرض کر دیا گیا - ایسا فرض جسکے بغیر وہ جاہلیہ کی ظلمت سے نکل کر اسلامی زندگی کی روشنی میں نہیں آسکتا - اسلام کی اصطلاح میں اسی قومی مرکز کا نام ” خلیفہ “ اور امام ہے ، اور جب تک یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ہے - یعنی کتاب و سنۃ کے مطابق اُسکا حکم ہے ، ہر مسلمان پر اُسکی اطاعت و اعانت اُسی طرح فرض ہے جس طرح خود اللہ اور اُسکے رسول کی :

|   |   |
|---|---|
| یا ایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ   | مسلمانو! اطاعت کرو اللہ کی ، اُسکے  |
| و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم - فان تنازعتم فی شئ فردوه الی اللہ و الرسول | رسول کی ، اور تم میں جو اولو الامر ہو ، اُسکی - پھر اگر کسی معاملہ میں تم مختلف ہو جاؤ تو چاہیے کہ اللہ اور اُسکے رسول کی طرف لوٹو اور اُسکے فیصلہ پر متفق ہو جاؤ - |
| ان کنتم تؤمنون باللہ و الیوم الآخر - ذلک خیر و احسن تاریلہ - ( ۴ : ۶۳ )       |   |

اس آیت میں بالترتیب تین اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہے - اللہ کی ، رسول کی ، مسلمانوں میں جو اولو الامر ہو ، اُسکی - اللہ کی اطاعت کتاب اللہ کی اطاعت ہے - رسول کی اطاعت سے مقصود سنت قولی و فعلی ہے - باقی رہی اطاعت اولو الامر ، تو نہایت قوی و روشن وجوہ موجود ہیں کہ ” اولو الامر “ سے مقصود مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے جو کتاب و سنت کے احکام نافذ کرنے والا ، نظام امت قائم رکھنے والا ، اور تمام اجتہادی امور میں صاحب حکم و سلطان ہے :

قال وان صلی و صام و زعم انه مسلم - فادعو المسلمين باسمائهم علی ما سماهم الله - المسلمین المومنین عباده الله " اخرجه احمد و الحاكم من حدیث الحارث الاشعری علی شرط الصحیحین - قال ابن کثیر هذا حدیث حسن و له الشواهد -

یعنی فرمایا - میں تم کو پانچ باتوں کیلئے حکم دیتا ہوں جنکا حکم مجھے اللہ نے دیا ہے - جماعت 'سمع و طاعة' ہجرت 'اور اللہ کی راہ میں جہاد - یقین کر رکھو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشٹ بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا ' اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیہ کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اسکا ٹھکانا جہنم ہے - لوگوں نے عرض کیا - کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو؟ فرمایا ہاں - اگرچہ روزہ رکھتا ہو ' نماز پڑھتا ہو ' اور اپنے زعم میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو -

اس حدیث میں پانچ باتیں بتلائی ہیں :

پہلی چیز "جماعت" ہے - یعنی تمام امت کو ایک خلیفہ و امام پر اکٹھا ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے ملحق ہو کر رہنا چاہیے - الگ الگ نہیں رہنا چاہیے - آگے چل کر کثرت کے ساتھ وہ حدیثیں ملینگی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے ' اور ابھی آپ سن چکے ہیں کہ انفرادی زندگی کو قرآن کوئی زندگی ہی نہیں مانتا - اسلامی زندگی جماعت ہے -

دوسری بات "سمع و الطاعة" ہے - یعنی خلیفہ کی کامل درجہ کی اطاعت - ایسی اطاعت کہ بس سننا اور اُسپر بلا چون و چرا چلنا -

تیسری بات "ہجرت" ہے - ہجرت ہجر سے ہے جسکے معنی ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں - اسلام کی اصطلاح میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت و صداقت کے کسی مقصد اعلیٰ کیلئے اپنی دنیوی معیشتات و مالوفات ترک کر دے - مثلاً دولت کو ' آرام و راحت کو ' عزیز و اقرباء کے قرب کو ' وطن و مکان کو ' تو اسکا نام ہجرت الی اللہ اور ذہاب الی اللہ ہے - خدا کے ہر رسول اور انکے پیروں کو قیام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑی : انی مہاجر الی ربی - اور انی ذاہب الی ربی - چونکہ وطن و مکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جسکے

نقل کیا ہے ” ہم الامراء “ اور علامہ ابن حزم نے اُن تمام صحابہ و تابعین کو شمار کیا جن سے یہ تفسیر منقول ہے تو ۱۳ - سے زیادہ ثابت ہوے - باقی رہا بعض صحابہ و تابعین کا یہ کہنا کہ مقصود اہل علم و نظر ہیں - مثلاً جابر بن عبد اللہ کا قول کہ ” ہم اہل العلم و الخیر “ اور مجاہد و عطاء و ابو العالیہ کا قول کہ ” ہم العلماء “ تو ان اقوال میں اور صحابہ کی مشہور تفسیر میں کوئی اختلاف نہیں ہے - دراصل اسلام کا نظام حکومت و جماعت تو یہی تھا کہ حکومت و ولایت کا منصب تمام شرعی و علمی قوتوں سے مرکب ہو ، اور اسوقت تک قوتوں کے انتشار اور مناصب کے تفرقہ کی بنیادیں نہیں پڑی تھیں - پس جو شخص والی ملک اور حاکم مسلمین ہوتا تھا ، وہ بدرجہ اولیٰ عالم و فقیہ بھی ہوتا تھا - پس جن صحابہ و تابعین نے ” اولو الامر “ کی تفسیر میں علم و خیر کا ذکر کیا ، انہوں نے واقعی بہت صحیح تفسیر کی - گویا ظاہر کر دیا کہ مسلمانوں کا اولو الامر ایسے ہی افراد کو ہونا چاہیے جو اہل علم و خیر ہوں - مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اولو الامر سے مقصود علماء و فقہاء کا وہ مخصوص و متعارف گروہ ہے جو اسلام کے نظام جماعت کے انقراض کے بعد پیدا ہوا ، اور جس کا صدر اول کے مفسرین کو رہم و گمان بھی نہ ہوا ہوگا ؟

امام ابن جریر نے عکرمہ کا ایک قول نقل کیا ہے ” ابو بکر و عمر “ اس سے بھی اُنکا مقصود یہی ہے کہ اولو الامر مسلمانوں کا خلیفہ و امام ہے - جیسے ابوبکر و عمر - رضی اللہ عنہما

اصل یہ ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے حجاز میں ایک طرح کی باقاعدہ طوائف الملوكی قائم تھی ، اور مکہ میں قریش کا قبیلہ بالکل خود مختار اور غیر مسئلہ تھا - اسلام کا جب ظہور ہوا تو اُس نے ” جماعت “ اور ” امارت “ کے نظام پر زور دیا ، اور برے برے گردن کشوں کو بھی مجبور کر دیا کہ اطاعت امیر و التزام جماعت سے باہر نہ ہوں - قریش کی نسلی فطرت اس اطاعت کیشی کے خلاف تھی ، اسلیے خصوصیت کے ساتھ اُنکو اس بات کا خوگر بنانا تھا - حافظ عسقلانی نے امام شافعی کا قول نقل کیا ہے ” رجم الشافعی الاول و احتج بأن قریشا كانوا لا يعرفون الامارة و لا ينقادون الى امير ، فامرنا بالطاعة لمن ولي الامر ، و لذلك قال صلعم ، من اطاع اميري فقد اطاعني “ ( فتح ۸ : ۱۹۱ )



”اسمعوا واطيعوا وان استعمل عليكم عبد حبشي كان راسه زبيبة“  
( صحیحین عن انس ) اگر ایک حقیر صورت حبشی غلام بھی تمہارا امیر  
بنا دیا جائے تو چاہیے کہ اسکی سنو اور اطاعت کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ بار بار اور کثرت سے خطبوں میں آپ فرماتے  
تھے۔ اسی لیے مختلف لفظوں میں اور مختلف مواقع کی نسبت  
مردی ہے۔ حجة الوداع کے عظیم الشان اور یادگار عالم مرقعہ پر جبکہ دو تین  
ماہ کے بعد آپ دنیا سے تشریف لیجانے والے تھے اور ایک آخری اور رداعی  
پیام دنیا کو سنا رہے تھے، فرمایا ”و لو استعمل عليكم عبد يقودكم بكتاب الله“  
اسمعوا واطيعوا“ (مسلم) اگر ایک حبشی غلام بھی تم پر امیر بنادیا جائے  
اور وہ کتاب اللہ کے ساتھ تم پر حکومت کرے، تو اسکی سنو اور اطاعت کرو!  
”من خرج من الطاعة و فارق الجماعة“ فمات، مات ميتة جاهلية“  
و عن ابن عباس ”من راي من اميره شيئا يكرهه“ فليصبر، فانه من فارق  
الجماعة شبرا، فمات، فميتته ميتة جاهلية“ و في لفظ ”فانه ليس احد  
من الناس خرج من السلطان شبرا فمات عليه“ الا مات ميتة جاهلية“  
(متفق عليه) یعنی جس نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا۔ خلیفہ کی  
اطاعت سے باہر ہو گیا، اور اسی حالت میں بغیر توبہ کے مر گیا، تو اسکی  
موت جاهلیہ کی موت ہوئی (اسلام سے پہلے اہل عرب پر جو زمانہ گزرا ہے،  
اسکو عہد جاہلیہ کہتے ہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ عرب جاہلیہ کی طرح  
گمراہی پر موت ہوئی) دوسری روایت میں ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے  
امیر کو ایسی بات کرتے دیکھے جو اُسے پسند نہ آئے تو چاہیے کہ صبر  
کرے۔ اسکی اطاعت سے باہر نہو۔ کیونکہ جو کوئی سلطان اسلام کی اطاعت  
سے بالشت بھر بھی باہر ہوا اور اسی حالت میں مر گیا، تو اسکی موت  
جاہلیہ کی حالت پر ہوئی۔ حضرت ابن عمر کی روایت میں ہے ”من خلع  
يدا من طاعة“ لقي الله يوم القيامة و لا حجة له، و من مات رايس في عنقه بيعة“  
مات ميتة جاهلية“ جس نے خلیفہ کی اطاعت سے ہاتھ کھینچا، یعنی  
اطاعت نہ کی، تو قیامت کے دن وہ اللہ کے سامنے حاضر ہوگا اور اسے لیے  
کوئی بچاؤ نہ ہوگا۔ اور جو مسلمان دنیا سے اس حال میں گیا کہ خلیفہ کی  
بیعت و اطاعت کے حلقہ سے اسکی گردن خالی ہوئی، تو یقین کر رکھو  
اسکی موت جاہلیہ کی موت ہوئی۔

تو اُسکا اطلاق عموماً حکومت و سلطنت ہی کے معنوں پر ہوتا ہے۔ احادیث میں یہ استعمال اس کثرت سے موجود ہے کہ ایک صاحب نظر کیلئے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔ نیز لغت کی بنا پر بھی ظاہر ہے کہ ”امر“ کے معنی حکم کے ہیں، اور ”اولی الامر“ کے معنی امام بخاری نے ”ذری الامر“ کے کیے ہیں۔ یعنی ”حکم والا“ اور معلوم ہے کہ صاحب حکم رہی ہو سکتا ہے جو صاحب حکومت ہو۔

ثالثاً، احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ خود یہ آیت جس واقعہ کی نسبت آتری، وہ امیر جماعت کی اطاعت ہی کا معاملہ تھا۔ بخاری و مسلم میں ہے ”عن ابن عباس نزلت فی عبد اللہ بن حذافہ بن قیس ابن عدی اذ بعثہ النبی صلعم فی سرية“ اور امام طبری نے تفسیر میں ایک روایت درج کی ہے کہ عمار بن یاسر اور خالد بن ولید کی باہمی نزاع کے بارے میں آتری۔ خالد امیر تھے اور عمار نے بلا اُنکے حکم کے ایک شخص کو مزدوری پر رکھا لیا تھا ”نزلت فی قصة جرت اعمار مع خالد رکن خالد امیراً فاجار عمار رجلاً بغير امره فتخاصما“ دونوں روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ معاملہ امیر کی اطاعت و عدم اطاعت کا تھا، نہ کہ احکام و مسائل کے حکم و افتاء کا۔

رابعاً، اکثر اقوال مرویہ صحابہ و تابعین سے بھی یہی تفسیر ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ صدر اول میں صرف یہی تفسیر مشہور و معلوم تھی۔ بہت سی موشگافیاں جو پیدا کی گئی ہیں، سب بعد کے مفسرین کی طبع زاد ہیں۔ حافظ ابن حجر نے ابن عیینہ کا قول نقل کیا ہے ”سألت زید بن اسلم عنها و لم یکن بالمدينة احد یفسر القرآن بعد محمد بن کعب مثله۔ فقال اقرأ ما قبلها تعرف۔ فقرأت: ان الله یامران تؤدرا الامانات الی اهلها و اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔ فقال هذه فی الولاة“ (فتح ۱۳: ۹۹) یعنی مدینہ میں محمد بن کعب کے بعد زید بن اسلم سے بڑھکر قرآن کا کوئی مفسر نہ تھا۔ میں نے اسے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔ اس آیت سے ما قبل آیت پڑھو۔ میں نے پڑھا ”ان الله یامران تؤدرا الامانات الی اهلها و اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل“ پس کہا کہ مقصود اس سے حکام ہیں۔ یعنی چونکہ پہلے سے ذکر حکومت و قضا کا ہو رہا ہے، پس اولو الامر سے مقصود وہی ارباب اقتدار ہیں جو حکومت رکھتے ہوں۔ طبری نے بسند صحیح حضرت ابو ہریرہ اور میمون بن مہران وغیرہ سے

یہاں ایک اور اہم اور قابل غور امر یہ بھی ہے کہ اس حدیث اور نیز دیگر احادیث میں ہمیشہ جماعت اور اطاعت خلیفہ کی زندگی کو اسلامی زندگی قرار دیا ہے اور اسکے عکس کو جاہلیۃ - جاہلیۃ کی زندگی میں ہلاکت کا اصلی تخم کیا تھا ؟ قرآن نے واضح کیا ہے کہ تفرقہ اور باہم دگر علحدگی ، اور کسی ایک مرکزی قوت کے ماتحت نہ ہونا - اسلام نے ظاہر ہو کر زندگی کی جو تخم ریزی کی ، وہ کیا تھی ؟ باہمی اتحاد و ائتلاف - تمام افراد کو ایک متحدہ جماعت بنا کر نفس واحدہ کر دیا اور سب کے سر ایک ہی چوکھٹ پر جھکا دیے - و اذکرا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء ، فالف یٰدین قلوبکم ، فاصبحتم بنعمۃ اخوانا - و کنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها ” الخ -

پس جاہلیۃ کا دوسرا نام تفرقہ ہوا ، اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت - یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی ، اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعت امام سے الگ ہو گیا تو گویا جماعت اسلام سے خارج ہو گیا - اسکی موت اسلام پر نہیں بلکہ جاہلیۃ پر ہوئی - اگرچہ نماز پڑھتا ہو ، روزہ رکھتا ہو ، اور اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو -

جمہور اہل اسلام کا یہ ایک ایسا متفقہ عقیدہ ہے کہ اسکو اسلامی عقیدہ ثابت کرنے کی کوشش ایسی ہی کوشش ہوگی جیسی عقیدہ توحید کے اثبات کی کوشش - جمہور اہل اسلام نے خوارج کے خلاف ابتدا سے جس چیز پر اجماع کیا ، اور انکی سب سے بڑی علامت قرار پائی ، وہ یہی التزام جماعت و اطاعت امام فی المعروف کا مسئلہ ہے - اگرچہ غیر مستحق خلافت مسلط ہو گیا ہو - البتہ اطاعت فیما رافق الشرع میں ہے - لا فی ما خالفہ -

” من اطاعنی فقد اطاع اللہ “ و من اطاع امیری فقد اطاعنی ، و من عصی امیری فقد عصانی “ ( صحیحین عن ابی ہریرہ ) جس نے میری اطاعت کی ، اُس نے اللہ کی اطاعت کی ، اور جس نے میرے امیر کی ( یعنی میرے نائب کی ) اطاعت کی ، اُس نے خود میری اطاعت کی ، اور جس نے امیر سے روگردانی کی ، اس نے میری اطاعت سے انکار کیا - حاصل یہ کہ امیر المومنین کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے - مسلم کی ایک روایت میں ” امیری “ کی جگہ صرف ” الامیر “ ہے - یعنی جو شخص مسلمانوں کا امام ہو اُسکی اطاعت -

سے وسیع میدان دھونڈتے ہیں اور ہر ممکن مفہوم کو بحث و نظر کی ورزش کیلئے اختیار کر لینا چاہتے ہیں۔ پس متاخرین کے اختلافات سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ صرف اسی تفسیر کو اختیار کرنا چاہیے جو حدیث و آثار سے ماخوذ ہو، اور لغۃ و عربیۃ اسکی تصدیق کرے۔ متاخرین کی کارشیں دراصل ایک طرح کا منطقی تفنن ہے جس سے دماغ کو ورزش ملتی اور ذہن میں حدت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن تفسیر قرآن نہیں ہے۔ قرآن کی تفسیر صرف وہی ہوسکتی ہے جو خود حامل قرآن کے علوم سے ماخوذ ہو، اور ان لوگوں نے بتلائی ہو جنکے علم و عمل پر خود اللہ نے اپنی رضا و پسندیدگی کی شہادت دی ہے: رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ! اگر سلف سے اعراض و انکار اس بنا پر ہے کہ اصول فقہ و علم کلام کی یونانی دقیقہ سنجیوں سے نا آشنا تھے، تو کم از کم قرآن کا علم تو انکے لیے چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ قرآن نازل تو ہوا ہو محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر، لیکن اُسکے معانی و مطالب اُس وقت تک مسلمانوں کو معلوم نہوں جب تک ارسطو یونانی اُنکی رہنمائی نہ کرے؟

امام رازی (رح) وغیرہ کو زیادہ حیرانی اس بنا پر ہوئی ہے کہ اولو الامر کی اطاعت کا ذکر بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ کیا گیا ہے، اور عطف تسویہ پیدا کر رہا ہے، پس اولو الامر ایسا ہونا چاہیے جسکی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہو، سلاطین و امراء کو یہ منصب کیونکر حاصل ہوسکتا ہے؟ حالانکہ بات بالکل صاف تھی۔ حیرانی کی کوئی وجہ نہیں۔ قرآن و سنت قانون ہے، لیکن قانون بالکل بیکار ہے اگر کوئی قوت نافذ نہ ہو۔ یعنی اس قانون پر عمل کرانے والی قوت، اور ظاہر ہے کہ جو قوت نافذ ہوگی، اسکی اطاعت عین قوت مقننہ کی اطاعت ہوگی۔ ایک دھقانی تک جانتا ہے کہ گورنر اور نائب السلطنت کی اطاعت عین پادشاہ کی اطاعت ہے۔ بلکہ ایک سپاہی کی اطاعت بھی عین قانون اور پادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اور اس سے مقابلہ کرنا عین قانون اور پادشاہ سے بغاوت کرنا۔ یہ ساری بحثیں اسلیے پیدا ہو گئیں کہ اسلام کے جماعتی نظام کی اہمیت پر نظر نہ ڈالی گئی۔ اگر یہ حقیقت پیش نظر ہوتی کہ شریعت کے نفاذ اور امت کے قوام و نظام کیلئے ایک مرکزی اقتدار ناگزیر ہے اور وہی امام اور اُسکے نائب امراء ہیں، تو اولی الامر کا مطلب بالکل صاف تھا۔ کسی کارش و بحث کی ضرورت ہی نہ تھی۔

نے کیا۔ خلیفہ چہارم کے ہاتھ پر خود تمام جماعت نے بیعت کی۔ نسل خاندان 'ولی عہدی' کو اسمیں کوئی دخل نہ تھا۔ اگر دخل ہوتا تو ظاہر ہے کہ خلافت خلیفہ اول کے خاندان میں آجاتی، یا درم و سوم کے خاندان میں حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ خلیفہ درم نے یہ بات بھی گوارا نہ کی کہ انکا فرزند اصحاب شوری میں شامل ہو۔

پس پہلی صورت یہ ہے کہ اگر صحیح نظام شرعی قائم ہو جو خالص جمہوری ہے، اور قوم کو اپنا خلیفہ منتخب کرنے کا موقعہ ملے، تو کیسا شخص منتخب کرنا چاہیے؟ اور اسمیں کیا کیا اوصاف ہونا چاہیئیں؟

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر یہ نظام باقی نہ رہا ہو۔ قوم کی رائے اور انتخاب کو اسمیں دخل نہ ہو۔ محض طاقت اور تسلط کی بنا پر کوئی خاندان یا کوئی ایک طاقتور فرد تخت خلافت پر قابض ہو جائے، تو اس صورت میں از روئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اگر وہ اہل نہیں ہے، شرائط خلافت اسمیں نہیں پائے جاتے۔ یا ظالم و جابر ہے، تو اس صورت میں کیا طرز عمل اختیار کیا جائے؟ اسکی اطاعت کرنی چاہیے؟ یا اس پر خرچ کرنا چاہیے؟ وہ شرعاً خلیفۃ المسلمین ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے ماتحت وہ تمام کام انجام پاسکتے ہیں یا نہیں جو از روئے شرع خلیفہ اسلام کی موجودگی پر موقوف ہیں؟ اسکو زکوٰۃ دینی چاہیے؟ اس کے پیچھے جمعہ پڑھنا چاہیے؟ اس کے تمام احکام کی اطاعت کرنی چاہیے؟

یہ مسئلہ امت کی اجتماعی زندگی کا بنیادی مسئلہ تھا، اور ممکن نہ تھا کہ شریعت اسکی پوری پوری تشریح و توضیح سے خاموش رہتی۔ اس بارے میں نصوص سنہ بے شمار اور بالکل واضح ہیں۔ اسی لیے جب خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کی حکومت ظلم و جبر کے ساتھ قائم ہوئی، تو صحابہ کرام کو اپنے طرز عمل کے فیصلے میں ذرا بھی تامل و تذبذب نہ ہوا۔ بالکل اس شخص کی طرح جو اپنے سے ایک خاص وقت کا سمجھا ہوجھا ہوا منتظر ہو، فوراً یکسوئی کے ساتھ فیصلہ کر لیا۔ جو کچھ انہوں نے بتلایا اور کیا، اسی پر اجماع امت کی مہر لگ گئی، اور تیرہ سو برس سے جمہور اہل اسلام کا وہی متفقہ اعتقاد و عمل قرار پایا۔ بلاشبہ پہلی صورت میں بعض اسلامی فرقوں کو اختلاف ہوا، مگر اس بارے میں سب متفق ہو گئے۔



خامساً، تاریخ اسلام کے سب سے بڑے فقیہ یعنی امام بخاری کا بھی مذہب یہی ہے۔ کتاب الاحکام میں باب باندھا ہے ”اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولي الامر منكم“ اور اس میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت درج کی ہے ”من اطاع اميري فقد اطاعني“ الخ جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے خود میری اطاعت کی۔ جس نے اُس سے انکار کیا اُس نے خود مجھ سے انکار کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اُن کے نزدیک اولی الامر کی اطاعت سے مقصود امیر و امام ہی کی اطاعت ہے۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں ”في هذا إشارة من المصنف الى ترجيح القول الصائر الى أن الآية نزلت في طاعة الامراء“ خلافاً لمن قال نزلت في العلماء“ (فتح ۱۳ : ۹۹)

سادساً، سب سے زیادہ قدیم اور مکمل تفسیر جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے، وہ امام ابن جریر طبری کی تفسیر ہے، اور صحابہ و تابعین کی تفاسیر پر اُنکا احاطہ و نظر معلوم، انہوں نے بھی تمام اقوال نقل کر کے ترجیح اسی تفسیر کو دی ہے۔

سابعاً، اس نکتہ پر نظر رہنی چاہیے کہ تفسیر قرآن کے معاملہ میں جس قدر اختلافات کی کثرت اور مذاہب و طرق کا تعدد و تنوع نظر آتا ہے، وہ تمام تر متاخرین کی فلسفیانہ کارش پسندی کا نتیجہ ہے جبکہ معقولات کے شیوع اور یونانیہ کے غلبہ و احاطہ سے علوم دینیہ میں اُس ”تعمق“ کی بنیادیں پوری طرح پڑ چکی تھیں جسکی نسبت کہا گیا تھا کہ ”هلك المتعمقون“۔ فکر و نظر میں عجمیہ کے ظہور، عربیہ خالصہ و صالحہ کے بعد، اور علوم سنۃ کے ترک و ہجر نے اس معاملہ کو اور زیادہ گہرا اور وسیع کر دیا۔ لیکن اراٹل و سلف میں یہ تمام اختلافات یکقلم ناپید تھے۔ ہر آیت اور ہر لفظ کے ایک ہی صاف اور سادہ معنی تھے جو عربی لغت و محاورہ میں ہوسکتے ہیں اور لوگ اُس پر قانع تھے۔ ابداع معانی کثیرہ اور تفحص اشارات و مفہومات بعیدہ کی کارش ہی نہیں کی جاتی تھی۔ نہ فرضی و تخمینی شکوک و ایرادات گرہ کر نئے نئے معانی فرض کیے جاتے تھے۔ ”اولو الامر“ کا لفظ جب کبھی ایک ایسے عرب کے سامنے کہا جائیگا جسکی عربیہ خالص و صحیح ہو، تو صرف ایک ہی معنی اُس کے ذہن میں آئینگے۔ یعنی صاحب حکومت۔ کسی دوسرے مفہوم کا اسے رھم بھی نہیں گزرے گا۔ صحابہ و تابعین اس پر قانع تھے۔ لیکن امام رازی کی دقیقہ سنجی اس سہل پسندی اور لغوی سادگی پر قانع نہیں ہوسکتی۔ اس لیے وہ امکانی مطالب کا وسیع

” من فارق الجماعة شبرا فکانما خلع ربة الاسلام من عنقه “ ( ترمذی )  
 جو جماعت سے باہر ہوا تو گویا وہ اسلام کی پابندی سے باہر ہو گیا۔ ایک  
 روایت میں ہے ” دخل النار “ ( اخرجہ الحاکم علی شرط الصحیحین )  
 یعنی جو خلیفہ کی اطاعت سے باہر ہوا، اُسکا ٹھکانا درزخ ہے۔

” کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبیاء - کما هلك نبي - خلفه نبي -  
 و انه لا نبي بعدي - و سيكون خلفاء فيکثرون - قالوا - فما نأمرنا ؟ قال -  
 فوا بیعة الاول فالاول “ ثم اعطوهم حقهم فان الله سائلهم عما استرعاهم ( متفق  
 علیہ ) بنی اسرائیل کی رہنمائی و ریاست انبیاء کرتے تھے۔ ایک نبی گیا تو  
 دوسرا اُسکی جگہ مامور ہوا۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ البتہ  
 خلفاء ہونگے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ ہم کو اُنکی نسبت کیا حکم ہوتا  
 ہے ؟ فرمایا۔ جس سے پہلے بیعت کی یعنی جس کی حکومت پہلے مان لی  
 گئی، اُسکی اطاعت مقدم ہے۔ پھر کسی دوسرے کو خلیفہ نہ مانو۔ اور  
 فرمایا۔ اُنکا تم پر جو کچھ حق ہے، وہ اُنکے حوالے کر دو۔ یعنی اُنکی طاعت کر دو۔  
 زکوٰۃ و خراج وغیرہ اُنہی کو دو۔

انکے علاوہ بے شمار احادیث ہیں۔ اجماع کے شواہد اور کتب عقائد  
 و فقہ کے اقوال نقل نہیں کرتا کہ مشہور و معروف ہیں، اور احادیث کے  
 بعد اُنکی ضرورت نہیں۔

( شرائط امامت و خلافت )

تمام نصوص و دلائل کتاب و سنت اور اجماع ائمہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا  
 ہے کہ شریعت نے شرائط امامت و خلافت کے بارے میں دو صورتیں اختیار کی  
 ہیں۔ اور قدرتی طور پر یہی دو صورتیں اس مسئلہ کی ہوسکتی تھیں۔  
 اسلام نے اس بارے میں نظام عمل یہ مقرر کیا تھا کہ امام کے انتخاب  
 کا حق امت کو ہے۔ اور طریق انتخاب جمہوری تھا نہ کہ شخصی  
 و نسلی۔ یعنی قوم اور قوم کی اصحاب الرائے جماعت ( اہل حل و عقد )  
 کو شرائط و مقاصد خلافت کے مطابق اپنا خلیفہ منتخب کرنا چاہیے۔ بحکم  
 و امرہم شوری بینہم بنیاد تمام امور کی شرعاً شوری یعنی باہمی مشورہ ہے۔  
 نہ کہ نسل و خاندان۔ خلافت راشدہ کا عمل اسی نظام پر تھا۔ خلیفہ اول کا  
 انتخاب عام جماعت میں ہوا۔ خلیفہ دوم کو خلیفہ اول نے نامزد کیا اور  
 اہل حل و عقد نے منظور کر لیا۔ خلیفہ سوم کا انتخاب جماعت شوری

غرضکہ اس ایتہ کریمہ میں قرآن نے اس قانون شریعت کا اعلان کیا ہے کہ خلیفہ و امام کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہے، اور اسی کا وجود نظام جماعت کا مرکزی اقتدار ہے۔

## فصل

( شرح حدیث حارث اشعری )

احادیث صحیحہ سے اسکی مزید توضیح ہوتی ہے۔ اس بارہ میں اس کثرت کے ساتھ حدیثیں موجود ہیں، اور عہد صحابہ سے لیکر عہد تدوین کتب تک مختلف طبقات روات و حفاظ میں اسقدر آنکی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدہ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی اور چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہوگی۔

سب سے پہلے میں مسند امام احمد وغیرہ کی ایک روایت نقل کرونگا جس میں بالترتیب اسلام کا نظام عمل بیان کیا گیا ہے :

قال صلی اللہ علیہ وسلم : ” انا امرکم بخمس ، اللہ امرنی بہن : الجماعة ، و السمع ، و الطاعة ، و الهجرة ، و الجہاد فی سبیل اللہ - فانہ من خرج من الجماعة قید شبر ، فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه الا ان یراجع ، و من دعا بدعوی جاہلیة فہو من جثی جہنم - قالوا یا رسول اللہ و ان صام و صلی ؟ قال و ان صلی و صام و زعم انه مسلم ” اخرجه احمد و العاکم من حدیث ” الحارث الاشعری علی شرط الصحیحین - قال ابن کثیر هذا حدیث حسن و لہ الشواہد -

یعنی فرمایا - میں تم کو پانچ باتوں کیلئے حکم دیتا ہوں جنکا حکم اللہ نے دیا ہے - جماعت ، سمع ، طاعة ، ہجرت ، اور اللہ کی راہ میں جہاد - یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا ، اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیہ کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اسکا ٹھکانا جہنم ہے - لوگوں نے عرض کیا - کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو ؟ فرمایا ہاں - اگرچہ روزہ رکھتا ہو ، نماز پڑھتا ہو ، اور اپنے زعم میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو -

اسی طرح جماعت امامیہ اس طرف گئی کہ خلافت خاندان نبوت یعنی بنی فاطمہ کے مخصوص ائمہ اہل بیت میں رہنی چاہیے۔ انکے اعتقاد میں آنحضرت صلعم کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ ہونا چاہیے تھا۔ اور انکے بعد انکی نسل کے ائمہ عترتہ رضی اللہ عنہم کو۔

زیدیہ اسطرف گئے کہ بنی فاطمہ یعنی تمام سادات مستحق خلافت ہیں۔ ائمہ عترتہ کی خصوصیت ضروری نہیں۔ اور شرطوں کے ساتھ صرف اسقدر کافی ہے کہ امام سید یعنی بنی فاطمہ میں سے ہو۔

لیکن دوسری صورت (یعنی اگر نظام شرعی کی جگہ ملکی قبضہ و تسلط کی صورت پیدا ہو جائے، اور جمہور کو انتخاب و نصب کا موقع نہ ملے، تو اس صورت میں از روئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟) سو اسکی نسبت چونکہ خود احادیث صحیحہ اور اجماع صحابہ و عترتہ بالکل صاف صاف موجود تھا، اسلیے بلا اختلاف یہ اسلامی اعتقاد قرار پایا کہ جب ایک مسلمان منصب خلافت پر قابض ہو جائے اور اسکی حکومت جم جائے، تو ہر مسلمان پر از روئے شرع واجب ہے کہ اسی کو خلیفہ اسلام تسلیم کرے۔ اسی کے سامنے گردن اطاعت جھکا دے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک اہل و مستحق خلیفہ کے آگے جھکنا چاہیے۔ اطاعت و اعانت کی وہ تمام باتیں جو منصب خلافت کے شرعی حقوق میں سے ہیں، ایسے خلیفہ کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس سے روگردانی کسی مسلمان کیلیے جائز نہیں۔ اس کے مقابلے میں خرچ اور دعوے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا اگرچہ کیسا ہی افضل اور جامع الشروط ہو۔ جو کوئی ایسا کرے، مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس کے مقابلے اور قتل میں خلیفہ کا ساتھ دیں۔ وہ شرعاً باغی ہے۔ اسکو قتل کر دینا چاہیے۔

شریعت نے دوسری صورت میں یہ حکم کیوں دیا؟ اسکی علت و مصلحت اسقدر کھلی ہے کہ شرح و تفصیل کی حاجت نہیں۔ شریعت اور امت کا قائم و باقی رہنا خلافت کے وجود و قیام پر موقوف تھا۔ ساری باتیں شاخ ہیں۔ جز یہی مقام و منصب ہے۔ پس اس کے لیے ایک نظام شرعی مقرر کیا گیا جو بہتر سے بہتر اور افضل و عادل نظام ہو سکتا تھا۔ یعنی اسلامی حکومت کی بنیاد جمہور اور شوری کے انتخاب پر رکھی۔ شخص، نسل، تسلط و اقتدار، اور پادشاہی و ملوکی کو اسمیں دخل نہیں۔ ساتھ ہی اس منصب کی اہلیت کیلئے تمام ضروری شرطیں اور صفتیں

” فان تنازعتم ” الخ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اسلامی خلیفہ کا وجود مسیحیت کے پوپ سے کس درجہ مختلف ہے جو اسلام کے نزدیک اربابا من دون اللہ میں داخل ہے ۔ مسیحیت کا خلیفہ ، ارضی خلیفہ نہیں ہے ۔ آسمانی و دینی فرمانروا ہے جو مذہب کی آخری طاقت اپنے قبضہ میں رکھتا ہے ۔ لیکن اسلامی خلافت کی اصلی بنا خلافت ارضی یعنی حکومت و سلطنت ہے ۔ وہ صرف شریعت اور امت کی حفاظت کرنے والا اور احکام شریعت نافذ کرنے والا ہے ۔ یعنی محض ایک قوت نافذہ ہے ۔ نہ کہ مقننہ ۔ اسکی ذات کو اصل شریعت اور اسکے احکام میں کوئی دخل نہیں ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فرودہ الی اللہ و الرسول نہ فرمایا جاتا۔ یعنی اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے جس میں نزاع و اختلاف پیدا ہو ، تو پھر اسکے آخری فیصلہ کی قوت خلیفہ کا حکم نہیں ہے بلکہ مرکز اولی و حقیقی کا ۔ یعنی قرآن و سنت کا ۔ اور خود خلیفہ بھی اسکی اطاعت پر اسی طرح مجبور ہے جس طرح جماعت امت کا ہر عام فرد ۔

یہی وجہ ہے کہ ” اطیعوا اللہ ” کے بعد پھر اطیعوا الرسول ” میں فعل کا اعادہ کیا گیا مگر ” اولی الامر ” میں نہیں کیا گیا ۔ تاکہ واضح ہو جائے کہ اصل اطاعت جو مطلوب ہے وہ اللہ کی ہے اور رسول کی ہے ۔ یعنی کتاب و سنت کی ، اور اولو الامر کی اطاعت صرف اسلیئے ہے تاکہ کتاب و سنت کی اطاعت کی جائے ۔ بالاستقلال نہیں ہے ۔ پھر ” فان تنازعتم ” کہہ کر آر زیادہ واضح کر دیا کہ اگر اولو الامر کتاب و سنت کے خلاف حکم دے تو پھر اُس حکم میں انکی اطاعت نہیں ہے ۔ اللہ اور اسکے رسول ہی کے حکم کی طرف لوٹنا چاہیے ۔ قالہ الطیبی فی الشرح ۔

بعض امراء بذوامیہ نے اپنے مظالم و بدعات کی اطاعت کرانے کیلئے جب اس آیت سے استدلال کیا اور کہا ” الیس اللہ امرکم ان تطیعونا فی قولہ و اولی الامر منکم ” ؟ کیا خدا نے تم لوگوں کو ہماری اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے کہ و اولی الامر منکم ؟ تو بعض ائمہؑ تا بعین نے کیا خوب جواب دیا ” الیس قد نزعتم عنکم بقولہ فان تنازعتم ” ؟ ہاں ، مگر پھر اس منصب سے تم محروم بھی تو کر دیے گئے جب فرمایا کہ فان تنازعتم فی شی فرودہ الی اللہ و الرسول ۔



پہلی صورت میں شریعت نے اہلیت و صلاحیت کے رہ تمام شرائط اچھے انتہائی اور کامل مرتبہ میں قرار دیے ہیں جو ایک ایسے مرکزی اور اہم ترین منصب کیلئے قدرتی طور پر ہونا چاہیئیں۔ کیا باعتبار قوت علمی کے۔ اور کیا بہ لحاظ قوت عملی کے۔ اور چونکہ یہ منصب متعدد حیثیتوں سے مرکب ہے، اسلئے ہر حیثیت کے لحاظ سے ضروری اوصاف بتلائے گئے۔ مثلاً اسلام، علم و نظر، عمل و تقویٰ، شجاعت و صولۃ، عدالت و ایثار، قدرت و نفوذ، طاقت و شوکت۔ چنانچہ عام کتب عقائد میں صدیوں سے مسلمان پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں: ”ویشترط ان یکون من اهل الولاية المطلقة الكاملة بان یکون مسلماً، حراً، ذکراً، عاقلاً، بالغاً، سائساً بقوۃ رائہ و رویتہ، و معونۃ باسہ و شوکتہ، قادراً بعلمہ و عدالتہ و کفایتہ و شجاعتہ علی تنفيذ الاحکام، و حفظ حدود الاسلام، و انصاف المظلوم من الظالم عند حدوث المظالم“ الخ۔ (۱) کذا فی شرح المواقف، و الذسفی، و التمهید، و شرح فقہ الاکبر للقاری، و شرح المقاصد۔ و من کتب المحدثین شرح عقیدہ ابن عقیل، و فتح الباری، و شرح منظومۃ الاداب، و خلاصہ ابن مفلح، و نیل الارطار، و بل المرام للشوکانی، وغیرہم۔

جس وقت تک خاندان عباسیہ کی خلافت باقی رہی، یعنی خلافت خاندان قریش و عرب میں رہی (سنہ ۶۴۰ھ مطابق سنہ ۱۲۴۳ع۔ تک) علماء اسلام کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال رہا کہ بہ موجب حدیث ”ان هذا الامر فی قریش“ خلیفہ کو قرشی ہونا چاہیے۔ یعنی اگر مسلمان خلیفہ مقرر کریں، تو جہاں آدر بہت سی باتیں اسمیں ہونا چاہیئیں، وہاں یہ بات بھی ہو کہ خاندان قریش میں سے ہو۔ ✓

(۱) یعنی ایسے شخص کو خلیفہ منتخب کرنا چاہیے جس میں حسب ذیل اوصاف پائے جائیں۔ مسلمان ہو، آزاد ہو، مرد ہو، عاقل و بالغ ہو، صاحب رائے و نظر ہو، تدبیر و انتظام کی پوری قوت رکھتا ہو، احکام شریعت کا محافظ ہو، انکے جاری و نافذ کرنے اور اسلامی ممالک کی حفاظت اور دشمنوں کی روک تھام کیلئے جسقدر علمی و عملی قوتوں کی ضرورت ہے، وہ سب اُس میں موجود ہوں۔ اتباع شریعت، عدل و انصاف، شجاعت و ہمت، شوکت و صولت، ساری صفتیں ہونی چاہیئیں۔

ملاؤ، لیکن تیل اور پانی کی طرح ہمیشہ الگ الگ ہی نظر آئیں، باہم ملکر ایک جان نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عناصر کو اسلیے پیدا کیا ہے کہ باہم دیگر ملکر ایک نئے مرکب وجود میں متشکل ہوں، اسی طرح افراد انسانی کو بھی اسلیے پیدا کیا تاکہ انکے باہم ملنے سے جماعت پیدا ہو۔ ”جماعت“ ایک مرکب وجود ہے۔ افراد اسکے عناصر ہیں۔ فرد بجائے خود کوئی کامل وجود نہیں رکھتا۔ محض ایک مثنیٰ ہے، اور جب تک اپنے بقیہ تکرروں سے مل نہ جائے کامل وجود نہیں پاسکتا۔ لیکن یہ باہم ملنا ”امتزاج“ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ تاکہ ہر تکررہ اپنے صحیح و مناسب تکررہ کے ساتھ ملکر اس طرح جوڑ جائے کہ معلوم ہو، یہ نگینہ اسی انگشتی کے لیے تھا!

”نظم“ سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی و تقویمی حالت ہے جب اسکے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم، اپنے اپنے دائرہ میں محدود، اور اپنے اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

اجتماع کے یہ خواص و اوصاف نہ تو حاصل ہوسکتے ہیں، نہ قائم رہ سکتے ہیں، جب تک کوئی بالا تر فعال و مدبر طاقت وجود میں نہ آئے، اور وہ منتشر افراد کو ایک متحد، مؤتلف، ممزوج، اور منظم جماعت کی شکل میں قائم نہ رکھے۔ پس ایک ”امام“ کا وجود ناگزیر ہوا، اور اسی لیے ضروری ہوا کہ سب سے پہلے تمام افراد ایک ایسے وجود کو اپنا امام و مطاع تسلیم کر لیں جو بکھرے ہوئے اجزاء کو اتحاد و ائتلاف اور امتزاج و نظم کے ساتھ جوڑ دینے اور آرتے ہوئے ذروں سے ایک حی و قائم جماعتی وجود پیدا کردینے کی قابلیت رکھتا ہو۔ اصل مرکز اس طاقت کا امام اعظم یعنی خلیفہ ہے۔ اور پھر ہر ملک، ہر آبادی، ہر گروہ میں اسکے ماتحت امام جماعت ہونے چاہئیں۔ مسلمانوں کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گروہ کیلیے بھی شرعاً جائز نہیں کہ بلا قیام امام کے زندگی بسر کریں۔ حتیٰ کہ اگر صرف تین مسلمان بھی ہوں، تو چاہیے کہ ایک ان میں سے امام تسلیم کر لیا جائے۔ ”اذا کان ثلاثۃ فی سفر، فلیؤمر احدثہم“

پانچ وقت کی جماعت نماز میں جماعتی نظام کا پورا پورا نمونہ مسلمانوں کو دکھلا دیا گیا۔ کیونکہ نماز ہی وہ عمل عظیم ہے جو اسلام کے تمام عقائد و اعمال کا جامع ترین نمونہ ہے۔ کس طرح سیکڑوں ہزاروں منتشر افراد مختلف مقاموں، مختلف جہتوں، مختلف شکلوں، اور مختلف

ابو موسیٰ کی روایت لائے ہیں جس میں آپ نے فرمایا : ” انا لا نولی هذا من سألہ “ و لا من حرص علیہ “ جو شخص خود اس چیز کا طالب ہو یا اسکی حرص رکھتا ہو اسکو میں یہ کام سپرد نہ کرونگا - یعنی امت کو اپنا عملی نمونہ دکھلا دیا کہ جو دعویٰ دار خود خلافت کا سائل و حرص ہو اسکو خلافت کیلئے منتخب نہ کرو -

مسئلۂ خلافت کا اصلی نظام شرعی یہ ہے - اگر یہ قائم ہو تو دنیا امن و سکون کی بہشت بن جائے - لیکن چونکہ معلوم تھا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا - یہ نظام تیس برس سے زیادہ قائم رہنے والا نہیں اسلئے شرع

[ بقیہ برت صفحہ ۳۶ ]

بالحکمة “ افسوس اس باب کے ربط و ترتیب کی اصلی علت لوگ نہ سمجھے - منصب خلافت کے اثبات کے بعد یہ چیز سامنے آنی تھی کہ اعمال خلافت کی بنیاد کیا ہے ؟ اور اسکا طریق کس منہاج سے ماخوذ ہے ؟ امام صاحب واضح کرنا چاہتے ہیں کہ بنیاد اُسکی طریق ” حکمت “ پر ہے - یعنی انبیاء کرام کے طریق تربیت امم پر جو ” سنت “ کا اصلی اور وسیع مفہوم ہے اور قرآن حکیم کی اصطلاح میں ” حکمت “ سنۃ نبوة ہی کا دوسرا نام ہے - ترجمۂ باب میں اس پر قرآن سے دلیل بھی لائے : و من لم یحکم بما انزل اللہ فارلائک ہم الفاسقون - حکم و قضا ” ما انزل اللہ “ کے مطابق ہونا چاہیے - اگر خلاف ہو تو فسق ہے - ” ما انزل اللہ “ کتاب و سنۃ ہے : و یعلمهم الکتاب والحکمة - پس ثابت ہوا کہ اعمال خلافت کی بنیاد حکمت و منہاج نبوة پر ہونی چاہیے - اس بارے میں جو زیادہ واضح و مفصل احادیث تھیں ” چونکہ انکی شرط کے مطابق نہیں لی جاسکتی تھیں “ اور بنیاد استدلال کی صرف مرفوع ہی پر رکھتے ہیں اسلئے آثار و موقوفات بھی نہیں لے سکتے تھے پس مشہور حدیث ” لا حسد الا فی الفتن “ الخ درج کر کے قضاء بالحکمة کی اہمیت و مطلوبیت واضح کر دی - جب یہ مقدمات طے ہو چکے تو اب دکھلانا تھا کہ اس مرکز کی اطاعت کس طرح امت پر فرض کر دی گئی ہے ؟ پس باب باندھا ” السمع و الطاعة للامام ما لم تکن معصية “ امت کا سننا اور اطاعت کرنا امام کے حقوق میں سے ہے - بجز اس حکم کے کہ معصیت ہو - اسمیں وہ تمام حدیثیں لائے ہیں جن میں صریح حکم موجود ہے کہ خلیفہ اہل ہو یا نا اہل جامع الشرط ہو یا فاقہ

اس حدیث میں پانچ باتیں بتلائی ہیں :

(۱) پہلی چیز ”جماعت“ ہے - یعنی تمام اُمت کو ایک خلیفہ و امام پر جمع ہو کر اور اپنے مرکز قومی سے جڑ کے رہنا چاہیے۔ الگ الگ نہیں رہنا چاہیے۔ آگے چل کر کثرت کے ساتھ وہ حدیثیں ملیں گی جن سے معلوم ہوگا کہ جماعت سے الگ ہو کر رہنے کو یا ایسی منتشر زندگی کو جو ایک بندھی اور سمٹی ہوئی جماعت کی شکل نہ رکھتی ہو اور کسی امیر کے تابع نہ ہو، اسلام نے غیر اسلامی اور ابلیسی راہ قرار دیا ہے۔ انفرادی زندگی کو وہ زندگی ہی نہیں مانتا۔ اسلامی زندگی ”جماعت“ ہے۔

”جماعت“ سے مقصود افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد، ائتلاف، امتزاج، اور نظم ہو۔

”اتحاد“ سے مقصود یہ ہے کہ اپنے اعمال حیات میں منتشر نہوں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور ان کے تمام اعمال مل جل کر انجام پائیں۔ کسی گوشہ عمل میں بھی پھرت اور بیگانگی نہ ہو۔

”ائتلاف“ کا مرتبہ ”اتحاد“ سے بلند تر ہے۔ ”اتحاد“ صرف باہم مل جانا ہے۔ ضرور نہیں کہ کسی تناسب کے ساتھ ترکیب ہوئی ہو۔ لیکن ”ائتلاف“ سے مقصود ایسا اتحاد ہے جو محض اتحاد ہی نہ ہو بلکہ ایک صحیح و مناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو۔ یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ جس فرد کو اس کی صلاحیت و قوت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہیے، وہی جگہ اُسے ملی ہو۔ اور ہر فرد کی انفرادی قوت کو جماعتی ترکیب میں اتنا ہی دخل دیا جائے، جتنی مقدار میں دخل پانے کی اسمیں استعداد ہو۔ ایسا نہو کہ زید کو سردار ہونا چاہیے اور اس سے چاکری کا کام لیا جائے، اور عمرو کی قابلیت کا عنصر صرف چھٹانک بھر جزو جماعت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسکو سیر بھر قرار دیدیا جائے۔

”امتزاج“ ترکیب کا تیسرا مرتبہ ہے۔ اسمیں کمیت سے زیادہ کیفیت کا اتحاد ہونا چاہیے۔ یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماعی مزاج جس قسم کے مزاج کے ساتھ مل کر ایک متحدہ کیفیت حاصل کر سکتا ہے، ویسا ہی مزاج اس کے ساتھ ملایا جائے۔ یہ نہو کہ دو ایسے آدمیوں کو ملا دیا گیا جنکی طبیعت و خصلت اور استعداد و صلاحیت باہم دگر میل نہیں کھا سکتی اور اسلیئے خواہ کتنا ہی دونوں کو

بتلا دیں کہ اپنا خلیفہ بناؤ تو ایسے شخص کو بناؤ۔ ایسے کو نہ بناؤ جو اُسکی اہلیت نہ رکھتا ہو۔ پھر پورے زور کے ساتھ اسکا بھی اعلان کر دیا کہ لوگوں کو خود خلیفہ بننے اور امارت و سرداری حاصل کرنے کا خواہشمند نہ ہونا چاہیے۔ نہ دعویٰ دار بنکر دوسروں سے لڑنا چاہیے۔ آنحضرتؐ ہمیشہ اس عہد پر لوگوں سے بیعت لیتے تھے کہ ” لا ینزع الا مراہلہ “ جس کام کا جو اہل ہوگا اسی پر وہ کام چھوڑ دینگے۔ دنیا اگر اس چھوٹے سے جملہ پر عمل کرے تو روئے زمین کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ امام بخاری نے کتاب الاحکام میں باب باندھا ہے ” ما یکرہ من العرص علی الامارہ “ ( ۱ ) اور

( ۱ ) حق یہ ہے کہ بقول علامۃ ابن خلدون صحیح بخاری کی شرح و تفسیر کا قرض اب تک امت کے ذمہ باقی ہے۔ بے شمار شرحوں اور حاشیوں کے بعد بھی اب تک ابن خلدون کا قول ویسا ہی صحیح ہے جیسا فتح الباری اور عینی وغیرہ سے پہلے تھا۔ اس کتاب کے عجائب و دقائق قیامت تک ختم نہ ہونگے۔ ہر کتاب، ہر باب، ابواب کی ہر ترتیب، اور ہر عنوان و ترجمہ، اس فقیہ الارض و اعجوبۃ الدھر کی فقاہۃ ربانی کی ایک آیۃ باہرہ و حجتہ قاہرہ ہے۔ اسی مسئلۃ خلافت کو سامنے لاؤ، اور دیکھو، کس دقت نظر کے ساتھ محض ترتیب ابواب ہی میں اسلام کا نظام شرعی واضح کر دیا ہے اور ساری مشکلات حل کر دی ہیں؟ سب سے پہلی بات یہ تھی کہ اسلام کا نظام مرکزیۃ اس بارے میں کیا ہے؟ تو پہلا باب ” اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم “ کا باندھا، اور ” من اطاع امیری فقد اطاعنی “ الخ کی روایت درج کر کے بتلا دیا کہ مرکز کتاب اللہ ہے، رسول ہے، اور پھر خلیفۃ و امام ہے۔ ” اول الامر “ خلیفہ کے سوا کوئی نہیں۔ اُسکی اطاعت ( بشرطیکہ کوئی خلاف شرع حکم نہ ہو ) مثل خدا و رسول کی اطاعت کے فرض ہے۔ پھر باب باندھا ” الا مراۃ من قریش “ اور اسمیں ابن جبیر زالی روایت لائے ” ما اقاموا الدین “ جب تک قریش دین کے قائم رکھنے کی اہلیت رکھینگے، خلافت انہی میں رہیگی۔ اسطرح واضح کر دیا کہ ایک خاص مدت تک قرشی خلافت کی پہلے سے خبر دیدی گئی تھی، مگر خلیفہ کا قرشی ہونا کوئی شرط اصلی و تشریعی نہیں ہے۔ صرف پیشین گوئی اور ہونے والے واقعات کا بتلا دینا ہے جیسا کہ بے شمار معاملات کی نسبت خبریں دی گئی ہیں۔ اور پھر جو کچھ بھی ہے ” ما اقاموا الدین “ کے ساتھ مشروط ہے۔ اسکے بعد ایک نہایت ہی اہم اور دقیق نکتہ کی طرف متوجہ ہوئے اور باب باندھا ” اجر من قضی



ہجرت الی اللہ اور ذہاب الی اللہ ہے - خدا کے ہر رسول اور انکے پیروں کو قیام حق کی راہ میں یہ منزل طی کرنی پڑی : انی مہاجر الی ربی - اور انی ذاہب الی ربی - چونکہ وطن و مکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جسکے ترک کرنے میں اہل و عیال ، مال و متاع ، دوست و احباب ، ہر طرح کے علاقوں کو ترک کر دینا پڑتا ہے ، اور اسکی محبت و الفت کی زنجیر اور ساری زنجیروں سے بھاری ہے ، اسلیے ترک وطن کی ہجرت اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہوئی ، اور زیادہ تر مہاجرۃ کا اطلاق تارکین وطن ہی پر کیا گیا - ” ولکل امری ما نوبی - فمن کانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ ، فہجرتہ الی اللہ ورسولہ ، و من کانت ہجرتہ لدنیا یصیبہا ، اوامرأة یتزوجہا ، فہجرتہ الی ما ہاجر الیہ “ (بخاری عن عمر رض ) یعنی ہر شخص کیلئے وہ ہے جسکی اُس نے نیت کی - پس جس نے اللہ اور اسکے رسول کیلئے ہجرت کی تو اسکی ہجرت اللہ اور اسکے رسول کیلئے ہوئی ، اور جس نے اسلیے گھر چھوڑا کہ دنیا کماے یا نکاح کرے ، تو اسکی ہجرت اسی کام کیلئے ہوئی جسکے لیے اس نے گھر چھوڑا - پھر ہجرت کے بھی اقسام ہیں اور مراتب - بعضہا فوق بعض - کتاب و سنت اسکی تفصیل سے لبریز ہیں - یہ موقعہ تفصیل کا نہیں -

پانچویں چیز ”جہاد فی سبیل اللہ“ ہے - ”جہاد“ جہد سے ہے جسکے معنی ”استفراغ الوسع فی مدافعة العدو ظاہراً و باطناً“ ہیں ( مفردات واغب ) یعنی دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کے دور کرنے اور اپنے کو قائم و باقی رکھنے کیلئے انتہا درجہ کی کوشش کرنا - یہ کوشش زبان سے بھی ہوتی ہے - مال سے بھی ہوتی ہے - جان سے بھی ہوتی ہے - جس قسم کی کوشش کی ضرورت ہو - ہر قسم جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے - ” و جاهدوا المشرکین باموالکم و انفسکم و السنتکم “ ( رواہ ابوداؤد ، و احمد ، و نسائی ، و ابن حبان ، عن انس )

یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہی پانچ چیزیں دنیا میں قوموں اور ملکوں کے بقاؤ قیام کی اصلی بنیاد ہیں - دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جسکی قومی ہستی ان پانچ عنصروں سے مرکب نہ ہو - سعی و عمل کا کوئی گوشہ ہو ، کامیابی بغیر ان اصول خمسہ کے نہیں مل سکتی - تم مٹھی بھر گیہوں کے طالب ہو یا قطب شمالی کی تحقیق کے ، مگر کوئی چیز بھی بغیر

لیکن اگر ایسوں کی خلافت تسلیم نہ کی جائے، اُن پر خرچ کرنے کی اجازت دیدی جائے، اور اطاعت امت کا مستحق صرف اہل اور جامع الشرط خلیفہ ہی قرار دیا جائے، تو پھر دائمی کشت و خون، جنگ و قتال، دعوؤں کا ٹکرانا، قوتوں کا نزاحم، ہمیشگی کی بد امنی، کبھی ختم نہ ہونے والی طوائف الملوک اور انارکی، امت کی تباہی، ملکوں کی خرابی، نظام جماعت کا اختلال، احکام شرع کی تعطیل، مسلمانوں کے جان و مال سے امن کا اُٹھ جانا، دشمنان اسلام کا اس با ہمدگر کشمکش سے فائدہ اٹھانا، اور اسی طرح کی بے شمار ہلاکتوں اور بربادیوں کا پھیل جانا لازمی تھا۔ مگر ساتھ ہی اسکی امید بھی تھی کہ شاید ان بربادیوں کے بعد اصلی نظام خلافت قائم ہو جائے اور نا اہلوں کی جگہ کسی اہل اور ساری شرطیں رکھنے والے آدمی کو خلافت دلائی جاسکے۔ پہلی صورت میں مصلحت کا بقا و حصول، مگر خرابیوں کا امکان تھا۔ دوسری صورت میں خرابیوں کا وقوع، مگر مصالح کا امکان تھا۔ اسلام نے پہلی صورت اختیار کی، اور پوری قوت و اصرار کے ساتھ دوسری راہ مسدود کر دی۔ یعنی مصالح کے امکان پر اُنکے وقوع کو ترجیح دی۔

[ بقیہ نوٹ صفحہ ۳۶ ]

”حکمت“ ہے۔ پس ضرور ہے کہ خلیفہ کے تمام کاموں کی بنیاد طریق سنۃ پر ہو۔ بدعت و احداث پر نہ ہو۔ یہی معنی منہاج نبوت کے ہیں۔ (۴) جب خلافت منعقد ہوگئی تو تمام امت پر اسکی اطاعت فرض ہے۔ فی ما احب و یکرہ، مالم یؤمر بمعصیۃ (۵) امت کو چاہیے کہ احق و اہل کو منتخب کرے۔ لیکن مستحق کو نہ چاہیے کہ خود خلافت کی خواہش کرے۔ جس نے ایسا کیا، اللہ کے حضور شرمندگی پائیگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب لوگ خود خواہش نہ کریں گے، اور حق انتخاب جمہور کو ہے، تو کسی طرح کی بھی کشمکش نہوگی۔ نہ بہت سے دعویداروں میں باہم جھگڑا ہوگا۔ امن و سکون کے ساتھ یہ معاملہ انجام پا جائیگا۔ یہ تھا صحیح نظام شرعی، جسکے علم و فہم کیلئے صرف صحیح بخاری ہی کافی ہے، اور اسلام کی کونسی حقیقت ہے جسکے لیے صحیح بخاری کافی نہیں؟ لیکن افسوس کہ نظام شرعی قائم نہ رہا۔ مجلس شوریٰ کی جگہ میدان جنگ میں خلافت کا فیصلہ ہوا، اور محض تسلط و جبر سے دعویدار قابض ہونے لگے۔ چنانچہ پہلے ہی سے اسکی خبر دیدی گئی تھی۔

لباسوں میں آتے ہیں، لیکن یکایک صدائے تکبیر سب کے انتشار کو ایک کامل اتحادی جسم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ہزاروں اجزاء کا یہ منتشر مواد بالکل ایک جسم واحد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سب کے وجود ایک ہی صف میں جڑے ہوئے، سب کے کاندھے ایک دوسرے سے ملے ہوئے، سب کے قدم ایک ہی سیدھے میں، سب کے چہرے ایک ہی کی جانب۔ قیام کی حالت ہے تو سب ایک جسم واحد کی طرح کھڑے ہیں، جھکاؤ ہے تو تمام صفیں بہ یک وقت جھکی ہوئی ہیں۔ ظاہر کے ساتھ باطن بھی یکسر متحد و ممزوج۔ سب کے دل ایک ہی کی یاد میں محو، سب کی زبانیں ایک ہی کے ذکر میں مترنم۔ پھر دیکھو، سب کے آگے صرف ایک ہی وجود امام کا نظر آتا ہے جسکے اختیار میں جماعت کے تمام اعمال و افعال کی باگ ہوتی ہے۔ جب چاہے سب کو جھکا دے۔ جب چاہے سب کو اُٹھا دے۔

اسلام کی زبان میں ”جماعت“ سے مقصود ایسا اجتماع ہے۔ انبؤہ اور بھیڑ کا نام جماعت نہیں ہے۔

جماعت کے جن اوصاف و خواص کا ارپور ذکر کیا گیا، وہ تمام تر قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں۔ لیکن شراہد کی تفصیل کا یہ مرقعہ نہیں۔

(۲) دوسری چیز ”السمع“ ہے۔ یعنی امام جو احکام دے، اُسکو سننا، اور اس سے تعلیم و ارشاد حاصل کرنا۔ ”سمع“ کے لفظ میں قبولیت احکام و طلب تعلیم، دونوں کی طرف ترجہ دلائی ہے اور امام کی معلمانہ حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔

(۳) تیسری چیز ”طاعت“ ہے۔ یعنی امام کی کامل درجہ اطاعت و فرماں برداری، اور اپنی تمام عملی قوتوں کو اُس کے سپرد کر دینا، اور اس کے ہر حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کرنا۔ البتہ اطاعت معروف میں ہے۔ نہ کہ معصیت میں کہ ”انما الطاعة في المعروف“

(۴) چوتھی بات ”ہجرة“ ہے۔ ہجرة ہجر سے ہے جسکے معنی ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں ”الہجر والہجران مفارقة الانسان غيره“ اما بالبدن او باللسان او بالقلب۔ و المہاجرة مصارمة الغير و متاركة“ (۵۵۸) اسلام کی اصطلاح میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت و صداقت کے کسی مقصد اعلیٰ کیلئے اپنی دنیوی محبوبات و مالوفات ترک کر دے۔ مثلاً دولت کو، آرام و راحت کو، عزیز و اقرباء کے قرب کو، وطن و مکان کو، تو اسکا نام

و ملت کی حفاظت کیلئے ضروری تھا کہ نظام اصلی پر زور دینے کے ساتھ ان وقتوں کیلئے بھی صاف صاف احکام دیدیے جائیں، جب انتخاب و نصب خلافت کے بارے میں شریعت کا ٹھہرایا ہوا طریقہ باقی نہ رہے، اور جمہوری حکومت کی جگہ شخصی و استبدادی طریقہ قائم ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں درہی راہیں سامنے آتی ہیں۔ اگر ایسے لوگوں کی خلافت تسلیم کر لی جائے تو اس سے امت کی جمعیت، جان و مال کا امن، ممالک اسلامیہ کی حفاظت، احکام شرع کا اجراء، جماعت کا قیام و بقا، اور اسی طرح کے مصالح و فوائد حاصل ہوتے ہیں کیونکہ بلا کسی نزاع کے اسلامی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ مگر ساتھ ہی غیر مستحق کی خلافت اور غیر نظام شرعی کے قائم ہو جانے کی خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

[ بقیہ نوت صفحہ ۳۶ ]

الشرط، عادل ہو یا جابر، مکررہات کا حکم دے یا معبودات کا، جب تک وہ مسلمان ہے۔ نماز قائم رکھتا ہے، اسکی اطاعت کرنی چاہیے۔ کسی مسلمان کیلئے اسکی اطاعت سے باہر ہونا جائز نہیں۔ اس کے بعد بالترتیب تین باب آتے ہیں۔ ”من لم یسأل الامارة (اعانہ اللہ) دوسرا ”من سأل الامارة ركل اليها“ تیسرا ”ما يكره من الحرص على الامارة“ حاصل ان تینوں عنوانوں کا یہ ہے کہ جہاں شارع نے امت کو خلیفہ و امام کی ضروری صفتیں اور شرطیں بتلا دی ہیں، وہاں اس سے بھی روک دیا ہے کہ کوئی شخص خود امامت و سرداری کا خواہاں ہو اور اس کے لیے کوشش کرے۔ حتیٰ کہ عبد الرحمن بن سمرہ سے کہا ”جو اہل اور احق ہو، اسی کا ساتھ دو۔ خود اپنے لیے خواہاں نہ ہو۔ اگرچہ اس کے لیے قسم توڑنی اور کفارہ بھی دینا پڑے“ پس ان تمام ابواب کی یکے بعد دیگرے ترتیب سے واضح ہو گیا کہ اس بارے میں نظام شرعی کی قدرتی ترتیب یہ ہے :

(۱) امت کیلئے حسب نص ”راولی الامر مذکم“ مرکز اجتماع و جماعت خلیفہ کا وجود ہے۔ اسکی اطاعت فرض ہے۔ (۲) خبر دیدی گئی تھی کہ جب تک عرب و قریش میں صلاحیت رہیگی، خلافت پر قابض رہینگے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ (۳) بنیاد معاملہ خلافت کی ”حکمت“ پر ہے۔ وہ حکمت کہ ”و یعلمہم الكتاب والحکمة“ یہ نیابت نبوت ہے، اور اعمال و سنت نبوت ہی کا نام قرآن کی اصطلاح میں

رسالہ کے ”مشہد وحدۃ“ کی اصطلاح اختیار کی ہے جو سالک طریق کیلئے کشف حجب اور سیر حقائق کا سب سے بلند تر مقام ہے۔ مقصود اس سے وہ قوت نظر و فکر ہے جو ظواہر سے گزر کر حقیقت تک پہنچ جائے اور اسماء و تعبیرات کے اختلافات دور کر کے مقاصد و معانی کا اتحاد معلوم کر لے۔ بعدیکہ سارے نزاعات و اختلافات دور ہو جائیں اور سخت سے سخت منازع و متضاد راہوں پر چلنے والے بھی دیکھ لیں کہ اصل مطلوب درنوں کا ایک ہی ہے۔

اس اصل کو پیش نظر رکھ کر اگر غور کر گئے تو واضح ہو جائیگا کہ جماعت، تعلیم، اطاعت، ہجرت، اور جہاد، دنیا کی وہ عالمگیر صداقتیں ہیں جنکی حقیقت سے کسی فرد بشر کو انکار نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی کوئی صالح جماعت ایسی نہیں ہے جس نے اسے الگ رکھ کر کامیابی حاصل کی ہو۔ ہر عقل نے انکا اقرار کیا ہے، ہر دل میں انکا اعتقاد موجود ہے، اور ہر عامل جماعت شب و روز انپر عمل کر رہی ہے۔ البتہ ناموں کے اختلاف نے ساری الجھن ڈال دی ہے۔ اسلام نے جن ناموں سے انکو تعبیر کیا ہے، انسے دنیا کو اختلاف ہے، لیکن اسلام جن حقیقتوں کو پیش کرتا ہے، انسے دنیا اختلاف نہیں کر سکتی۔ اگر کرے تو زندگی اور مراد سے محروم ہو جائے۔

اس نظام میں پہلی چیز ”جماعت“ ہے جسکی مختصر تشریح اوپر گزر چکی۔ غور کرو، دنیا کا کونسا کام ایسا ہے جسکو بلا اجتماع و جماعت کے انجام دیا جاسکتا ہے؟ جماعت کی زیادہ دقیق اور فلسفیانہ تعریف چھوڑ دو۔ صاف اور سیدھے سادے معنی جو ہو سکتے ہیں، صرف انہیں پر غور کرلو۔ سوسائٹی، پارٹی، کمیٹی، کلب، انجمن، کانفرنس، پارلیمنٹ، بلکہ قوم، ملک، فوج، ان سب سے مقصود کیا ہے؟ یہی کہ ”جماعت“ اور ”التزام جماعت“۔ وحشی قوموں تک کو دیکھتے ہو کہ جنگل کے درختوں کے نیچے اکٹھے ہو جاتے ہیں، اور مل جل کر اپنے معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں۔ پھر جماعت بے سود ہے اگر اسکا نظام نہ ہو اور کوئی سردار و رہنما نہ ہو۔ تم پانچ آدمیوں کی بھی کوئی مجلس منعقد کرتے ہو، تو سب سے پہلے ایک پریسیدنٹ کا انتخاب کرتے ہو اور کہتے ہو کہ جب تک کسی کو صدر مجلس نہ مان لینگے، یہ پانچ آدمیوں کی مجلس بھی باقاعدہ کام نہ کر سکیگی۔ فوج ترتیب دیتے ہو تو دس آدمیوں کو بھی بغیر ایک افسر کے نہیں چھوڑتے۔



یقینی اور ہر طرح کے شک و شبہ سے ماورا ہے کہ اگر دنیا اس پر یقین لانے کیلئے طیار نہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دنیا کے پاس ماضی کی جس قدر معلومات موجود ہے اُن میں سے کوئی بات بھی یقینی نہیں۔ نہ تو اس دنیا میں سکندر نامی کوئی پادشاہ کبھی گزرا، نہ روما نامی کوئی سلطنت قائم ہوئی، اور نہ ہم یسویں صدی کے انسان اس کے لیے مجبور ہیں کہ نپولین کا رجوع اور رائے لار کی جنگ کا وقوع تسلیم کریں !

بہر حال احادیث کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہونے والے واقعات پیشتر سے معلوم تھے اور ہر حالت اور ہر وقت کیلئے صاف صاف حکم دیدیا گیا تھا۔ احادیث کے اس حصہ کا نہایت دقت نظر سے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہر دور کی خاص حالت ہے اور اس لیے خاص حکم۔ سب سے پہلے وہ حدیثیں سامنے آتی ہیں جن میں خلافت خاصہ و راشدہ کا ذکر کیا ہے، اور چونکہ یہ خلافت تھیک تھیک طریق نبوت و سنت پر قائم ہونے والی تھی، اس لیے امت کو وصیت کی ہے کہ نہ صرف اُنکی اطاعت کی جائے، بلکہ اُنکے تمام اجماعی باتوں اور کاموں کو مثلاً اعمال نبوت کے ”سنت“ سمجھا جائے اور اُسکی پوری طرح پیروی کی جائے۔

مشہور حدیث عرباض بن ساریہ ”قام فینا رسول اللہ صلعم ذات یوم فوعظنا موعظة بلیغة“ و جلت منها القلوب، و ذرفت منها العیون، فقلیل یا رسول اللہ ! وعظتنا موعظة مودع فاعہد الینا بعہد۔ فقال علیکم بتقوی اللہ، و السمع و الطاعة و ان کان عبدأ جشیاً، و ستررن من بعدی، اختلفاً شدیداً، فعلیکم بسنتی و سنتہ الخلفاء الراشدين المہدیین۔ عضوا علیہا بالنواجذ“ (ابن ماجہ و ترمذی) اور حدیث ”خیر القرون قرنی“ ثم یلونہم ”الخ اور ”اما طبقتی و طبقۃ اصحابی فاهل علم و ایمان“ الخ رواہ البغوی عن انس۔ یعنی آنحضرت (صلعم) نے خطبہ دیا اور فرمایا۔ میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو، اپنے امام کا حکم سنو اور مانو اگرچہ وہ ایک حبشی غلام ہو۔ اور دیکھو! میرے بعد بڑے سخت جھگڑے ہونے والے ہیں، پس چاہیے کہ فتنوں سے بچو اور ہمیشہ میری سنت اور میرے بعد کے جانشینوں کی سنت پر کاربند رہو، اور اسکو اس طرح مضبوطی سے پکڑ لو جیسے کوئی شخص دانتوں سے کوئی چیز پکڑ لیتا ہے۔ اور فرمایا: بہتر زمانہ میرا ہے، پھر وہ جو میرے بعد کا ہے۔ اور فرمایا: میرا اور

جماعت، اطاعت، ہجرت، اور جہاد کے حاصل نہ ہو سکیں گی۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے، غور کرو گے تو وہ سب انہی پانچ سچائیوں کے ثمرات و نتائج ہیں۔

دنیا کے تمام نزاعات و اختلافات کی ایک سب سے بڑی علت حقیقت کی وحدت اور اسماء و مصطلحات کی کثرت ہے۔ طلب صداقت کے اکثر جھگڑے حکایتِ شہد و غسل سے زیادہ نہیں۔ یعنی سچائی ہر جگہ اور ہر گوشہٴ عمل میں حقیقت و مسمیٰ کے اعتبار سے ایک ہی ہے، لیکن بھیس مختلف ہو گئے ہیں اور نام متعدد۔ مصیبت یہ ہے کہ دنیا معافی کی جگہ لفظوں کی پرستش کرتی ہے، اور گوسب طلبگار و پرستار ایک ہی حقیقت کے ہیں، لیکن محض ناموں کے اختلاف کی وجہ سے باہمدگر لڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے شہد، دوسرا کہتا ہے غسل۔ مگر کوئی نہیں جو دونوں کو سمجھا دے کہ مقصود دونوں کا ایک ہی ہے۔ اختلاف مسمیٰ میں نہیں ہے۔ صرف اسم میں ہے۔ ایک شخص شب و روز ایک حقیقت کو مانتا اور جانتا ہے، لیکن اپنی اصطلاح و رسم میں کسی خاص لقب سے پکارتا ہے۔ وہی حقیقت جب ایک دوسرے نام سے اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو فوراً انکار کر دیتا ہے اور اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اس سے ہر طرح نفرت کرے۔ مذاہب کے اختلافات سے لیکر معاشرت و رسوم کے چھوٹے چھوٹے اختلافات تک، ہر جگہ یہی علت کام کر رہی ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو سکے کہ ظواہر و اسماء کے تمام پردے اٹھا دیے جائیں اور حقیقت بے نقاب ہو کر سب کے سامنے آجائے، تو یکایک دنیا کے تمام نزاعات ختم ہو جائیں، اور تمام لڑنے والے دیکھ لیں کہ سب کا مطلوب ایک ہی ہے اگرچہ بھیس مختلف ہیں، اور سب کا مقصود ایک ہی ہے اگرچہ نام بہت سے ہیں:

عبداللہ شتی و حسنک واحد

وکل الی ذاک الجمال یشیرا

علوم و حقائق کے مشاہد و مناظر میں یہ مشہد سب سے اعلیٰ و ارفع مقام رکھتا ہے۔ اسی کو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ”علم الجمع بین المختلفات“ سے تعبیر کرتے ہیں (۱) اور عامۃ اصحاب اشارات

(۱) تفہیمات میں لکھتے ہیں ”لما تمت بی دورة الحکمة، البسني

اللہ خلعت المجددیة، فعلمت علم الجمع بین المختلفات“

کیا دنیا میں ایک دماغ اور ایک عقل صحیح بھی ایسی مل سکتی ہے جو شریعت کے اس فیصلہ کو غلط بتلائے ؟ اللہ کی شریعت کا اصل اصول جلب مصالح اور دفع مفسد ہے - یعنی ہمیشہ فوائد حاصل کرنا اور مفسد کو دور کرنا - اور جب مصالح کے ساتھ مفسد بھی جمع ہو جائیں تو جس راہ میں مصالح زیادہ ہوں اور خرابیاں کم، اُس کو اختیار کرنا - تمام احکام کا محور یہی اصل ہے - پس اگر پہلی راہ اختیار کی جاتی اور خلیفہ کی اطاعت کیلئے خلیفہ کا جامع الشروط اور بطریق صحیح منتخب ہونا شرط قرار دیدیا جاتا، تو اس کا کیا نتیجہ نکلتا ؟ نصب و انتخاب کیلئے نظام شرعی تو درہم ہو چکا تھا - ہر دماغ میں حرص و دعوا، اور ہر ہاتھ میں تلوار تھی - یہی نتیجہ نکلتا کہ ایک عام طوائف الملوک اور انار کی پھیل جاتی - ہر شخص یہ کہہ کر کہ خلیفہ اہل و مستحق نہیں ہے، بغارت کیلئے اُتھ کھڑا ہوتا - تمام امت میں خون اور موت کی وبا پھیل جاتی - شہروں کا کوئی محافظ نہ رہتا - آبادیوں کا کوئی حاکم نہ ہوتا - نہ مجرموں کو کوئی سزا دینے والا، اور نہ ڈاکوؤں سے کوئی بچانے والا - زکوٰۃ کس کو دی جاتی ؟ جمعہ کون قائم رکھتا ؟ سرحدوں کی کون حفاظت کرتا ؟ بارجود اسلام کے اس صریح حکم اور مسلمانوں کے متفقہ اعتقاد کے، جو کچھ تاریخ اسلام کا حال رہا ہے، ظاہر ہے - مدعیان سلطنت کی باہمی پیکار اور جماعتوں کے باہمی نزاع نے کس طرح اسلامی فتوحات کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی قوت رکھ دی ؟ اور پھر جو کچھ حاصل ہو چکا تھا، اس کو بھی کھونا شروع کر دیا ؟ حتیٰ کہ جو قوم دنیا کی تمام قوموں کی وارث ہونے کیلئے آئی تھی، دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی قوم بھی اُس کی وارث بن گئی، اور اسلامی خلافت کے اجزاء حیاتِ ثبوتِ ثبوت کر اور کت کت کر دنیا کی نئی نئی سلطنتوں اور ملکوں کیلئے سرور سامان و مواد کا کام دینے لگے ! فما کان اللہ لیظلمہم، و لکن کانوا انفسہم یظلمون !

( ۳۹ : ۹ )

( نصوص سنۃ و اجماع امت )

سب سے پہلے احادیث پر نظر ڈالنے چاہیے - اگر داعی اسلام ( صلی اللہ علیہ وسلم ) کی نبوت کی صداقت کی اور کوئی دلیل نہ ہوتی، تو صرف یہی ایک بات بس کرتی تھی کہ آئے والے واقعات کی تمام تفصیلات کس طرح اہل روز ہی بتلا دی گئی تھیں ؟ اور ایک ایک جزئی حالت کا کیسا کامل نقشہ صدیوں پہلے کھینچ دیا تھا ؟ یہ معاملہ اس قدر

ملکوں کا عروج، قوموں کی بالا دستی، تمدن کی وسعت، فی الحقیقت انسان کے کس عمل حق کے نتائج و ثمرات ہیں؟ اگر کچھ نظری چہرے در تو معلوم کراوگے کہ صرف عمل ہجرت کے - اگر انسان اور انسانوں کی جماعتوں نے طلب مقاصد و عزائم میں ہزاروں قربانیاں نہ کی ہوتیں، ہر طرح کے آرام و راحت سے مفارقت نہ کرجاتے، اپنی ساری خواہشوں اور دلوں کو ترک نہ کردیتے، گھر کے عیش، اہل و عیال کی محبت، خویش و یگانہ کی الفت، اور ملک و وطن کی دامنگیریوں سے بالکل آزاد ہوکر راہ ہجرت میں قدم نہ اٹھاتے، تو آج دنیا میں علم کی جگہ جہل ہوتا، تمدن کی جگہ وحشت ہوتی، آبادیوں کی جگہ جنگل ہوتے، اور ان تمام ترقیوں میں سے ایک ترقی بھی کرۂ ارضی کی پیٹھ پر نظر نہ آتی - دنیا میں جس قدر علوم و فنون موجود ہیں، ان سب کی تکمیل کیونکر ہوتی اگر ولولۂ ہجرت سے انسان کا قلب خالی ہوتا؟ کتنے ہی انسانوں نے اپنے گھروں اور وطنوں سے ہجرتیں کی ہیں، دنیا کے ایک ایک گوشہ ایک ایک چپہ کو چہاں مارا ہے، جب کہیں جا کر فن طب کی تکمیل ہوئی ہے اور ادویۂ و اشیاء کے خواص کا علم مکمل ہوا ہے - اگر مہاجرین علم کے قافلے اپنے اپنے گوشوں سے نہ نکلتے، اور گھر کے آرام و راحت کی جگہ سفر و غربت کی صعوبتیں گورا نہ کر لیتے، تو اشیاء کی تحقیق کیونکر ہوتی؟ پیداوار کی معلومات کیونکر تکمیل پاتی؟ جغرافیہ کیونکر وجود میں آتا؟ علم الحیات کے تجارب کی جزئیات کیونکر جمع ہوسکتیں؟ نئی نئی ایجادات اور اکتشافات کی کس طرح راہ کھلتی؟ کولمبس اگر ہجرت نہ کرتا، تو آج دنیا کا نصف تمدن ناپید تھا - یورپ اگر ہجرت نہ کرتا تو آج نیویارک اور واشنگٹن کی سر بفلک عمارتوں کا وجود نہ ہوتا - اگر یورپ کی قومیں اپنے ملکوں سے مہاجرت نہ کرتیں، تو آج تمام دنیا کی دولت ان کے گھروں میں کھنچکر نہ جاتی - یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگر صرف قطب شمالی کی تحقیق کے لیے مہاجرین کشف کے دیرہ سو قافلے یکے بعد دیگرے نکلیں، اور یکسر قربان و ہلاک ہو جائیں، تو تم کہو کہ یہ تحقیق علم کا کمال اور جذبۂ نوع پرستی کی انتہا ہے، لیکن اگر اسی چیز کو اللہ کی شریعت ایک جامع تر لفظ ”ہجرت“ سے تعبیر کرے، تو تم اسکا انکار کردو؟ تمہارے نزدیک یہ تو تمدن ہے کہ دریائے نیل کا مخرج دریافت کرنے کیلئے سیکڑوں انسان اپنا گھر بار چھوڑ دیں اور ہلاک ہو جائیں، لیکن یہ وحشت ہے کہ قیام حق اور اشاعت

عن عباده بن الصامت - قال ” بايعنا رسول الله صلعم على السمع والطاعة في منشطنا و مكرهنا و عسرنا و يسرنا و اثرة علينا “ و ان لا ننازع الامر اهله

[ بقیہ نرت صفحہ ۴۲ ]

مشترکات و مختلفات کو الگ الگ کر دینا چاہیے۔ پھر ہر حدیث اور ہر حکم کو اُسکی جگہ دینی چاہیے۔ ایسا نہ کرنے سے لوگوں کو بڑی بڑی غلط فہمیاں ہوئیں۔ بہتوں کو یہ لغزش ہوئی کہ ” اطاعت “ اور ” اقتداء “ کا فرق نہ سمجھے۔ جن حدیثوں میں ” اقتداء “ کی ممانعت بلکہ خلاف کرنے کا حکم پایا، انکو ” منع اطاعت “ اور جواز خرچ پر محمول کر لیا۔ خوارج اور معتزلہ کے ایک گروہ کو یہی دھوکا ہوا۔ ایک دوسری جماعت نے یہ غلطی کی کہ حکم اطاعت کو عام مطلق سمجھ لیا، اور منع اقتداء و تاسی اور رجوب امر بالمعروف نے جو تخصیص کر دی تھی، وہ انکی سمجھ میں نہ آئی۔ یعنی اس دھوکے میں پڑ گئے کہ جب امراء و حکام کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، خواہ انکے اعمال کیسے ہی خراب ہوں، تو پھر چاہیے کہ نہ کسی برائی پر توکین، نہ منکرات کے خلاف جد و جہد کریں۔ ہر حال میں چپ چاپ بیٹھ کر اطاعت کرتے رہیں۔ یہ جو صدیوں سے عام علماء اسلام نے اصحاب اقتدار کے خلاف امر بالمعروف یکقلم ترک کر دیا ہے، تو نفس خادع انکو بھی یہی دھوکا دے رہا ہے۔ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے۔ ان لوگوں نے چونکہ ” اطاعت “ اور ” اقتداء “ کا فرق نہیں سمجھا تھا، اسلیے یہ مطلب سمجھے کہ پادشاہوں اور امیروں کو برائی پر توکنے اور انکے خلاف حق کے اعلان میں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ یہی چیز فتنہ ہے۔ پس اس فتنہ سے بچنا چاہیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حق و باطل میں کوئی تمیز باقی نہ رہی۔ تمام زبانیں گونگی اور۔ تمام دل مردہ ہو کر رہ گئے۔ حالانکہ درنوں جماعتوں نے ٹھوکر کھائی۔ درنوں نے حدیثوں کا صحیح مورد اور محل نہ سمجھا۔ ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان کسی کو اپنا قومی پادشاہ مان لیں، اور ایک پادشاہ کی جیسی فرماں برداری رعایا کو کرنی چاہیے، تھیک تھیک ویسی ہی فرماں برداری کریں۔ کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے ثابت ہو کہ اُسے اپنا حاکم نہیں سمجھتے۔ اسکا نام ” اطاعت “ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی انسان کو دینی و اخلاقی اعتقاد و عمل میں اپنا پیشوا مان لینا، اور راستی و حق پرستی کے اعتبار سے اُسکی زندگی کو اپنے لیے



اسکی اطاعت ماتحتوں کیلئے فرض سمجھتے ہو اور یقین کرتے ہو کہ بغیر اس کے فوج کا نظام قائم نہیں رہ سکتا - پانچ دس آدمی بھی اگر بغیر امیر کے کام نہیں کر سکتے تو قومیں کیونکر اپنے فرائض بلا امیر کے انجام دے سکتی ہیں ؟ اس سے بھی سادہ تر مثال یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں اور خاندانوں کو دیکھو ! خود تمہارا گھر بھی تو ایک چھوٹی سی آبادی ہے ؟ اگر بیوی تمہارا حکم نہ مانے تو تم کیوں بگڑتے ہو ؟ اگر گھر کے لوگ تمہارے کہنے پر نہ چلیں، تو تم کیوں لڑتے ہو ؟ تم کہتے ہو کہ فلاں گھر میں امن و انتظام نہیں - رز خانہ جنگی ہوتی ہے - یہ سب کیوں ہے ؟ صرف اسلیئے کہ ”الجماعۃ“ و ”السمع“ و ”الطاعة“ کوئی جماعت امن و نظم نہیں پاسکتی جب تک اسکا کوئی امیر نہ ہو، اور جب تک امیر کی اطاعت نہ کی جائے - گھر اور خاندان بھی ایک چھوٹی سی جماعت ہے - تم گھر کے بڑے ہو - یعنی امیر ہو - پس گھر کی عافیت و کامیابی اس پر موقوف ہے کہ سب تمہاری سنیں اور تمہارے کہے پر چلیں -

”ہجرت“ کا لفظ کس قدر تمہارے لیے نا آشنا اور نا مانوس ہے ؟ تم سمجھتے کہ یہ دنیا کے اُس عہد جہل و وحشت کی یادگار ہے جب مذہبی جذبات کی برائی بخندگی نے تمدنی احساسات کو مغلوب کر دیا تھا، اور انسان دین پرستی کے جنون میں اپنی عقلی و تمدنی زندگی تک کو قربان کر دیتا تھا - لیکن بتلاؤ، اب دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ علمی و تمدنی ترقیاں بھی تم کو جس راہ کی طرف بلا رہی ہیں، وہ ”ہجرت“ کی حقیقت سے کب خالی ہیں ؟ اور خود علم و تمدن کا تمام ذخیرہ عروج بھی کس عملی حقیقت کا نتیجہ ہے ؟ ”ہجرت“ سے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینا، اور حصول مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں، اُن سب کو ترک کر دینا - خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشیں ہوں، حتیٰ کہ قوم ہو، ملک ہو، وطن ہو، اہل و عیال ہوں، سب کو چھوڑ دینا - پھر بتلاؤ، علم و عمل کا کون گوشہ ہے جس میں کامیابی بغیر اس جذبہ کے ملسکتی ہے ؟ انسان کی مطلوبات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی بتلا سکتے ہو جو بلا ہجرت کے مقام سے گذرے اُسے پالی ہو ؟ یہ دنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں، حیرت انگیز اکتشافات، انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام، طرح طرح کے وسائل معیشت و فلاح کا ظہور، پھر

میرے یاروں کا طبقہ علم اور ایمان کا طبقہ ہے۔ اسی طرح حضرت ابن مسعود کی حدیث ”ما من نبی بعثہ اللہ فی امتہ قبلی“ الا کان لہ حواریون واصحاب، یاخذون بسنتہ و یقتدون بامرہ“ الخ (مسلم) و غیر ذلک۔ غرضکہ اس پہلے دور کیلئے در حکم دیے گئے تھے۔ ایک اطاعت کا، دوسرا اقتداء اور پیروی کا۔

لیکن اسکے بعد وہ حدیثیں سامنے آتی ہیں جن میں خلافت کے دوسرے دور کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس دور میں پہلا حکم تو بدستور باقی رہتا ہے، لیکن دوسرا حکم بالکل بدل جاتا ہے۔ یعنی امت کو اس دور کے خلفاء و سلاطین کی اطاعت کی تو رسی ہی وصیت کی جانی ہے، جیسے پہلے دور کیلئے کی تھی، لیکن انکے کاموں کی پیروی اور اقتداء کا حکم نہیں دیا جاتا، بلکہ بتدریج ترک و مخالفت کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اس دور میں جو لوگ خلافت پر قابض ہو جائیں گے، انکی خلافت شریعت کے مطلوبہ نظام پر نہ ہوگی، اور نہ انکا چلن قرآن و سنت کے مطابق ہوگا۔ ان میں اچھے بھی ہونگے۔ برے بھی ہونگے۔ اسلیئے امت کو اب صرف اطاعت کا اور انکی خلافت کے آگے سر جھکا دینے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ انکے طور طریقوں کی پیروی اور انکے کاموں کو شرعی کام سمجھ لینے کا حکم نہیں دیا جاتا۔ صاف صاف وصیت کی جاتی ہے کہ جب وہ لوگ برائیاں پھیلائیں، تو جس کی طاقت جہاں تک کام دے، برائیوں کے روکنے کی پوری کوشش کرے۔ ہاتھ سے کام لے۔ زبان کو حرکت میں لائے۔ یہ دونوں درجے نصیب نہ ہوں تو کم از کم دل ہی دل میں برائی کو برا سمجھے۔ ”و ذلک اضعف الایمان“۔ لیکن برے کاموں کو انکی عظمت کے دباؤ سے اچھا نہ سمجھ لے اور نہ انکا ساتھ دے۔ ”و لیس وراء ذلک من الایمان حبة خردل“ (۱)

(۱) احادیث کا یہ حصہ نہایت اہم اور غور طلب ہے۔ مختلف حدیثوں میں مختلف دوروں اور لوگوں کا ذکر ہے، اسلیئے احکام بھی مختلف ہیں۔ اس نکتہ پر جسکی نظر نہ گئی وہ احکام و علائم کو مختلف و متضاد دیکھ کر یا تو حیران ہوا۔ یا سخت غلطیوں میں مبتلا ہو گیا۔ عہد نبوی سے لیکر آخر تک مختلف دور آنے والے تھے۔ ہر دور کے خصائص و حالات دوسرے سے مختلف تھے۔ پس انکے احکام میں بھی اختلاف ہوا۔ پوری دقت نظر کے ساتھ احادیث کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ پہلے انکے باہمی

اُسی قوم کو باقی رھنا چاہیے جو حق و ہدایت کے اعتبار سے اصلح ہو۔ غیر اصلح عقائد و اعمال کو مت جانا چاہیے اور قانون الہی کا ہاتھ بند کر مٹا دینا چاہیے۔ ہدایت یافتہ اقوام کا یہ حق ہے کہ غیر ہدایت یافتہ قوموں پر غالب آئیں : لیظہرہ علی الدین کلامہ۔ پھر اس بات پر تم کیوں مضطرب ہوتے ہو؟ کیوں اس قدرتی قانون ہستی کے ذکر میں تم کو قتل و غارتگری کی دہشت ناکی نظر آتی ہے؟ یورپ کی قومیں تمام دنیا کو اپنی نو آبادیوں سے بھر دیں، اور کہیں کہ افریقہ کے وحشیوں کی جگہ ہم متمدن اقوام زیادہ خدا کی زمین کی حقدار ہیں۔ اسکو تو تم گوارا کرلو، لیکن اگر اسلام کہے کہ ”ان الارض لله و لرسوله“ خدا کی زمین حق پرستوں کیلئے ہے۔ کفر و ضلالت کے پرستاروں کیلئے نہیں ہے، تو تم اسکو وحشت اور خوفناکی کہو؟

## فصل

( جماعت و التزام جماعت )

یہاں ایک اور اہم اور قابل غور امر یہ بھی ہے کہ اس حدیث اور نیز دیگر احادیث میں ہمیشہ جماعت اور اطاعت خلیفہ کی زندگی کو اسلامی زندگی قرار دیا ہے اور اسکے عکس کو جاہلیۃ - جاہلیۃ کی زندگی میں ہلاکت کا اصلی تخم کیا تھا؟ قرآن نے واضح کیا ہے کہ تفرقہ اور باہم دگر علیحدگی، اور کسی ایک مرکزی قوت کے ماتحت نہونا - اسلام نے ظاہر ہو کر زندگی کی جو تخم ریزی کی، وہ کیا تھی؟ باہمی اتحاد و ائتلاف - تمام منتشر افراد کو ایک متحدہ جماعت بنا کر نفس واحدہ کر دیا اور سب کے سر ایک ہی چوکت پر جھکا دیے : واذکر ان نعمت اللہ علیکم ان کنتم اعداء، فالف بین قلوبکم، فاصبحتم بنعمتہ اخوانا - وکنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها“ الخ۔

پس جاہلیۃ کا دوسرا نام تفرقہ ہوا، اور اسلام کا دوسرا نام جماعت اور التزام جماعت - یہی وجہ ہے کہ تمام احادیث میں یہ حقیقت واضح کی گئی، اور اعلان کیا گیا کہ جو شخص جماعت اور اطاعت امام سے الگ ہو گیا،

کہ ہر حال اور ہر طرح کی زندگی میں امام کی اطاعت کریں گے۔ حکومت و سرداری کو اس کے کرنے والوں پر چھوڑ دینگے، اور کبھی اس بارے میں کوئی جھگڑا نہیں کریں گے۔ الا یہ کہ بالکل کھلا کفر امام سے ظاہر ہو۔ ایسی بات میں جس کے لیے اللہ کی کتاب میں حکم و دلیل موجود ہے۔ سو اس وقت کسی کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت سے نہ روک سکیگی۔ یعنی جب تک امام سے صریح کفر نہ سرزد ہو، ہر حال میں اس کی اطاعت واجب ہے۔

”خيار ائمتكم الذين تحبونهم و يحبونكم، و تصلون عليهم و يصلون عليكم، و شرار ائمتكم الذين تبغضونهم و يبغضونكم، و تلعنونهم و يلعنونكم“ قال قلنا۔  
 أفلا ننبأهم عند ذلك؟ قال لا، ما أقاموا فيكم الصلوة، الا من ولي عليه  
 وال فرأه شيئاً من معصية الله فليكره ما يأتي من معصية الله، و لا ينزع عن  
 يدأ من طاعة“ رواه احمد و مسلم۔

و عن حذيفة أنه ( صلعم ) قال ” يكون بعدي أئمة لا يهتدون بهدي ولا يستنون بسنتي “ و سيقوم فيكم رجال قلوبهم قلوب الشياطين في جثمان انس۔ قال قلت۔ كيف اصنع يا رسول الله ان أدركت ذلك؟ قال۔ تسمع و تطيع و ان ضرب ظهرك و اخذ مالك فا سمع و اطع“ رواه مسلم و احمد۔

یعنی فرمایا : تمہارے بہتر حاکم وہ ہیں کہ ان کی محبت تمہارے دلوں میں ہو اور تمہاری ان کے دلوں میں۔ تمہاری زبانوں سے ان کے لیے رحمت کی صدا نکلے اور ان کی زبانوں سے تمہارے لیے۔ اور بدترین حاکم وہ ہیں کہ تمہارے دلوں میں ان کی دشمنی ہو، اور وہ تمہیں دشمن سمجھتے ہوں۔ تم ان پر لعنت بھیجو۔ وہ تم پر۔ صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ! کیا ایسے حاکموں سے ہم نہ جھگڑیں؟ فرمایا نہیں۔ جب تک وہ تم میں نماز قائم رکھیں۔ ان کی اطاعت ہی کرو! ہاں جو بات گناہ کی دیکھو اسے پسند نہ کرو مگر امام کی طاعت سے ہاتھ نہ کھینچو۔ نیز فرمایا۔ میرے بعد ایسے امام ہونگے جو میرا طور طریق چھوڑ دینگے۔ میری سنت پر نہیں چلیں گے۔ عنقریب تم پر ایسے لوگ حکمران ہونگے کہ ان کا جسم تو انسانوں کا ہوگا مگر دل شیطان کا سا۔ رادی نے پوچھا۔ اگر ہم نے ایسا زمانہ پایا تو کیا کریں؟ فرمایا۔ سنو اور اطاعت کرو۔ اگر وہ تمہاری پیٹھ پر تازبانے لگائیں اور تمہارا مال چھین لیں، تب بھی ان کی سنو اور اطاعت کرو!

”ستكون بعدي اثرة و امور تنكرونها“ قالوا۔ فما تا مرنا؟ قال ”تؤدون الحق الذي عليكم، و تسألون الله الذي لكم“ متفق عليه عن ابن مسعود،



صداقت کی راہ میں اللہ کے بندے ترک وطن کریں ؟ اگر نیدوٹن اپنی رائوں کی نیند اور بستر کی راحت چھوڑ دے تاکہ ” کشش ثقل “ کا قانون دریافت کر لے ، تو تم اسکی پرستش کر رہے ہو کہ یہ علم پرستی ہے ۔ لیکن اگر تم عزم و طالب کے ایسے ہی پرستار ہو تو اُس عازم صادق کیلئے کیا کہتے ہو جو قانون کشش ثقل کیلئے نہیں بلکہ قانون نجات عالم کیلئے اپنا گھر بار چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حق پرستی ہے ؟ آج تمام یورپ قومی ترقی اور ملکی استحکام کی سب سے بڑی بنیاد ” کالونیل سسٹم “ کو یقین کرتا ہے ۔ یعنی نو آبادیوں کے اصول کو ، اور اسکا اس درجہ پرستار ہے کہ صرف اسی کی خاطر پانچ سال تک دنیا کو عالمگیر جنگ و قتال میں مبتلا رکھتا ہے ۔ لیکن نو آبادیوں کے اصول کے کیا معنی ہیں ؟ یہی کہ ترک وطن کر کے اپنی نئی نئی آبادیاں قائم کرنا ، اور قومی دولت و طاقت کو بڑھانے کیلئے دنیا میں دور در دور تک پھیل جانا ۔ اب غور کرو کہ یہ وہی ” ہجرت “ اور ترک وطن کی بات ہوئی یا نہیں ؟ اور ” الجماعۃ ، والسمع ، والطاعة ، والہجرة “ پر دنیا عمل کر رہی ہے یا نہیں ؟ نام مختلف ہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے ۔

” جہاد “ کے معنی یہ ہیں کہ دفع اعداء میں اپنی جان و مال سے کمال درجہ سعی و محنت کرنا ۔ کیا دنیا میں کوئی قوم ، کوئی ملک ، کوئی جماعت ، کوئی قبیلہ ، کوئی خاندان ، کوئی گھر ، کوئی انسان ، بلکہ کوئی وجود اور زندگی بغیر جہاد کے زندہ و قائم رہ سکتی ہے ؟ کون ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے اور جہاد نہیں کرتا ؟ جس چیز کو تم ہزاروں ناموں اور لفظوں میں بولتے ہو اور کارزار ہستی میں بقاء قیام کی اصلی بنیاد سمجھتے ہو ، اُسی کو اسلام نے ایک جامع لفظ ” جہاد “ سے تعبیر کیا ہے ۔ اگر تم سے دارن اور رسل و پلیس تنازع البقاء ( Struggle for existence ) اور انتخاب طبیعی ( Natural Selection ) اور بقاء اصلح ( Survival of the fittest ) کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کارزار حیات میں بقا صرف اصلح و امثل کیلئے ہے ، تو تم پوری طرح کان دھرتے ہو ، اور فطرت کے قتل و غارت کا افسانہ خونین تم کو پریشان خاطر نہیں کرتا ۔ لیکن اُسی حقیقت کو قرآن و اسلام زیادہ مکمل شکل میں بیان کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ جو قانون الہی زمین کے کیتروں مکوروں تک پر نافذ ہے ، اُس سے جمعیت بشری کیونکر بری ہو سکتی ہے ؟ پس دنیا میں



الا ان تروا كفرا بواحا عندكم فيه من الله برهان " متفق علیہ - عبادہ بن الصامت کہتے ہیں - ہم سے رسول اللہ ( صلعہ ) نے اس بات پر بیعت لی

[ بقیہ نوٹ صفحہ ۴۲ ]

نمونہ بنا لینا ' اور اُسکے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرنا - اسکا نام " اقتداء " اور " تاسی " ہے - دونوں صورتیں الگ الگ ہیں - بلاشبہ " اطاعت " ایک عام حالت ہے اور اسمیں " اقتداء " کی حالت بھی داخل ہے ' لیکن " اقتداء " اطاعت سے زیادہ خاص ہے ' اور ضروری نہیں کہ ہر اطاعت اقتداء بھی ہو - احادیث میں خلفاء راشدین کی نسبت امت کو " اطاعت " اور " اقتداء " دونوں کا حکم دیا گیا ' لیکن بعد کے خلفاء و سلاطین کو صرف " اطاعت " کا مستحق بتلایا - " اقتداء " کا نہیں - کیونکہ معلوم تھا کہ اُنکے کام اچھے نہ ہونگے - شریعت و عدالت سے منحرف ہو جائینگے - اور چونکہ نظام جماعت کے قیام کے ساتھ احکام کتاب و سنت اور عدل و صداقت کی حفاظت کا انتظام بھی ضروری تھا ' اسلیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ہر حال میں باقی رہا - اور حکم دیا گیا کہ ایسے وقتوں میں سلطان اسلام کو اپنا امام مانکر پوری پوری اطاعت کر ' لیکن پادشاہ کی اطاعت کے یہ معنی نہیں کہ سفید کو سیاہ ' اور دن کو رات مان لو - حق حق ہے - باطل باطل - برائی جب دیکھو ' ٹوکو - ظلم جب کیا جائے ' روکو - اس کام میں ایک پادشاہ اور ایک مزدور ' دونوں برابر ہیں - " لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق " قاعدہ کلیہ ہے ' اور تواموا بالحق و تواموا بالصبر حکم عام و مطلق - کسی مخلوق کی ایسی اطاعت نہیں کی جاسکتی جس میں خالق کے حکم سے نافرمانی کرنی پڑے - اور یہ جو جابجا کہا کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے - تو یاد رہے کہ " اطاعت " نہ کرنے میں ' نہ کہ " اقتداء " نہ کرنے میں ' اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں - یعنی خلیفہ اسلام سے بغاوت نہ کرر - اسمیں جمعیت امت کیلیے بڑا ہی فتنہ ہے - یہ مطلب نہیں کہ برائی کی مخالفت اور حق کے اعلان میں فتنہ ہے - حق کا اعلان تو ہمیشہ اور ہر حال میں دنیا کیلیے نظم و امن ہے - وہ کبھی فتنہ نہیں ہو سکتا - اگر حق کی پکار فتنہ ہو جائے تو پھر نظام ہستی منقلب ہو جائے : و لو اتبع العقب اھوائهم ' فسادت السموات و الارض و من فیہن ! ( ۷۴ : ۲۳ )

گزارا ہے ' اسکو عہد جاہلیہ کہتے ہیں - پس مطالب یہ ہوا کہ عرب جاہلیہ کی طرح گمراہی پر موت ہوئی ( دوسری روایت میں ہے - اگر کوئی شخص اپنے امیر کو ایسی بات کرتے دیکھے جو اُسے پسند نہ آئے تو چاہیے کہ صبر کرے - اسکی اطاعت سے باہر نہر - کیونکہ جو کوئی سلطان اسلام کی اطاعت سے بالشت بھر بھی باہر ہوا اور اسی حالت میں مر گیا ' تر اسکی موت جاہلیہ کی حالت پر ہوئی - حضرت ابن عمر کی روایت میں ہے : " من خلع یداً من طاعة ' لقي الله يوم القيامة ولا حجة له ' و من مات رليس في عنقه بيعة ' مات ميتة جاهلية " جس نے خلیفہ کی اطاعت سے ہاتھ کھینچا ' یعنی اطاعت نہ کی ' تو قیامت کے دن وہ اللہ کے سامنے حاضر ہوگا اور اس کے لیے کوئی بچاؤ نہ ہوگا - اور جو مسلمان دنیا سے اس حال میں گیا کہ خلیفہ کی بیعت و اطاعت کے حلقہ سے اُسکی گردن خالی ہوئی ' تو یقین کرو کہ اسکی موت جاہلیہ کی موت ہوئی -

" من فارق الجماعة شبرا فکانما خلع ربقة الاسلام من عنقه " ( ترمذی ) جو جماعت سے بالشت بھر بھی باہر ہوا ' اس کا حکم یہ ہے کہ گویا اس نے اسلام کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا - ایک روایت میں ہے " دخل النار " ( اخرجه الحاكم علي شرط الصحيحين ) یعنی جو خلیفہ کی اطاعت سے باہر ہوا ' اُسکا تھکانا درزخ ہے -

" کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبياء - کلما هلک نبی ' خلفه نبی - و انه لا نبی بعدی - و سیکون خلفاء فیکثرون - قالوا - فما تاملنا ؟ قال - فوا بیعة الاول فالاول ' ثم اعطوهم حقهم ' فان الله یسألهم عما استرعاهم " ( متفق علیہ ) بنی اسرائیل کی رہنمائی و ریاست انبیاء کرتے تھے - ایک نبی گیا تو دوسرا اُسکی جگہ مامور ہوا - لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے - البتہ خلفاء ہونگے - لوگوں نے عرض کیا - ہم کو اُنکی نسبت کیا حکم ہوتا ہے ؟ فرمایا - جس سے پہلے بیعت کی یعنی جس کی حکومت پہلے مان لی گئی ' اُسکی اطاعت مقدم ہے - پھر کسی دوسرے کو خلیفہ نہ مانو - اور فرمایا - اُنکا تم پر جو کچھ حق ہے ' وہ اُنکے حوالے کرو - یعنی اُنکی اطاعت کرو - زکوٰۃ و خراج وغیرہ اُنہی کو دو -

انکے علاوہ بے شمار احادیث ہیں - اجماع کے شواہد اور کتب عقائد و فقہ کے اقوال نقل نہیں کیے گئے کہ مشہور و معروف ہیں ' اور احادیث کے بعد اُنکی ضرورت بھی نہیں -

والجور“ اور اسی لیے جمہور فقہا کا یہی مذہب قرار پایا کہ اگر حکام جور کو زکوٰۃ دی گئی تو ادا ہو گئی۔ ائمہ اہل بیت و عترۃ نے بھی قولاً و فعلاً اس سے اتفاق کیا جیسا کہ حضرت امام باقر (علیہ و علی آبائہ السلام) سے اصول میں منقول ہے۔ اور اسی لیے محققین امامیہ و فقہاء زیدیہ بھی اس فیصلہ میں جمہور کے ساتھ ہیں۔

( اذا بریخ الخلیفتین فاقتلوا اخرهما )

اگر ایک خلیفہ کی حکومت جم چکی ہے اور قائم ہے اور دوسرا مدعی کہتا ہو، تو اسکا حکم یہ ہے کہ وہ باغی ہے۔ فرمایا اُسے قتل کر دو۔ اُسکی زندگی تمام اُمت کے نظم و امن کیلئے فتنہ ہے۔ وہ اُمت میں پھوٹ ڈالنا اور جمے ہوئے انتظام کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔ والفتنة اشد من القتل۔ عن عرفة الاشجعي۔ قال سمعت صلعم یقول ”من اتاکم و امرکم جمیع علی رجل واحد“ یرید ان یشق عصاکم اریفرق جماعتکم“ فاقتلوه“ (احمد و مسلم)

اسی لیے جمہور اہل اسلام نے اتفاق کیا کہ خلیفہ خواہ اہل ہویا نا اہل، لیکن اگر اسکی حکومت قائم ہے تو جو اُس پر خروج کرے، اُسکا حکم باغی کا حکم ہے۔ اُس سے لڑنا اور اُسکی جماعت کو قتل کرنا جائز ہے بشرطیکہ تبلیغ و دعوتِ ارز دفعِ شرک کے بعد بھی باز نہ آئے۔ ایک گروہ نے کہا کہ نہ صرف جائز بلکہ بحکم فقاتلوا التي تبغي (۴۹ : ۹) واجب ہے۔ ”وقد حکي في البحر عن العترة جميعاً ان جهادهم افضل من جهاد الكفار الى ديارهم“ ان فعلهم في دالار الاسلام كفعل الفاحشة في المسجد“ (نیل الاوطار۔ جلد ۷ صفحہ ۸۰) یعنی تمام ائمہ اہل بیت و عترۃ سے منقول ہے کہ ایسے باغیوں سے جہاد کرنا کفار پر حملہ کرنے سے بھی افضل ہے۔

( اجماع امت و جمہور فقہاء و اعلام )

بنو امیہ کے امراء کی حکومت ظلم و بدعت کے ساتھ قائم ہوئی اور اسوقت ایک جم غفیر صحابہ کرام و ائمہ اہل بیت نبوت کا موجود تھا۔ عہد عباسیہ کی پوری پانچ صدیاں گزر گئیں اور یہی زمانہ تمام علوم شرعیہ کی تدریس و ترتیب کا تھا۔ تمام ائمہ و اعلام اور فقہاء مذاہب اسی عہد میں پیدا ہوئے اور عقائد و مسائل نے آخری ترتیب و تنظیم پائی۔ لیکن ان تمام عہدوں میں سب کا اتفاق اسی بات پر رہا جو اوپر گزر چکی۔ عقائد ضروریہ اور ارکانِ اربعہ کے بعد شاید ہی کسی اسلامی اعتقاد پر اس درجہ محکم

گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا - اسکی موت اسلام پر نہیں بلکہ جاہلیۃ پر ہوگی - اگرچہ نماز پڑھتا ہو ، روزہ رکھتا ہو اور اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو - مزید احادیث میں سے بعض روایات صحاح یہ ہیں :-

” من اطاعنی فقد اطاع اللہ “ و من اطاع امیری فقد اطاعنی ” و من عصی امیری فقد عصانی “ ( صحیحین عن ابی ہریرہ ) جس نے میری اطاعت کی ، اُس نے اللہ کی اطاعت کی ، اور جس نے میرے امیر کی ( یعنی میرے نائب کی ) اطاعت کی ، اسنے خود میری اطاعت کی ، اور جس نے امیر سے روگردانی کی ، اس نے میری اطاعت سے انکار کیا - یعنی امیر المؤمنین کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے - مسلم کی ایک روایت میں ” امیری “ کی جگہ صرف ” الامیر “ ہے - یعنی جو شخص مسلمانوں کا امام ہو ، اُسکی اطاعت -

” اِسمعوا و اطیعوا و ان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیبة “ ( صحیحین عن انس ) اگر ایک حقیر صورت حبشی غلام بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے ، تو چاہیے کہ اسکی سنو اور اطاعت کرو -

معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ بار بار اور کثرت سے خطبوں میں آپ فرماتے تھے - اسی لیے مختلف لفظوں میں اور مختلف مواقع کی نسبت مروی ہے - حجة الوداع کے عظیم الشان اور یادگار عالم موقعہ پر ( جبکہ در تین ماہ کے بعد آپ دنیا سے تشریف لیجانے والے تھے اور ایک آخری اور وداعی پیام دنیا کو سنا رہے تھے ) فرمایا ” و لو استعمل علیکم عبد یقودکم بکتاب اللہ ، اسمعوا و اطیعوا “ ( مسلم ) اگر ایک حبشی غلام بھی تم پر امیر بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ کے ساتھ تم پر حکومت کرے ، تو اُسکی سنو اور اطاعت کرو !

” من خرج من الطاعة و فارق الجماعة ، فمات ، مات میة جاہلیة “ و عن ابن عباس ” من رای من امیرہ شیئاً یکرهہ ، فلیصبر ، فانہ من فارق الجماعة شبرا ، فمات ، فمیة میة جاہلیة “ و فی لفظ ” فانہ لیس احد من الناس خرج من السلطان شبرا فمات علیہ ، الا مات میة جاہلیة “ ( متفق علیہ ) یعنی جس نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا ، خلیفہ کی اطاعت سے باہر ہو گیا ، اور اسی حالت میں بغیر توبہ کے مر گیا ، تو اُسکی موت جاہلیۃ کی موت ہوئی ( اسلام سے پہلے اہل عرب پر جو زمانہ

و اخرجہ ایضاً العرث بن رهب و اوردہ الحافظ فی التلخیص ' ر عن جابر بن عتیک مرفوعاً عند ابی داؤد بلفظ " سیاتیکم ركب مبغضون " فاذا اترکم فرحبوا بهم و خلوا بینہم و بین ما یتتغون۔ فان عدلو فلا نفسہم ' ر ان ظلموا ' فعلیہا "

ر عن رائل بن حجر۔ قال سمعت رسول اللہ صلعم و رجل یسألہ۔ فقال۔  
أرایت ان کان علینا امرأ یمنعونا حقنا و یسألونا حقہم ؟ قال " اسمعوا و اطیعوا " فانما علیہم ما حملوا ' و علیکم ما حملتم " ( مسلم و الترمذی و صحیحہ )

" علی المرء المسلم السمع والطاعة فیما أحب و کره " الا ان یومر بمعصیة ' فان امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة " ( شیخان و غیرہما عن ابن عمر )

سبکا خلاصہ رھی ہے جو اوپر گزر چکا۔ آخری روایت میں فرمایا۔ ایک مسلمان کا قرض ہے کہ خواہ گوارا ہو یا ناگوار، مگر امام کا کہا سننے اور ماننے۔ ہاں اگر وہ ایسا حکم دے جسکی تعمیل میں گناہ ہو، تو پھر اس حکم میں نہ ترسنا ہے اور نہ ماننا۔ کسی برے سے برے مخلوق کی خاطر بھی خدا سے نافرمانی نہیں کی جاسکتی۔ یہ اسلام کا، اور دراصل تمام سچی تعلیموں اور سچے انسانوں کا عالمگیر قاعدہ کلیہ ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ صدقات و زکوٰۃ وغیرہ مالیات کی ادائیگی کی نسبت حکم دیا گیا کہ اگرچہ وصول کرنے والے حکام ظالم و جابر ہوں، یا بیت المال کا روپیہ نا جائز طور پر خرچ کر رہے ہوں، لیکن اگر امام کی طرف سے مامور ہیں تو انکی اطاعت کرنی چاہیے۔ جس شخص نے زکوٰۃ ایسے عامل کو دیدی، اسکی زکوٰۃ ادا ہوگئی۔ البتہ قوم کو کوشش کرنی چاہیے کہ ایسے عامل معزول کیے جائیں۔ لیکن جب تک معزول نہوں، نظم شریعت کے قیام کیلئے ضروری ہے کہ انکے احکام کی تعمیل کی جائے۔ بشیر بن خصامہ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے کہا " ان قوماً من اصحاب الصدقة یعتقدون علینا " عمال صدقہ لینے میں ہم پر ظلم کرتے ہیں۔ کیا حق سے زیادہ نہ دینے میں انکا مقابلہ کریں ؟ فرمایا نہیں۔ ( ابو داؤد ) سعد بن رقاہ کی روایت میں فرمایا " ادفعوا الیہم ما صلوا " ابن ابی شیبہ میں حضرت ابن عمر کی نسبت ہے کہ کسی نے کہا۔ زکوٰۃ کسے دیں ؟ کہا رقت کے حاکم کو۔ سائل نے کہا " اذا یتخذون بها ثیاباً و طیباً " وہ تو زکوٰۃ کا روپیہ اپنے کپڑوں اور زینت میں خرچ کر دالتے ہیں۔ فرمایا " ر ان " اگرچہ ایسا کرتے ہوں مگر زکوٰۃ حاکم ہی کو دے۔ اسی بنا پر محدثین نے باب باندھا " برأۃ رب المال بالدفع الی السلطان مع العدل



ہے، ظالم ہے، جابر ہے، شرائط خلافت اُس میں نہیں پائے جاتے؟ تو اُس کی اطاعت کرنی چاہیے، یا اُس پر خروج کرنا چاہیے؟ وہ شرعاً خلیفۃ المسلمین ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اُس کے ماتحت وہ تمام کام انجام پاسکتے ہیں یا نہیں جو از روئے شرع خلیفۃ اسلام کی موجودگی پر موقوف ہیں؟ اُس کو زکوٰۃ دینی چاہیے؟ اُس کے پیچھے جمعہ پڑھنا چاہیے؟ اُس کے تمام احکام کی اطاعت کرنی چاہیے؟

یہ مسئلہ امت کی اجتماعی زندگی کا بنیادی مسئلہ تھا، اور ممکن نہ تھا کہ شریعت اُس کی پوری پوری تشریح و توضیح نہ کر دیتی۔ اس بارے میں نصوص سنۃ بے شمار اور بالکل واضح ہیں۔ اسی لیے جب خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کی حکومت جبر و استبداد کے ساتھ قائم ہوئی، تو صحابہ کرام کو اپنے طرز عمل کے فیصلے میں ذرا بھی تامل و تذبذب نہوا۔ بالکل اُس شخص کی طرح جو پہلے سے ایک خاص وقت کا سمجھا ہوا تھا، منتظر ہو، فوراً یکسوئی کے ساتھ فیصلہ کر لیا۔ جو کچھ انہوں نے بتلایا اور کیا، اُسی پر اجماع امت کی مہر لگ گئی، اور تیرہ سو برس سے جمہور اہل اسلام کا وہی متفقہ اعتقاد و عمل قرار پا گیا۔ بلاشبہ پہلی صورت میں بعض اسلامی فرقوں کو اختلاف ہوا، مگر دوسری صورت میں قولاً و فعلاً سب متفق ہو گئے۔

پہلی صورت میں شریعت نے اہلیت و صلاحیت کی وہ تمام شرائط اپنے انتہائی اور کامل مرتبہ میں قرار دی ہیں جو ایک ایسے مرکزی اور اہم ترین منصب کیلئے قدرتی طور پر ہونا چاہیئیں۔ کیا باعتبار قوت علمی کے۔ کیا بہ لحاظ قوت عملی کے۔ اور چونکہ یہ منصب متعدد حیثیتوں سے مرکب ہے، اس لیے ہر حیثیت کے لحاظ سے ضروری اوصاف بتلائے گئے۔ مثلاً اسلام، علم و نظر، عمل و تقویٰ، شجاعت و صولۃ، عدالت و ایثار، قدرت و نفوذ، طاقت و شوکت۔ چنانچہ تمام کتب عقائد میں صدیوں سے مسلمان پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں: ”ویشترط ان یکون من اهل الولاية المطلقة الكاملة بان یکون مسلماً، حراً، ذکراً، عاقلاً، بالغاً، سائساً بقوة، رائہ و رریتہ، و معونۃ باسہ و شوکتہ، قادراً بعلمہ و عدالتہ و کفایتہ و شجاعۃ علی تنفيذ الاحکام و حفظ حدود الاسلام، و انصاف المظلوم من الظالم عند حدوث المظالم“ الخ۔ کذا فی شرح المواقف، و النسفی، و التمهید، و شرح فقہ الاکبر للقراری، و شرح المقاصد۔ و من کتب المحدثین شرح عقیدہ ابن عقیل، و فتح الباری،

اسی طرح تمام ائمہ اہلبیت کا زمانہ خلفاء بنو امیہ و عباسیہ کے عہدوں میں گزرا۔ یہ معلوم ہے کہ وہ خلافت کا مستحق صرف اپنے ہی کو یقین کرتے تھے نہ کہ بنو امیہ و عباسیہ کو۔ با ایں ہمہ کسی نے بھی اُنکے خلاف خروج نہ کیا اور نہ اطاعت سے انکار کیا۔ سب اسی پر متفق ہوئے کہ حکومت اُنکی قائم ہو چکی ہے، اسی سے سلطان رقت رہی ہیں۔ خاندان اہل بیت میں سے جس کسی نے خروج کیا، ائمہ نے برابر اپنی مخالفت اُن سے ظاہر کی۔ جیسا کہ حضرت زید کے واقعہ اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے انکار سے ثابت و معلوم ہے۔ حضرت امام علی رضا کو مامون الرشید نے اپنا ولی عہد قرار دیا۔ امام موصوف نے ولی عہدی قبول کر لی۔ یعنی تسلیم کر لیا کہ مامون خلیفہ ہے، اور اُسکو اپنے استخلاف اور ولی عہدی کا حق پہنچتا ہے۔ اگر وہ خود خلیفہ نہ تھا تو دوسرے کو ولی عہدی کیونکر مل سکتی تھی؟ ائمہ اہل بیت کی پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی موجود نہیں کہ انہوں نے لوگوں کو بنو امیہ و عباسیہ کی اطاعت سے روکا ہو۔ بلکہ برخلاف اسکے کتب حدیث امامیہ (مثلاً اصول کافی وغیرہ) میں بے شمار تصریحات موجود ہیں کہ باوجود اظہار استحقاق خود، و شکوہ غصب و تعدی، عدم اطاعت و خروج سے ہمیشہ ممانع رہے۔

( سنی اور شیعہ دونوں متفق ہیں )

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ حضرات امامیہ اور اہل سنت میں مسئلہ خلافت کی نسبت جو مشہور اختلاف ہے، وہ پہلی صورت میں ہے، نہ کہ دوسری صورت میں۔ یعنی اس بارے میں ہے کہ اگر امت خلیفہ و امام منتخب کرے تو کس کو اور کیسے کو منتخب کرے؟ شیعہ کہتے ہیں کہ اسکا استحقاق صرف ائمہ اہل بیت کو ہے۔ دہی امام ہو سکتے ہیں۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ شرط ضروری نہیں۔ لیکن اگر اصلی نظام باقی نہ رہا ہو اور غلبہ و تسلط سے کوئی شخص اور خاندان اسلام کی مرکزی سلطنت پر قابض ہو گیا ہو، تو اُسکی اطاعت پر جس طرح اہل سنت کی تمام جماعتیں متفق ہیں، ٹھیک اُسی طرح شیعہ بھی متفق ہیں۔ اہل سنت کے نزدیک خلافت کی تمام شرطیں صرف خلفاء راشدین ہی میں جمع تھیں اور اُنکا انتخاب صحیح نظام شرعی کے مطابق ہوا تھا۔ اُنکے بعد پھر نہ ہوا۔ امامیہ کے نزدیک ابتدا ہی سے نہ ہوا۔ لیکن اطاعت دونوں عہدوں میں اہل سنت نے بھی ضروری قرار دی۔ شیعوں نے بھی ضروری قرار دی

# فصل

( شرائط امامت و خلافت )

تمام نصوص و دلائل کتاب و سنۃ اور اجماع امت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے شرائط امامت و خلافت کے بارے میں دو صورتیں اختیار کی ہیں۔ اور قدرتی طور پر یہی دو صورتیں اس مسئلہ کی ہوسکتی تھیں۔

اسلام نے اس بارے میں نظام عمل یہ مقرر کیا تھا کہ امام کے انتخاب کا حق امت کو ہے۔ اور طریق انتخاب جمہوری تھا نہ کہ شخصی و نسلی۔ یعنی قوم اور قوم کی اصحاب الرائے جماعت ( اہل حل و عقد ) کو شرائط و مقاصد خلافت کے مطابق اپنا خلیفہ منتخب کرنا چاہیے۔ بحکم و امرہم شوری بینہم۔ بنیاد تمام امور کی شرعا شوری یعنی باہمی مشورہ ہے۔ نہ کہ نسل و خاندان۔ خلافت راشدہ کا عمل اسی نظام پر تھا۔ خلیفۃ اول کا انتخاب عام جماعت میں ہوا۔ خلیفۃ دوم کو خلیفۃ اول نے نامزد کیا اور اہل حل و عقد نے منظور کر لیا۔ خلیفۃ سوم کا انتخاب جماعت شوری نے کیا۔ خلیفۃ چہارم کے ہاتھ پر خود تمام جماعت نے بیعت کی۔ نسل، خاندان، رلی عہدی، کو اسمیں کوئی دخل نہ تھا۔ اگر دخل ہوتا تو ظاہر ہے کہ خلافت خلیفۃ اول کے خاندان میں آجاتی، یا دوم و سوم کے خاندان میں، مگر ایسا نہیں ہوا۔ خلیفۃ دوم نے تو قوم کو بھی اسکا موقع نہ دیا کہ انکے لئے کو خلیفہ منتخب کرے۔ وصیت کردی کہ وہ کسی طرح منتخب ہی نہیں ہوسکتا۔

پس پہلی صورت یہ ہے کہ اگر صحیح نظام شرعی قائم ہو جو خالص جمہوری ہے، اور قوم کو اپنا خلیفہ منتخب کرنے کا موقع ملے، تو کیسا شخص منتخب کرنا چاہیے؟ اور اسمیں کیا کیا اوصاف ہونا چاہئیں؟

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر یہ نظام باقی نہ رہا ہو۔ قوم کی رائے اور انتخاب کو اسمیں دخل نہ ہو۔ محض طاقت اور تسلط کی بنا پر کوئی خاندان یا کوئی طاقتور فرد تخت خلافت پر قابض ہو جائے، تو اس صورت میں از روئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اگر وہ اہل نہیں

یقینی اجماع و تعامل<sup>۱</sup> ثابت کیا جاسکے۔ صحابہ کا حال معلوم ہے۔ مردان مدینہ کا گورنر تھا اور حضرت ابو ہریرہ مسجد نبوی میں موزن تھے۔ مردان کی عبادت سے بد ذوقی کا یہ حال تھا کہ سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہنا اور مقتدیوں کو شرکت کا موقعہ دینا بھی اسکی جلد بازی پر شاق گزرتا تھا۔ ابو ہریرہ اس سے وعدہ لے لیتے ”لا تغتبی بآمین“ قرأت میں ایسی جلدی نہ مچائیں کہ میری آمین ضائع جائے، لیکن نماز اُسی کے پیچھے پڑھتے اور اُسی اطاعت سے انکار نہ کرتے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ امراء بنو امیہ علانیہ ظلم و ستم کرتے تھے۔ بدعات کا یہ حال تھا کہ جس سنت کو چاہتے، اپنی ہوا نفس سے بدلالتے۔ لوگ اُنکی یارہ گوئی سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ عید کے دن خطبہ دیتے تو لوگ اُٹھ کر چلے جاتے کہ خطبہ عید کی سماعت واجب نہیں۔ یہ حال دیکھ کر مردان نے چاہا۔ عید کے دن نماز سے پہلے خطبہ دیدے تاکہ نماز کے انتظار کی وجہ سے مجبوراً لوگوں کو خطبہ سننا پڑے۔ حالانکہ یہ صریح سنت مستمرہ و اجماعی کے خلاف تھا۔ حضرت ابوسعید خدری نے بلا تامل اسپر توکا۔ ایسی بے شمار باتیں کی جاتی تھیں۔ صحابہ کرام نہایت بے باکی سے امر بالمعروف کا فرض ادا کرتے اور ہمیشہ ٹوکتے۔ لیکن خلیفہ اُنہی کو مانتے اور اطاعت اُنہی کی کرتے۔ کسی صحابی نے بھی اطاعت سے پہلے اسکی جستجو نہ کی کہ خلیفہ میں ساری شرطیں خلافت کی پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ اگر اسکی جستجو کرتے تو سب سے پہلی شرط یعنی بطریق انتخاب شرعی و شوری منتخب ہونا ہی مفقود تھا۔ باقی شرطیں تو سب اسکے بعد کے دیکھنے اور جانچنے کی ہیں۔ حضرت سید التابعین سعید بن المسیب کہا کرتے۔ بنی مردان انسانوں کو بھوکا مارتے ہیں اور کتوں کو گھلاتے ہیں (۱) اور پھر اُنکے ہاتھوں ہر طرح کے مظالم و شوائد بھی سہتے، مگر ساتھ ہی بہ حیثیت سلطان اسلام کے اُنہی کی اطاعت بھی کرتے۔ مامون و معتصم کے عہد میں علماء سنہ ۲۰۰ پر جو جو مظالم و شوائد ہوئے، معلوم ہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبل نے اسی کوزوں کی ضرب اور برسوں تک قید خانے میں رہنا گوارا کر لیا لیکن مامون و معتصم کی دعوۃ بدعت کی پیروی نہ کی۔ با ایں ہمہ اطاعت کا مستحق اُنہی کو سمجھا، اور اپنے نامۃ رصیۃ میں یہی لکھا ”و الدعاء لائمة المسلمين بالصلاح“ و لا تخرج علیہم بالسيف“ و لا تقاتل ہم فی الفتنة“ کذا نقل عنہ ابن الجوزی فی سیرتہ۔

ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اُسی کو خلیفہ اسلام تسلیم کرے ، اُسی کے سامنے گردن اطاعت جھکائے ۔ بالکل اُسی طرح ، جیسے ایک اہل و مستحق خلیفہ کے آگے جھکنا چاہیے ۔ اطاعت و اعانت کی وہ تمام باتیں جو منصب خلافت کے شرعی حقوق میں سے ہیں ، ایسے خلیفہ کو حاصل ہو جاتی ہیں ۔ اُس سے روگردانی کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں ۔ اُس کے مقابلے میں خروج اور دعوے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا ۔ اگرچہ کیسا ہی افضل اور جامع الشروط کیوں نہ ہو ۔ جو کوئی ایسا کرے ، مسلمانوں پر واجب ہے کہ اُس کے مقابلے اور قتل میں خلیفہ کا ساتھ دیں ۔ وہ شرعاً باغی ہے ۔ اُس کو قتل کر دینا چاہیے ۔

شریعت نے دوسری صورت میں یہ حکم کیوں دیا ؟ اسکی علت و مصلحت اسقدر واضح ہے کہ شرح و تفصیل کی حاجت نہیں ۔ شریعت اور اُمت کا قائم و باقی رہنا حکومت کے وجود و قیام پر موقوف تھا ۔ ساری باتیں شاخ ہیں ۔ جڑ یہی مقام و منصب ہے ۔ پس اس کے لیے ایک نظام شرعی مقرر کر دیا گیا جو بہتر سے بہتر نظام ہو سکتا ہے ۔ یعنی اسلامی حکومت کی بنیاد جمہور اور شوری کے انتخاب پر رکھی ۔ شخص ، نسل ، تسلط ، اقتدار ، اور پادشاہی و ملوکی کو اس میں دخل نہیں ۔ ساتھ ہی اس منصب کی اہلیت کیلئے تمام ضروری شرطیں اور صفتیں بھی بتلا دیں کہ اپنا خلیفہ بناؤ تو ایسے شخص کو بناؤ ۔ ایسے کو نہ بناؤ جو اُسکی اہلیت نہ رکھتا ہو ۔ پھر پورے زور کے ساتھ اسکا بھی اعلان کر دیا کہ لوگوں کو خود خلیفہ بننے اور امارت و سرداری حاصل کرنے کا خواہشمند نہ ہونا چاہیے ۔ نہ دعویدار بنکر دوسروں سے لڑنا چاہیے ۔ آنحضرتؐ ہمیشہ اس عہد پر لوگوں سے بیعت لیتے ” لا ینزع الا مراہلہ “ سرداری کا جو اہل ہوگا ، اسی پر سرداری چھوڑ دینگے ۔ دنیا اگر اس چھوٹے سے جملہ پر عمل کرے تو روئے زمین کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں ۔ امام بخاری نے کتاب الاحکام میں باب باندھا ہے ” ما یکرہ من الحرص علی الامارۃ “ ( ۱ ) اور

( ۱ ) حق یہ ہے کہ بقول علامہ ابن خلدون صحیح بخاری کی شرح و تفسیر کا قرض اب تک اُمت کے ذمہ باقی ہے ۔ بے شمار شرحوں اور حاشیوں کے بعد بھی یہ قول ویسا ہی صحیح ہے ، جیسا ابن خلدون کے عہد میں تھا ۔ اس کتاب کے علوم و دقائق کا کوئی احاطہ نہ کر سکا ۔ ہر کتاب ، ہر باب ،



سب سے زیادہ مشرح بحث حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں کی ہے ”وقد اجمع الفقهاء على رجوب طاعة السلطان المتغلب والجهاد معه“ ران طاعته خير من الخروج عليه لما في ذلك من حقن الدماء وتسكين الدهماء“ ولم يستثنوا من ذلك الا اذا وقع من السلطان الكفر الصريح فلا يجوز طاعته في ذلك بل تجب مجاهدته لمن قدر عليها كما في الحديث “ (جلد : ۲۱۲) •

حافظ نوارى شرح مسلم میں لکھتے ہیں ”وهذه الاحاديث في البحث على السمع والطاعة في جميع الاحوال“ وسببهما اجتماع كلمة المسلمين“ فان الخلاف سبب لفساد احوالهم في دينهم ودنياهم :- وقوله صلعم : ران كان عبد امجدع الاطراف - يعنى مقطوعها“ والمراد اخس العبيد - اے اسمع واطيع للامير ران كان دني النسب \* \* \* \* \* ويتصور امارة العبد ان ولاء بعض الائمة“ اريغلب على البلاد بشركته“ الخ - (جلد ۲ : ۱۲۵)

اور قاضي شوکانی درر البہیہ میں لکھتے ہیں ”وطاعة الائمة واجبة الا في معصية الله“ ولا يجوز الخروج عليهم ما اقاموا الصلوة“ (شرح درر : ۴۱۴) اور حجة الله البالغہ میں ہے ”ان الخليفة اذا انعقدت خلافته“ ثم خرج آخر ينازعه“ حل قتله“

اور ازالۃ الخفاء میں ایک مفصل اور دقیق بحث مسئلۂ خلافت و حقیقت خلافت پر کرتے ہوئے (جس سے بہتر اور جامع بحث شاید ہی کسی دوسری جگہ مل سکے) لکھتے ہیں ”وحرام ست خروج بر سلطان بعد ازان کہ مسلمین برے جمع شدند“ مگر آنکہ کفر بواج ازوے دیدہ شود“ اگرچہ آن سلطان مستجمع شرائط نہ باشد و این مضمون متواتر بالمعنی ست“ (جلد - ۱ : ۱۳۷)

حاصل ان تمام عبارتوں کا وہی ہے جو اوپر گزر چکا - یعنی ہر زمانے میں امت کیلئے ایک خلیفہ ہونا چاہیے جو صاحب طاقت و اقتدار ہو۔ اگر امت منتخب کرے تو اسکے لیے فلاں فلاں شرطیں ہیں - لیکن اگر کسی مسلمان کی حکومت قائم ہوگئی ہے اور وہی صاحب اقتدار و شوکت ہے تو اسی کو خلیفہ ماننا چاہیے۔ خواہ تمام شرطیں اُس میں پائی جائیں یا نہ پائی جائیں، اور اُسکی اطاعت و حمایت ہر مسلمان پر واجب ہے۔

و شرح منظومة الاداب ، و خلاصہ ابن مفلح ، و نیل الارطار ، و ربل المرام  
 للشوکانی ، و الاقناع و شرحہ ، وغیرہم - یعنی ایسے شخص کو خلیفہ منتخب کرنا  
 چاہیے جس میں حسب ذیل اوصاف پائے جائیں - مسلمان ہو ، آزاد ہو ،  
 مرد ہو ، عاقل و بالغ ہو ، صاحب رائے و نظر ہو ، تدبیر و انتظام کی پوری  
 قوت رکھتا ہو ، احکام شریعت کا محافظ ہو ، انکے جاری و نافذ کرنے اور  
 اسلامی ممالک کی حفاظت اور دشمنوں کی روک تھام کیلئے جس قدر علمی  
 و عملی قوتوں کی ضرورت ہے ، وہ سب اُس میں موجود ہوں - اتباع  
 شریعت ، عدل و انصاف ، شجاعت و ہمت ، شوکت و صولت ، ساری  
 صفتیں ہونی چاہیئیں -

جس وقت تک خاندان عباسیہ کی خلافت باقی رہی ، یعنی خلافت  
 خاندان قریش و عرب میں رہی ( سنہ ۶۴۰ ھ مطابق سنہ ۱۲۴۳ ع - تک  
 اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک بوجہ بقاء خلافت عباسیہ مصر )  
 علماء اسلام کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال رہا کہ بموجب حدیث  
 ” ان هذا امر فی قریش “ خلیفہ کو قرشی بھی ہونا چاہیے - یعنی اگر مسلمان  
 خلیفہ مقرر کریں ، تو جہاں آدر بہت سی باتیں اوسمیں ہونی چاہیئیں ،  
 وہاں یہ بات بھی ہو کہ خاندان قریش میں سے ہو -

اسی طرح جماعت امامیہ اس طرف گئی کہ خلافت آئمہ اہل بیت  
 نبوة کیلئے مخصوص ہے - انکے اعتقاد میں آنحضرت صلعم کے بعد حضرت علی  
 علیہ السلام کو خلیفہ ہونا چاہیے تھا - اور انکے بعد انکی نسل کے آئمہ عترت  
 رضی اللہ عنہم کو -

زیدیہ اس طرف گئے کہ بنی فاطمہ یعنی تمام سادات مستحق خلافت  
 ہیں - آئمہ عترت کی خصوصیت ضروری نہیں - اور شرطوں کے ساتھ صرف  
 اس قدر کافی ہے کہ امام سید یعنی بنی فاطمہ میں سے ہو -

لیکن دوسری صورت میں ( یعنی اگر نظام شرعی کی جگہ ملکی قبضہ  
 و تسلط کی صورت پیدا ہو جائے ، اور جمہور کو انتخاب و نصب کا موقع نہ ملے ،  
 تو اُس صورت میں از روئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے ؟ ) سو اسکی  
 نسبت چونکہ خود احادیث صحیحہ اور اجماع صحابہ و عترت بالکل صاف صاف  
 موجود تھا ، اسلئے تمام اُمت بلا اختلاف اس پر متفق ہو گئی کہ جب ایک  
 مسلمان منصب خلافت پر قابض ہو جائے اور اُسکی حکومت جم جائے ، تو

نتیجہ یہ نکلا کہ ایک قائم و نافذ اسلامی سلطنت کی اطاعت پر سنی و شیعہ دونوں متفق ہیں۔ یہی حال زیدیہ وغیرہ فرقوں کا ہے اور بجز خوارج کے کسی اسلامی فرقہ کو اس سے اختلاف نہیں۔

( بعض کتب مشہورہ عقائد و فقہ )

بہتر ہوگا کہ اس موقع پر چند مشہور کتب عقائد اور فقہ و حدیث کے اقوال بھی نقل کر دیے جائیں تاکہ جو لوگ علوم شرعیہ سے ناواقف ہیں انکو معلوم ہو جائے کہ یہ بات مسلمانوں کے عقائد کی ایک مانی ہوئی بات ہے اور تمام اسلامی مدرسوں میں صدیوں سے پڑھی پڑھائی جا رہی ہے۔ شرح مقاصد میں ہے : ” و اما اذا لم يوجد من يصلح ذالك “ ار لم يقتدر على نصبه لاستيلاء اهل الباطل و شوكة الظلمه و ارباب الضلال “ فلا كلام في جواز تقليد القضاء و تنفيذ الاحكام و اقامة الحدود و جميع ما يتعلق بالامام من كل ذي شوكة “ اور شرط امامت بیان کر کے لکھتے ہیں ” نعم “ اذا لم يقتدر على اعتبار الشرائط “ جاز الابتداء للاحكام المتعلقة بالامام “ على كل ذي شوكه تغلب او استولي “ اور اسی میں ہے ” فان لم يوجد من قرئش من يجمع الصفات المعتره “ ولي كناني “ فان لم يوجد “ فرجل من ولد اسماعيل “ فان لم يوجد فرجل من العجم “۔

مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے ” و اما الخروج عليهم و قتالهم “ فمحرم و ان كانوا فسقة ظالمين “ اور حدیث ” من اتاكم و امرکم جميع على رجل واحد “ کی شرح میں لکھتے ہیں ” ای له اهلية الخلافة “ ار التسلط و الغلبة “۔

شامی میں ہے ” و یثبت عقد الامامة اما باستخلاف الخليفة اياه كما فعل ابوبکر “ و اما ببيعة جماعة من العلماء ار من اهل الراے “۔

مسامرہ میں ہے ” و المتغلب تصح منه هذه الامور ( ای ولاية القضاء و الامارة و الحكم بالاستفتاء و نحوها ) للضرورة “ و صار الحال عند التغلب كما لم يوجد قرشي عدل “ اور وجد و لم يقدر ( ای لم توجد قدرة على توليته لغلبة الجورة ) اذ يحكم في كل من الصورتين بصحة ولاية من ليس بقرشي و من ليس بعدل للضرورة “۔

اور شرح مواقف میں امامت کی شرطیں بیان کر کے لکھتے ہیں :  
لكن للامة ان ينصبوا فاقد ها “ دفعا للمفاسد التي تندفع بنصبه “ ( ۶۱۴ )

نہیں آیا۔ یہ نظام تیس برس سے زیادہ قائم رہنے والا نہیں، اس لیے شرع و ملت کی حفاظت کیلئے ضروری تھا کہ نظام اصلی پر زور دینے کے

[ بقیہ نوت صفحہ ۴۵ ]

مفہوم ہے، اور جسکو قرآن حکیم اپنی اصطلاح میں ”حکمت“ سے تعبیر کرتا ہے۔ ترجمہ باب میں اس پر قرآن سے دلیل بھی لائے ”و من لم یحکم بما انزل اللہ فارلاک ہم الفاسقون“ حکم و قضا ”ما انزل اللہ“ کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر خلاف ہو تو فسق ہے۔ ”ما انزل اللہ“ کتاب و سنت ہے: ”یعلمہم الكتاب والحکمة“ پس ثابت ہوا کہ اعمال خلافت کی بنیاد حکمت و منہاج نبوت پر ہونی چاہیے۔ اس بارے میں جو زیادہ واضح و مفصل احادیث تھیں، وہ چونکہ انکی شروط کے مطابق نہیں لی جا سکتی تھیں، اور بنیاد استدلال کی صرف مرفوع ہی پر رکھتے ہیں، اس لیے آثار و موقوفات بھی نہیں لے سکتے تھے، پس مشہور حدیث ”لا حسد الا فی اثنتین“ الخ درج کر کے قضاء بالحکمة کی اہمیت و مطلوبیت واضح کر دی۔ جب یہ مقدمات طے ہو چکے، تو اب دکھلانا تھا کہ اس مرکز کی اطاعت کس طرح اُمت پر فرض کر دی گئی ہے؟ پس باب باندھا ”السمع و الطاعة للامام ما لم تکن معصیة“ اُمت کا سننا اور اطاعت کرنا امام کے حقوق میں سے ہے۔ بجز اُس حکم کے کہ معصیت ہو۔ اسمیں وہ تمام حدیثیں لائے ہیں جن میں صریح حکم موجود ہے کہ خلیفہ اہل ہو یا نا اہل، جامع الشرط ہو یا فاقد الشرط، عادل ہو یا جابر، مکروہات کا حکم دے یا محبوبات کا، جب تک وہ مسلمان ہے، نماز قائم رکھتا ہے، اُسکی اطاعت کرنی چاہیے۔ کسی مسلمان کیلئے اُسکی اطاعت سے باہر ہونا جائز نہیں۔ اس کے بعد بالترتیب تین باب آتے ہیں۔ ”من لم یسأل الامارة أعانہ اللہ“ دوسرا ”من سأل الامارة وکل الیہا“ تیسرا ”ما یکرہ من الحرص علی الامارة“ حاصل ان تینوں عنوانوں کا یہ ہے کہ جہاں شارع نے اُمت کو خلیفہ و امام کی ضروری صفتیں اور شرطیں بتلا دی ہیں، وہاں اس سے بھی روک دیا ہے کہ کوئی شخص خود امامت و سرداری کا خواہاں ہو اور اس کے لیے مقابلہ کرے۔ حتیٰ کہ عبد الرحمن بن سمرہ سے کہا ”جو اہل اور احق ہو، اُسی کا ساتھ دو۔ خود اپنے لیے خواہاں نہ ہو۔ اگرچہ اس کے لیے قسم بھی توڑنی اور کفارہ بھی دینا پڑے“ پس ان تمام ابواب کی یکے بعد دیگرے ترتیب سے واضح ہو گیا کہ اس بارے میں نظام شرعی کی اصلی ترتیب یہ ہے:

کی جماعت سے خارج ہو جاتا ہے ۔ لوگوں کا خواہ کچھ ہی قیاس ہو  
لیکن اللہ کے رسول کا صریح فیصلہ یہی ہے ، اور قرآن و سنت کے تمام  
احکام اسی کی تائید میں ہیں ۔

( واقعہ امام حسین علیہ السلام )

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر سلطان اسلام کو خلیفہ مان لینا  
چاہیے گو نا اہل ہو ، تو پھر حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزید بن  
معاویہ کی حکومت کے خلاف کیوں خرچ کیا ؟ اور کیوں انکو برسر حق  
اور شہید ظلم و جور تسلیم کیا جاتا ہے ؟

پس گربحث کے اس حصے کا طول بقیہ مطالب کی تشریح میں  
مخل ہو رہا ہے ، لیکن چونکہ اس معاملہ میں عام طور پر ایک سخت  
غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے ، اسلیے صاف کر دینا ضروری ہے ۔ یہ  
بالکل غلط ہے کہ حضرت امام حسین اُس حالت میں لڑے ، جبکہ وہ یزید کی  
حکومت کے مقابلے میں خود مدعی امامت اور طالب خلافت تھے ۔  
جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں ، انہوں نے واقعہ کربلا کا دقت نظر کے ساتھ  
مطالعہ نہیں کیا ۔ حالات میں اچانک ایسی تبدیلیاں ہوئی  
ہیں کہ اس غلط فہمی کا پیدا ہو جانا عجیب نہیں ۔ حضرت امام جب  
مدینہ سے چلے ، تو انکی حیثیت دوسری تھی ۔ جب کربلا میں  
حق پرستانہ لڑکر شہید ہوئے ، تو انکی حیثیت دوسری تھی ۔ دونوں  
حالات مختلف ہیں ۔ دونوں کا حکم شرعاً مختلف ۔ جب وہ مدینہ سے  
چلے ہیں تو حالت یہ تھی کہ نہ تو ابھی یزید کی حکومت قائم ہوئی تھی ۔  
نہ اہم مقامات و مراکز نے اسکو خلیفہ تسلیم کیا تھا ۔ ابتدا سے معاملہ  
خلافت میں سب سے پہلی آواز اور قرة انعقاد اہل مدینہ کی رہی ہے ،  
پھر حضرت علی کے زمانے میں مدینہ کی جگہ کوفہ دار الخلافۃ بنا ۔ لیکن  
اہل مدینہ اُسوقت تک متفق نہیں ہوئے تھے ۔ اور کوفہ کا یہ حال تھا کہ  
تمام مخلوق یکقلم مخالف اور حضرت امام حسین سے بیعت کرنے  
کیلئے پیہم اصرار و الحاح کر رہی تھی ۔ انہوں نے خود خلافت کی حرص  
نہ کی ، بلکہ ایک ایسے زمانے میں جب تخت حکومت سابق حکمران سے  
خالی ہو چکا تھا اور نئے کی حکومت ابھی قائم نہیں ہوئی تھی ، ایک بہت  
بڑی مرکزی و موثر آبادی ( یعنی کوفہ و عراق ) کے طلب و سوال کو منظور  
کر لیا ۔ البتہ اس منظوری میں یہ مصلحت بھی ضرور پیش نظر تھی کہ



ابو موسیٰ کی روایت لائے ہیں جس میں اپنے فرمایا : ” انا لا نولي هذا من سألہ “ ر لا من حرص علیہ “ جو شخص خود اس چیز کا طالب ہو یا اسکی حرص رکھتا ہو ، اسکو میں یہ کام سپرد نہ کرونگا ۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ جب لوگ خود طلب و حرص نہ کریں گے تو کشمکش اور مقابلہ بھی نہ ہوگا اور امت کیلئے نہایت آسان ہو جائیگا کہ اہل و اصالح کو منتخب کر لے ۔ مسئلہ خلافت کا اصلی نظام شرعی یہ تھا ۔ اگر یہ قائم ہو تو دنیا امن و سکون کی بہشت بن جائے ۔ لیکن چونکہ معلوم تھا کہ ابھی وہ وقت

[ بقیہ نوت صفحہ ۴۵ ]

ابواب کی ہر ترتیب ، اور ہر عنوان و ترجمہ ، اس فقیہ الارض و اعجوبۃ الدھر کی فقاہۃ ربانی کی ایک آیت باہرہ و حجتہ قاہرہ ہے ۔ اسی مسئلہ خلافت کو سامنے لاؤ ، اور دیکھو ، کس دقت نظر کے ساتھ محض ترتیب ابواب ہی میں اسلام کا نظام شرعی واضح کر دیا ہے اور ساری مشکلات حل کر دی ہیں ؟ سب سے پہلی بات یہ تھی کہ اسلام کا نظام مرکزیت اس بارے میں کیا ہے ؟ تو پہلا باب ” اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم “ کا باندھا ، اور ” من اطاع امیری فقد اطاعنی “ الخ کی روایت درج کر کے بتلادیا کہ مرکز کتاب اللہ ہے ، رسول ہے ، اور پھر خلیفہ و امام ہے ۔ ” اولو الامر “ خلیفہ کے سوا کوئی نہیں ۔ اسکی اطاعت ( بشرطیکہ کوئی خلاف شرع حکم نہ ہو ) مثل خدا و رسول کی اطاعت کے فرض ہے ۔ پھر باب باندھا ” الا مراء من قریش “ اور اسمیں ابن جبیر رالی روایت لائے ” ما اقاموا الدین “ جب تک قریش میں دین قائم رکھنے کی اہلیت بھیگی ، خلافت بھی انہی میں بھیگی ۔ یعنی واضح کر دیا کہ ایک خاص مدت تک قرشی خلافت کی پہلے سے خبر دیدی گئی ہے ، مگر خلیفہ کا قرشی ہونا کوئی شرط اصلی و تشریعی نہیں ۔ صرف پیشین گوئی ہے اور ” ما اقاموا الدین “ کے ساتھ مشروط ۔ اسکے بعد ایک نہایت ہی اہم اور دقیق نکتہ کی طرف متوجہ ہوئے اور باب باندھا ” أجرة من قضی بالحكمة “ افسوس اس باب کے ربط و ترتیب کی اصلی علت لوگ نہ سمجھتے ۔ منصب خلافت کے اثبات کے بعد یہ چیز سامنے آتی تھی کہ اعمال خلافت کی بنیاد کیا ہے ؟ اور اسکا طریق کس منہاج سے ماخوذ ہے ؟ امام صاحب واضح کرنا چاہتے ہیں کہ بنیاد اسکی طریق ” حکمت “ پر ہے ۔ یعنی انبیاء کرام کے طریق تربیت امم پر جو ” سنت “ کا اصلی اور وسیع

( من حمل علینا السلاح فلیس منا )

بخاری و مسلم میں ہے ” من حمل علینا السلاح فلیس منا “ ( رواہ ابن عمر و سلمہ و ابو موسیٰ الاشعری - و فی روایۃ سلمہ ” من سل علینا السیف “ ) یعنی جس مسلمان نے مسلمانوں کے مقابلے میں ہتھیار اٹھایا ( کفار کے ساتھ ہو کر ) یعنی حملہ کیا یا لڑائی کی ، وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے ۔

یہ حدیث نہایت اہم ہے اور من جملہ قواعد و کلیات کے ہے ۔ اسی لیے امام مسلم کتاب الایمان میں لائے تاکہ حقیقت ایمان و کفر کی تحقیق میں اس سے مدد لیں ، اور حافظ نواری نے ایک مستقل عنوان قرار دیکر باب باندھا ۔

آنحضرت صلعم کے طرز تکلم و خطاب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ” لیس منا “ اور ” لیس منی “ وعید کا ایک ایسا جملہ تھا جو ان موقعوں پر آپ استعمال فرماتے ، جہاں صریح و قطعی کفر کی جگہ کفر سے کوئی بہت ہی قریب اور اسلامی زندگی سے بہت ہی بعید حالت کا بتلانا مقصود ہوتا تھا ۔ عام معاصی و فسوق سے یہ حالت زیادہ سخت مگر کفر قطعی سے کم ہوتی تھی ۔ جن جن احادیث میں یہ لفظ آیا ہے ، ان سب پر غور کیا جائے ، اور ایمان و کفر کے عملی مراتب کی حقیقت بھی پیش نظر ہو ، تو یہ بات واضح ہو جائیگی ۔ صاحب شریعت نے جن کاموں کیلئے جو احکام دیے اور جو الفاظ استعمال کیے ، ہمیں حق نہیں ہے کہ تاویل و توجیہ کر کے انکے لغوی مفہوم کا اصلی زور و اثر گھٹانے کی کوشش کریں ۔ ایسی کوششیں جن لوگوں نے کیں ، انہوں نے مسلمانوں کو اسلام و ایمان کی عملی زندگی سے محروم کر دیا (۱) ۔ ” لیس منا “ کے صاف معنی یہ ہیں کہ ” وہ ہم میں سے نہیں “ یعنی مسلمانوں میں سے نہیں ۔ اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کی کسی جماعت پر بطور جنگ و قتال کے ہتھیار اٹھانا جبکہ وہ غیر مسلمانوں سے لڑ رہے ہوں ، ایک ایسا فعل ہے جسکے کرنے کے بعد انسان مسلمانوں میں شمار ہونے کے قابل نہیں رہتا ۔ مسلمانوں

( ۱ ) قال النواری ” و کان سفیان بن عیینہ یکرہ قول من یفسرہ بلیس منا بلیس علی ہدینا “ و یقول بئس هذا القول - یعنی بل یمسک عن تاریلہ “ ( شرح مسلم مطبوعہ احمدی - صفحہ ۶۹ )

نزاع کے اسلامی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور مزید جنگ و جدال اور کشت و خون کا سدباب ہو جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی غیر مستحق کی خلافت اور غیر نظام شرعی کے قائم ہو جانے سے بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر خلافت تسلیم نہ کی جائے، اُن پر خرچ کرنے کی اجازت دیدی جائے، اور اطاعت امت کا مستحق صرف اہل اور جامع الشروط خلیفہ ہی کو قرار دیا جائے، تو پھر دائمی کشت و خون، جنگ و قتال، دعوؤں میں تصادم، قوتوں میں تزاوم، ہمیشگی کی بد امنی، کبھی ختم نہ ہونے والی طوائف الملوکی اور انارکی، امت کی تباہی، ملکوں کی خرابی، نظام جماعت کا اختلال، احکام شرع کی تعطیل، مسلمانوں کے جان و مال کی بد امنی، اندرونی خانہ جنگی کی وجہ سے دشمنوں کا حملہ و تسلط، اور اسی طرح کی بے شمار ہلاکتوں اور بربادیوں کا ہمیشہ کیلیے دروازہ کھل جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اسکی امید بھی کی جاسکتی ہے کہ شاید ان بربادیوں کے بعد اصلی نظام خلافت قائم ہو جائے اور نا اہلوں کی جگہ کسی اہل اور جامع الشروط کو خلافت دلائی جاسکے۔ پہلی صورت میں مصلحت کا بقاؤ حصول، مگر خرابیوں کا امکان تھا۔

دوسری صورت میں خرابیوں کا وقوع، مگر مصالح کا امکان تھا۔

اسلام نے پہلی صورت اختیار کی، اور پوری قوت و اصرار کے ساتھ دوسری راہ مسدود کر دی۔ یعنی مصالح کے امکان پر اُنکے وقوع کو ترجیح دی۔

کیا دنیا میں ایک عقل صحیح بھی ایسی ملسکتی ہے جو شریعت کے اس فیصلہ کو غلط بتلائے؟ اللہ کی شریعت کا اصل اصول جلب مصالح اور دفع مفسد ہے۔ یعنی ہمیشہ فوائد حاصل کرنا اور مفسد کو دور کرنا۔ اور جب مصالح کے ساتھ مفسد بھی جمع ہو جائیں، تو جس راہ میں مصالح زیادہ ہوں اور خرابیاں کم، اُسکو اختیار کرنا۔ تمام احکام کا محور یہی اصل ہے۔ پس اگر پہلی راہ اختیار کی جاتی اور خلیفہ کی اطاعت کیلیے خلیفہ کا جامع الشروط اور بطریق صحیح منتخب ہونا شرط قرار دیدیا جاتا، تو اسکا کیا نتیجہ نکلتا؟ نصب و انتخاب کیلیے نظام شرعی درہم برہم ہرچکا تھا۔ ہر دماغ میں حرص و دعو، اور ہر ہاتھ میں تلوار تھی۔ یہی نتیجہ نکلتا کہ ایک عام طوائف الملوکی اور انارکی پھیل جاتی۔ ہر شخص یہ کہہ کر کہ خلیفہ اہل و مستحق نہیں ہے، بغاوت کیلیے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ تمام امت

پائی جاتی تھی، تو آرر بہت سی اہم شرطیں مفقود تھیں۔ بنیادی شرط یہ ہے کہ حکومت تلوار کے زور سے نہ منوائی جائے بلکہ امت کے انتخاب و اجماع سے ہو، سو یہ شرط کسی کی خلافت میں بھی نہ تھی۔ پھر خلیفہ کو عادل و منصف ہونا چاہیے۔ حکومت نظام شوریٰ کے ساتھ کرنی چاہیے۔ سنہ رسول اللہ اور سنت خلفاء راشدین پر عامل ہونا چاہیے۔ بجز عمر بن عبد العزیز کے کوئی بھی ان سب کا جامع نہ تھا۔ عباسیہ کے بعد حکومت عجمیوں کے ہاتھ آئی۔ آرر پھر مصر کے عباسی خلفاء کے بعد ترکوں کا خاندان عثمانیہ خلافت پر قابض ہوا۔ آخری مصری خلیفہ نے خود سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ خلافت بلا نزاع آج تک قائم اور تمام عالم اسلامی کیلئے شرع و امت کا مرکزی اقتدار ہے۔ اگر بنو امیہ و عباسیہ میں پانچ شرطیں نہیں پائی جاتی تھیں تو ان میں چہہ نہ سہی۔ یعنی یہ عرب بھی نہیں اور قرشی بھی نہیں۔ لیکن چونکہ سوال خلیفہ کے انتخاب کا نہیں ہے بلکہ ایک قائم و نافذ خلافت کے ماننے کا، اسلئے شرائط کی بحث یہاں کوئی اثر ہی نہیں رکھتی۔

منجملہ شروط خلافت کے ایک متفق علیہ شرط حریت کی ہے۔ یعنی خلیفہ آزاد ہو۔ غلام نہ ہو۔ مصلحت و ضرورت بھی اسکی ظاہر ہے، مگر معلوم ہے کہ تمام دنیا کی تاریخ میں صرف ایک مسلمانوں ہی کی تاریخ اسکی مثال پیش کر سکتی ہے کہ غلاموں نے امامت کی ہے، امارت کی ہے، پادشاہت کی ہے۔ اور تمام سادات و قریش اور عرب و عجم نے انکے آگے اطاعت کا سر جھکایا ہے۔ خود مشہور حدیث ہے ”اسمعوا و اطیعوا و ان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیہ“ اور روایت ابوذر عذہ مسلم کہ ”ان کان عبدًا مبدع الاطراف“ اور روایت ابن حصین کہ ”و لو استعمل علیکم عبد یقودکم بکتاب اللہ، اسمعوا لہ و اطیعوا“ یعنی اگر ایک ذلیل سے ذلیل حبشی غلام بھی تمہارا امیر ہو جائے تو اسکی سزا اور اطاعت کر۔ حافظ نواروی اسکی شرح میں لکھتے ہیں ”و المراد اخس العبد۔ ای اسمع و اطیع و ان کان دنی النسب“ حتی لو کان عبد اسود مقطوع الاطراف، فطاعته واجبة، و یتصور امارۃ العبد اذا ولاہ بعض الائمہ، و یرغلب علی البلاد بشوکتہ و اتباعہ، و لا یجوز ابتداء عقد الولاية لہ مع الاختیار، بل شرطها العبرۃ“ (جلد ۲ : ۱۲۵) یعنی یہ جو فرمایا کہ اگرچہ حبشی غلام ہو، تو مقصود اس سے یہ ہے کہ اگرچہ امیر نہایت ذلیل نسب و خاندان کا ہو، لیکن اگر

ساتھ اُن وقتوں کیلئے بھی صاف صاف احکام دیدیے جائیں ، جب انتخاب و نصب خلافت کے بارے میں شریعت کا ٹہرایا ہوا طریقہ باقی نہ رہے ، اور جمہوری حکومت کی جگہ شخصی و استبدادی طریقہ قائم ہو جائے ۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں دو ہی راہیں سامنے آتی تھیں ۔ اگر ایسے لوگوں کی خلافت تسلیم کر لی جائے تو اس سے اُمت کی جمعیت ، جان و مال کا امن ، ممالک اسلامیہ کی حفاظت ، احکام شرع کا اجراء ، جماعت کا قیام و بقا ، اور اسی طرح کے بے شمار مصالح و فوائد حاصل ہو جاتے ہیں ، کیونکہ بلا کسی

( بقیہ نوٹ صفحہ ۴۵ )

- ( الف ) اُمت کیلئے حسب نص ” و اری الامر منکم “ مرکز اجتماع و جماعت خلیفہ کا وجود ہے ۔ اسکی اطاعت فرض ہے ۔
- ( ب ) خبر دیدی گئی تھی کہ جب تک عرب و قریش میں صلاحیت رہیگی ، خلافت پر قابض رہینگے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔
- ( ج ) بنیاد معاملہ خلافت کی ” حکمت “ پر ہے ۔ وہ حکمت کہ و یعلمہم الكتاب و الحکمة ۔ یہ نیابت نبوت ہے ، اور اعمال و سنت نبوت ہی کا نام قرآن کی اصطلاح میں ” حکمت “ ہے ۔ پس ضرور ہے کہ خلیفہ کے تمام کاموں کی بنیاد ” سنت “ پر ہو ۔ بدعت و احداث پر نہ ہو ۔ یہی معنی خلافت علی منہاج النبوة ہیں ۔
- ( د ) جب خلافت منعقد ہوگئی تو تمام امت پر اسکی اطاعت فرض ہے ۔ فی ما احب و یکرہ ، ما لم یؤمر بمعصیة ۔
- ( ہ ) امت کو چاہیے کہ احق و اہل کو منتخب کرے ۔ لیکن مستحق کو نہ چاہیے کہ خود خلافت کی خواہش کرے ۔ جس نے ایسا کیا ، اللہ کے حضور شرمندگی پائیگا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب لوگ خود خواہش نہ کریں گے ، اور حق انتخاب جمہور کو ہے ، تو کسی طرح بھی کشمکش نہوگی ۔ نہ بہت سے دعویداروں میں باہم جھگڑا ہوگا ۔ امن و سکون کے ساتھ یہ معاملہ انجام پا جائیگا ۔

یہ تھا صحیح نظام شرعی ، جسکے علم و فہم کیلئے صرف صحیح بخاری ہی کافی ہے ، اور اسلام کی کونسی حقیقت ہے جسکے لیے صحیح بخاری کافی نہیں ؟ لیکن افسوس کہ نظام شرعی قائم نہ رہا ۔ مجلس شوریٰ کی جگہ میدان جنگ میں خلافت کا فیصلہ ہوا ، اور محض تسلط و جبر سے دعویدار قابض ہونے لگے ۔ چنانچہ پہلے ہی سے اسکی خبر دیدی گئی تھی ۔



یزید جیسے نا اہل کی حکومت سے اُمت کو بچایا جائے - لیکن جب وہ کوفہ پہنچے ، تو یکایک نظر آیا کہ حالت بالکل بدل چکی ہے - تمام اہل کوفہ ابن زیاد کے ہاتھ پر یزید کیلئے بیعت کر چکے ہیں ، اور سرزمین عراق کی وہ بے وفائی و غداری جو حضرت امیر کے عہد میں بارہا ظاہر ہو چکی تھی ، بدستور کام کر رہی ہے - یہ حال دیکھ کر معاملہ خلافت سے وہ بالکل دست بردار ہو گئے ، اور فیصلہ کر لیا کہ مدینہ واپس چلے جائیں - لیکن ابن سعد کی فوج نے ظالمانہ محاصرہ کر لیا اور مع اہل و عیال کے قید کرنا چاہا - وہ اس پر بھی آمادہ ہو گئے کہ مدینہ کی جگہ دمشق جائیں اور براہ راست یزید سے اپنے معاملے کا فیصلہ کرائیں ، مگر ظالموں نے یہ بھی منظور نہ کیا -

اب امام کے سامنے صرف دو راہیں تھیں - یا اپنے تئیں مع اہل و عیال قید کرادیں - یا مردانہ راز لڑ کر شہید ہوں - شریعت نے کسی مسلمان کو مجبور نہیں کیا ہے کہ ناحق ظالموں کے ہاتھ اپنے تئیں قید کرادے - انہوں نے دوسری راہ کمال عزیمت و دعوت کی اختیار کی ، اور خود فرشتانہ لڑ کر حالت مظلومی و مجبوری میں شہید ہوئے - پس جس وقت کربلا میں میدان جنگ گرم ہوا ہے ، اسوقت حضرت امام حسین مدعی خلافت و امامت نہ تھے - نہ اس حیثیت سے لڑ رہے تھے - انکی حیثیت محض ایک مقدس اور پاک مظلوم کی تھی جسکو ظالموں کی فوج ناحق گرفتار کرنا چاہتی ہے - وہ اپنے آپکو زندہ گرفتار کرادینا پسند نہیں کرتا ، اور طاقتور ظلم کے مقابلے میں حق کی بے سرومان استقامت کا ایک یادگار منظر دنیا کو دکھلا دینا چاہتا ہے - تعجب ہے کہ یہ غلط فہمی صدیوں سے پھیلی ہوئی ہے - جسکو مفصل اور محققانہ بحث دیکھنی ہو ، وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی منہاج السنہ جلد ۲ - کا مطالعہ کرے -

### ( شرط قرشیہ )

مندرجہ بالا فصول سے یہ بات واضح ہو گئی کہ انتخاب خلیفہ و امام کیلئے متعدد شرطیں ہیں - از انجملہ ایک عرصہ تک علماء کی رائے رہی کہ خلیفہ کو خاندانی قریش میں سے ہونا چاہیے - لیکن اگر اُمت کیلئے انتخاب کا موقعہ باقی نہ رہا ہو تو خلیفہ تسلیم کر لینے کیلئے بجز اسلام اور انعقاد حکومت ( یعنی حکومت کے جماؤ اور جگہ پکڑ لینے ) کے اور کوئی شرط نہیں ہے - خلفاء راشدین کے بعد سے جامع الشروط کوئی بھی سلسلہ خلافت قائم نہ ہوا - بنو امیہ و عباسیہ میں اگر ایک شرط قرشیہ کی

سب سے پہلے وہ حدیثیں سامنے آتی ہیں جن میں خلافت خاصہ و راشدہ کا ذکر کیا گیا ہے، اور چونکہ یہ خلافت تھیک تھیک طریق نبوت و سنت پر قائم ہونے والی تھی، اس لیے امت کو وصیت کی ہے کہ نہ صرف انکی اطاعت کی جائے بلکہ انکے تمام اجماعی باتوں اور کاموں کو مثل اعمال نبوت کے ”سنت“ سمجھا جائے اور اُسکی پوری طرح پیروی و تاسی کی جائے۔

چنانچہ مشہور حدیث عرباض بن ساریہ ”قام فینا رسول اللہ صلعم ذات یوم“ فوعظنا موعظة بلیغة“ رجلت منها القلوب و ذرفت منها العیون“ فقیل یارسول اللہ! و عظمتنا موعظة مودع فاعهد الینا بعهد - فقال علیکم بتقوی اللہ“ و السمع و الطاعة و ان کان عبداً حبشیاً“ و ستررن من بعدی اختلافاً شدیداً“ فعلیکم بسنتی و سنت الخلفاء الراشدین المہدیین - عضوا علیہا بالزواجذ“ (ابن ماجہ و ترمذی) اور حدیث ”خیر القرون قرنی“ ثم یلونہم“ الخ اور ”اما طبقتی و طبقة اصحابی فاعل علم و ایمان“ الخ رواہ البغوی عن انس و امثالہا“ اسی قسم میں داخل ہیں۔

خلاصہ انکا یہ ہے کہ آنحضرت (صلعم) نے خطبہ دیا اور فرمایا - میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو، اپنے امام کا حکم سناؤ اور مانو اگرچہ وہ ایک حبشی غلام ہو۔ اور دیکھو! میرے بعد بڑے سخت اختلافات پڑنے والے ہیں، پس چاہیے کہ فتنوں سے بچو اور ہمیشہ میری سنت اور میرے بعد کے جانشینوں کی سنت پر کاربند رہو، اور اسکو اسطرح مضبوطی سے پکڑ لو جیسے کوئی شخص دانتوں سے کوئی چیز پکڑ لیتا ہے۔ اور فرمایا: بہتر زمانہ میرا ہے، پھر وہ جو میرے بعد کا ہے۔ اور فرمایا: میرا اور میرے یاروں کا طبقہ علم اور ایمان کا طبقہ ہے۔ اسی طرح حضرت ابن مسعود کی حدیث ”ما من نبی بعثہ اللہ فی امتہ قبلی“ الا کان لہ حواریون و اصحاب، یاخذون بسنتہ و یقتدون بامرہ“ الخ (مسلم) میں بھی اسی عہد خلافت کا ذکر کیا گیا ہے۔

غرضکہ اس پہلے دور کیلئے دو حکم دیے گئے۔ ایک اطاعت کا، دوسرا اقتداء اور پیروی کا۔

لیکن اسکے بعد وہ حدیثیں سامنے آتی ہیں جن میں خلافت کے دوسرے دور کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس دور میں پہلا حکم تو بدستور باقی رہا، لیکن دوسرا حکم بالکل بدل گیا۔ یعنی اس دور کے خلفاء و سلاطین کی اطاعت کی

قائم کیا ہو ، بلکہ اس سے بڑھکر اسلام کے دامن صداقت پر کوئی دھبہ نہیں ہوسکتا کہ اُسپر کسی طرح کے بھی اختصاص نسل و قوم کی تہمت لگائی جائے ۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ امتیاز نسب کے جس بت کو توڑنا اُسکا سب سے بڑا کارنامہ ہو ، اُسی کے تکرار کو پھر جوڑنا اُسکی طرف منسوب کیا جائے ؟

تفصیل و دلائل کی ضرورت نہیں ۔ یہ بات ہر اُس شخص پر جو اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے ، روشن ہے کہ نسلی و خاندانی امتیازات کی نسبت عام اسلامی احکام کا کیا حال ہے ؟ اسلام کا ظہور عرب میں ہوا جنکے غرور قوم و نسب کا یہ حال تھا کہ وہاں کا ایک چرواہا اپنے نسبی و خاندانی شرف کے سامنے قیصر و کسریٰ کو بھی ذلیل و حقیر سمجھتا تھا ۔ - - عرب کے علاوہ بقیہ دنیا بھی طرح طرح کے قومی و وطنی امتیازات کی پرستش کر رہی تھی ۔ اسلام نے اپنی دعوت کی سب سے پہلی اور کاری ضرب اسی غرور نسل و قوم کے بت پر لگائی ، اور اللہ کے اس قانون فطرۃ کی مذاہب بلند کی کہ بنیاد ہر طرح کی فضیلت کی عمل ہے نہ کہ کوئی آدرش :

با ایہا الناس ! اذا خلقناکم من ذکر و انثیٰ و جعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ( ۱۴ : ۴۹ ) اور فرمایا : لا تزر رازرۃ رزر اخریٰ

و ان لیس للانسان الا ما سعی ، و ان سعیہ سوف یری ( ۵۳ : ۴۶ ) آنحضرت ( صلی اللہ علیہ وسلم ) کا زندگی بھر قول و فعل یہ رہا کہ ” لیس منا من دعی الی عصبیۃ “ اور ” لیس منا من قاتل علی عصبیۃ “ اور ” لیس منا من مات علی عصبیۃ “ و امثالہا ۔ یعنی وہ ہم میں سے نہیں جو نسل و قوم کی خصوصیت کے تعصب کی طرف لوگوں کو بلائے ۔ وہ ہم میں سے نہیں جو اس تعصب کی حالت میں دنیا سے جائے ۔ وہ ہم میں سے نہیں جو اس تعصب کی بنا پر لوگوں سے جنگ کرے ! دنیا کو چھوڑنے سے پہلے حجۃ الوداع میں جو آخری پیام امت کو سنایا ، اُس میں بھی سب سے پہلی چیز یہی تھی ۔ یعنی نوع انسانی کی عام مسارات کا اعلان : ” لا فضل لعربی علی عجمی “ و لا لعجمی علی عربی ۔ کلکم ابناء آدم “ اور فرمایا ” لیس لا حد فضل علی احد الا بدین و تقویٰ ۔ الناس کلہم بنو آدم “ و آدم من تراب “ یعنی اسلام کا ظہور و قیام نوع انسانی کی مسارات اور با ہمدگر

میں خون اور موت کی وبا پھیل جاتی - شہروں کا کوئی محافظ نہ رہتا - آبادیوں کا کوئی حاکم نہ ہوتا - نہ مجرموں کو کوئی سزا دینے والا ، نہ ڈاکوؤں سے کوئی بچانے والا - زکوٰۃ کس کو دی جاتی ؟ جمعہ کون قائم رکھتا ؟ سرحدوں کی کون حفاظت کرتا ؟ تمام عالم اسلامی ایک دائمی خانہ جنگی و بد امنی میں مبتلا ہو جاتا - امن و نظم ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتا - دشمنان اسلام ہر طرف سے اُمدد آتے - انکو روکنے کے لیے کوئی طاقت موجود نہ ہوتی - پس اگرچہ ایک نا اہل مسلمان کا خلیفہ ہو جانا برائی ہے ، لیکن اس سے بھی بڑھکر برائی یہ ہے کہ تمام ملک برباد ہو جائے - اسلام نے ملک و شرع کی حفاظت کو مقدم رکھا جو کلمی مصلحت کا حکم رکھتی ہے ، اور نا اہل و فاقد الشروط کا تسلط گوارا کر لیا جس کا فساد جزئی فساد ہے -

## فصل

( نصوص سنۃ و اجماع امت )

سب سے پہلے احادیث پر نظر ڈالنی چاہیے - اگر داعی اسلام ( صلی اللہ علیہ وسلم ) کی نبوت کی صداقت کی اور کوئی دلیل نہ ہوتی ، تو صرف یہی ایک بات بس کرتی تھی کہ آنے والے واقعات کی تمام تفصیلات کس طرح اول روز ہی بتلا دی گئیں ؟ اور ایک ایک جزئی حالت کا کیسا کامل نقشہ صدیوں پہلے کھینچ دیا گیا ؟ یہ معاملہ اسقدر یقینی اور ہر طرح کے شک و شبہ سے ماورا ہے ، کہ اگر دنیا اس پر یقین لانے کیلئے طیار نہیں ، تو دنیا کے پاس ماضی کی جسقدر معلومات موجود ہیں اُن میں سے کوئی بات بھی یقینی نہیں ہو سکتی - نہ تو اس دنیا میں سکندر نامی کوئی پادشاہ گزرا ، نہ روما نامی کوئی سلطنت قائم ہوئی ، نہ ہم بیسویں صدی کے انسان اس کے لیے مجبور ہیں کہ نپولین کا وجود اور رائٹر لو کی جنگ کا وقوع تسلیم کر لیں !

بہر حال احادیث کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہونے والے واقعات پیشتر سے معلوم تھے - ہر حالت اور ہر وقت کیلئے صاف صاف حکم دیدیا گیا تھا - احادیث کے اس حصہ کا نہایت دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیے - ہر دور کی خاص حالت ہے اور اسلیئے اسی کے مطابق خاص حکم ہے -

امیر ہو گیا ہے تو اطاعت کرر - اور اسی بنا پر غلام امیر ہو سکتا ہے اگر نسی امام نے مقرر کر دیا ہو - یا خود وہ شہروں پر غالب آ کر مسلط ہو گیا ہو - البتہ جائز نہیں کہ ابتدا میں کسی غلام کو امیر منتخب کیا جائے - کیونکہ آزاد ہونا شرائط امامت میں سے ہے

جب غلبہ و تسلط کی صورت میں خود حافظ نوابی ( جو شرط قرشیہ کے سب سے بڑے حامیوں میں سے ہیں ) نص حدیث کی بنا پر تسلیم کرتے ہیں کہ ایک دنیٰ النسب ، خسیس الحال ، حبشی غلام امیر ہو سکتا ہے اگرچہ آزاد ہونا شرط ابتدائی ہے ، تو پھر ظاہر ہے کہ ایک غالب و مسلط اور منظم و قائم خلیفہ کی خلافت کیلئے شرط قرشیہ کا موجود نہ ہونا کیوں مغل ہو اگرچہ قرشیہ ایک شرط ابتدائی مان لی جائے ؟

پس یہ مان لینے کے بعد بھی کہ قرشی ہونا شرائط شرعیہ میں سے ہے ، ترکان عثمانی کی خلافت مسلمہ و منعقدہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا ، اور شرائط کی پوری بحث موجودہ مسئلہ سے یکقلم غیر متعلق ہے ، تاہم تحقیق مقام کے خیال سے بہتر ہے کہ اس شرط کی حقیقت پر بھی ایک فیصلہ کن نظر ڈال لی جائے -

سوراضح ہو کہ جہانتک قرآن و سنت اور آثار صحابہ کے دلائل کا تعلق ہے ، کوئی نص قطعی موجود نہیں جس سے ثابت ہو کہ اسلام نے معاملہ خلافت و امامت صرف خاندان قریش کیلئے شرعاً مخصوص کر دیا ہے - احادیث اس بارے میں جسقدر موجود ہیں ، سب صحیح ہیں - یہ بھی حق ہے کہ حضرت ابوبکر نے مجمع صحابہ میں اسکو پیش کیا اور کسی نے انکار نہ کیا - یہ بھی حق ہے کہ صحابہ میں ہمیشہ اس بات کی شہرت رہی - یہ بھی غلط نہیں کہ جب تک خاندان عباسیہ باقی رہا ، لوگ اسکو بطور ایک شرط کے سمجھتے رہے - با ایں ہمہ ان ساری باتوں کی حقیقت وہ نہیں ہے جو اب سمجھی جاتی ہے - ان ساری باتوں کے سچ ہونے کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اسلام نے خلافت کو نہ کسی قوم میں مخصوص کیا ، نہ کسی خاندان میں ، اور نہ کسی خاص نسل میں - اسلام جو اس طرح کی تمام قومی و نسلی امتیازات کے مٹانے اور ہمیشہ کیلئے صرف انسانیت کی بے قید و عام عظمت کے قائم کرنے اور ” عمل “ کے قانون الہی کے آخری اعلان کیلئے آیا تھا ، اُسکی نسبت ساری باتیں مان لی جاسکتی ہیں لیکن یہ محال ہے کہ اُس نے خاندان و نسل کا کوئی امتیاز



کہ ہر حال اور ہر طرح کی زندگی میں امام کی اطاعت کریں گے - حکومت و سرداری کو اس کے کرنے والوں پر چھوڑ دینگے ، اور کبھی اس بارے میں کوئی

( بقیہ نرت صفحہ ۵۲ )

بہتوں کو یہ لغزش ہوئی کہ ” اطاعت “ اور ” اقتدا “ کا فرق نہ سمجھے - جن حدیثوں میں ” اقتدا “ کی ممانعت بلکہ خلاف کرنے کا حکم پایا ، انکو منع اطاعت اور جواز خروج پر معمول کر لیا - خوارج اور معتزلہ کے ایک گروہ کو یہی دھوکا ہوا - ایک دوسری جماعت نے یہ غلطی کی کہ حکم اطاعت کو عام مطلق سمجھ لیا ، اور منع اقتداء و تاسی اور رجوب امر بالمعروف نے جو تخصیص کر دی تھی ، وہ انکی سمجھ میں نہ آئی - یعنی اس دھوکے میں پڑ گئے کہ جب امراء و حکام کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے ، خواہ انکے اعمال کیسے ہی خراب ہوں ، تو پھر چاہیے کہ نہ کسی برائی پر توکیں ، نہ منکرات کے خلاف جد و جہد کریں - ہر حال میں چپ چاپ بیٹھ کر اطاعت کرتے رہیں - یہ جو صدیوں سے علماء و مشائخ نے اصحاب اقتدار کے خلاف امر بالمعروف یکقلم ترک کر دیا ہے ، تو نفس خادع انکو بھی یہی دھوکا دے رہا ہے - بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے - ان لوگوں نے چونکہ ” اطاعت “ اور ” اقتدا “ کا فرق نہیں سمجھا ، اور دیکھا کہ پادشاہوں اور امیروں کو برائی پر توکنے اور انکے خلاف حق کے اعلان میں بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں ، اسلیے اس دھوکے میں پڑ گئے کہ یہی مصائب فتنہ ہیں - پس اس فتنہ سے بچنا چاہیے - نتیجہ یہ نکلا کہ حق و باطل میں کوئی تمیز باقی نہ رہی - تمام زبانیں گونگی اور تمام دل مردہ ہو کر رہ گئے -

حالانکہ دونوں جماعتوں نے تھوکر کھائی - دونوں نے حدیثوں کا صحیح مورد اور محل نہ سمجھا -

ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان کسی کو اپنا قومی پادشاہ مان لیں ، اور ایک پادشاہ کی جیسی فرماں برداری رعایا کو کرنی چاہیے ، ٹھیک ٹھیک ویسی ہی فرماں برداری بجالائیں - کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے ثابت ہو کہ اسے اپنا حاکم نہیں سمجھتے - اسکا نام ” اطاعت “ ہے -

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی انسان کو اپنے دینی و اخلاقی اعتقاد و عمل میں پیشوا مان لینا ، اور راستی و ہدایت کے اعتبار سے اسکی

بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی (رض) کا جو حال تھا، معلوم ہے۔ بلال کو عمر فاروق جیسے قرشی نے ”ہمارا آقا و سردار“ کہا۔ اور صہیب کو دیکھتے تو کہتے ”نعم العبد صہیب! لو لم یخف اللہ لم یعصہ“ مرنے کے وقت وصیہ کی کہ نماز جنازہ بھی پڑھائیں۔ سلمان کا یہ حال تھا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ”سلمان منا اہل البیت“ اسی چیز کا نتیجہ تھا کہ ایک صدی کے اندر ہی اندر عرب کی نسلی عصبیہ کا نام و نشان باقی نہ رہا، اور وہ زمانہ آگیا جب بزرگی و فضیلت کے ہر میدان میں سرداری و ریاست عجمیوں اور غلام زادوں کے ہاتھ میں تھی۔ عرب انکے علم و عمل کے آگے اسی طرح جھکے ہوئے تھے، جس طرح ایک قرشی و ہاشمی کے آگے جھک سکتے تھے۔ حتیٰ کہ خلیفہ ہشام بن عبد الملک کو امام زہری سے کہنا پڑا ”واللہ لیسودن الموالی العرب“ و یخطب لہم علی المنابر، و العرب تحتہم!“

پھر کیا ایسی حالت میں ایک لمحہ کیلیے بھی بارر کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کا داعی تمام دنیا کو تو قومی و نسلی امتیازات کی غلامی سے نجات دلانا چاہتا ہو اور مسارات عامہ کی طرف بلا رہا ہو، لیکن (نعوذ باللہ) خود اس درجہ خود غرض ہو کہ قیامت تک کیلیے پادشاہی و خلافت کو صرف اپنے ہی ملک کیلیے، اور اپنے ملک ہی کیلیے نہیں، خاص اپنے ہی وطن کیلیے، اور صرف اپنے وطن ہی کیلیے نہیں، خاص اپنے قبیلے کیلیے، اور پھر صرف قبیلہ ہی کیلیے نہیں، بلکہ صرف اپنے ہی خاندان کیلیے مخصوص کر دے؟ وہ ساری دنیا سے کہے کہ تمہارے سارے بڑے ہوئے حق جھوٹے ہیں۔ سچا حق صرف عمل اور اہلیت کا ہے۔ لیکن خود اپنے لیے یہ کر جائے کہ نہ تو عمل اور نہ اہلیت، بلکہ صرف قوم، صرف نسل، اور صرف خاندان؟

کیا اسلام کیلیے اس سے بھی بڑھ کر کوئی عجیب بات ہو سکتی ہے؟

خیر، یہ بات کتنی ہی عجیب ہوتی، لیکن ہم بارر کر لیتے اگر فی الحقیقت قرآن و سنت نے واقعی تہرادی ہوتی۔ ہمارے نزدیک کسی اسلامی اعتقاد کی صحت و عدم صحت کا معیار صرف یہ ہے کہ کتاب و سنت سے بطریق صحیح ثابت ہو۔ نہ کہ ہماری عقلوں اور

تو ایسی ہی وصیت کی جاتی ہے ' جیسے پہلے در کیلیے کی گئی ہے ' لیکن انکے کاموں کی پیروی اور اقتداء کا حکم نہیں دیا جاتا ' بلکہ بتدریج ترک اقتداء و مخالفت کا حکم دیا جاتا ہے - اس سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اس در میں جو لوگ خلافت پر قابض و متسلط ہونگے ' انکی خلافت شریعت کے مطلوبہ نظام پر نہ ہوگی - نہ انکا چلن قرآن و سنت کے مطابق ہوگا - اُن میں اچھے بھی ہونگے - اور برے بھی - اسلیے امت کو اب صرف اطاعت کا اور انکی خلافت کے آگے سر جھکا دینے کا حکم دیا جاتا ہے - انکے طور طریقوں کی پیروی کرنے اور انکے کاموں کو شرعی کام سمجھ لینے کا حکم نہیں دیا جاتا - بلکہ اس بات کی بھی وصیت کی جاتی ہے کہ جب وہ لوگ برائیاں پھیلائیں ' تو جس کی طاقت جہاں تک کام دے ' برائیوں کے روکنے کی پوری کوشش کرے - ہاتھ سے کام لے - زبان کو حرکت میں لائے - یہ دونوں درجے نصیب نہ ہوں تو کم از کم دل ہی دل میں برائی کو برا سمجھے - " وذلک اضعف الایمان " - لیکن برے کاموں کو انکی حکومت کے دباؤ سے اچھا نہ سمجھ لے اور نہ اُن کا ساتھ دے - " و لیس راء ذلک من الایمان حبة خردل " ( ۱ )

عن عبادة بن الصامت - قال " بايعنا رسول الله صلعم على السمع والطاعة في منشطنا و مكرهنا و عسرنا و يسرنا و اثرة علينا " و ان لا ننازع الامر اهله ' الا ان تروا كفرا بواحا عندكم فيه من الله برهان " متفق عليه - عبادة بن الصامت کہتے ہیں - ہم سے رسول اللہ ( صلعم ) نے اس بات پر بیعت لی

( ۱ ) احادیث کا یہ حصہ نہایت اہم اور غور طلب ہے - مختلف حدیثوں میں مختلف دروں اور لوگوں کا ذکر ہے ' اسلیے احکام بھی مختلف ہوئے - اس نکتہ پر جسکی نظر نہ گئی وہ احکام و علائم کو مختلف و متضاد دیکھ کر یا تو حیران رہ گیا - یا سخت غلطیوں سے دوچار ہوا - عہد نبوة سے لیکر آخر تک مختلف دور آنے والے تھے - ہر دور کے خصائص و حالات دوسرے سے مختلف تھے - پس انکے احکام میں بھی اختلاف ضروری تھا پوری دقت نظر کے ساتھ احادیث کا مطالعہ کرنا چاہیے - پہلے انکے باہمی مشترکات و مختلفات کو الگ الگ کر دینا چاہیے - پھر ہر حدیث اور ہر حکم کو اُسکی صحیح جگہ دینی چاہیے - ایسا نہ کرنے سے لوگوں کو بڑی بڑی غلط فہمیاں ہوتی ہیں -

برابری کا اعلان ہے ۔ اب نہ کسی عرب کو عجمی پر ، اور نہ کسی عجمی کو عرب پر ملک و قوم کی وجہ سے فضیلت مملسکتی ہے ۔ سب ایک ہی آدم کی اولاد ہیں ، اور وہی سب سے بڑا ہے جو عمل میں بڑا ہو ۔

عملاً یہ حال تھا کہ آپؐ اپنی زندگی میں سب سے آخری اور ذمہ داری کے لحاظ سے نہایت اہم فوجی مہم جو بھیجی ، اسکی سرداری آسامہ بن زید کو دی ، اور معلوم ہے کہ زید آپؐ کے غلام تھے ۔ بعضوں پر یہ بات گراں گزری تو فرمایا ” لقد طعنتم فی امارۃ ایہہ و قد کان لہا اہلاً “ ان آسامہ لہا اہل “ تم لوگ پہلے زید کی سرداری پر بھی طعن کر چکے ہو حالانکہ وہ اس کام کا اہل تھا ، اور اب آسامہ سردار بنایا گیا ہے اور وہ اس کام کا اہل ہے ۔ ” اہل “ کے لفظ پر زور دیا ۔ یعنی طعن بیکار ہے کیونکہ بنیاد معاملہ امارت و سرداری کی صرف اہلیت و قابلیت ہے ۔ اور کوئی نہیں ۔ حضرت عائشہ کا قول مشہور ہے ” لو کان زید حیاً ، ما استخلف رسول اللہ غیرہ “ ( ۱ ) آسامہ کو جس لشکر کی سرداری دی گئی ، جانتے ہو اسمیں کیسے کیسے لوگ ماتحت کیے گئے تھے ؟ بڑے بڑے مہاجرین و قریشی ۔ جن میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق کا نام نظر آتا ہے ۔ ( وہی ابوبکر ( رض ) جو چند دنوں کے بعد رسول اللہ کے جا نشین ہونے والے ہیں !

بندۂ عشق شدی ، ترک نسب کن جامی

کیں دریں راہ فلان ابن فلاں چیزے نیست !

( ۱ ) اللہ اللہ ! اس بارے میں اسلام و پیروان اسلام کے معاملات کیسے خود فروشانہ و عجیب رہے ہیں ؟ آج مسلمانوں کو جو طرح طرح کے خاندانی امتیارات و تفریقات کی بت پرستانہ پرستش کر رہے ہیں ، کیونکر یاد دلایا جائے کہ ایک زمانے میں بحز اللہ اور اُسکے رسول کے رشتہ کے نہ کوئی رشتہ مقبول تھا ، نہ عمل کی بزرگی کے سوا کوئی بزرگی تسلیم کی جا سکتی تھی ۔ حضرت عمر کے زمانہ خلافت کا ایک واقعہ مجھے نہیں بھولتا ۔ اُنکے لڑکے عبد اللہ نے ایک بار شکایت کی کہ تقسیم اموال وغیرہ میں آسامہ بن زید سے مجھے کم درجہ پر کیوں رکھا جاتا ہے ؟ حضرت عمر نے کہا ” کان ابوہ احب الی رسول اللہ من ابوک ، و کان احب الی رسول اللہ منک “ اسلیے کہ تیرے باپ سے زیادہ اُسکا باپ اللہ کے رسول کو پیارا تھا ، اور اسلیے کہ وہ خود بھی تجھ سے زیادہ رسول اللہ کے نزدیک محبوب تھا !

کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت سے نہ روک سکیگی - یعنی جب تک امام سے صریح کفر نہ سرزد ہو، ہر حال میں اُسکی اطاعت واجب ہے -

”خيار ائمتكم الذين تحبونهم و يحبونكم“ و تصلون عليهم و يصلون عليكم“ و شرار ائمتكم الذين تبغضونهم و يبغضونكم“ و تلعنونهم و يلعنونكم“ قال قلنا افلا نذا بذ هم عند ذلك؟ قال ”لا“ ما اقاموا فيكم الصلوة“ الا من ولي عليه زال فراه شيئاً من معصية الله فليكره ما يأتي من معصية الله“ و لا ينزعن يداً من طاعة“ رواه احمد و مسلم -

و عن حذيفة أنه ( صلعم ) قال ”يكون بعدي أئمة لا يهتدون بهدي ولا يستنون بسنتي“ و سيقوم فيكم رجال قلوبهم قلوب الشياطين في جحيمان انس“ - قال قلت ”كيف اصنع يا رسول الله ان أدركت ذلك“؟ قال ”تسمع و تطيع و ان ضرب ظهرك و اخذ مالك فاسمع و اطع“ رواه مسلم و احمد -

یعنی فرمایا : تمہارے بہتر حاکم وہ ہیں کہ اُنکی محبت تمہارے دلوں میں ہو اور تمہاری اُنکے دلوں میں - تمہاری زبانوں سے اُنکے لیے رحمت کی دعا نکلے اور اُنکی زبانوں سے تمہارے لیے - اور بدترین حاکم وہ ہیں کہ تمہارے دلوں میں اُنکی دشمنی ہو، اور وہ تمہیں دشمن سمجھتے ہوں - تم اُن پر لعنت بھیجو - وہ تم پر - صحابہ نے عرض کیا - یا رسول اللہ ! کیا ایسے حاکموں سے ہم نہ جھگڑیں؟ فرمایا نہیں - جب تک وہ تم میں نماز قائم رکھیں - اُنکی اطاعت ہی کرر - ہاں جو بات گناہ کی دیکھو اُسے پسند نہ کرر مگر امام کی طاعت سے ہاتھ نہ کھینچو - نیز فرمایا - میرے بعد ایسے امام ہونگے جو میرا طور طریق چھوڑ دیں گے - میری سنت پر نہیں چلیں گے - عنقریب تم پر ایسے لوگ حکمراں ہونگے کہ اُنکا جسم تو انسانوں کا ہوگا مگر دل شیطان کا سا - راہی نے پوچھا - اگر ہم نے ایسا زمانہ پایا تو کیا کریں؟ فرمایا - سزاوار اطاعت کرر - اگر وہ تمہاری پیٹھ پر تازیانے لگائیں اور تمہارا مال چھین لیں، جب بھی اُنکی سزاوار اطاعت کرر!

”ستكون بعدي اثرة و امور تذكرونها“ قالوا - فما تأمرنا؟ قال ”تؤدرون الحق الذي عليكم“ و تسألون الله الذي لكم“ متفق عليه عن ابن مسعود“ و اخرجه ايضاً الحرث بن وهب و أورده الحافظ في التلخيص“ و عن جابر بن عتيك مرفوعاً عند ابي داود بلفظ ”سيأتيكم ركب مبغضون“ فاذا اتوكم فرحبوا بهم و خلوا بينهم و بين ما يبتغون - فان عدلوا“ فلا نفسمهم“ و ان ظلموا“ فعليهم“



کی نظریں اُسی پر اُٹھتی تھیں۔ جب تک مکہ فتح نہوا اور قریش مسلمان نہ ہوئے، تمام عرب کے قدم رکے رہے۔ جونہی قریش مسلمان ہوئے، سب نے اُنکی پیروی کی، اور اپنے اپنے وفد بھیجنا شروع کر دیے۔ حتیٰ کہ تمام عرب مسلمان ہو گیا۔ پس فرمایا ”الناس تبع لقریش“ لوگ جاہلیہ اور اسلام، دونوں حالتوں میں قریش کے تابع ہوئے۔ رہ بگڑے رہے تو سارا عرب بگڑا رہا، رہ سنورے تو سب سنور گئے۔ اور یہ بالکل حق و معلوم ہے۔ ہمیشہ اور ہر ملک میں سردار جماعتوں اور بڑے لوگوں کا ایسا ہی اثر تمام ملک پر ہوتا ہے۔ اچھی بری، ہر طرح کی باتوں میں لوگ اُنہی کی پیروی کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکر کی روایت سے یہی حدیث مسند امام احمد میں یوں مروری ہے ”بر الناس تبع لبرہم“ و فاجرہم تبع لفاجرہم“ اور بیہقی نے حضرت علی سے روایت کیا ”کان هذا الامر فی حمیر فنزعه الله منهم وجعله فی قریش“ لیکن اس سے یہ کہاں نکلا کہ مسلمانوں کا خلیفہ بجز اُنکے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا؟ اسلام صرف عرب ہی کا اسلام نہ تھا جس میں ممتاز قریش تھے۔ اسلام تمام عالم کیلئے اسلام ہے جسکی سرداری و ریاست صرف علم و عمل حق ہی کو مل سکتی ہے، اور یہ سرداری اسلام ہی نے دلائی ہے!

امام مسلم نے جابر بن سمرہ سے ایک اور حدیث روایت کی ہے: ”ان هذا الامر لا ینقضی حتی یمضی فیہم اثنا عشر خلیفۃ“ ثم تکلم بکلام خفی علی۔ قال فقلت لا بی ما قال؟ قال کلہم من قریش“ حاصل اسکا اور اسکی ہم معنی روایتوں کا یہ ہے کہ آپ اُیدہ کی نسبت خبر دے رہے ہیں اور فرماتے ہیں، ضرور ہے کہ بارہ خلیفہ ہوں۔ سب قریش سے ہونگے۔ اس طرز بیان کی وضاحت نے ظاہر کر دیا کہ اس بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس سے صرف اُوندہ کی نسبت اطلاع مقصود ہے۔ حکم و تشریع نہیں ہے۔

ان سب کے بعد وہ حدیث آتی ہے جسکو امام بخاری نے باب ”الامراء من قریش“ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ تمام روایات کے ساتھ یہ حدیث سامنے رکھی جائے تو پوری طرح اصلیت روشن ہو جاتی ہے۔ امیر معاویہ کی مجلس میں ایک مرتبہ ذکر آیا کہ عبد اللہ بن عمرو کہا کرتے ہیں ”سیکون ملک من قحطان“ قحطان میں سے ایک پادشاہ ہوگا۔ امیر معاویہ یہ سنکر غضب ناک ہوئے اور خطبہ دیا: ”بلغنی ان رجلاً منکم یحدثون احادیث لیست

جھگڑا نہیں کریں گے۔ الا یہ کہ بالکل کھلا کھلا کفر امام سے ظاہر ہو۔ اور ایسی بات میں جسکے لیے اللہ کی کتاب میں حکم و دلیل موجود ہے۔ سر اسوقت کسی

( بقیہ نرت صفحہ ۵۲ )

زندگی کو اپنے لیے نمونہ بنالینا، اور اُسکے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرنا۔ اسکا نام ”اقتدا“ اور ”تأسی“ ہے۔

دونوں صورتیں الگ الگ ہیں۔ بلا شبہ ”اطاعت“ ایک عام حالت ہے اور اس میں ”اقتداء“ کی حالت بھی داخل ہے، لیکن ”اقتداء“ اطاعت سے زیادہ خاص ہے، اور ضروری نہیں کہ ہر اطاعت اقتداء بھی ہو۔ احادیث میں خلفاء راشدین کی نسبت امت کو ”اطاعت“ اور ”اقتداء“ دونوں کا حکم دیا گیا، لیکن بعد کے خلفاء و سلاطین کو صرف ”اطاعت“ کا مستحق بتلایا۔ ”اقتداء“ کا نہیں۔ کیونکہ معلوم تھا کہ اُنکے کام اچھے نہ ہونگے۔ شریعت و عدالت سے منحرف ہو جائیں گے۔ اور چونکہ نظام جماعت کے قیام کے ساتھ احکام کتاب و سنت اور عدل و صداقت کی حفاظت کا انتظام بھی ضروری تھا، اسلیے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض ہر حال میں باقی رہا۔ یعنی حکم دیا گیا کہ ایسے وقتوں میں سلطان اسلام کو اپنا امام مانکر پوری پوری اطاعت کرے، لیکن پادشاہ کی اطاعت کے یہ معنی نہیں کہ سفید کو سیاہ، اور دن کو رات مان لو۔ حق حق ہے۔ باطل باطل۔ برائی جب دیکھو، ٹوکو۔ ظلم جب کیا جائے، روکو۔ اس کام میں ایک پادشاہ اور ایک مزدور، دونوں برابر ہیں۔ ”لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق“ قاعدہ کلیہ ہے، اور تواموا بالحق و تواصوا بالصبر حکم عام و مطلق۔ کسی مخلوق کی ایسی اطاعت نہیں کی جاسکتی جس میں خالق کے حکم سے نافرمانی کرنی پڑے۔

اور یہ جو جابجا کہا گیا کہ اطاعت نہ کرنے میں فتنہ ہے۔ تو یاد رہے کہ ”اطاعت“ نہ کرنے میں فتنہ ہے۔ نہ کہ ”اقتداء“ نہ کرنے میں، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں۔ یعنی خلیفہ اسلام سے بغاوت نہ کر۔ اسمیں جمعیت امت کیلیے بڑا ہی فتنہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ برائی کی مخالفت اور حق کے اعلان میں فتنہ ہے۔ حق کا اعلان تو ہمیشہ اور ہر حال میں دنیا کیلیے نظم و امن ہے۔ وہ کبھی فتنہ نہیں ہوسکتا۔ اگر حق کی پکار فتنہ ہو جائے تو پھر نظام ہستی کس بنیاد پر قائم رہے؟

و لو اتبع الحق اهلهم، لفسدت السموات و الارض و من فیہن! (۷۴ : ۲۳)

سمجھوں کا احاطہ و ادراک - لیکن استعجاب کی ساری بنیاد ہمارا عقلمندی و قیاسی استبعاد نہیں ہے - یہی ہے کہ کسی نص سے ایسا ثابت نہیں اور چونکہ ثابت نہیں اس لیے ہم جانتے ہیں کہ اسلام کیلئے کوئی ایسی بات ثابت بھی نہیں ہونی چاہیے -

شارع کے بیانات ، انسان کی عام بول چال کی طرح مختلف قسموں کے راقع ہوئے ہیں - از انجملہ ایک صورت احکام و ارامر اور تشریع کی ہے - دوسری قسم اخبار و اطلاعات کی - یہ دوسری قسم مجرد بیان واقعہ و حال ہے اور اگر آئندہ کی نسبت ہے تو پیشین گوئی ہے - حکم اور تشریع نہیں ہے - یعنی صرف ایک اطلاع ہے کہ ایسا ہوگا - یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنا چاہیے - قریش کی خلافت کی نسبت جس قدر روایات موجود ہیں سب دوسری قسم میں داخل ہیں - نہ کہ پہلی قسم میں - اور جب اس حدیث کے تمام طریقوں اور لفظوں کو جمع کر کے دیکھا جائے تو بلا کسی اضطراب کے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے -

یہ حدیث صحاح میں حضرت ابو ہریرہ ، جابر بن عبد اللہ ، جابر بن سمرہ ، معاریہ بن سفیان ، وغیرہم مختلف صحابہ سے مرزی ہے اور عمدہ طریق رہے ہیں جو بخاری و مسلم نے اختیار کیے ہیں - لیکن کسی طریق سے بھی کوئی ایسا لفظ مرزی نہیں جس سے ثابت ہو کہ مقصود پیشین گوئی نہ تھا - تشریع و امر تھا - ” تشریع “ یعنی بہ حیثیت احکام شریعت کے کسی حکم کا دینا اور شرعی قانون ٹہرا دینا -

عن ابی ہریرہ ” الناس تبع لقریش فی هذا الشأن - مسلمہم لمسلمہم و کافرہم لکافرہم “ ( مسلم ) دوسرے طریق میں زیادہ وضاحت ہے ” مسلمہم تبع لمسلمہم “ و کافرہم تبع لکافرہم “ ( مسلم ) جابر کی روایت میں ” الناس تبع لقریش فی الخیر و الشر “ ہے : امام نواری اسکی شرح میں لکھتے ہیں ” معناه فی الاسلام و الجاہلیۃ - لانہم کانوا فی الجاہلیۃ رؤساء العرب و اصحاب حرم اللہ و اهل الحج “ و كانت العرب تنتظر اسلامہم فلما اسلموا و فتحت مکہ تبعمہم الناس “ و جاءت وفود العرب من کل جہۃ و دخل الناس فی دین اللہ افواجا “ ( جلد ۲ : ۱۱۹ ) پس معلوم ہوا کہ اس حدیث کو مسئلہ خلافت کے اختصاص و شرائط سے کوئی تعلق نہیں - مقصود یہ ہے کہ عرب میں خاندان قریش حج کے اہتمام اور بیت اللہ کی مجاورت کی وجہ سے تمام قبائل کی سرداری رکھتا تھا اور ہر کام میں سب

اسی بنا پر محدثین نے باب باندھا ہے ” برآة رب المال بالدفع الى السلطان مع العدل و الجور “ کما فی المنتقى - یعنی صاحب مال نے جب اپنی زکوٰۃ عمال کے حوالے کر دی تو وہ شرعاً بری الذمہ ہو گیا اگرچہ وہ ظالم و جابر ہوں - اور اسی لیے جمہور فقہاء کا بھی یہی مذہب قرار پایا کہ اگر حکام جور کو زکوٰۃ دیدی گئی تو ادا ہو گئی - ائمہ اہل بیت و عترۃ نے بھی قولاً و فعلاً اس سے اتفاق کیا جیسا کہ حضرت امام باقر (علیہ السلام) سے اصول میں منقول ہے - اور اسی لیے محققین امامیہ و فقہاء زیدیہ بھی اس فیصلہ میں جمہور کے ساتھ ہیں -

## فصل

( اذا بریخ الخلیفتین فاقتلوا اخرهما )

اگر ایک خلیفہ کی حکومت جم چکی ہے اور قائم ہے اور دوسرا مدعی کھڑا ہو، تو اسکا حکم یہ ہے کہ وہ باغی ہے - فرمایا اُسے قتل کر دو - اُسکی زندگی تمام امت کے نظم و امن کیلئے فتنہ ہے - وہ امت میں پھرت ڈالنا اور جمے ہوئے انتظام کو دھم برہم کر دینا چاہتا ہے - والفتنۃ اشد من القتل - عن عرفة الشجعی - قال : سمعت صلعم یقول ” من اتاکم و امرکم جمیع علی رجل واحد “ یرید ان یشق عصاکم و یرفرق جماعتکم ، فاقتلوه “ (احمد و مسلم)

اسی لیے جمہور اہل اسلام نے اتفاق کیا کہ خلیفہ خواہ اہل ہویا نا اہل، لیکن اگر اسکی حکومت قائم ہے تو جو اُس پر خرچ کرے، اُسکا حکم باغی کا ہوگا اگرچہ کتنا ہی افضل اور جامع الشرط ہو - اُس سے لڑنا اور اُسکی جماعت کو قتل کرنا جائز ہے - بشرطیکہ تبلیغ و دعوت اور دفع شکوک کے بعد بھی باز نہ آئے - ایک گروہ علماء نے کہا کہ نہ صرف جائز ہے بلکہ بحکم

فقاتلوا الّتی تبغی ( ۴۹ : ۹ ) واجب ہے - ” وقد حکي فی البحر عن العترة جمیعاً ان جهادهم افضل من جهاد الکفار الی دیارهم “ ان فعلهم فی دالار الاسلام کفعل الفاحشة فی المسجد “ ( نیل الارطار - جلد ۷ صفحہ ۸۰ ) یعنی تمام ائمہ اہل بیت و عترۃ سے منقول ہے کہ ایسے باغیوں سے جہاد کرنا کفار پر حملہ کرنے سے بھی افضل ہے -

الدین ” کی قید ہے ۔ اس سے ثابت ہوا کہ جب قریش میں ایسے لوگ نہ رہینگے جو دین قائم رکھ سکیں تو پھر کوئی غیر قرشی مسلط ہو جائیگا ۔ صحیح بخاری کے ترجمہ باب سے صاف واضح ہوتا ہے کہ امام بخاری کا بھی مذہب یہی ہے ۔ انہوں نے باب باندھا ہے ” الامراء من قریش ” قریش میں امارت اور امراء ۔ اس مضمون کا باب نہیں باندھا کہ امارت ہمیشہ قریش ہی میں ہونی چاہیے ۔

امام بخاری نے ایک دوسری روایت بھی ابن عمر کی درج کی ہے جو مسلم وغیرہ میں بھی ہے ” لا یزال هذا الامر فی قریش ما بقی منهم اثنان “ یعنی یہ چیز قریش ہی میں رہیگی جب تک دو آدمی بھی اُن میں باقی رہینگے ۔

اس روایت سے ہمارے بیان کی آرزو مزید تصدیق ہوگئی ۔ حدیث کا منظور صریح پبشین گوئی کا ہے ۔ اگر اسکا یہ مطلب قرار دیا جائے کہ جب تک دو انسان بھی خاندان قریش میں باقی رہینگے خلافت اُنہی کے قبضہ میں رہیگی ، تو یہ واقعات کے بالکل خلاف ہے ۔ در کی جگہ ہزاروں قرشی انسان موجود رہے اور خلافت قریش سے نکل گئی ۔ پس ضرور ہے کہ ” ما بقی منهم اثنان “ کے منظور پر مفہوم کو ترجیح دی جائے ۔ اور وہ یہی ہے کہ اگر قریش میں دو آدمی بھی ایسے باقی رہینگے ، جو خلافت کے اہل ہونگے ، تو کبھی خلافت کے شرف سے یہ خاندان محروم نہ ہوگا ۔ مگر جب انقلاب حال سے ایسا وقت آجائے کہ دو آدمی بھی اہل نہ رہیں ، تو مشیت الہی اپنے قانون انتخاب اصلح کے مطابق دوسروں کو اس کام پر مامور فرمادیگی ، اور قریش خلافت سے محروم ہو جائینگے ۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا ۔ معتصم کے بعد سے عباسیہ کا زوال شروع ہوگیا تھا ۔ آخر میں یہاں تک پہنچ گیا کہ حکومت دوسروں کی تھی ، عباسی خلیفہ صرف اپنے عشرت کدوں کیلئے تھا ۔ تاہم اقتدار خلافت اُنہی کا رہا ۔ کبھی کو جرأت نہ ہوئی کہ خلافت کا دعوا کر سکے ۔ کیسی کیسی طاقتور اور باجبررت عجمی و ترکی اور سلجوقی حکمرانیں قائم ہوئیں ؟ لیکن سب اپنا بڑا سے بڑا شرف یہی سمجھتے رہے کہ مقام خلافت سے اُنہیں خدمت و یارری خلافت کا کوئی لقب ملے ، اور بس ۔ ایک قرشی ، فاطمی ، عباسی بھی اگر کسی ہنگامہ و قتال سے بچکر نکل جاتا ، تو جس گوشہ عالم میں تنہا پہنچ جاتا ، ایک عالم



و عن رائل بن حجر - قال سمعت رسول الله صلعم و رجل يساله - فقال -  
 ارايت ان كان علينا امرء يمنعونا حقنا و يسألونا حقهم ؟ قال ” اسمعوا و اطيعوا ”  
 فانما عليهم ما حملوا ” و عليكم ما حملتم ” ( مسلم و الترمذي و صححه )  
 ” علي المرء المسلم السمع و الطاعة فيما أحب و كره ” الا ان يامر بمعصية  
 فان امر بمعصية فلا سمع و لا طاعة ” ( شيخان و غيرهما عن ابن عمر )

سب کا خلاصہ دہی ہے جو ارپر گزر چکا - آخری روایت میں فرمایا - ایک  
 مسلمان کا فرض ہے کہ خواہ گوارا ہو یا ناگوار ، مگر امام کا کہا سننے اور مانے -  
 ہاں اگر وہ ایسا حکم دے جسکی تعمیل میں گناہ ہو ، تو پھر اُس حکم میں  
 نہ تو سننا ہے اور نہ ماننا -

بڑے سے بڑے مخلوق کی خاطر بھی خدا کا چھوٹا سے چھوٹا حکم نہیں  
 تالا جا سکتا ، اور نہ مخلوق کی خاطر خالق سے نافرمانی کی جاسکتی ہے -  
 یہ اسلام کا ، اور دراصل دنیا کی تمام سچی تعلیموں اور سچے انسانوں کا  
 عالمگیر قاعدہ کلیہ ہے -

اور یہی وجہ ہے کہ صدقات و زکوٰۃ و غیرہ مالیات کی ادائیگی کی نسبت  
 حکم دیا گیا کہ اگرچہ وصول کرنے والے حکام ظالم و جابر ہوں ، یا بیت المال  
 کا روپیہ ناجائز طور پر خرچ کر رہے ہوں ، لیکن اگر امام کی طرف سے  
 مامور ہیں تو انکی اطاعت ہی کرنی چاہیے - جس شخص نے زکوٰۃ ایسے  
 عامل کو دیدی ، اُسکی زکوٰۃ ادا ہوگئی - بلاشبہ قوم کو کوشش کرنی چاہیے  
 کہ ایسے عامل معزول کیے جائیں - لیکن جب تک معزول نہوں ، نظام  
 شریعت و حکومت کے قیام کیلئے ضروری ہے کہ انکے احکام کی تعمیل کی  
 جائے - بشیر بن خصاصہ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے کہا ” ان قوماً من  
 اصحاب الصدقة یعتدون علينا ” عمال صدقہ لینے میں ہم پر ظلم کرتے ہیں -  
 کیا حق سے زیادہ نہ دینے میں اُنکا مقابلہ کریں ؟ فرمایا نہیں - ( ابوداؤد )  
 سعد بن وقاص کی روایت میں فرمایا ” ادفعوا الیہم ما صلوا ” ابن ابی  
 شیبہ میں حضرت ابن عمر کی نسبت ہے کہ کسی نے کہا - زکوٰۃ کسے دیں ؟  
 کہا وقت کے حاکموں کو - سائل نے کہا ” اذا يتخذون بها ثياباً و طيباً ”  
 وہ تو زکوٰۃ کا روپیہ اپنے کپڑوں اور زینت میں خرچ کردالتے ہیں - فرمایا  
 ” ر ان ” اگرچہ ایسا کرتے ہوں مگر زکوٰۃ اُنہی کو دے -

فی کتاب اللہ و لا تؤثر عن رسول اللہ الخ - مجہد تک یہ بات پہنچی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہیں جو نہ تو قرآن میں ہیں نہ رسول سے ثابت ہیں۔ ”انی سمعت رسول اللہ یقول : ان هذا الامر فی قریش لا یعادیم احد“ الا کبه اللہ علی رجہ ” ما اقاموا الدین “ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ یہ بات ( یعنی حکومت ) قریش میں بھیگی جب تک وہ دین قائم رکھیں گے - جو انکی مخالفت کریگا ، اَلثا رسوا ہوگا - یعنی کامیاب نہوگا -

اس روایت نے سارا معاملہ حل کر دیا - معلوم ہو گیا کہ ایک خاص وقت تک کیلیے یہ پیشین گوئی تھی ، اور حرف بہ حرف پوری ہوئی - یعنی آپؐ بتلا دیا تھا کہ قریش میں جب تک دین قائم رکھنے کی قابلیت بھیگی ، حکومت انہی کے قبضے میں بھیگی - جو انکے خلاف اُٹھیں گے ، ناکام بھیگا - چنانچہ ایسا ہی ہوا - جب تک عرب و قریش میں صلاحیت تھی ، اسلامی خلافت کے بھی مالک رہے - جب اس کے اہل نہ رہے ، عجم و ترک نے یہ بار اُٹھالیا - بحکم ان یسایذہبکم ریات بخلق جدید“ وما دلک علی اللہ بعزیز

( ۱۶:۳۰ ) اور یستبدل قوما غیرکم الخ - باقی رہا امیر معاریہ کا ابن عمر پر انکار ، تو یہ بھی صحیح نہ تھا - وہ صرف یہ بات سن کر گھبرا اُٹھے کہ دوسری پادشاہت بننے والی ہے - اصلیت پر غور نہیں کیا - قحطانی والی حدیث بطریق رفع ثابت ہے ، اور قریش والی حدیث میں ” ما اقاموا الدین “ کی قید موجود ہے - دونوں میں کوئی تعارض نہیں - اسی بنا پر ائمہ حدیث نے حدیث قحطانی اور حدیث قریش میں تطبیق دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا کہ امارۃ قریش والی روایت تشریع نہیں ہے - محض خبر ہے - اور وہ بھی ” ما اقاموا الدین “ کے ساتھ مقید - شیخ الاسلام لکھتے ہیں ” هذا انکار من معاریہ بلا تامل “ والا ، فقد جاء حدیث القحطانی مرفوعاً ، و ما ذکر فی المعارضہ ، فهو حجة لما فیہ من التقلید بقوله : ما اقاموا الدین “ اور حافظ عسقلانی نے فتح میں ابن التین کا قول نقل کیا ہے ” الذی انکرہ معاریہ فی حدیث ما یقوہ لقلہ ما اقاموا الدین “ فردما کان فیہم من لا یقیمہ فیتسلط القحطانی علیہ و هو کلام مستقیم “ یعنی امیر معاریہ کا سرے سے انکار انکی بے غوری کا نتیجہ تھا - ورنہ قحطانی والی بات ثابت ہے - امیر معاریہ نے جو حدیث معارضہ میں پیش کی ، اسکا آخری ٹکڑا خود انہی پر حجة ہے اور ابن عمر کی تصدیق کر رہا ہے - یعنی اُسمیں ” ما اقاموا

کو شرکت کا موقعہ دینا بھی اسکی جلد بازی پر نہایت شاق گزرتا تھا۔ سورۃ فاتحہ ختم کرتے ہی بلا سکتہ کے قرأت شروع کر دیتا حالانکہ احادیث میں آمین کہنے کی نہایت درجہ فضیلت وارد ہے ” فمن وافق تامينه تامين الملائكة“ غفر له ما تقدم من ذنبه“ (بخاری) ابو ہریرہ اس سے وعدہ لے لیتے ” لا تفتني بآمين“ قرأت میں ایسی جلدی نہ مچائیو کہ میری آمین ضائع جائے، لیکن نماز اسی کے پیچھے پڑھتے اور اسکی اطاعت سے انکار نہ کرتے۔ (بخاری)

لوگ انکی یارہ گوئی سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ اسلیے اکثر ایسا ہوتا کہ عید کے دن نماز کے بعد ہی مجمع منتشر ہو جاتا۔ خطبہ کا لوگ انتظار نہ کرتے۔ یہ حال دیکھ کر مردان نے ایک مرتبہ چاہا۔ عید کے دن نماز سے پہلے خطبہ دیدے تا کہ نماز کے انتظار کی وجہ سے لوگوں کو مجبوراً خطبہ سننا پڑے۔ حالانکہ یہ صریح سنت کے خلاف تھا۔ سنۃ ثابۃ خطبۃ عید کے بارے میں یہی ہے کہ نماز پہلے ادا کی جائے۔ پھر خطبہ دیا جائے۔ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ اسپر فوراً ایک شخص نے ٹوکا اور حضرت ابو سعید خدری نے ” من رآی منکم منکراً فلیغیرہ“ الخ۔ والی روایت بیان کی۔

ایسی بے شمار باتیں کی جاتی تھیں۔ صحابۃ کرام نہایت بے باکی سے امر بالمعروف کا فرض ادا کرتے اور ہمیشہ توکتے۔ لیکن خلیفہ انہی کو مانتے اور اطاعت انہی کی کرتے۔ کسی صحابی نے بھی اطاعت سے پہلے اسکی جستجو نہ کی کہ خلیفہ میں ساری شرطیں خلافت کی پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ اگر اسکی جستجو کرتے تو سب سے پہلی شرط یعنی بطریق انتخاب شرعی و شوریٰ منتخب ہونا ہی مفقود تھا۔ باقی شرطیں تو سب اسکے بعد کے دیکھنے اور جانچنے کی ہیں۔

حضرة سید التابعین سعید بن المسیب کہا کرتے۔ بنی مردان انسانوں کو بھوکا مارتے ہیں اور کتوں کو کھلاتے ہیں (۱) اور پھر انکے ہاتھوں ہر طرح کے مظالم و شوائد بھی سہتے، مگر ساتھ ہی بہ حیثیت سلطان اسلام کے اطاعت بھی انہی کی کرتے۔

مامون و معتصم کے عہد میں بدعت اعتزال اور قول بخلق قرآن کی وجہ سے ایک فتنۂ عظیم برپا ہوا۔ علماء سنۃ پر جو جو مظالم و شوائد ہوئے

صرف ملکی و رقتی مصالح کی بنا پر استدلال تھا کہ کس قبیلہ و خاندان سے امام ہونا چاہیے جسکی سرداری عرب کے تمام قبائل بلا چوں و چرا تسلیم کر لیں ؟ اس امر کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ صحابہ خلافت کا شرعاً مستحق صرف قریش ہی کو یقین کرتے تھے ، بلکہ اسکے خلاف شواہد موجود ہیں ۔ امام احمد نے حضرت عمر کا قول نقل کیا ہے اگر معاذ بن جبل میری وفات تک زندہ رہے تو اپنے بعد انہی کو خلیفہ بناؤنگا ۔ یہ ظاہر ہے کہ معاذ قرشی نہ تھے ۔ انصار مدینہ میں سے تھے ۔ اگر خلافت کیلئے قرشیہ شرط ہوتی تو حضرت عمر جیسا محرم اسرار خلافت کیونکر انکی خلافت کا تصور بھی کر سکتا تھا ؟ مسند امام احمد میں حضرت عمر کا ایک اور قول بھی ابو رافع کی روایت سے موجود ہے ” لو أدركني احد رجلين ثم جعلت هذا الامر اليه ، اوثقت به - سالم مولی حذیفہ و ابو عبیدہ الجراح “ اگر سالم مولی حذیفہ اور ابو عبیدہ الجراح میں سے کوئی ایک میری وفات تک زندہ رہتا اور خلافت اسکے سپرد کر دیتا ، تو مجھے اس بارے میں پورا اطمینان و اعتماد ہوتا ۔ اگر حضرت عمر صدها صحابہ و مہاجرین قریش کی موجودگی میں سالم مولی حذیفہ کو خلافت سپرد کر دینے کا ارادہ کر سکتے ہیں ، تو پھر کیسے بارر کیا جاسکتا ہے کہ شرعاً خلافت غیر قرشی کو نہیں مل سکتی اور صحابہ کا اس پر اجماع ہو گیا تھا ؟

( دعوای اجماع )

اب صرف ایک بات رہ گئی ۔ یعنی علماء اسلام کا شرط قرشیہ پر زور دینا ، اور قاضی عیاض کا دعوئے اجماع ، تو اس بارے میں چند امور قابل غور و نظر ہیں :

اولاً ، یہ ظاہر ہے کہ قریش میں خلافت ہونے کی نسبت جو کچھ فرمایا گیا ، وہ محض آئندہ کی پیشتر سے اطلاع تھی ۔ یعنی پیشین گوئی تھی ۔ اور پیشین گوئیوں کا یہ حال ہے کہ جب تک انکا ظہور کامل طور پر نہ ہو جائے ، انکے معانی و مطالب کی نسبت کسی قطعی بات کا اختیار کرنا مشکل ہے ۔ اجتہاد و قیاس کیلئے کسی چیز میں اتنی وسعت نہیں جسقدر پیشین گوئیوں میں ہوتی ہے ۔ علی الخصوص جبکہ عموماً پیشین گوئیاں نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ ہوتی ہیں ، اور اس باب میں انکا ایک خاص مبہم انداز بیان ہے ۔ پس چونکہ یہ پیشین گوئی تھی ، اسلئے مشکل تھا کہ جب تک تمام واقعات پروری طرح ظاہر نہ ہو جائیں ، انکا ٹھیک

مصلحت و حکمت اس حکم کی ظاہر ہے ۔ اگر ازل روز ہی سے دعویٰ اور خرچ کا دروازہ بند نہ کر دیا جاتا ، تو کوئی بہتر سے بہتر اسلامی حکومت بھی خرچ و شورش سے محفوظ نہ رہ سکتی ۔ ایک جامع الشرط خلیفہ کی موجودگی میں بھی صدہا دعویدار آتے کہتے ہوتے اور کہتے کہ جمع شرائط و اہلیت میں ہم زیادہ احق و افضل ہیں ۔ اوصاف و فضائل کا قطعی فیصلہ کرنا نہایت مشکل ہے ، اور نہ افضل و مفضل کے امتیاز کیلئے کوئی قطعی معیار ہو سکتا ہے ۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ ہمیشہ کشت و خون کا بازار گرم رہتا اور امت کا نظام جمعیت کبھی نہ سدھرتا ۔ پس ناگزیر تھا کہ خلافت قائمہ کی موجودگی میں ہر طرح کے دعوے کو بغاوت و جرم قرار دیدیا جائے ، اور اسکے لیے ایسی سزا تجویز کی جائے جو سخت سے سخت سزا ہو سکتی ہے ۔ یعنی قتل ۔ ایک انسان کو قتل کر دینا بہتر ہے ۔ بمقابلہ اسکے کہ ہزاروں انسان قتل ہوں ۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں حکم کی علت کی طرف واضح اشارہ کر دیا گیا کہ ” یرید ان یشق عصا کم “ یہ مضمون مختلف الفاظ و اسناد سے صحاح میں موزی ہے ۔ ہم نے صرف ایک روایت پر اختصاراً اکتفا کیا ۔

## فصل

( اجماع امت و جمہور فقہاء و اعلام )

امراء بنو امیہ کی حکومت جبر و استبداد کے ساتھ قائم ہوئی اور اسوقت ایک جم غفیر صحابہ کرام و ائمہ اہل بیت نبوت کا موجود تھا ۔ عہد عباسیہ کی پوری پانچ صدیاں گذر گئیں ، اور یہی زمانہ تمام علوم شرعیہ کی تدوین و ترتیب کا ہے ۔ تمام ائمہ و اعلام اور فقہاء مذاہب اسی عہد میں پیدا ہوئے اور عقائد و مسائل نے آخری ترتیب و تنظیم پائی ۔ لیکن ان تمام عہدوں میں سب کا اتفاق اسی اعتقاد و عمل پر رہا ۔ عقائد ضروریہ اور ارکان اربعہ کے بعد شاید ہی کسی اسلامی اعتقاد پر اس درجہ محکم و یقینی اجماع و تعامل امت ثابت کیا جاسکے ۔

صحابہ کرام و ائمہ تابعین کا حال معلوم ہے ۔ مروان مدینہ کا گورنر تھا اور حضرت ابو ہریرہ مسجد نبوی میں مؤذن تھے ۔ مروان کی عبادت سے بد ذوقی کا یہ حال تھا کہ سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہنا اور مقتدیوں



اُسکے ساتھ ہو جاتا اور اپنی حکومت قائم کر لیتا - گویا ہر قرشی کے وجود میں ایک خلافت پنہاں تھی - ایک اموی شہزادہ شام کے قتل عام سے بچ کر نکلا اور افریقہ ہو کر یورپ جا پہنچا - وہاں پانچ صدیوں تک کیلیے اسپین کی عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم ہو گئی - لیکن جب عرب قریش کے تنزل و ادبار کا وہ آخری وقت آ گیا کہ در قرشی بھی دنیا میں حکمرانی کے اہل و لائق باقی نہ رہے تو تاریخ خلافت کے معاً صفحہ اُلٹ دیا ، اور یکقدم غیر عربی و غیر قرشی خلافت کا دور شروع ہو گیا -

و کان وعداً مفعولاً !

باقی رہی مشہور حدیث ” الاثمة من القریش “ اور یہ استدلال کہ حضرت ابوبکر نے سقیفہ بنی ساعدہ کے مجمع میں برخلاف انصار پیش کی اور سب نے تسلیم کر لیا ، تو اس سے بھی شرعاً اختصاص قریش کے دعوے کو کوئی مدد نہیں مل سکتی - اولاً ، یہ الفاظ اور حضرت ابوبکرؓ والی روایت بطریق اتصال ثابت ہی نہیں - فتح الباری میں ہے ” الاثمة من القریش - رجالہ رجال الصحیح و لکن فی سندہ انقطاع “ نانیا ، اس سے بھی یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ خلافت کا شرعاً حق بجز قریش کے اور کسی مسلمان کو نہیں ؟ یہ بھی آئندہ کی نسبت خبر ہے ، اور انہی حدیثوں کا ایک ٹکڑہ جو دوسرے طریقوں سے صریح پیشین گوئی کے لفظوں میں پڑ چکے ہو - حضرت ابوبکر نے یہ بات اس لیے پیش کی کہ پیشتر سے ہونے والے واقعات کی خبر دیدی گئی ہے - پس ایسا ہی ہونا ضروری ہے - اس کے خلاف بات نہ آتھاؤ - یہ سنکر انصار مایوس ہو گئے اور تسلیم کر لیا - ثالثاً ” الناس تبع لقریش “ والی روایت سے مدد لی جائے تو بالکل کھل جاتا ہے کہ سقیفہ میں حضرت ابوبکر کا استدلال صرف قریش کی بزرگی و عظمت اور عرب میں انکی ریاست و سرداری سے تھا - نہ کہ شرعاً شرائط امامت سے - وہ بتلانا چاہتے تھے کہ خود آنحضرت نے فرمادیا ہے کہ جاہلیۃ اور اسلام ، دونوں میں لوگ قدرتی طور پر قریش کی سرداری سے متاثر ہیں اور رہیں گے ، اس لیے یہ معاملہ بھی انہی کے قبضہ میں رہیگا - چنانچہ حضرت ابوبکر کا یہ مشہور جملہ اس مطلب کو زیادہ واضح کر رہا ہے جو سقیفہ میں کہا تھا ” ان العرب لا تعرف هذا الامر لغير هذا الحی “ یعنی اہل عرب قریش کے سوا اور کسی قبیلہ کی سرداری سے آشنا نہیں - پس یہاں سرے سے شرائط شرعیہ کا سوال ہی نہ تھا -

تھا - لیکن اسکے بعد جو سلسلہ خلافت شروع ہونے والا تھا ، وہ اپنے متضاد خصائص و حالات کی وجہ سے امت کیلئے ایک بڑی ہی سخت کشمکش اور ابتلا رکھتا تھا - وہ ایک ہی وقت میں سیاہ بھی تھا اور سفید بھی ، نور بھی تھا اور ظلمت بھی ، حق بھی تھا اور باطل بھی - حب و بغض ، ہجر و رمل ، ترک و طلب ، اطاعت و مخالفت ، دونوں چیزیں ایک ہی وجود میں جمع ہو گئی تھیں ، اور حکم شریعت یہ تھا کہ بہ یک وقت دونوں کو نبھاؤ ، اور اپنی اپنی جگہوں پر دونوں باتیں بجالاؤ - ایک طرف تو اس پر زور دیا گیا کہ وہ خلیفہ و امام ہیں - اسلئے واجب اطاعت ہیں - جب تک کفر صریح ظاہر نہ ہو ، انکی فرمانبرداری سے منہ نہ موڑو - دوسری طرف یہ بھی کہ دیا گیا کہ انکے اعمال اچھے نہ ہونگے - پس اطاعت کرو - مگر پیروری و اقتداء نہ کرو - برائیوں کی طرف بلائیں تو ہاتھ سے ، زبان سے ، دل کے اعتقاد سے ، جس طرح بھی بن پرے ، پوری طرح مخالفت کرو اور انکے قہر و تسلط سے دب کر حق کا ساتھ نہ چھوڑو غور کرو ! معاملہ کس درجہ کٹھن اور جذبات انسانی کیلئے کیسا پر از امتحان تھا ؟

انسان ایک وقت میں ایک ہی جذبہ کام میں لاسکتا ہے - یا محبت کریگا یا دشمنی - یا اطاعت کریگا یا نافرمانی - جسکو اطاعت کا مستحق سمجھیگا ، اسکی ہر بات اسکی نظروں میں محبوب ہو جائیگی - جسکو برا سمجھیگا ، اسکی فرمانبرداری کبھی اسکے نفس کو گوارا نہ ہوگی - لیکن یہ وہ منزل عمل تھی جس میں ایک ہی وجود ممدوح و مزموم اور محبوب و مبغوض ، دونوں صورتیں رکھتا تھا - ایک ہی انسان کے آگے جھکنا بھی تھا ، اور پھر اُسی کے سامنے سرکشی بھی کرنی تھی - البتہ جھکنے کا موقع دوسرا تھا - سرکشی کی گھڑی دوسری - جذبات و عواطف کیلئے سخت آزمائش اسمیں آ پڑی تھی کہ ہر جذبہ اپنے صحیح موقع پر کام میں لایا جائے - ورنہ ذرا سی بے اعتدالی بھی سخت گمراہی و ہلاکت کا موجب ہو جاتی - اطاعت کیشی میں اگر بے اعتدالی ہوتی ، تو وہ اقتداء اور تاسی ہو جاتی جسکا نتیجہ باطل پرستی اور حق سے انحراف تھا - عدم اقتداء اور امر بالمعروف میں اگر بے اعتدالی ہوتی ، تو وہ خروج و بغاوت تک پہنچا دیتی ، جسکا نتیجہ بد امنی و خونریزی ہوتا اور سخت معصیت و فسق کا وقوع - اس تیرہ سو برس میں کتنے ہی فتنے صرف اسی بے اعتدالی اور افراط و تفریط سے پیدا ہوئے - کتنوں ہی نے جوش حق پرستی میں

خلافت قریش کے خاندان سے نکل چکی تھی ، تو یہ حالات دیکھ کر انکی رائے بدل گئی ، اور قاضی عیاض والے اجماع کا دعوا باقی نہ رہا ۔ علامہ ابن خلدون ( المتولد سنہ ۷۳۲ ) مقدمہ تاریخ میں شرط قرشیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں : ” لما ضعف امر قریش ، وتلاشت عصبیتهم بما نالهم من الترف والنعم و بما انفقتهم الدولة في سائر اقطار الارض ، عجزوا عن حمل الخلافة ، وتغلبت عليهم الاعاجم و صار الحل والعقد لهم ، فاشتبه ذلك على كثير من المحققين ، حتى ذهبوا الى نفی اشتراط القرشیة و عولوا على ظواهر في ذلك مثل قوله صلعم : اسمعوا و اطيعوا و ان امر علیکم عبد حبشي ما اقام فيکم کتاب الله “ یعنی جب قریش کی قوت کمزور ہو گئی - عیش پرستیوں میں پڑ کر اپنی عصبیہ متا دی - خلافت کا برجہ اٹھانے سے عاجز آ گئے ، تو عجمیوں نے انپر غلبہ حاصل کر لیا ، اور خلافت کا فیصلہ انہی کے ہاتھوں میں چلا گیا - یہ انقلاب دیکھ کر بہت سے محققین کے نزدیک قرشیہ کی شرط مشتبہ ہو گئی - یہاں تک کہ انہوں نے اس شرط سے انکار کر دیا - انتہی -

اشاعرہ کے امام الائمہ قاضی ابوبکر باقلانی نے یہی مذہب اختیار کیا تھا کہ قرشیہ کی شرط ضروری نہیں ہے - یہی ابن خلدون لکھتے ہیں ” ومن القائلین بنفی اشتراط القرشیة “ القاضی ابوبکر الباقلانی

تیرھویں صدی کے مشہور مجدد فقہ و حدیث ، و مجتہد العصر ، و مصلح امت ، امام شروکانی یمنی کی بھی یہی تحقیق ہے - بدل الغمام میں شرط قرشیہ کے دلائل نقل کر کے لکھتے ہیں ” لا ریب ان فی بعض هذه الالفاظ ما يدل على الحصر “ ولكن قد خصص مفهوم الحصر احادیث و جوب الطاعة لغير القرشي “ الی ان قال ” و الاخبار منه صلعم بان الائمة من قریش ، هو كالاخبار منه بان الاذان فی العبدشہ والقضاء فی الازد “ و ما هو الجواب عن هذا ، فہر الجواب عن ذلك - و تخصیص كون الائمة من قریش ببعض بطونہم ، لا يتم الا بدلیل ، والاخذ بما رقع علیه الاجماع لا شک انه احوط ، و اما انه يتعتم المصير اليه ، فليس بواضح ، و لو صح ذلك ، لزم بطلان اكثر ما درنوه من المسائل و المقام و المراكز ، و ما احقه بان لا يكون كذلك “ یعنی اگرچہ امامت قریش کی روایات میں ایسے الفاظ ہیں جن سے قریش کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے ، لیکن وجوب طاعت امام کے عام احکام کتاب و سنہ میں موجود ہیں - وہ دلائل کرتے ہیں کہ غیر قرشی کی بھی طاعت امت پر قرشی ہی کی طرح واجب ہے - باقی رہی یہ بات کہ آنحضرت

معلوم ہیں - حضرت امام احمد بن حنبل نے اسی کوزوں کی ضرب اور برسوں تک قید خانے میں رہنا گوارا کر لیا ، اور ماموں و معتصم کی دعوت بدعت کی پیروی نہ کی - لیکن اطاعت کا مستحق انہی کو سمجھا ، اور اپنے نامہ وصیۃ میں لکھا تو یہی لکھا ” والدعاء للأئمة المسلمين بالصلاح ، ولا تخرج عليهم بالسيف ، ولا تقاتل هم في الفتنة “ کذا نقل عنه ابن الجوزي في سيرته -

حافظ عسقلانی نے ابن التین کا ایک قول نقل کیا ہے ” قد اجمعوا انه ( اى الخليفة ) اذا دعى الى كفر أو بدعة ، انه يقام عليه “ یعنی علمائے اسپر اجماع کیا کہ اگر خلیفہ کفر اور بدعت کی طرف بلاے تو اسپر خروج کرنا چاہیے - پھر اس قول کی نسبت لکھتے ہیں ” ما ادعاه من الا جماع على القيام في ما اذا دعا الى البدعة ، مردود ، الا اذا حمل على بدعة تؤدى الى صريح الكفر “ والا ، فقد دعا المامون والمعتصم والواثق الى بدعة القول بخلق القرآن و عاقبوا العلماء من اجلها بالقتل والضرب والحبس وأنواع الاهانة ، ولم يقل أحد بوجوب الخروج عليهم بسبب ذلك ، و دام الا مربضع عشرة سنة حتى رلى المتوكل الخلافة فابطل المحنة “ ( فتح - ۱۳ : ۱۰۳ ) یعنی یہ جو ابن التین نے کہا کہ اگر خلیفہ بدعت کی طرف بلاے تو اسپر خروج کرنا جائز ہے اور اسپر اجماع ہو چکا ہے ، تو یہ قول مردود ہے - الا یہ کہ بدعت سے اسکا مقصود ایسی بدعت ہو جو صریح طور پر کفر تک پہنچ جاتی ہو - کیونکہ یہ معلوم ہے کہ ماموں ، معتصم ، الواثق ، تینوں خلیفوں نے بدعت خلق قرآن کی طرف دعوت دی ، اور اسکی وجہ سے علماء سنۃ کو طرح طرح کے مصائب و شدائد جھیلنے پڑے - قتل ہوئے ، پیٹے گئے ، قید کیے گئے ، لیکن پھر بھی کسی نے انپر خروج واجب نہیں بتلایا ، اور برابر انکی اطاعت کرتے رہے - حتیٰ کہ تقریباً دس برس تک یہی حالت رہی - خلیفہ متوکل نے تخت نشین ہو کر اس مصیبت کو دور کیا - انتہی -

حقیقت یہ ہے کہ صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت و اطاعت کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا ، عہد سلف کے مسلمانوں نے کر کے دکھلا دیا کہ اسکا اصلی مفہوم و مقصد کیا ہے ؟ وہ اپنے طرز عمل میں احکام خلافت کے ہر تکرر اور ہر قسم کی ایک عملی تفسیر و شرح تھے - گذشتہ فصول میں اُن احادیث پر نظر دال چکے ہو جن میں آنے والے وقتوں کی نسبت امت کو احکام دیے گئے ہیں - خلافت راشدہ کا عہد فتنوں و فسادوں سے محفوظ

تھیک مطلب متعین کیا جاسکے - خلافت کا یہ حال رہا کہ گوار ابتدا سے بہت مدعی اُٹھے مگر ساتویں صدی ہجری تک قریش ہی میں رہی اور اسی بات کی احادیث میں خبر بھی دی گئی تھی - جن علماء کی رائے پیش کی جاتی ہے وہ سب وہی ہیں جنکا ظہور ساتویں صدی اور اُس سے پیشتر یعنی عہد خلافت قریش میں ہوا - پس ضرور تھا کہ معاملہ خلافت کو ابتدا سے قریش ہی میں محدود دیکھ کر یہ خیال پیدا ہو جاتا کہ خلافت اسی خاندان سے شرعاً بھی مخصوص ہے اور یہی مطلب تمام احادیث کا ہے - اگر وہ بعد کا حال دیکھتے تو معلوم کر جاتے کہ مقصود تشیع و حکم نہ تھا - محض خبر دی گئی تھی - وہ ان حدیثوں کا مقصود صرف اپنے وقت تک کے حالات کی روشنی ہی میں دیکھ رہے تھے اور اس کے لیے ہر طرح مجبور و معذور تھے -

حافظ نواری شرح مسلم میں لکھتے ہیں ”وقد ظهر ما قاله صلعم - فمن زمنه الى الان الخلافة في قریش من غير مزاحمة لهم فيها“ و تبقى كذا لك ما بقى منهم اثنان“ (جلد ۲ : ۱۱۹) یعنی جیسا فرمایا تھا، ویسا ہی ہوا - آنحضرت صلعم کے زمانے سے اب تک خلافت بغیر کسی رکارت کے قریش ہی میں رہی اور آئندہ بھی ہمیشہ انہی میں رہیگی جب تک در قریشی بھی دنیا میں باقی رہینگے -

حافظ نواری کا سال وفات سنہ ۴۷۶ھ ہے - اور سال پیدائش سنہ ۶۳۱ھ - یا اس سے بھی پہلے - آخری خلیفہ بغداد المستعصم کو ہلا کر نے سنہ ۲۵۶ میں قتل کیا - پس گو انہی وفات فتنہ تاتار کے بعد ہوئی، لیکن تصنیف و تالیف کا زمانہ مستعصم کی خلافت ہی کا زمانہ ہے - اس لیے وہ اپنے زمانے تک خلافت کو صرف قریش ہی میں قائم دیکھ کر احادیث باب کے اسی مطلب پر قانع اور جمے ہوئے ہیں اور اسی لیے ”ما بقى منهم اثنان“ کا بھی یہی مطلب سمجھتے ہیں کہ جب تک خاندان قریش کے در انسان بھی دنیا میں باقی رہینگے، خلافت انہی میں رہیگی - لیکن اگر آؤ کر اپنے بعد کا حال معلوم ہوتا تو کیا ایسا دعو کر سکتے تھے؟ کیا اُس صورت میں اپنی تمام رائے پر نظر ثانی نہ کرتے؟ وہ کیا جانتے تھے کہ عنقریب صفحہ اُلتنے والا ہے اور خلافت نہ صرف قریش سے، بلکہ عرب ہی سے رخصت ہو جانے والی ہے - جو علماء اس انقلاب کے بعد پیدا ہوئے، اور انہوں نے وہ زمانہ پایا جب ”ما اقاموا الدين“ کا ظہور پوری طرح ہو چکا تھا - یعنی



اٹھ-وں نے جس طرح اس حکم کی پیروی کی کہ ”تسمع و تطیع و ان ضرب ظہرک و اخذ مالک فاسمع و اطع“ رواہ مسلم - ٹھیک ٹھیک اُسی طرح اس فرمان کی بھی کی کہ ”فان امر بمعصیة فلا سمع و لا طاعة“ اور ”من رای منکم منكرا فلیغیرہ بیدہ“ فان لم یستطع فبلسانہ“ و ان لم یستطع فبلقبہ“ و ذلک اضعف الایمان“ رواہ مسلم -

حضرت امام احمد بن حنبل کی پیٹھ پر نو جلاں تازیانے مار رہے تھے - خود المعتصم سر پر کھڑا تھا - تمام پیٹھ سے خون کے فوارے بہہ رہے تھے - اور یہ سب کچھ صرف اتنی بات کیلئے ہو رہا تھا کہ قرآن کی نسبت ایک ایسے سوال کا جواب دیدیں جس کا جواب اللہ کے رسول اور اُسکے یاروں نے نہیں دیا ہے اور نہ دینے کا حکم دیا ہے - وہ سب کچھ سہہ رہے تھے مگر جواب نہیں دیتے تھے - اگر کوئی صدا نکلتی بھی تھی تو یہی نکلتی ”اعطونی شیئاً من کتاب اللہ او سنۃ رسولہ حتی اقول“ درے مارنے سے کیا ہوتا ہے؟ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے ثابت کر دکھاؤ تو اقرار کرلوں - اس کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے جس کے آگے اقتداؤ اتباع کا سر جھک سکے -

ما قصۃ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم  
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس !

## فصل

( سنی اور شیعہ دونوں متفق ہیں )

اسی طرح تمام ائمہ اہلبیت کا زمانہ خلفاء بنو امیہ و عباسیہ کے عہدوں میں گزرا - یہ معلوم ہے کہ وہ خلافت کا مستحق صرف اپنے ہی کو یقین کرتے تھے نہ کہ بنو امیہ و عباسیہ کو - با ایں ہمہ کسی نے بھی اُنکے خلاف خرچ نہ کیا اور نہ اطاعت سے انکار کیا - سب اسی پر متفق ہوئے کہ حکومت اُنکی قائم ہو چکی ہے ، اسلئے سلطان رقت وہی ہیں -

خاندان اہل بیت میں سے جس کسی نے خرچ کیا ، ائمہ نے برابر اپنی مخالفت اُن سے ظاہر کی - جیسا کہ حضرت زید کے خرچ اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے انکار سے ثابت و معلوم ہے -

ثانیاً ' میرا یقین ہے کہ یہ بات بھی آر بے شمار باتوں کی طرح رقت کے سیاسی اثرات کا نتیجہ تھی - یہ ظاہر ہے کہ معاملہ خلافت ابتدا سے سخت کشمکش و نزاحم میں رہا - جو خاندان قابض ہوا ' اسکو رقیبوں اور دعویداروں کی طرف سے ہمیشہ کھٹکا رہا - پس جبکہ خلافت اہل عرب کے ہاتھ میں تھی ' تورہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ عجمیوں کے رولوں کی اس بارے میں جرأت افزائی کی جائے ؟ اور عرب میں سے بھی جب خاص خاندان قریش میں تھی جو ہر طرح سیادت و بزرگی رکھتا تھا ' تورہ کیسے پسند کر سکتے تھے کہ غیر قرشی خلافت کا وجود تسلیم کرے غیر قرشیوں کو ہمتیں دلائی جائیں اور مادی طاقت کے ساتھ شریعت کی حمایت کا سہارا بھی انہیں حاصل ہو جائے ؟ بخاری کی روایت میں پڑھ چکے ہو کہ امیر معاویہ نے قحطانی پادشاہ کے ظہور کی روایت سنی تو کس درجہ مضطرب اور غضب ناک ہوئے ؟ اور کس طرح فوراً قریش والی روایات کا اعلان کر دیا تاکہ پہلے ہی سے سد باب ہو جائے ؟ جن علماء کے اقوال پر متاخرین فقہاء و متکلمین کا اعتماد ہے ' وہ سب کے سب بھی ہیں جنکا ظہور اواخر عہد عباسیہ میں ہوا ہے جب قرشی خلافت قائم تھی - مثلاً قاضی عیاض و امام نواری وغیرہم - پس رقت کی حکومت کا جو پولیٹیکل اثر سب پر پڑ رہا تھا ' وہ بھی یہی تھا کہ خلافت کو حکمران خاندان کی قوم اور خاندان سے مخصوص سمجھا جائے اور تمام ایسی باتوں میں جس میں اجتہاد رائے کو دخل ہو ' فکر و قیاس کا میلان قدرتی طور پر اسی جانب ہو جائے - علی الخصوص جبکہ اسکے لیے کسی غلط بیانی یا تحریف احکام کی ضرورت نہ تھی - واقعی احادیث موجود تھیں - صرف مفہوم کے تعین میں اجتہاد کو کام کرنا تھا - اسی مسئلہ پر موقوف نہیں ' رقت کے پولیٹیکل اثرات بے شمار چیزوں میں اندر ہی اندر کام کر چکے ہیں ' اور آج انکا پتہ لگانا بہت دشوار ہو گیا ہے - ساتویں صدی ہجری میں جب عربی خلافت کا خاتمہ ہو گیا ' تو آہستہ آہستہ اس اثر سے افکار خالی ہونے لگے ' اور بتدریج بعثت و نظر کی صورت دوسری ہو گئی - حافظ عسقلانی اور قاضی عینی جو آٹھویں صدی میں بخاری کی شرح لکھ رہے ہیں ' انکے مباحث پڑھو تو قاضی عیاض اور نواری سے انکارنگ مختلف نظر آئیگا - قاضی عینی تو صاف صاف رہی کہنا چاہتے ہیں جو ہمارا بیان ہے اگرچہ اسپر زیادہ زور نہیں دیتے -

بغارت و خرچ کر کے جمعیت امت و استحکام خلافت کو نقصان پہنچایا ، اور کتنوں ہی نے افراط اطاعت کیشی میں حق کو باطل اور باطل کو حق بنا کر امت کا نظام حق و عدل درہم برہم کر دیا ۔

دنیا میں کوئی قوم نہیں جس کے اجتماعی اعمال کی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر مل سکے کہ ایسے سخت و نازک حکم پر عمل کیا گیا ہو ، اور پوری کامیابی کے ساتھ اس کے دونوں پہلوؤں کو سنبھالا ہو ۔ لیکن عہد صحابہ و سلف کے مسلمانوں نے صدیوں تک عمل کر کے ثابت کر دیا کہ سچائی اور اخلاق کی کوئی عملی مشکل ایسی نہیں جو پیران اسلام کیلئے مشکل ہو سکے ۔ انہوں نے نہ صرف اس پر عمل کیا ، بلکہ پوری کامیابی کے ساتھ اس اخلاقی امتحان سے عہدہ برا ہو کر نکلے ۔ انہوں نے ایک ہی رقت میں دونوں متضاد عمل کر دکھلائے ۔ اطاعت بھی کی اور مخالفت بھی ۔ لیکن اطاعت اُسی بات میں کی جو مستحق اطاعت تھی ، اور مخالفت وہیں کی جہاں مخالفت کرنی تھی ۔ ” اطاعت “ اور ” اقتداء “ کے اُس نازک فرق کو جسکو فلسفۂ اخلاق بڑی بڑی دقیقہ سنجیوں کے بعد حل کرسکتا ہے ، انہوں نے اپنی عملی زندگی کی سادگی سے حل کر دکھایا ، اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ اخلاق کے فلسفہ کیلئے جو چیز سب سے زیادہ مشکل ہے ، وہی ایک مومن کے عمل کیلئے سب سے زیادہ آسان ہے !

قومی حکومت کی اطاعت اور فرماں برداری اس سے بڑھکر اور کیا ہوسکتی ہے جو صحابہ و تابعین نے بنو امیہ کے امراء جور کی کی ؟ اور اُنکے بعد علماء سلف نے بنو عباس کے دعاۃ بدعت کی ؟ ہر طرح کے مظالم سہے ، ہر طرح کی مصیبتیں جھیلیں ، قید کیے گئے ، دروں سے مارے گئے ، قتل ہوئے ، مگر پھر بھی اطاعت سے باہر قدم نہ رکھا ، اور ہمیشہ یہی کہتے رہے ” ینصب لكل غادر لواء يوم القيامة “ و نحن بائعونہم “ رہ جو فرمایا تھا کہ ” قید شبر “ بالشت بھر بھی اطاعت سے الگ نہو ، سو واقعی ویسا ہی عمل کر کے دکھا دیا !

مگر ساتھ ہی استقامت حق اور امر بالمعروف و دعوة الی السنة کا بھی یہ حال تھا کہ نہ تو عبد الملک کی بے پناہ تلوار اس پر غالب آ سکتی تھی ، نہ حجاج کی خون آشامی ، اور نہ مامون و معتصم کی قہرمانیہ ۔ قدم جب اُٹھتا تھا تو حق کی طرف ، زبان جب کھلتی تھی تو سچائی کیلئے ، اور دل میں کسی کی گنجائش نہ تھی مگر عشق کتاب و سنت کی ۔

نے قریش میں امامت کی خبر دی ، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُنکے سوا کوئی دوسرا امام نہیں ہو سکتا ۔ یہ ویسی ہی خبر ہے جیسی اس بارے میں خبر دی کہ اذان کا کام اہل حبش میں ہے اور قضاء ازیوں میں ۔ جس طرح ان روایتوں سے یہ بات نہیں نکلتی کہ مؤذن اور قاضی صرف حبشی اور ازہی ہی ہونے چاہئیں ، اُسی طرح یہ بات بھی ثابت نہیں ہوتی کہ امام صرف قرشی ہی ہو سکتا ہے ۔ جر جواب اُنکا دیا جائیگا ، رہی اسکا ہوگا ۔

یہ راضع رہے کہ جن جن علماء حدیث و کلام کے اقوال سے یہ اجماع ثابت کیا جاتا ہے ، وہ سب کے سب اُسی عہد کے ہیں جبکہ خلافت عباسی قائم تھی ۔ بعد والوں نے جو کچھ لیا ہے ، اُنہی سے لیا ہے ۔ سب سے زیادہ اعتماد اس بارے میں قاضی عیاض کے بیان پر کیا جاتا ہے جنکا قول نواری نے شرح مسلم اور منہاج میں نقل کیا ہے ۔ انکا سال وفات سنہ ۵۴۴ ھ ہے ۔ پھر یہ بھی راضع رہے کہ اجماع کے دعوے نے عام طور پر جو رسعت اختیار کر لی ہے ، اور جس طرح بتدریج اس لفظ کا استعمال اپنے لغوی و اصولی معنی سے ہٹ کر مختلف مصطلحہ معنوں میں ہونے لگا ہے ، اسکو فراموش نہیں کرنا چاہیے ۔ علی الخصوص فقہاء مذاہب کے استعمالات متکلمین اور ارباب اصول کے مصطلحہ اجماع سے بالکل مختلف ہیں ۔ ہر مذہب کے فقہا بلا تامل اپنے مسلک کو ” جمہور “ اور ” اجماع “ کے لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں ۔ اسمیں کسی کا مطلب کچھ ہوتا ہے کسی کا کچھ ۔ صاحب ہدایہ وغیرہ کے نزدیک عدم وجوب قراۃ فاتحہ خلف امام اور افضلیت اسفار جمہور کا قول ہے ۔ بعضوں نے اجماع تک کہ دیا ۔ لیکن شوافع و محدثین کہتے ہیں کہ قراۃ فاتحہ ہی جمہور کا مذہب ہے اور اسی پر جماہیر علماء کا اتفاق ہے ۔ انہی حافظ نواری کی ( جو اشتراط قرشیہ کو جمہور کا مذہب بتلاتے ہیں ) شرح مسلم دیکھ لی جائے ۔ کس طرح شافعیہ کا ہر مذہب اُنکے نزدیک ” جمہور “ کا مذہب ہے ، اور مخالف کا ہر قول شاذ ۔ شافعیہ اور حنفیہ کی خلافیات میں تقریباً دو تہائی مسائل تو ضرور ایسے ہونگے جنکی نسبت ہر جگہ شرح مسلم میں پاؤ گے ” هذا مذہب الشافعی و الجماہیر “ و خالف فیہ ابو حنیفہ “ امام شافعی اور جمہور کا مذہب یہی ہے مگر امام ابو حنیفہ نے اس سے خلاف کیا ۔ اگر ہمارے علماء احناف حافظ نواری کی ان تمام جمہوریات و اجماعیات کو تسلیم کر لینے کیلئے طیار ہیں ، تو خیر شرط قرشیہ کا ایک اجماع آر رہی !

اہل سنت کی تمام جماعتیں متفق ہیں، ٹھیک اسی طرح شیعہ بھی متفق ہیں۔ اہل سنت کے نزدیک خلافت کی تمام شرطیں صرف خلفاء راشدین ہی میں جمع تھیں اور انہی کا انتخاب صحیح نظام شرعی کے مطابق ہوا۔ اُنکے بعد پھر نہ ہوا۔ امامیہ کے نزدیک ابتدا ہی سے نہ ہوا۔ لیکن اطاعت دونوں عہدوں میں اہل سنت نے بھی ضروری قرار دی۔ شیعوں نے بھی ضروری قرار دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک قائم و نافذ اسلامی سلطنت کی اطاعت پر سنی و شیعہ دونوں متفق ہیں۔ یہی حال زیدیہ وغیرہ فرقوں کا ہے۔

## فصل

( بعض کتب مشہورہ عقائد و فقہ )

تمام اسلامی مدرسوں میں صدیوں سے جو کتابیں پڑھی پڑھائی جا رہی ہیں، ان میں سے بعض کی عبارتیں ہم نقل کرینگے :

شرح مقاصد میں ہے : ” و اما اذا لم يوجد من يصلح ذالك ، او لم يقدر على نصبه لاستيلاء اهل الباطل و شوكة الظلمة و ارباب الضلال ، فلا كلام في جواز تقليد القضاء و تنفيذ الاحكام و اقامة الحدود و جميع ما يتعلق بالامام من كل ذي شوكة “ اور شروط امامت بیان کر کے لکھتے ہیں ” نعم “ اذا لم يقدر على اعتبار الشرائط ، جاز الابتداء للاحكام المتعلقة بالامامة على كل ذي شوكة يقتدر تغلب او استولي “ اور اسی میں ہے ” فان لم يوجد من قریش من يجمع الصفات المعتمدة ، ولي كذا “ فان لم يوجد ، فرجل من ولد اسماعيل ، فان لم يوجد فرجل من العجم “ ۔

مرقات شرح مشکوٰۃ میں ہے ” و اما الخروج عليهم و قتالهم ، فمحرم و ان كانوا فسقة ظالمين “ اور حدیث ” من اتاكم و امرکم جميع على رجل واحد “ کی شرح میں لکھتے ہیں ” ای له اهلية الخلافة ، او التسلط و الغلبة “ ۔

شامی میں ہے ” و ثبت عقد الامامة اما باستخلاف الخليفة اياه كما فعل ابو بكر “ و اما بيعة جماعة من العلماء او من اهل الراے “ ۔



باللہ کے خون نے بھر ہمیشہ کیلیے عربی و قرشی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا ۔ مستعصم کا قتل عربی خلافت کا قتل تھا : ( ۱ )

وما کان قیس ہلکۃ ہلک واحد  
ولکنہ بنیان قوم تہدما !

یہ سب کچھ ہو چکا ، مگر ابھی پیشین گوئی کی ایک آخری سطر باقی تھی ۔ یعنی ” ما بقی منہم اثنان “ قریش سے حکومت نکل جائیگی ۔ پر نکل جانے پر بھی انکی عظمت رفتہ کا یہ اثر باقی رہیگا کہ اگر در قرشی بھی کسی گوشہ میں نکل آئیں گے تو لوگ خلافت کا انہی کو مستحق مانیں گے ۔ بغداد میں قرشی خلافت مٹی ، لیکن مٹتے مٹتے بھی ایک آخری نقش چھوڑ گئی ۔ وہ بغداد کی خون آلود خاک سے اکھڑا اور تین سو برس تک کیلیے مصر میں جا کر جم گیا ۔ البتہ یہ جماؤ قرشی حکومت کا جماؤ نہ تھا ۔ محض اُسکے نقش قدم کا تھا :

گو کہ ہم صفحہ ہستی پہ تیر ایک حرف غلط  
لیکن اُٹھے بھی تو ایک نقش بٹھا کے اُٹھے !

عباسی خاندان کے در چار آدمی بغداد کے قتل عام سے بچ کر نکل گئے تھے ۔ انہی میں مستعصم کا چچا احمد بن ظاہر عباسی بھی تھا ۔ وہ سنہ ۴۹۰

( ۱ ) فتنہ تاتار کا ظہور مسلمانوں کیلیے وہی معاملہ تھا جو بنی اسرائیل

کیلیے بخت نصر کا ظہور ۔ ثم بعثنا علیکم عبداً لنا اولی باس شدید ۔ فجاسوا

خلال الدیار ۔ و کان وعداً مفعولاً ( ۱۷ : ۶ ) بحکم ” یا ائی علی امتی ما اتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل “ ( صحیحین ) اس امت پر بھی وہ سب کچھ گذرنے والا ہے جو بنی اسرائیل پر گزر چکا ۔ بنی اسرائیل پر غفلت و ضلالت کے وہ سب سے بڑے دور آئے ۔ اس لیے وہی مرتبہ عام

بربادی بھی چھائی : و قضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب لتفسدن

فی الارض مرتین و لتعلن علواً کبیراً ( ۱۷ : ۵ ) پہلی بربادی بخت نصر

کے ہاتھوں ہوئی : عبداً لنا اولی باس شدید ۔ اور دوسری ٹیئس قیصر روم کے ہاتھوں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح اس امت کیلیے بھی در انقلاب لگے گئے ۔ ایک فتنہ تاتار ۔ دوسرا فتنہ یورپ ۔ پہلا ہو چکا ۔ دوسرا ہو رہا ہے ۔

حضرة امام علي رضا کو مامون الرشید نے اپنا رلي عہد قرار دیا۔ امام موصوف نے رلي عہدي قبول کرلي۔ یعنی تسلیم کرليا کہ مامون خليفہ ہے، اور اُسکو اپنے استخلاف اور رلي عہدي کا حق پہنچتا ہے۔ اگر وہ خود خليفہ نہ تھا تو دوسرے کو رلي عہدي کیونکر مل سکتی تھی؟

آئمۃ اہل بیت کی پوري تاريخ میں ایک واقعہ بھی موجود نہیں کہ انہوں نے لوگوں کو بنو امیہ و عباسیہ کی اطاعت سے روکا ہو۔ برخلاف اس کے کتب حدیث امامیہ (مثلاً اصول کافی وغیرہ) میں ایسی تصریحات موجود ہیں کہ باوجود اظہار استحقاق خود و شکوہ غصب و تعدی، عدم اطاعت و حکم خروج سے ہمیشہ مانع رہے۔

سب سے زیادہ قاطع اور فیصلہ کن اسوۂ حسنہ اس بارے میں خود حضرت علي علیہ السلام کا ہے۔ حضرات امامیہ انکی خلافت کو منصوص تسلیم کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ انکی موجودگی میں آر کوئی جائز خليفہ نہیں ہو سکتا تھا۔ با ایں ہمہ ظاہر ہے کہ یکے بعد دیگرے تین خليفہ ہوئے، اور حضرت علي نے نہ تو خروج کیا، نہ بیعت سے انکار کیا، نہ علحدگی اختیار کی۔ متصل بیس برس تک اُنکا یہی طرز عمل قائم رہا۔ اس سے بڑھکر قاطع و فاصل دلیل اس بات کیلیے آر کیا ہو سکتی ہے کہ جب امت ایک سلطان پر مجتمع ہو جائے، تو پھر کسی طرح نہی اسکی مخالفت جائز نہیں۔ اور اسکی اطاعت کرنا ہر فرد پر واجب ہے؟ جب ایک خليفہ و امام منصوص من اللہ کیلیے انکار جائز نہ تھا، تو عامۃ امت کیلیے کب جائز ہو سکتا ہے؟

غرضکہ اس بارے میں اہل سنت و امامیہ دونوں متفق ہیں۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ حضرات امامیہ اور اہل سنت میں مسئلۂ خلافت کی نسبت جو مشہور اختلاف ہے، وہ صرف پہلی صورت میں ہے، نہ کہ دوسری صورت میں۔ یعنی اس بارے میں ہے کہ اگر امت خليفہ و امام منتخب کرے تو کس کو اور کیسے کو منتخب کرے؟ شیعہ کہتے ہیں کہ اسکا استحقاق صرف آئمۃ اہل بیت کو ہے۔ وہی امام ہو سکتے ہیں۔ اہل سنۃ کہتے ہیں کہ یہ شرط ضروری نہیں۔

لیکن اگر اصلی نظام باقی نہ رہا ہو اور غلبہ و تسلط سے کوئی شخص اسلام کی مرکزی سلطنت پر قابض ہو گیا ہو، تو اسکی اطاعت پر جس طرح

بخاری کی حدیث معاریہ ” ما اقاموا الدین “ کی شرح میں لکھتے ہیں  
 ” ای مدۃ اقامتہم امور الدین - قیل یحتمل ان یكون مفہومہ فاذا لم یقیموہ  
 لا یسمع لہم “ یعنی یہ جو حدیث میں ہے کہ ” جب تک دین قائم رکھینگے “  
 تو اسکا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جب وہ وقت آجائے کہ قریش اقامت  
 دین نہ کریں تو انکی بات نہیں سنی جائیگی -

غرضکہ جہاں تک تمام احادیث و دلائل پر نظر ڈالی جاتی ہے ، اشتراط  
 قرشیۃ کیلئے کوئی نص موجود نہیں ، اگرچہ بصورت اشتراط بھی موجودہ  
 مسئلہ خلافت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا - موجودہ مسئلہ انتخاب امام کا نہیں  
 ہے - امام قائم و نافذ کی امامت و اطاعت کا ہے -

( چند لمحات تاریخیہ )

اب بہتر ہوگا کہ تھوڑی دیر کیلئے ہم آگے بڑھنے سے رک جائیں ، اور  
 چند لمحوں کے لیے گذشتہ تیرہ صدیوں کی طرف مڑ کے دیکھیں کہ خلافت  
 اسلامیہ کے مختلف دوروں کا کیا حال رہا ہے ؟

” الخلافة بعدی ثلاثون سنة “ ( میرے بعد خلافت خاصہ ۳۰ برس تک  
 رہیگی ) کی خبر کے مطابق خلفاء راشدین کا دور ۳۰ - برس تک رہا -  
 سنہ ۱۱ - ہجری سے شروع ہوا ، اور تھیک سنہ ۴۱ - تک باقی رہا - اسی  
 سنہ سے بنو امیہ کی خلافت کا دور شروع ہوتا ہے اور سنہ ۴۱ - ۵ سے سنہ  
 ۱۳۲ - تک قائم رہتا ہے - اسکے بعد خلافت نے ایک نیا ررق اُلٹا ،  
 اور خاندان عباسیہ کا سلسلہ شروع ہوا - خلافت کا سب سے بڑا سلسلہ یہی  
 ہے جو سنہ ۱۳۲ - سے ۶۵۶ - تک قائم رہا - چونکہ کامل پانچ صدیوں  
 تک حکمرانی ایک ہی گھرانے میں رہی ، اسلئے وہ تمام ذہنی و جسمانی  
 اور اجتماعی و مدنی فسادات کمال درجہ تک پیدا ہو گئے ، جو ہمیشہ  
 امتداد سلطنت و عروج تمدن کے لازمی نتائج رہے ہیں - قریش کی نسبت  
 فرمایا تھا ” ما اقاموا الدین “ جب تک وہ دین قائم رکھینگے ، حکومت  
 انہی میں رہیگی - سراب تھیک تھیک وہ وقت آ گیا تھا - قریش و عرب  
 میں دین قائم رکھنے کی صلاحیت منقود ہو گئی تھی - قیام دین کا  
 کام دوسری قومیں اور طاقتیں انجام دے رہی تھیں - پس رہی ہوا  
 جو تاریخ عالم ہر ایسے زمانے میں دہراتی آئی ہے - سنہ ۶۵۶ - میں  
 ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا اور آخری خلیفہ عباسی المستعصم

اور حجة الله البالغة میں ہے ” ان الخليفة اذا انعقدت خلافتہ “ ثم  
خرج آخر يذاعه “ حل قتله “

اور ازالۃ الخفاء میں ایک مفصل اور دقیق بحث مسئلۂ خلافت و  
حقیقت خلافت پر کرتے ہوئے ( جس سے بہتر اور جامع بحث شاید ہی  
کسی دوسری جگہ مل سکے ) لکھتے ہیں ” و حرام ست خرج بر سلطان  
بعد ازان کہ مسلمین بر رے جمع شدند، مگر آنکہ کفر بواج از رے دیدہ شود،  
اگرچہ آن سلطان مستجمع شرائط نہ باشد و این مضمون متواتر بالمعنی ست “  
( جلد - ۱ : ۱۳۷ )

حاصل ان تمام عبارتوں کا وہی ہے جو اوپر گزر چکا - یعنی ہر زمانے میں  
امت کیلئے ایک خلیفہ ہونا چاہیے جو صاحب طاقت و اقتدار ہو - اگر  
امت منتخب کرے تو اسکے لیے فلاں فلاں شرطیں ہیں - لیکن اگر کسی  
مسلمان کی حکومت قائم ہوگئی ہے اور وہی صاحب اقتدار و شوکت ہے، تو  
اسی کو خلیفہ ماننا چاہیے - خواہ تمام شرطیں اُس میں پائی جائیں یا  
نہ پائی جائیں - قرشی ہو یا غیر قرشی، ظالم ہو یا عادل، عالی خاندان  
ہو یا دنی النسب، حتیٰ کہ ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، لیکن اُسکی  
اطاعت و حمایت ہر مسلمان پر واجب ہے - جب تک کفر صریح اس سے  
ظاہر نہ ہو - لیکن اگر ایسا ہوا، تو پھر نہ بیعت قائم رہی نہ عہد اطاعت  
باقی رہا - اُس حالت میں مسلمانوں پر واجب ہو جائیگا کہ اسکا مقابلہ  
کریں - جو شخص مقابلہ کی طاقت اپنے میں نہ دیکھے، وہ اسکے ملک سے  
ہجرت کر جائے - ” فمن قام علی ذلک فله الثواب - ومن داهن، فعليه  
الاثم - ومن عجز، وجبت عليه الهجرة من تلك الارض “ کذا فی الفتح  
( ۱۳ : ۱۰۹ )

فتح الباری کی اس عبارت سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ  
جس ملک میں کفار کی سلطنت قائم ہو جائے، وہاں مسلمانوں کو خروج  
کرنا چاہیے، اور حق کے اظہار و اعلان میں کسی طرح کی مداخلت گوارا  
نہ کرنی چاہیے - لیکن اگر اسکی طاقت اپنے اندر نہ دیکھیں، تو پھر اس  
ملک سے ہجرت کر جائیں - یعنی یہ کسی حال میں جائز نہیں کہ تسلط  
کفر پر قانع و رضامند ہو کر زندگی بسر کریں -

خلافت کا منصب عثمانی سلاطین ہی کے قبضہ میں آجائے - رقت کی جو اسلامی سلطنت سب سے بڑی اور سب سے زیادہ شرع و ملت کی حفاظت کی طاقت رکھتی ہو، رہی شرعاً خلافت کا منصب رکھ سکتی ہے - گذشتہ چار صدیوں کے اندر اسلامی حکومتوں کے انقلابات کا جو حال رہا ہے، انکو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ حق بجز اس سلطنت کے اور کسی سلطنت کو مل سکتا تھا؟ خود ہندوستان میں سلاطین مغلیہ کی حکومت قائم تھی - وہ ہندوستان کے اندر اپنے ہی کو امام سمجھتے تھے، لیکن عالم اسلامی کی خلافت کا انہیں کبھی دھم و خیال بھی نہیں گزرا، اور اگر گزرتا تو دنیا ماننے کیلئے طیار نہ تھی - ابتدا سے لیکر آخر تک مقام خلافت کی جو عام و مشترک خصوصیات رہی ہیں اور جنکو تمام دنیا کے مسلمانوں نے عملاً علائم خلافت تسلیم کر لیا ہے، وہ خلفاء عباسیہ کے بعد صرف عثمانی سلاطین ہی کو حاصل ہوئیں - کوئی دوسری اسلامی حکومت اس عام اقتدار و اختیارات کے ساتھ قائم نہ ہو سکی -

#### ( خلافت و امامت سلاطین عثمانیہ )

اس عارضی وقفہ کے بعد اب ہم پھر آگے بڑھتے ہیں - سلطان سلیم خاں ارل کے عہد سے لیکر آج تک بلا نزاع سلاطین عثمانیہ ترک تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام ہیں - ان چار صدیوں کے اندر ایک مدعی خلافت بھی انکے مقابلہ میں نہیں آتا - بنو امیہ اور عباسیہ کے عہدوں میں بے شمار رقبتوں اور دعویداروں کی کشمکش نظر آتی ہے، لیکن سلاطین عثمانیہ کی خلافت کی پوری تاریخ میں کسی ایک مدعی خلافت کا نام بھی نہ ہونڈھکر نہیں نکالا جاسکتا - حکومت کے دعویدار سیکڑوں آئے ہوں، مگر اسلام کی مرکزی خلافت کا دعویٰ کوئی نہ کر سکا -

صدیوں سے اسلام و بلاد اسلام کی حفاظت کی تلوار صرف انہی کے ہاتھوں میں ہے - صدیوں سے صرف انہی کا سینہ اسلام کی راہ میں زخمی ہے، صرف انہی کی لاشیں اسلام کیلئے خاک و خون میں تڑپتی ہیں، صرف انہی کی ذمہ داری پر تمام کرۂ ارضی کے مسلمانوں نے اسلام کی مرکزی حفاظت کا کاروبار چھوڑ رکھا ہے - دنیا کے خواہ کسی گوشے میں کوئی مسلمان ہو، اگر وہ بہ حیثیت ایک مسلمان کے اسلام کا چوتھا رکن حج ادا کرنے کیلئے نکلتا ہے، تو عرفات کے میدان میں کھڑے ہو کر اسکو



مسامرہ میں ہے ”و المتغلب تصح منه هذه الامور ( ای رلیۃ القضاء و الامارۃ و الحکم بالاستفتاء و نحوها ) للضرورة“ و صار الحال عند التغلب كما لم يوجد قرشی عدل“ ار جرد و لم یقدر ( ای لم توجد قدرة علی تولیته لغلبة الجورة ) اذ یحکم فی کل من الصورتین بصحة رلیۃ من لیس بقرشی و من لیس بعدل للضرورة“

اور شرح مواقف میں امامت کی شرطیں بیان کر کے لکھتے ہیں :  
”لكن للامة ان ينصبوا فاقد ها“ دفعا للمفاسد التي تندفع بنصبه“ ( ۶۱۴ )

سب سے زیادہ مشرح بحث حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں کی ہے : ”و قد اجمع الفقهاء علی وجوب طاعة السلطان المتغلب و الجهاد معه“ و ان طاعته خیر من الخروج علیه لما فی ذلك من حقن الدماء و تسکین الدهماء“ و لم یستثنوا من ذلك الا اذا وقع من السلطان الکفر الصریح“ فلا یجوز طاعته فی ذلك بل تجب مجاهدته لمن قدر علیها كما فی الحدیث“ ( جلد ۱۳ : ۷ )

اور روایت حذیفہ ”فاعتزل تلك الفرق كلها“ الخ مندرجہ کتاب الفتن کی شرح میں لکھتے ہیں ”قال ابن بطال : فيه حجة لجماعة الفقهاء في وجوب لزوم جماعة المسلمين و ترک الخروج علی أئمة الجور“ لانه وصف الطائفة الاخيرة بانهم دعاة علی ابواب جهنم“ مع ذالك امر بلزوم الجماعة“ ( ۱۳ : ۳۱ )

اور حدیث ”اسمعوا و اطیعوا“ ان استعمل علیکم عبد حبشی“ کی شرح میں لکھتے ہیں ”و اما لو تغلب عبد حقيقة بطريق الشوكة“ فان طاعته تجب اخماداً للفتنه“ ( ۱۳ : ۱۰۹ )

حافظ نواری شرح مسلم میں لکھتے ہیں ”و هذه الاحادیث فی البحث علی السمع و الطاعة فی جمیع الاحوال“ و سببها اجتماع كلمة المسلمين“ فان الخلاف سبب لفساد احوالهم فی دینهم و دنیا هم - و قوله صلعم : و ان كان عبد مجذع الاطراف - یعنی مقطوعها“ و المراد اخس العبيد - اے اسمع و اطیع للامیر و ان كان دنی النسب \* \* \* \* \* و یتصور امارۃ العبد ان و لاه بعض الائمة“ ار یغلب علی البلاد بشوکتہ“ الخ - ( جلد ۲ : ۱۲۵ )

اور قاضی شوکانی درر البہیہ میں لکھتے ہیں ”و طاعة الائمة واجبة الا فی معصية الله“ و لا یجوز الخروج علیهم ما اقاموا الصلوة“ ( شرح درر : ۴۱۴ )

میں مصر پہنچا - وہاں ایوبی خاندان کے ممالیک کی حکومت قائم تھی اور ملک ظاہر بیبرس حکمران تھا - اسکو احمد کے خاندان کا حال معلوم ہوا تو منصب خلافت کا حقدار اسی کو تسلیم کیا اور خود اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی -

احمد بن ظاہر نے المستنصر باللہ کا لقب اختیار کیا اور بیبرس کی معیت و اعانت میں چاہا کہ دار الخلافۃ بغداد کو تاتاریوں کے تسلط سے نجات دلاے - لیکن کامیابی نہ ہوئی اور لڑائی میں شہید ہوا - اب پھر وہ وقت آگیا تھا کہ قریش سے خلافت کا انتساب بالکل معدوم ہو جائے ، لیکن ” ما بقی منهم اثنان “ کی پیشین گوئی آخر تک اپنے عجائب دکھلانے والی تھی - قتل عام بغداد سے ایک اور عباسی ابو العباس احمد بن علی بچ کر نکل گیا تھا اور حلب میں مخفی تھا - اسکا حال بیبرس کو معلوم ہوا تو برے اعزاز و اکرام سے مصر لایا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی - حاکم بامر اللہ لقب قرار پایا - اسی کی نسل میں مصر کی عباسی خلافت ۲۹۱ - برس تک قائم رہی - یعنی سنہ ۶۶۰ ھ سے سنہ ۹۲۳ ھ تک - اس عرصہ میں عالم اسلامی در صدیوں تک طرح طرح کے انقلابات و حوادث سے تہ و بالا ہو کر بالآخر ایک نئے دور میں منتقل ہو چکا تھا - عثمانی ترکوں کی حکومت قسطنطنیہ میں قائم ہو کر یورپ و ایشیا کے اندر ہر طرف پھیل رہی تھی - سنہ ۹۲۳ ھ - ( ۱۵۱۷ - مسیحی ) میں سلطان سلیم خاں ارل نے مصر و شام پر قبضہ کیا ، اور آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے تمام حقوق و امتیازات خلافت سپرد کر دیے - اختیار و حکومت کے علاوہ جو چیزیں اس سلسلہ میں سلطان سلیم کو دی گئیں ، ان میں سب سے بڑی چیز مقامات مقدسہ و حرمین کی کنجیاں تھیں ، اور بعض آثارِ نبویہ - مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار - جھنڈا - ایک چادر - یہ آثار اس وقت تک قسطنطنیہ میں بطور سند خلافت کے موجود ہیں - اسی تاریخ سے عثمانی سلاطین نمایاں طور پر ” خلیفہ “ کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے ، اور حجاز اور مصر و شام کے منبروں پر انکا ذکر بہ حیثیت امیر المومنین کے ہونے لگا - حج کی امارت بھی انہی کے قبضہ میں آگئی جو شرعاً خلافت کے اہم ترین فرائض میں سے ہے -

سلسلہ خلافت کی یہ ایک مجمل تاریخ ہے - بالفرض خلیفہ متوکل عباسی نے سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت نہ کی ہوتی ، جب بھی آئندہ پیش آنے والے واقعات کا قدرتی نتیجہ یہی تھا کہ تمام عالم اسلامی کی

اور ابن ابی شیبہ نے ابو ہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے ”الملائكة تلعن أحدكم إذا أشار إلى الآخر بحديدة“ (جلد ۱۳ : ۲۱) یعنی ابن العربی نے کہا: جب صرف ہتھیار اُٹھا کر اشارہ کرنے کی نسبت ایسی شدید وعید آئی کہ فرشتے لعنت بھیجتے ہیں، تو اُس بد بخت کا کیا حال ہوگا جو صرف اشارہ ہی نہ کرے، بلکہ سچے ہتھیار سے ایک مسلمان کو قتل کر دالے؟ اور یہ جو فرمایا کہ اشارہ کرنے والا مستحق لعنت ہوتا ہے، تو اس سے مقصود بھی شخص ہوگا جو درانے کیلئے ایسا کرے۔ خواہ غصہ سے ہو خواہ ہنسی سے۔ انتہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہنسی دل لگی سے بھی کوئی شخص ہتھیار اُٹھا کر کسی مسلمان کو درائے، تو وہ لعنت کا مستحق ہوگا۔ یعنی کسی حال میں بھی یہ بات مسلمانوں کیلئے جائز نہیں۔ اور یہ فعل اس درجہ شریعت کے نزدیک مبعوض ہے کہ اُسکی ہنسی دل لگی بھی لعنت کا موجب نہ رہی!

حضرت عبد اللہ بن عمر سے مرفوعاً مروی ہے ”زال الدنيا كلها اهن على الله من قتل رجل مسلم“ (خرجه الترمذي وقال حديث حسن، وخرجه النسائي بلفظ ”لقتل المؤمن اعظم عند الله من زوال الدنيا“) یعنی آنحضرت نے فرمایا۔ اللہ کی نظروں میں تمام دنیا کے زائل ہوجانے سے بھی بڑھ کر جو چیز ہے، وہ ایک مسلمان کا قتل ہونا ہے۔ اور اسی بنا پر فرمایا ”اول ما يقضي بين الناس في الدماء“ (رواه البخاري عن ابن مسعود و زاد مسلم ”في يوم القيامة“) قیامت کے دن سب سے پہلے جس معاملہ کا فیصلہ چکایا جائیگا وہ انسان کا خون ہے۔ (۱)

(۱) یہاں یہ شبہ وارد نہو کہ یہ حدیث محاسبہ صلوات کی مشہور حدیث سے معارض ہے، کیونکہ نماز کی نسبت قضاء کا لفظ نہیں آیا ہے۔ حساب کا آیا ہے۔ بخاری کی روایت میں ہے ”اول ما يحاسب به المرء“

میں سے سمجھتی ہو۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی شہادت ' اُسکی شریعت کی آن گنت اور بے شمار دلیلیں ' ایک ہزار تین سو برس سے مانا ہوا اسلام کا حکم و عقیدہ ' اسلام کی سیکڑوں نسلوں اور لا تعداد گہرائیوں کا تعامل و اجماع ' اور سورج کی کرنوں کی طرح یقینی اور قطعی حقیقت ' یہی بتلا رہی ہے۔ ایک مسلمان کیلئے ( بشرطیکہ وہ ساری باتوں سے مقدم اپنے اسلامی تعلق کو سمجھتا ہو ' اور دنیا سے ایک مومن اعتقاد و عمل ساتھ لے جانا چاہتا ہو ) اس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ جاہل سے لیکر عالم تک ' ایک مزدور سے لیکر نظام دکن تک ' مسلمانوں کے ایک ایک فرد ' ایک ایک بچے کے دل پر یہ اعتقاد اس طرح کھدا ہوا ہے کہ تلوار کی نوک سے بھی چھیلا نہیں جاسکتا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کا عشق اور انسانی طاقتوں کا خوف کسی زبان کو گونگا یا کسی ہاتھ کو شل کر دے۔ لیکن ہندوستان میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک دل ایک بھی ایسا نہیں مل سکتا جو اس اعتقاد میں تمام مسلمانوں کا شریک نہ ہو۔ زندگی کا عشق اور دنیوی تکلیفوں کا غم جس انسان سے چوری کرتا ہے ' داکے دلاتا ہے ' قتل کرتا ہے ' دل کے خلاف ہزاروں دعوؤں سے ' اور اعتقاد و ضمیر کے خلاف لاکھوں اقراروں سے اُسکا حلق و دھن بھر دیتا ہے ' اُس انسان سے کیا بعید ہے کہ آج کسی طمع یا خوف سے عثمانی خلافت کا انکار کر دے ' یا عثمانی خلیفہ کی اطاعت و حمایت کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے ؟ دنیا کی پوری تاریخ انسانی کمزوریوں کی ایک غم آلود اور ندامت انگیز داستان ہے۔ پس جہاں انسانی کمزوری کی بے شمار مثالیں اُسکے ہر عہد و باب میں ملتی ہیں ' وہاں آج چند مثالوں کا اضافہ اور سہی۔ لیکن حقیقت ہر حال میں حقیقت ہے۔ اُس سے انکار کیا جاسکتا ہے لیکن چھپایا نہیں جاسکتا۔ اُس سے انغماض کیا جاسکتا ہے ' لیکن اُس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ آج مسلمانوں کیلئے اس سے بڑھ کر بدبختی کی کوئی ماتم انگیز مثال نہیں ہو سکتی کہ ایک ایسی سچائی کے اثبات کیلئے دلیلوں کی تلاش ہے اور بحث و نظر کی ضرورت۔ اگر ایسی مسلم و معروف باتیں کیلئے بھی دلائل و اثبات کی ضرورت ہے ' تو شاید وہ وقت آ گیا جب توحید کے عقیدہ کو اسلامی عقیدہ ثابت کرنے کیلئے فتوے لکھوانے پڑیں گے ' اور کتابیں چھاپکر شائع کرنی پڑیں گی !



# فصل

( من حمل علينا السلاح فليس منا )

سورۃ نساء میں ہے :

ومن يقتل مؤمناً متعمداً فجزأؤه  
جهنم خالداً فيها و غضب الله  
عليه و لعنه و أعد له عذاباً  
عظيماً - ( ۴ : ۹۵ )  
جو مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو  
جان بوجھ کر قتل کر دالے تو اسکی سزا  
درزخ کی ہمیشگی ہے ، اللہ کا غضب  
ہے ، اسکی پھٹکار ہے ، اور بڑا ہی درد  
ناک عذاب ہے جو ایسوںکے لیے طیار ہو چکا ہے ۔

یہ آیت اس بارے میں نص قطعی و ظاہر ہے کہ جو مسلمان دانستہ  
بلا کسی حق شرعی کے دوسرے مسلمان کو قتل کرے ، وہ درزخ میں دالا  
جائیگا ، اللہ کے غضب و لعنت کا مورد ہوگا ، اور عذاب الیم کا مستحق ۔

بخاری و مسلم میں ہے ” سبب المسلم فسوق و قتاله كفر “ ( و رواہ  
الترمذی و صححہ و لفظہ ” قتال المسلم اياه كفر و سبابه فسوق “ ) یعنی  
مسلمان کو دشنام دینا فسق ہے اور اُس سے لڑائی لڑنا کفر ۔

آنحضرت نے آخری حج کے موقع پر جو یادگار عالم خطبہ دیا تھا ، اور جو  
خطبہ حجة الوداع کے نام سے مشہور ہے ، اسمیں ہمیشہ کیلئے تمام امت  
کو وصیت فرمائی ” لا ترجعوا ( و فی رواية لا ترجعون ) بعدی کفاراً يضرب  
بعضکم رقاب بعض “ ( بخاری ) میرے بعد کافروں کی طرح نہ ہو جانا کہ  
تم میں سے ایک دوسرے کی گردن ارزائے ۔

اور بخاری میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے ” لایشیر احدکم علی اخيه  
بالسلاح فانه لا یدري لعل الشيطان ینزغ فی یده ( و فی رواية ینزع بالعين )  
فیقع فی حفرة من النار “ ( و ایضاً أخرجه مسلم عن ابن رافع ، و ابو نعیم فی  
المستخرج من مسند ابن راهویہ ) یعنی فرمایا : کبھی اپنے بھائی مسلمان  
کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کیا کر ۔ ممکن ہے کہ ہتھیار لگ جائے اور تم جہنم کے  
گڑھے میں گتر پتر ۔ یعنی اگر اشارہ کرنے میں تلوار کام کر گئی اور مسلمان کا  
خون ہو گیا ، تو ایک ایسے فعل کا ارتکاب ہو جائیگا جسکی پاداش عذاب جہنم ہے ۔



عثمانی امامت کی دینی ریاست قبول کرنی پڑتی ہے اور حج کا فریضہ عثمانی خلیفہ ہی کے بھیجے ہوئے نائب کے ماتحت انجام دینا پڑتا ہے۔ شریف حسین نے غیر مسلم معاریبین کا ساتھ دیکر اگر بغارت کی اور حجاز کو قسطنطنیہ کے اقتدار حکومت سے الگ کر لیا، تو یہ بغارت فساد کی ایک عارضی حالت ہے جو شرعاً معتبر نہیں۔ حجاز حکماً اب بھی خلیفہ قسطنطنیہ کی حکومت ہی کا ایک جزء ہے۔ اور تمام مسلمانان عالم کا شرعاً فرض ہے کہ حرمین شریفین کو باغیوں کے تصرف سے نکالنے کی کوشش کریں، اور اس وقت تک کرتے رہیں جب تک بغارت اور باغیوں کا بالکل استیصال نہ ہو جائے۔ نہ کرینگے تو ہر مسلمان اسکے لیے عند اللہ جوابدہ ہوگا۔

تمام کرۂ ارضی کے مسلمان آرام و عیش کے دن بسر کرنے اور فارغ البالی کے بستر پر سونے کیلئے ہیں، لیکن صرف وہی ایک ہیں جو سارے مسلمانوں کی عزت و زندگی کے بچاؤ کیلئے صدیوں سے تلواروں کے سایے میں دن کات رہے ہیں، اور چاروں طرف سے دشمنوں کی زد میں ہیں۔ ایک چوتھائی صدی بھی آج تک انہیں ایسی نہیں ملی کہ آرام و چین سے بیٹھ سکے ہوں۔ انکا جرم اسکے سوا کچھ نہیں کہ جب اسلام کا محافظ دنیا میں کوئی نہ رہا۔ ساری تلواریں توت گئیں۔ سارے بازار شل ہو گئے۔ تو پانچ صدیوں سے وہ کیوں اسلام کے بچاؤ کیلئے باقی ہیں؟ کیوں وہ رقت نہیں آنے دیتے کہ اسلام کی پولیٹکل طاقت کا بالکل خاتمہ ہو جائے؟

بددوستی تو خصمِ عالمے با من

ہزار دشمن ریک دوست مشکل افتاد است !

پس تیرہ سو برس کے متفقہ عقیدہ و عمل کے مطابق وہی آج تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام اور ”اولو الامر“ ہیں۔ انکی اطاعت و حمایت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و حمایت ہے۔ ان سے پھرنا اور انکو اپنے جان و مال سے مدد نہ دینا، اللہ اور اس کے رسول سے پھرنا اور اللہ اور اس کے رسول کو اپنی جان و مال کے طرف سے صاف جواب دیدینا ہے۔ جو انکی اطاعت سے باہر ہوا، اگرچہ صرف بالشکت بہر باہر ہوا ہو، اور اسی حالت میں مر گیا، تو اسکی موت اسلامی زندگی کی موت نہوگی بلکہ جاہلیہ کی۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو، اگرچہ روزہ رکھتا ہو، اگرچہ اپنے زعم باطل میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔ جس نے انکے مقابلہ میں تلوار اٹھائی، وہ مسلمانوں میں سے نہیں اگرچہ دنیا اسکو مسلمانوں

شریعت کے مسلمانوں کی جمعیت و قومیت کی بنیاد باہمی مواخات پر رکھی ہے۔ یعنی ہر مسلمان کا شرعی رشتہ دوسرے مسلمان سے بھائی کا رشتہ ہے : فاصبحتم بنعمتہ اخوانا ( ۱۰۳ : ۶ ) انما المؤمنون اخوة ، فاصلحوا بین اخویکم ( ۱۰ : ۴۹ ) مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس جب ہر بھائیوں میں رنجش ہو جائے تو صلح کرادے۔ مسلمانوں کی قومی سیرۃ جا بجا یہ بتلائی۔ اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین ( ۵۹ : ۵ ) اشداء علی الکفار رحماء بینہم ( ۲۹ : ۲۸ ) اُن میں جس قدر بھی نرمی ہے ، مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ جس قدر بھی سختی ہے ، غیروں کے ساتھ۔ وہ سب سے زیادہ نرم بھی ہیں اور سب سے زیادہ سخت بھی۔ نرم اپنوں کے لیے ، سخت غیروں کے لیے۔ اُنکے پاس محبت بھی ہے ، عداوت بھی۔ لیکن محبت پرستاران حق کے ساتھ کرتے ہیں ، عداوت دشمنان حق کے ساتھ۔

احادیث میں اس حقیقت کی جو بے شمار تشریحات و تمثیلات ملتی ہیں ، وہ مشہور و معلوم ہیں ، اور مہاجرین و انصار اور عموم صحابہ کرام نے انکی عملی تصویر بنکر ہمیں بتلا دیا ہے کہ اخوت دینی کے معنی کیا ہیں ؟ ہر مسلمان پر اسکی نماز اور روزہ سے بھی بڑھکر جو چیز فرض کر دی گئی ، وہ یہی ہے کہ مسلمانوں سے محبت کرے ، جہاننگ بن پڑے انکی بھلائی چاہے ، اور کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے کسی مسلمان کو نقصان پہنچے۔ اگر یہ چیز نہیں ہے تو ایمان و اسلام بھی نہیں۔ پہاڑوں جتنا بھی زہد و عبادت ہو اور سمندر جتنی بھی دولت خرچ کر دالی جائے ، لیکن اگر یہ چیز نہیں تو بالکل بیکار و عبث ہے۔

فرمایا ” لا یؤمن احدکم حتیٰ یحب لایہ ما یحب لنفسہ “ (رواہ الشیخان) کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے کہ جو بات اپنے لیے پسند کرے ، وہی اپنے بھائی مسلمان کے لیے بھی پسند کرے۔

اور فرمایا ” لا تدخلون الجنة حتیٰ تؤمنوا و لا تؤمنون حتیٰ تحابوا “ ( شیخان ) تم کبھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک ایمان نہ لاؤ ؟ اور کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس میں محبت و پیار نہ کر رہے۔

میں قومی عظمت و عصبیت کے جذبات ان لوگوں کے دلوں سے بھی کھینچ لیے  
 جنکے آباؤ اجداد ساٹھ ستر برس پہلے اسی سر زمین میں حکمران تھے -  
 صرف یہی ایک چیز یورپ کے طرز حکومت اور ترکوں کے طرز حکومت کا  
 فرق واضح کر دینے کیلئے کافی ہے - ترکوں کے رہم و خیال میں بھی ظلم و  
 خونخواری کی وہ ہیبت ناک صورتیں اور قومی تعصب و نفرت کی وہ  
 وحشت ناک ہلاکیاں نہیں آسکتیں، جو یورپ کے تمدن و تہذیب کا  
 مغرور بت عین انیسویں اور بیسویں صدی کے سورج کی روشنی میں  
 ایشیا و افریقہ کے اندر کر چکا ہے - ان دو صدیوں کے اندر جنگل کے درندے آرام  
 کی نیند سوئے اور سانپوں کو انکی غاروں سے باہر نہیں نکالا گیا، لیکن ایشیا و  
 افریقہ کیلئے یورپ کے ہاتھوں زمین کا ایک ٹکڑہ بھی ایسا نہ بچ سکا جسکو  
 وہانکی بد بخت مخلوق اپنی زمین کہہ سکے، اور جہاں ایک مالک  
 و مختار کی طرح امن و عزت کی زندگی بسر کر سکے! خود اسی آخری جنگ  
 میں یورپ کے ہر درندے نے دوسرے درندے کو جس طرح پہاڑا اور ہر  
 سفید بھیرے نے دوسرے سفید بھیرے پر جس طرح پنجہ مارا، نہ صرف  
 ترکوں کی تاریخ بلکہ تمام ایشیا کی تاریخ رسی وحشت اور شرمناک درندگی  
 کی مثال پیش نہیں کر سکتی - با ایں ہمہ ترک خونخوار اور وحشی ہیں،  
 اور یورپ تہذیب و تمدن اور امن و رحم کا پیغمبر! علی الخصوص برطانیہ کے  
 مقدس جزیرہ میں تو جسقدر فرشتے بستے ہیں، وہ صرف انسانی آزادی کی  
 حفاظت اور چھوٹی قوموں کی حمایت ہی کیلئے آسمان سے اتارے گئے ہیں!  
 یہ کرۂ ارضی کی تاریخ میں حق و باطل کا سب سے بڑا مقابلہ ہے - آج اسکی  
 فتح و شکست کا اصلی فیصلہ نہیں ہو سکتا - زمین فوجوں کے بوجھ سے  
 دبی ہوئی ہے - فضاء ہوائی جہازوں کی قطاروں سے بھری ہوئی - اسکا  
 فیصلہ کل ہوگا جب خدا کا دائمی قانون نتائج و عواقب کی زبان میں حقیقت  
 کا اعلان کریگا، اور مورخ کا قلم لکے گا کہ یہ طاقت اور گہمند کا سب سے  
 بڑا چیلنج تھا جو سچائی کو دیا جا سکتا ہے - تاہم سچائی ہی سب سے  
 بڑی طاقت ہے - اور بالآخر فیصلہ اسی کا فیصلہ ہے - سنة الله في الدين  
خلوا من قبل، وان تجد لسنة الله تبديلا (۳۳ : ۲۲)

بہر حال ہماری صحبت سے یہ موضوع باہر ہے - ترکوں کی حکمرانی  
 جیسی کچھ بھی رہی ہو - ہر ترک سلطان حجاج بن یوسف اور خالد قسری

حضرت عبد اللہ بن عمر کے سامنے جب ایک قاتل لایا گیا تو اپنے فرمایا ”تزر من الماء البارد“ فانلح لن تدخل الجنة“ ( رواہ البیہقی ) بن پڑے تو اچھی طرح تھندے پانی کی طیاری کر لے کیونکہ تیرا تھکانا درزخ ہے - تو یقیناً جنت میں نہ جائیگا !

حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے شرک کے بعد اس سے بڑھکر اور کوئی کفر نہیں ہو سکتا کہ اپنے مسلمان بھائی کے خون سے ہاتھ رنگین کرے -

( بقیہ نوٹ صفحہ ۶۹ )

صلواتہ ” قیامت میں سب سے پہلے آدمی سے جس عمل کا حساب لیا جائیگا وہ نماز ہے - اس سے معلوم ہوا کہ جن کاموں میں محاسبہ ہوگا، ان میں سب سے پہلا کام نماز ہے - لیکن جن کاموں میں فیصلہ چکایا جائیگا، ان میں سب سے پہلا معاملہ خون کا ہوگا - پس دونوں میں کوئی تعارض نہیں - چنانچہ نسائی نے یہ دونوں تکررے ایک ہی متن و اسناد سے روایت کیے ہیں ”ازل ما یحاسب به العبد الصلاة“ و اول ما یقضي بین الناس فی الدماء“ امام بخاری نے مندرجہ متن حدیث ابن مسعود سے بہ طریق اعمش عن ابی رائل روایت کی ہے اور منجملہ ثلاثیات بخاری کے ہے - نسائی بھی یہ روایت ابو رائل ہی کے طریق سے لے گئے ہیں - پس سنداً و متناً روایت ایک ہی ہوئی - باقی رہا محاسبہ و قضاء کا فرق، تو وہ بالکل ظاہر ہے - بعض اعمال انسان کی ذات خاص سے تعلق رکھتے ہیں - بعض دوسروں کے حقوق سے - شریعت نے اسی فرق کو حقوق اللہ اور حقوق العباد سے تعبیر کیا ہے - پہلی قسم کے کاموں میں قضاء اور فیصلہ کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر شخص کی ذات خاص سے تعلق رکھتے ہیں - کوئی دوسرا نفس مدعی نہیں ہوتا - البتہ پرسش ہو سکتی ہے کہ وہ فرائض انجسام دیے گئے یا نہیں؟ لیکن دوسری قسم کے لیے پرسش کافی نہیں - فیصلہ چکانے کی ضرورت ہے - کیونکہ وہ ایسے کام ہیں جن میں دوسروں کے حقوق تلف ہوئے ہیں اور وہ بہ حیثیت مدعی کے کہتے ہوئے - نماز پہلی قسم کے اعمال میں سب سے زیادہ اہم ہے، اور قتل نفس کا معاملہ دوسری قسم میں سب سے زیادہ اہم - پس جب حساب ہوگا تو سب سے پہلے نماز کی نسبت پوچھا جائیگا، اور جب فیصلہ چکایا جائیگا تو سب سے پہلے قتل نفس کا معاملہ پیش ہوگا -

فان کنت لا تدري فتلك مصيبة  
وان کنت تدري فالمصيبة اعظم !

میں یہاں قصداً ترکوں کی سیاسی و تمدنی لیاقت و نالائقی کی بحث نہیں چھیڑنا۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کی تمام حکمران جماعتوں میں ترکوں ہی کی جماعت رہ جماعت ہے جسکے لیے کوئی یورپین دماغ منصف نہیں ہو سکتا۔ یورپ کا مورخ ہو، خواہ موجودہ عہد کا کوئی مدبر، وہ گذشتہ عہد کے بدتر سے بدتر مسلمانوں کی مدح و توصیف کر سکتا ہے جو اب موجود نہیں ہیں، لیکن اُن ترکوں کی نہیں کر سکتا جنکی تلواریں پانچ صدیوں سے یورپ کے دل و جگر میں پدوست ہونے کیلئے زندہ موجود ہیں۔ وہ بنو امیہ کی خلافت کی ایک بہتر تاریخ لکھ سکتا ہے۔ عباسیہ کے دور علم و تمدن کی مدحت سرائی کر سکتا ہے۔ صلاح الدین ایوبی تک کر ایک بت کی طرح پوج لے سکتا ہے جسکی تہا تلوار شام و فلسطین میں یورپ کے متحدہ مسیحی جہاد (کروسیڈ) کا مقابلہ کرتی رہی، لیکن وہ اُن ترکوں کیلئے کیونکر انصاف کر سکتا ہے جو نہ تو عرب پر قانع رہے، نہ ایران و عراق پر۔ نہ شام و فلسطین کی حکومت اُنکو خروش کر سکی، نہ وسط ایشیا کی، بلکہ تمام مشرق سے بے پروا ہو کر یورپ کی طرف بڑھے، اسکے عین قلب (قسطنطنیہ) کو مسخر کر لیا، اور اُسکی اندرونی آبادیوں تک میں سمندر کی موجوں کی طرح در آئے۔ حتیٰ کہ دار الحکومت استریا کی دیواریں اُنکے جولان قدم کی ترکتازیوں سے بارہا گرتے گرتے بچ گئیں !

ترکوں کا یہ رہ جرم ہے جو کبھی یورپ معاف نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کا کوئی موجودہ حکمران خاندان اس جرم (فتح یورپ) میں اُنکا شریک نہیں۔ اسلیئے ہر حکمران مسلمان اچھا تھا جو یورپ کی طرف متوجہ نہ ہو سکا، مگر ہر ترک وحشی و خونخوار ہے اسلیئے کہ یورپ کا طلسم اُسکی شمشیر سے ٹوٹ گیا۔ ترکوں نے پانچ صدیوں تک جس آزادی و عدالت گسٹری کے ساتھ حکومت کی ہے، اُسکا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ چار صدیوں کی متصل حکمرانی کے بعد بھی محکوم عیسائیوں کی مذہبی و قومی عصبیت ایسی زندہ و توانا رہی کہ خود کسی مسیحی حکومت کے ماتحت نہیں رہ سکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ترکوں کی کمزوری کے ساتھ ہی آزاد و خود مختار ہو گئے۔ ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے پورے تسلط کو ابھی پورے سو سال بھی نہیں ہوئے ہیں۔ اتنے ہی عرصہ کی حکومت نے ہندوستان



شریعت کا کون مجرم ہو سکتا ہے ؟ اور اگر انسان کی برائیاں اور بد عملیاں اللہ کی لعنت کا مستحق ہو سکتی ہیں ، تو اس فعل سے بڑھکر اور کونسا فعل ہے جو اللہ کے عرش جلال و غیرت کو ہلا دے ، اور اسکی لعنتیں بارش کی بوندوں کی طرح آسمانوں سے زمین پر برسنے لگیں ؟

جس مومن کا وجود اللہ کو اس قدر محبوب و محترم ہو کہ تمام دنیا کا زوال اُس کی ہلاکت کے مقابلے میں ہیچ بتلاے ، اُسی کا خون خود ایک مسلمان کے ہاتھوں بہے ؟ اس سے بڑھکر شریعت الہی کی کیا توہین ہو سکتی ہے ؟ اور اُن سارے گناہوں میں جو انسان کے ہاتھ پانوں کر سکتے ہیں ، کونسا گناہ ہے ، جو اس سے زیادہ ملعون و مردود ہو سکتا ہے ؟

دنیا کی کونسی برائی اور عظمت ہے جو کلمہ لا الہ الا اللہ سے بڑھکر خدا کی نظروں میں عزت رکھتی ہو ؟ اور کونسی معبودیت ہے جو اس کلمہ عزیز کے اقرار کرنے والے کو اللہ کے حضور نہیں ملجاتی ؟ پس جس بد بخت کا احساس ایمانی یہاں تک مسخ ہو جائے کہ باوجود دعوتِ اسلام مسلمانوں کا خون بہانے لگے ، وہ یقیناً مسلمانوں کا خون نہیں بہاتا ، بلکہ اللہ کے کلمہ توحید کو ذلیل و خوار کرتا ، اور اسکی عزت و اجلال کو بٹہ لگانا چاہتا ہے ۔

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت اسامہ کی روایت ہے کہ اُنکو آنحضرتؐ نے بنو النضیرہ کی طرف ایک فوجی مہم دیکر بھیجا تھا ۔ لڑائی میں اسامہ نے ایک آدمی پر حملہ کیا ۔ ساتھ ہی ایک انصاری بھی حملہ آور ہوا ۔ اسامہ کہتے ہیں کہ جب میری تلوار اُسکے سر پر چمکی تو وہ پکار اُٹھا ” لا الہ الا اللہ “ ۔ میں نے کچھ پروا نہ کی اور قتل کر ڈالا ۔ لیکن کلمہ کی صدا سنکر انصاری نے تلوار روک لی ۔ آنحضرتؐ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو نہایت ناراض و غمگین ہوئے اور فرمایا ” اُقتلته بعد ما قال لا الہ الا اللہ “ ؟ تو نے اُسے قتل کر دیا باوجودیکہ اس نے لا الہ الا اللہ کہا تھا ؟ میں نے عرض کیا ” انما کان متعوذا “ وہ تو اس نے محض میری تلوار سے بچنے کیلئے کہ دیا تھا ۔ فی الحقیقت مسلمان نہیں ہوا تھا ۔ ” فما زال یکررها علی حتی تمنیت انی لم اکن اسلمت قبل ذلک الیوم “ لیکن آنحضرتؐ برابر یہی جملہ دہراتے رہے ” تو نے قتل کر ڈالا باوجودیکہ اس نے لا الہ الا اللہ کہا تھا “ یہاں تک کہ آنحضرتؐ کا حزن و ملال اور اس واقعہ کا تاثر دیکھکر مجھے اسقدر ندامت ہوئی کہ دل نے کہا ” کاش آج کے دن

نمی دانم ز منع گریه مطلب چیست ناصح را ؟  
دل از من ، دیدہ از من ، آستین از من ، کنار از من !

جب تک بغداد کی خلافت باقی رہی ، ہندوستان کے تمام حکمران خاندان اُسی کے زیر اثر اور فرمانبردار رہے - عباسیہ بغداد کی خلافت جب مت گئی ، اور سنہ ۴۶۰ ھ میں مصر کی عباسی خلافت کا سلسلہ شروع ہوا ، تو اگرچہ یہ عباسیہ کے کاروان رفتہ کا محض ایک نمود غبار تھا ، تاہم تمام سلاطین ہند اسکی حلقہ بگوشی و غلامی کو اپنے لیے موجب صد فخر و امتیاز سمجھتے رہے ، اور مرکزی خلافت کی عظمت دینی نے مجبور کیا کہ اپنی حکومت کو شرعی طور پر منوادینے کیلئے مقام خلافت سے پرانہ نیابت و امارت حاصل کرتے رہیں - سلطان محمد بن تغلق شاہ کے غرور حکومت کا یہ حال تھا کہ ضیاء الدین برنی اسکو ”ہمت فرعون و نمرودی“ سے تعبیر کرنا چاہتا ہے - تاہم اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ غرور جوہ کرسکا ، یہی تھا کہ اپنے تئیں خلیفہ مصر کا زیادہ سے زیادہ فرمانبردار غلام اور چاکر ظاہر کرے ، اور کہے کہ بلا اس کے حکم کے میں تم پر حکومت نہیں کرسکتا - تاریخ برنی میں ہے :

”امیر المومنین خلیفہ را بندہ ترین ہمہ بندگان بود ، و بے امر و بے فرمان او دست در امور اولو الامری نہ زد“ ( مطبوعہ ایشیاٹک سوسیٹی - صفحہ - ۱۴۶۰ )

برنی نے سلطان فیروز شاہ کے فضائل و سوانح کیلئے گیارہ مقدمے ترتیب دیے ہیں - اُن میں نوراں مقدمہ یہ ہے ”مقدمہ نہم در آنکہ دوکرت از حضرت امیر المؤمنین خلعت اولو الامری و منشور اذن و لواء شاہی بر سلطان عصر فیروز شاہ رسیدہ ، و بادشاہی و اولو الامری خداوند عالم بدان استحکام گرفتہ“ پھر اس مقدمہ میں لکھتا ہے ”در مدت شش سال دوکرت از امیر المومنین منشور اولو الامری و خلعت شاہی و لواء سلطنت بدر رسید ، و حق جل و علی پادشاہ دین پرور ما را در عزت داشت منشور و خلعت و فرستادگان توفیق بخشید ، و شرائط حرمت مراحم امیر المؤمنین بالغاً ما بلغ بجا آورد ، و ہم چنین دانست کہ منشور و خلعت امیر المؤمنین از آسمان منزل شدہ ، و از درگاہ مصطفی صلعم رسیدہ - عرضداشتے با تحفہ و هدایا در نہایت تواضع بلدگی امیر المؤمنین روان کرد“ الخ (صفحہ ۵۹۸۰)

اور فرمایا ” لا تجسسوا ، ولا تبحسوا ، ولا تنابزوا ، ولا تباغضوا ، ولا تدابروا ، ولا تنابزوا ، وكونوا عباد الله اخوانا “ ( شیخان ) ایک دوسرے کی تُوہ میں نہ رہو ، باہم کینہ اور عناد نہ رکھو ، بدگوئی نہ کرو ، اور ایسا کرو کہ آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ ۔

حضرت جابر کو وصیت کی ” ان تصبح و تمسي و ليس في قلبك غش لاحد “ ( مسلم ) تجھ پر صبح کا سورج چمکے تو اس حالت میں چمکے کہ اسکی کرنوں کی طرح تیرا دل بھی صاف ہو ، اور شام آئے تو اس طرح آئے کہ کسی کے طرف سے تیرے اندر کھوت نہ ہو ۔

اور فرمایا ” المسلم من سلم المسلمون من يده و لسانه “ ( بخاری ) مسلمان وہ ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچے ۔  
اور فرمایا ” المسلم اخر المسلم “ لا يظلمه ، ولا يخذله ، ولا يعقره “ ( مسلم ) مسلمان مسلمان کا بھائی ہے ۔ پس اپنے بھائی کے ساتھ نہ تو ظلم کرے ، نہ اُسے ذلیل کرے ، نہ اُسکو حقیر جانے ۔

اور فرمایا ” لا يحل لرجل ان يهجر اخاه فوق ثلاث “ ( شیخان ) کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ کسی مسلمان سے روٹھا رہے ۔  
اور فرمایا ” ملعون من ضار مومنا او مكربه “ ( ترمذی ) اللہ کی اسپر پھٹکار جس نے مسلمان کو نقصان پہنچایا یا اسکو دھوکا دیا ۔

ایک حدیث میں یہاں تک زور دیا کہ ” من كان يومئذ بالله و اليوم الآخر فلا يعد النظر الى اخيه “ ( رواه الحاكم و صحيحه ) جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے ، اسکو نہ چاہیے کہ اپنے بھائی مسلمان کی طرف تیز نظروں سے گھورے ۔ یعنی جب مسلمان بھائی کو دیکھے تو محبت اور پیار کی نظروں سے دیکھے ۔

پس جب اللہ کی شریعت حقہ نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی باہمی محبت و برادری پر رکھی ، اسی کو ایمان کی جز قرار دیا ، وہی اسلام کی اصلی پہچان ہوئی ، اسی پر ایمان کی تکمیل موقوف تھری ، تو ظاہر ہے کہ جو مسلمان خدا کے اس جوڑے سے ہرے رشتے کو توڑ دے ، اور اپنے اُنہی ہاتھوں سے جو مسلمانوں کی دستگیری و مددگاری کیلئے بنائے گئے ، مسلمانوں کی گردنیں کاٹے ، اس سے بڑھکر خدا کی زمین پر اُسکی

جیسے اشرفیہ سے بھی بدتر کیوں نہ رہا ہو (۱) لیکن مسلمانوں کو اپنے مسلمان حاکموں کی اطاعت کا ہر حال میں حکم دیا گیا ہے - اور انکا از روئے شرع یہی عقیدہ ہے کہ وہ خلیفہ اسلام ہیں - اسمیں کسی دوسرے کو دخل دینے کا حق نہیں :

( ۱ ) جبکہ آج ترکوں کی رحشت و تمدن کا فیصلہ علم و تحقیق کے ہاتھ میں نہیں ہے - حریف حکومتوں کے اُن مغرور وزراء کے قبضہ میں ہے جو میدان جنگ سے واپس آکر اپنے ایک جنگی دشمن کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں ، تو اُمید نہیں دِریپر ( Draper ) جیسے زمانہ حال کے مورخوں کی شہادت اس بارے میں سنی جاوے - یہ امریکن مصنف اپنی مشہور کتاب History of The Coufflict Between Religiun And Seience میں لکھتا ہے کہ انصاف و عدالت اور مذہبی بے تعصبی میں اپنے عہد کی تمام عیسائی دنیا پر ترکوں کو بھی فرقیت رہی ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کو تنزل یافتہ بیزنطائن کے مقابلے میں تمام یورپ پر حاصل تھی - ایدرہ کرپسی نے تاریخ روم میں ترکوں کو تہذیب و تمدن اور علمی ایجادات و اختراعات کے لحاظ سے پندرھویں اور سولہویں صدی کے تمام یورپ میں سب سے برتر قوم تسلیم کیا ہے - وہ کہتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کے قسم کی کتابیں لکھنے کا یورپ میں ترکوں ہی کی تقلید سے راج ہوا - یورپ کی زبانوں میں سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا ڈالامبرٹ ( Dalambert ) نے لکھی - لیکن ایک ترک مصنف کلبی بے کی قاموس العلوم ہی کے مطالعہ سے اسکو رہنمائی ملی تھی - کمسریٹ ' رسد رسانی ' فوجی شفا خانوں کا باقاعدہ انتظام ' ترکوں ہی سے یورپ نے سیکھا - قلعہ کی تعمیرات میں تمام یورپ ترکوں کا شاگرد ہے - فوجی باجا تمام یورپ نے ترکوں ہی سے حاصل کیا - چیچک کے ٹیکہ کا اصلی موجد ایک ترک تھا - یہ دِریپر ' کرپسی ' اور کنگڈم کلفرد وغیرہ مورخوں کی تحقیق ہے جنہوں نے اپنے کتب خانوں میں بیٹھ کر ترکوں کے اعمال پر نظر ڈالی تھی - قدرتی طور پر مسٹر ایسکویٹھ اور مسٹر لائڈ جارج کی رائے اس سے مختلف ہونی چاہیے جو ابھی ابھی گیلی پولی اور عمارہ میں ترکوں کی تلوار کا کاری زخم کھا کر نکلے ہیں ، اور میدان جنگ سے واپس آکر کتب خانوں کی جگہ نظارت خانوں کے اندر فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں !

قتل ہو جانا گوارا نہ ہوا کیونکہ اُس نے خوفِ جان سے ایک مرتبہ لا الہ الا اللہ کہہ دیا تھا، اور اسپر اسقدر رنج و افسوس فرمایا کہ عرصہ تک صدائے المِ زبانِ مبارک سے نکلتی رہی، تو پھر غور کرو کہ جو مسلمان اُن مسلمانوں کو قتل کرے، جنکی ساری زندگیاں اسلام و ایمان میں بسر ہوئی ہیں، اور جنہوں نے معضِ خوفِ جان سے ایک مرتبہ ہی نہیں، بلکہ دل کے یقین و ایمان سے لاکھوں مرتبہ کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار اور ورد کیا ہے، اسکی شقاوت و خسران کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ اور شریعت کے نزدیک اس فعل سے بڑھ کر اور کون سا فعل ہے جو ایک مسلمان کیلئے عذاب الیم کا مستوجب ہو؟

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس فعل کیلئے وہ وعید فرمائی جو کسی معصیت کیلئے نہیں فرمائی۔ یعنی فجزاۃ جنہم خالداً فیہا، و غضب اللہ علیہ و لعنہ۔ اسمیں خلود فی النار، غضب، لعنت، تین چیزوں کا ذکر کیا ہے، اور تمام قرآن و سنت میں یہ تینوں کلمات وعیدِ کفار کیلئے مخصوص ہیں۔ مسلمانوں کی نسبت کہیں استعمال نہیں کیے گئے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ عام معاصی و فسوق سے اس فعل کی برائی کہیں زیادہ ہے۔ کفر صریح و قطعی کے بعد، اور عام معاصی سے اشد، کوئی فعل ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے۔ اور اسی لیے تمام احادیث میں اس فعل کو کفر فرمایا کہ ”و قتالہ کفر“ اور ”لا ترجعوا بعدی کفارا“ معصیت و فسوق کا لفظ اسکی ناپاکی و ملعونیت ظاہر کرنے کیلئے کافی نہ تھا۔ جب مسلمان کو صرف دشنام دینا فسق ہوا کہ ”سباب المسلم فسوق“ تو پھر اسکو قتل کر دینا صرف فسق ہی کیوں ہو؟

ثانیاً، جس طرح ایمان و اسلام کی ستر سے کچھہ اوپر شاخیں ہیں، اور اُن میں سے ہر شاخ ایمان و اسلام ہے۔ ”الایمان بضع و سبعون شعبۃ“ اعلاھا لا الہ الا اللہ و أدناها اماطۃ الاذی عن الطریق“ (رواہ مسلم و اصحاب السنن الثلاثہ، و رواہ البخاری ”بضع و ستون“) اسی طرح کفر کی بھی شاخیں ہیں اور اعلیٰ و ادنیٰ مراتب ہیں، جیسا کہ اپنے مقام پر ثابت ہو چکا ہے، اور اسی لیے صحابہ و سلف سے مروری ہے ”کفر دون کفر و ظلم دون ظلم“ (۱)۔ اور پھر جس طرح ایمان و اسلام اعتقادی بھی ہے

(۱) امام بخاری نے کتاب الایمان میں باب باندھا ہے ”کفران العشیۃ و کفر دون کفر“۔ لیکن دراصل یہ خود صحابہ کرام کے آثار سے



بعض یورورپین اخبارات کے مشرقی نامہ نگاروں نے بار بار یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ترکی حکومت سے باہر بسنے والے مسلمانوں میں ترکی خلافت کا اعتقاد زیادہ تر سلطان عبد الحمید خاں مرحوم کی سعی سے پیدا ہوا اور انکا مقصود اس سے یہ تھا کہ نام نہاد ”پان اسلامزم“ تحریک کو تمام مسلمانان عالم میں پھیلایا جائے۔ یہاں ہم یورپ کے متخیلہ و متوہمہ ”پان اسلامزم“ کی حقیقت سے بحث کرنا نہیں چاہتے ”پان اسلامزم“ سے مقصود اگر مسلمانوں کی بلا امتیاز وطن و قومیت باہمی برادری ہے تو اسکی تاریخ سلطان عبد الحمید کے زمانے سے نہیں بلکہ نزول قرآن و ظہور اسلام سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن عثمانی خلافت کے عالمگیر اسلامی اعتقاد کو سلطان عبد الحمید سے منسوب کرنا ایک ایسی بات ہے جو یا تو حد درجہ جہل کا نتیجہ ہو سکتی ہے یا حد درجہ دروغ گوئی کا۔ اور ہم نہیں جانتے کہ دونوں میں سے کس چیز کو محققین یورپ کیلیے پسند کریں؟

سنہ ۱۹۲۳ء میں جب بعہد سلطان سلیم خاں سلاطین عثمانیہ خلیفۃ المسلمین تسلیم کیے گئے تو اسوقت عالم اسلامی کا یہ حال تھا کہ ایران میں سلاطین مغربیہ کی حکومت تھی، ہندوستان میں مغلیہ کی اندرون یمن میں آلئہ زیدیہ کی، اور اندرون عرب میں خود مختار قبائل اور بعض شیوخ کی۔ پس جہاں جہاں اسلامی حکومتیں موجود تھیں، وہاں کے مسلمانوں کی اطاعت و انقیاد کا محل و مرکز خود مقامی اسلامی حکومت ہوگئی تھی، اور احکام شرعیہ کے نفاذ و اجراء کیلیے بھی وہ کسی بیرونی حکومت کے محتاج نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ان ممالک میں مرکزی خلافت کا تعلق کسی نمایاں شکل میں یکایک ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔ سلطنت کے رقیبانہ جذبات بھی اپنی انتہائی حالت میں سب پر چھائے ہوئے تھے۔ صدیوں پہلے سے تفرقہ و انتشار کی عالمگیر مصیبت تمام عالم اسلامی کو ٹکرے ٹکرے کرچکی تھی۔ لیکن ان ممالک کے علاوہ اور جہاں کہیں بھی مسلمان آباد تھے اور اپنی مقامی اسلامی حکومت نہیں رکھتے تھے، وہ اگرچہ ترکی حکومت سے گتے ہی دور دراز گوشوں میں واقع ہوں، لیکن عثمانی سلاطین ہی کو اسلام کی مرکزی خلافت عظمیٰ پر قابض و متصرف تسلیم کر گئے تھے اور اسلیے جمعہ و عیدین کے خطبوں میں انکے لیے خاص طور پر دعا مانگتا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ خود ہندوستان کے قرب و جوار اور بحر چین کے جزائر میں مسلمانوں کا ایک ایک فرد خلیفۃ قسطنطنیہ کی اس حیثیت

سے پہلے میں مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا - ایک روایت میں ہے ” افلا شققت عن قلبہ حتی تعلم “ تو نے اسکا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا کہ واقعی دل سے اقرار کیا ہے یا نہیں ؟ یعنی جب زبان سے یہ کلمہ نکلا تو اسکا احترام واجب ہو گیا - خواہ تلوار کے در سے کہا ہو یا سچ مچ دل سے اقرار کیا ہو - دل کا حال صرف اللہ ہی کو معلوم ہے -

یہی واقعہ صحیح مسلم میں جندب بن عبد اللہ کی روایت سے بھی مروی ہے اور اسمیں بعض زیادات ہیں - رفیہ ان النبی صلعم قال له ” فکیف تصنع بلا الہ الا اللہ اذا اتتک یوم القیامہ “ ؟ قال یا رسول اللہ استغفر لی - ” قال فکیف تصنع بلا الہ الا اللہ “ ؟ فجعل لا یزیدہ علی ذلک - یعنی آنحضرت صلعم نے اُسامہ سے کہا ” قیامت کے دن جب وہ لا الہ الا اللہ کے ساتھ تیرے سامنے آئیگا تو اسوقت تو کیا کریگا ؟ یعنی اللہ کو کیا جواب دیگا ؟ اُسامہ نے عرض کیا - یا رسول اللہ ! اب تو مجھ سے یہ قصور ہو گیا - میری بخشش کیلیے دعا کیجیے - لیکن آنحضرت یہی کہتے رہے کہ قیامت کے دن لا الہ الا اللہ کا جب دعوا ہوگا تو تم کیا جواب دو گے ؟ اور اس جملہ کے سوا کوئی بات نہ فرمائی -

بخاری میں ہے کہ آپ سے مقداد بن عمرو الکذبی نے پوچھا ” ان لقیتم کافراً فاقتتلنا “ فضرب یدی بالسیف فقطعها “ ثم لاذ بشجرة و قال اُسلمت للہ “ اُ قتلہ بعد ان قالہا ؟ “ اگر ایسا ہو کہ ایک کافر سے مقابلہ کریں ، اور وہ تلوار میرے ہاتھ پر اسطرح مارے کہ ہاتھ کٹ جائے - پھر الگ ہو کر کہے میں اللہ پر ایمان لایا ، تو یہ کہنے کے بعد اُسے قتل کروں یا نہ کروں ؟ فرمایا ” لا تقتلہ “ مت قتل کر - ” قال فانہ طرح احدی یدی ثم قال ذلک بعد ما قطعها “ مقداد نے عرض کیا - اس نے تو میرا ہاتھ کٹ ڈالا اور اسکے بعد اسلام لانے کا اقرار کیا - پھر کیوں نہ میں اُس سے اپنا بدلا لوں ؟ فرمایا ” لا تقتلہ “ فان قتلته فانہ بمنزلتک قبل ان تقتلہ “ وانت بمنزلتہ قبل ان یقول کلمتہ التي قال “ جو کچھ بھی ہوا ہو ، لیکن جب کلمہ توحید کا اقرار کر لیا تو پھر قتل نہ کر - اقرار کرنے سے پہلے وہ کافر تھا ، اور تو مسلمان ، لیکن اگر تو نے اقرار کے بعد اُسے قتل کر دیا تو وہ تیری جگہ ہو جائیگا اور تو اسکی جگہ -

یہ دو روایتیں اس بارے میں نہایت ہی عبرت انگیز ہیں - جب اللہ کے رسول کا یہ حال تھا کہ ایک مشرک دشمن کا جنگ کی حالت میں بھی

یعنی سلطان فیروز شاہ کے فضائل و مغاخر میں سے ایک بڑی بات یہ سمجھی گئی کہ خلیفہ مصر نے اجازت حکومت کا پروانہ اور لواء و خلعت بھیجا، اور پادشاہ کو اسکی اطاعت و حرمت کی توفیق ملی۔ فیروز شاہ نے اس بات کی اس درجہ قدر کی گویا آسمان سے یہ عزت نازل ہوئی ہے، اور خود بارگاہ حضرت محمد الرسول اللہ صلعم سے اسکو قبولیت کی سند ملگئی ہے ! شمس الدین سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ جب خلیفہ کے سفراء شہر سے قریب پہنچے تو فیروز شاہ خود استقبال کیلئے پیدل نکلا۔ فرمان خلافت کو دونوں ہاتھوں میں لیا۔ پھر بوسہ دیکر سر پر رکھا، اور اسی طرح سر پر دھرے ہوئے دربار حکومت تک واپس آیا۔

غور کرو! مقام خلافت کی عظمت کا ہمیشہ کیا حال رہا؟ خلافت بغداد کے مٹنے کے بعد بھی خلافت کی صرف ایک اسمی نسبت اس درجہ ہیبت و جبروت رکھتی تھی کہ ہندوستان جیسے بعید گوشہ میں ایک عظیم الشان فرمان رواے اقلیم، مصر کے دربار خلافت سے اذن و اجازت حاصل ہو جانے پر فخر کرتا ہے۔ مٹنے پر بھی اس مقام کی عظمت تمام عالم اسلامی پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ وہاں کا فرمان آسمانی فرمان، اور وہاں کا حکم بارگاہ نبوت کا حکم سمجھا جاتا ہے !

مغلیہ سلطنت خلفاء مصر کے آخری عہد میں قائم ہوئی۔ ہندوستان میں شہنشاہ اکبر کا زمانہ تھا جب سلطان سلیم خاں کے ہاتھ پر خلیفہ متوکل عباسی نے بیعت کی اور حجاز و شام میں سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا اعلان ہوا۔ شاہان مغلیہ اگرچہ ہندوستان میں خود اپنے ہی کرامام سمجھتے تھے، اور باعتبار حکومت کے یہ حق انہیں حاصل بھی تھا۔ تاہم عام اسلامی خلافت کا انہوں نے کبھی دعوا نہ کیا۔ ہمیشہ عرب و شام کے مسلمہ خلفاء ہی کو خلیفہ تسلیم کرتے رہے۔ خود شہنشاہ اکبر اور شاہجہاں بھی اگر حج کیلئے مکہ جاتے، تو وہاں آنکو قسطنطنیہ کے خلیفہ ہی کی امارت میں حج ادا کرنا پڑتا۔ میدان عرفات میں وہ خود خطیب نہ ہوتے۔ قسطنطنیہ کا نائب السلطان خطبہ دیتا رہا کہڑے ہو کر اسی طرح سنتے، جس طرح ایک عام مسلمان انکے بغل میں کہڑا سن رہا ہوتا۔ شرعاً و عقلاً تسلیم خلافت کیلئے اس سے زیادہ آرر کونسی بات ہو سکتی ہے ؟

پس اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ مسلمانوں پر ہتیار اٹھانا شریعت کے نزدیک اُن انتہائی معاصی میں سے ہے جو عملی کفریات کا حکم رکھتی ہیں۔ اس لیے اُس کفر کے بعد جو مسلمان کو قطعاً کافر و مرتد کر دیتا ہے، اس کفر سے بڑھ کر عند اللہ کوئی برائی نہیں، اور قریب ہے کہ اس کا مرتکب اُس کفر کے حدود میں بھی داخل ہو جائے۔ کتاب و سنت نے جن جن لفظوں اور وعید و امتناع کے جیسے جیسے پیرایوں میں اس فعل کا ذکر کیا ہے، وہ عام معاصی و فسوق کے لیے کبھی اختیار نہیں کیے گئے، اور وہ ایسے سخت و شدید ہیں کہ جس دل میں برائی برابر بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہو، اس کو لرزا دینے اور خوف الہی سے بد حال کر دینے کے لیے بس کرتے ہیں۔ اگر ایک مسلمان کا ایمان بالکل مردہ نہیں ہو گیا ہے، تو وہ سارے گناہ جو زمین پر کیے جاسکتے ہیں، اس سے سرزد ہو جا سکتے ہیں، مگر اس کفر کے ارتکاب کا کبھی دھیان بھی نہیں کر سکتا۔

قرآن میں ”لعنت“ اور ”غضب“ کا لفظ کفار و منافقین کے لیے مخصوص ہے۔ ”لعنت“ کے معنی یہ ہیں کہ رحمت الہی سے مہجوری اور ہر طرح کی کامیابیوں اور فلاح سے محرومی۔ یہودی ملعون و مغضوب ہوئے اور عزت و حکومت سے ہمیشہ کیلئے محروم ہو گئے۔ سورہ احزاب میں ”منافقین“ پر لعنت وارد ہوئی: ان الذین یؤذون اللہ و رسولہ لعنہم اللہ فی الدنیا و الآخرۃ۔ الخ۔ چنانچہ وہ سب نابود و مخدول ہو گئے۔ چونکہ ایمان و اسلام کے خصائص بالکل اس سے متضاد ہیں۔ وہ رحمت الہی کا مورد اور فلاح و مراد کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ جہاں ایمان ہو، وہاں لعنت الہی کا بھی ورود ہو سکے۔ احادیث میں جا بجا ایسے واقعات ملیں گے کہ سخت سے سخت معاصی و فسوق کا جن لوگوں سے ارتکاب ہو گیا تھا، ان پر بھی ”لعنت“ کرنے سے آنحضرتؐ نے روکا۔

امام بخاری نے باب باندھا ہے ”ما یکرہ من لعن شارب الخمر“ یعنی جو مسلمان شراب پینے کی معصیت میں مبتلا ہو جائے، اس پر لعنت کی ممانعت۔ اسمیں عبد اللہ ملقب بہ ”العمار“ کا واقعہ بروایت حضرة عمر لائے ہیں۔ یہ شخص بار بار شراب نوشی کے جرم میں ماخوذ ہو چکا تھا۔ سزائیں پاتا تھا، توبہ کرتا تھا، پھر مبتلا ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب ماخوذ ہوا، تو بعض مسلمان بول اُٹے ”اللہم العنہ۔ ما اکثر ما یوتی بہ“ اس پر خدا کی لعنت ہو۔ لیکن آنحضرتؐ نے نہایت سختی سے روکا ”لا تلعنہ“

کے بعد مجبور ہو گئے کہ بلا واسطہ خلافت قسطنطنیہ سے اپنا رشتہ انقیاد و عقیدت قائم کریں۔ تاہم سلاطین عثمانیہ کا اسلام کی مرکزی خلافت پر قابض ہونا ایک ایسی مسلم و معروف بات ہے جو ہمیشہ علماء ہند کے علم و اعتقاد میں رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا سال وفات سنہ ۱۱۷۴ - ہجری ہے۔ انکا زمانہ احمد شاہ ابدالی کی آمد و رفت کا زمانہ تھا اور ہندوستان میں اسلامی حکومت ابھی قائم تھی۔ انہوں نے تفہیمات الہیہ میں درجہ سلاطین روم کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”از زمان سلطان سلیم خاں کہ در اراٹل سنہ الف بود“ اکثر بلاد عرب و مصر و شام تحت تصرف سلاطین روم اند“ و خدمت حرمین الشریفین زاد ہما اللہ شرفا و کرامۃ“ و امارت موسم“ و ریاست حجاج“ و اہتمام محامل و قوافل بر ایشان استقرار یافت۔ و بہ ہمین جہت بر منابر عرب و شام خصوصا حرمین شریفین ہر یکے از ایشان بہ لقب امیر المومنین مذکور است“

یمن میں اگرچہ آئمہ زیدیہ سلاطین عثمانیہ کے رقیب و حریف تھے، ار انہوں نے اندرون ملک میں کبھی انکی حکومت جمنے نہ دی۔ با این ہمہ گیارہویں سے تیرہویں صدی تک کے علماء یمن کی مصنفات کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، اُنسے پوشیدہ نہیں کہ اکثروں نے سلاطین عثمانیہ کی مرکزی حیثیت تسلیم کی ہے جسکے معنی بجز خلافت اسلامیہ کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ علامۃ صالح مقبلی صاحب العلم الشامخ المتولد سنہ ۱۰۴۷ھ، علامۃ فلانی صاحب ایقاظ الہم، شیخ عبد الخالق زبیدی صاحب صفرة الاخبار و غیرہم اپنی کتابوں میں جا بجا ترکی گورنروں کے جبر و ستم کی شکایتیں کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی سلاطین عثمانیہ کا ذکر ایسے پیرایہ میں کرتے ہیں جس سے انکی اسلامی خلافت و امامت کا مسلمہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً سلطان کو مخاطب کر کے یہ کہنا کہ جو شخص آج روئے زمین پر تمام مسلمانوں کا خلیفہ و امام کہلائے، اسکے گورنر اس طرح رعایا کے ساتھ سلوک کریں؟ یہ موقعہ مزید اطناب و تفصیل کا نہیں۔ سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا زمانہ ہزار صدی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ پس اگر اسکا ذکر ملسکتا ہے تو پچھلی در تین صدیوں کی مصنفات میں۔ چونکہ ان عہدوں کی تصنیفات عام طور پر علماء ہند کے مطالعہ میں نہیں آئی ہیں، اسلیے مسئلہ کے تاریخی شواہد سے عموماً لوگ بے خبر ہیں۔ تلاش کیا جائے تو ایک بڑا ذخیرہ تاریخی شواہد کا فراہم ہو سکتا ہے



اور عملی بھی - یعنی اعتقادیات و معنویات میں بھی ہے ' اور عملیات و ظواہر میں بھی - فکر میں بھی ہے اور فعل میں بھی - ایمان باللہ و الرسل بھی اسلام ہے اور نماز بھی اسلام ہے - ٹھیک اسی طرح کفر اور نفاق کی بھی دو قسمیں ہیں - اعتقادی اور عملی - ایک کفر و نفاق اعتقادیات و افکار کا ہے - ایک اعمال و افعال کا - شرک کفر اعتقادی ہے ' اور ترک صلوٰۃ متعمداً کفر عملی - پس یہ جو فرمایا کہ " سباب المسلم فسوق و قتالہ کفر "

اور فجزارہ جہنم خالداً فیہا اور " لا ترجعوا بعدی کفارا " اور " فلیس منّا " تو ان میں اور عموم احکام کفر و اسلام میں کوئی تعارض نہیں - نہ لفظ " کفر " کی یہاں کوئی تاویل کرنی چاہیے ' اور نہ نفی اسلام کو نفی کمال پر محمول کرنے کی ضرورت - شارع نے جس فعل کو کفر کہا ' وہ کفر کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ' اور جب تک دنیا باقی ہے وہ کفر ہی ہے اور کفر ہی رہیگا - البتہ یہ کفر بھی مثل دیگر اعمال کفریہ کے عملی کفر ہے ' نہ کہ کفر اعتقادی و مخرج عن الملة - اسکا کرنے والا ویسا ہی فعل کفر کا مرتکب ہوگا ' جیسا نماز چھوڑ دینے والا مسلمان جسکے کفر پر صحابہ کرام کو اتفاق تھا " و کان اصحاب رسول اللہ صلعم لا یرون شیئاً من الاعمال ترکہ کفر غیر الصلوٰۃ " ( ترمذی ) " من الاعمال " کی قید اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عمل کی باتوں میں جو بات کفر ہو سکتی ہے ' وہ بات ترک صلوٰۃ سمجھی جاتی تھی - لیکن بلاشبہ یہ وہ کفر نہیں ہے جو مخرج عن الملة ہے - جب تک ایک شخص اعتقاد کے اُس دروازہ سے پلٹ نہ جائے ' جس دروازہ سے اسلام میں داخل ہوا تھا ' اسوقت تک اُس معنی میں کافر نہیں ہو سکتا -

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء اور حدیث ابو سعید خدری کہ " اخرجوا من کان فی قلبہ مثقال حبة من خردل من الایمان " ( رواہ البخاری )

[ بقیہ نوٹ صفحہ ۷۵ ]

ماخوذ ہے - جیسا کہ امام احمد نے کتاب الایمان میں عطاء بن ابی رباح وغیرہ کے طرق سے روایت کیا ہے - اور امام ابو الحسن اشعری نے بھی مقالات طوائف اسلامیہ میں لکھا ہے کہ یہ قول متعدد صحابہ سے منقول ہے ' اور سلف میں عام طور پر زباں زد تھا - ( کمانقل عنہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فی کتاب الایمان )

دینی کا پورا اعتقاد رکھتا تھا۔ جزائر سیلون ہندوستان ہی کا ایک بحری گوشہ ہیں۔ سنہ ۱۱۷۵ھ (سنہ ۱۷۶۱ع) میں دکن کے ایک مشہور عالم سید قمرالدین ارننگ آبادی حج سے واپسی میں کولمبو پہنچے اور وہاں کی سیر کی۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی ان کے معاصر ہیں۔ اپنی کتاب سبعة المرجان میں ان کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ ساحلی مقامات میں پرتکالیوں کی حکومت ہے۔ اندرونی جزائر میں ہندو راجہ ہے۔ کولمبو میں مسلمانوں کے در محلے ہیں۔ جمعہ کی نماز تین مرتبہ سید موصوف نے وہاں پڑھی۔ خطبہ میں امام نے بادشاہ ہند اور سلطان روم کیلئے دعا مانگی۔ ”لکنہ خادما للحریمین الشریفین“ یعنی اسلیے کہ وہ خادم حریمین ہیں۔ (سبعة المرجان مطبوعہ بمبئی صفحہ ۲۳) یہ اب سے قریب سو برس پیشتر کا واقعہ ہے۔ سیلون کے جزیروں میں اگر مسلمان ایک غیر مسلم حاکم کے ماتحت رہ کر شاہ ہند کا ذکر کرتے تھے تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کہ ہندوستان بالکل ان سے متصل تھا۔ لیکن قسطنطنیہ کے سلطان کیلئے دعا مانگنا جو بحر ہند سے اس قدر بعید فاصلہ پر واقع ہے، کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا اس کے سوا کوئی معنی ہو سکتے ہیں کہ تمام عالم اسلامی میں وہی خلیفۃ المسلمین ہے، اور اسلیے گو آج بھی بہت سی اسلامی حکومتیں دنیا میں موجود ہوں، مگر ہر گوشہ عالم کے مسلمانوں کے دلی تعلق و اطاعت کا اصلی مرکز صرف وہی ہو سکتا ہے؟

صاحب تحفة العالم چین کوچک کے ایک سیاح سے اپنی ملاقات کا حال لکھتے ہیں جس نے عجیب عجیب جزیروں اور وہاں کے رسم و رواج کا مشاہدہ کیا تھا۔ ”چین کوچک“ سے مقصود بحر چین کے جزائر سمائرا، ملایا، جارا، وغیرہ ہیں۔ سیاح مذکور کہتا ہے کہ اکثر جزائر میں مسلمان آباد ہیں۔ مسجدیں معمور۔ جمعہ کے خطبوں میں سلطان روم کیلئے دعا مانگتے ہیں اور وہاں کے حالات سے خوب باخبر ہیں۔ یہ واقعہ بھی بارہویں صدی کے ارائل کا ہے۔

باقی رہا یہ خیال کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا اعتقاد حال کی پیدار ہے، تو یہ بھی صحیح نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک خود ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم تھی، کسی بیرونی اسلامی حکومت سے مسلمانوں کو بلا واسطہ تعلق رکھنے کی کوئی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ البتہ سلطنت مغلیہ کے انقراض

یہ حدیث نہایت اہم ہے، اور من جملہ قواعد و کلیات شریعت کے ہے۔ اسی لیے امام بخاری نے کتاب الفتن میں ایک خاص عنوان باب قرار دیا، اور امام مسلم کتاب الایمان میں لائے تاکہ حقیقت ایمان و کفر کی تحقیق میں اس سے مدد لیں، اور حافظ نواری نے ایک مستقل عنوان قرار دیکر باب باندھا۔

”لیس منا“ کے معنی ہیں ”ہم میں سے نہیں ہے“ یعنی ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ آنحضرت صلعم کے طرز تکلم و خطاب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ”لیس منا“ وعید کا ایک ایسا جملہ تھا جو ان موقعوں پر آپ استعمال فرماتے (۱) جہاں صریح و قطعی کفر کی جگہ کفر سے کوئی بہت ہی قریب اور اسلامی زندگی سے بہت ہی بعید حالت کا بتلانا مقصود ہوتا تھا۔ عام معاصی و فسوق سے یہ حالت زیادہ سخت مگر کفر قطعی سے کم ہوتی تھی۔ جن جن احادیث میں یہ لفظ آیا ہے، ان سب پر غور کیا جائے، اور ایمان و کفر کے عملی مراتب کی حقیقت بھی پیش نظر ہو جو اوپر گزر چکی، تو یہ بات واضح ہو جائیگی۔ پس کچھ ضروری نہیں ہے کہ ”لیس منا“ کے یہ معنی کیے جائیں کہ ”لیس علی ہدینا“ یا ظاہر منطوق کو چھوڑ کر کوئی اور تائیل کی جائے۔ یا نفی کو نفی کمال پر محمول کیا جائے۔

صاحب شریعت نے جن کاموں کیلئے جو احکام دیے اور جو الفاظ استعمال کیے، ہمیں حق نہیں ہے کہ تائیل و توجیہ کر کے انکے لغوی مفہوم کا اصلی زور و اثر گھٹانے کی کوشش کریں۔ ایسی کوششیں جن لوگوں نے کیں، انہوں نے مسلمانوں کو اسلام و ایمان کی عملی زندگی سے محروم کر دیا۔

(۱) احادیث میں بعض اعمال کی نسبت ”لیس منا“ آیا ہے اور بعض کی نسبت ”لیس منی“۔ جیسے ”الزکاح من سنتی فمن رغب عنها فلیس منی“ درنوں میں فرق ہے۔ ”لیس منا“ میں جمع کا صیغہ ہے جس سے مقصود امت ہے۔ اور ”لیس منی“ میں اپنی ذات خاص کا ذکر ہے، جس سے مقصود ترک سنت ہے۔ پس جن احادیث میں ”لیس منا“ کی وعید آئی ہے، اُن سے مقصود وہی ہوگا جو متن میں لکھا ہے، اور جن میں ”لیس منی“ ہے ان سے مقصود صرف ترک اتباع سنت و اسوۂ نبوت ہوگا۔

میں انحراف اور تفرقہ و انتشار ہوا ، وہاں یہ بات بھی جاتی رہی - خلفاء راشدین کے بعد صرف بنو امیہ کے ابتدائی عہد تک یہ وحدۂ نظر آتی ہے - اُسکے بعد کوئی زمانہ ایسا نہ آیا جب تمام اسلامی کی حکومت کسی ایک طاقت میں جمع رہی ہو - مختلف گوشوں میں مختلف دعویدار اُٹھے ، اور جسکا قدم جہاں جم گیا ، خود مختارانہ فرمانروائی کرنے لگا - یہی وجہ ہے کہ مورخین نے بنو امیہ مروانیہ کے عہد کو تاریخ اسلام کا بہترین زمانہ قرار دیا ہے جب کرۂ ارضی کے تمام اسلامی خطے پر صرف ایک ہی خلیفہ کی حکومت قائم تھی - علی الخصوص عبد الملک بن مروان کا زمانہ کہ تمام مشرق و مغرب و افریقہ کے منبروں پر بجز ایک حکمران کے اور کسی کا ذکر نہ تھا - اسی لیے حافظ ذہبی نے کہا - بنو امیہ نے خلافت راشدہ کی برکتیں نہ پالیں لیکن بنو عباس کو بنو امیہ کی بھی برکات نہ ملیں - خلفاء عباسیہ کے زمانے میں تفریق کلمۂ و حکومت کا معاملہ آخری حد تک پہنچ گیا - تمام اسلامی دنیا مختلف حکمرانوں میں بت گئی -

با ایں ہمہ ایک خاص مرکزی اقتدار ہر زمانے میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور مورخ کی بصیرۂ محسوس کر لیتی ہے کہ اس تفرقہ و انتشار کی عام سطح میں ایک مرکزی قوت ابھری ہوئی ہے - اسلامی حکومتیں ہر گوشہ عالم میں قائم ہو گئی تھیں ، مگر ہمیشہ ایک خاص مقام ایسا ضرور رہا ، جہاں کی حکمرانی دنیا کی تمام اسلامی حکمرانیوں میں ایک مرکزی اقتدار کی حیثیت رکھتی تھی - دوسرے مقامات کے فرمانروا اپنے دائرہ حکومت سے باہر کوئی اثر نہیں رکھتے تھے ، لیکن وہاں کا حکمران باہر کے مسلمانوں کیلئے بھی ایک خاص کشش و دعوت اپنے اندر رکھتا تھا - یہ بلاد شام و عراق اور عرب و حجاز کی حکومت تھی - عرب اسلام کا اصلی سرچشمہ و مبداء ہے - حجاز اسلامی قومیت کا دائمی مرکز اور اسلام کے رکن حج کا کارگاہ - شریعت نے عرب ہی کو یہ شرعی خصوصیت دی ہے کہ ہمیشہ غیر مسلم اقوام کے اثر سے محفوظ رکھا جائے - شریعت کے اس حکم کی تعمیل بغیر حکومت کے ممکن نہیں - جو حکومت اسبق قابض ہوگی ، رہی اس شرعی حکم کی تعمیل و نفاذ کی ذمہ دار ، اور اقامۂ حج کی بھی کفیل ہوگی - پس قدرتی طور پر یہ بات ہوئی کہ یہاں کی حکومت کو تمام اسلامی حکومتوں میں ایک مرکزی اقتدار اور



( ر فی لفظ لا تلعه ) فر اللہ ما علمت انه یحب اللہ و رسولہ “ ( ر فی روایۃ - فانه یحب اللہ و رسولہ ) اسپر لعنت نہ بھیجور۔ یہ اللہ اور اسکے رسول کو درست رکھتا ہے ! حافظ عسقلانی نے حافظ ابن عبد البر کا قول نقل کیا ہے ” انه اتی بہ اکثر من خمسين مرة “ فتامل !

اسی طرح حضرة ابو هريرة کی روایت مندرجہ کتاب الدیات بخاری کہ ایک شخص اسی جرم میں ماخوذ ہوا اور اسکو پیٹنے کا حکم دیا گیا۔ کسی نے کہا ” اخزاک اللہ “ خدا تجھے رسوا کرے۔ فرمایا ” لا تقولوا هكذا۔ لا تعینوا علیہ الشیطان “ اور سنن ابوداؤد میں ابن رهب کے طریق سے ہے ” و لكن قولوا اللهم اغفر له - اللهم ارحمه “ بد دعا نہ در۔ بلکہ یوں کہو۔ خدایا اسپر رحم کر۔ خدایا اُسے بخش دے ! قلت و ما املح فی ہذا المقام قول الشاعر العارف :

فدائے شیوہ رحمت ، کہ در لباس بہار

بعدر خواہی رندان بادہ نوش آمد !

لیکن صرف قتل مسلم ہی ایک ایسی معصیت ہے جسکے لیے قرآن نے ” لعنت “ اور ” غضب “ کے الفاظ استعمال کیے ، اور احادیث میں بھی جا بجا لعنت و ملعون کا لفظ وارد ہوا۔ صرف اسی ایک بات سے فیصلہ کرلو۔ خواہ یہ فعل کفر قطعی و مخرج عن الملة ہو یا نہر ، لیکن اللہ کی شریعت کے نزدیک اُسکا ارتکاب کس درجہ مبغوض و ملعون ہے ؟ اور جو مسلمان اسکا ارتکاب کرتا ہے ، وہ اللہ کے حضور کس طرح اپنے اسلام و ایمان کی ساری رحمتیں اور برکتیں کھو دیتا ہے ؟

ثالثاً ، اس باب میں فیصلہ کن حدیث وہ ہے جسکو ہم نے بہ اتباع تبویب بخاری ، اس فصل کا عنوان قرار دیا ہے۔ اور جسکو امام موصوف اور امام مسلم نے مختلف طریقوں سے روایت کیا ہے۔ یعنی ” من حمل علینا السلاح فلیس منا “ ( رواہ ابن عمر ، و سلمہ ، و ابو موسی الاشعري - ر فی روایۃ سلمہ ” من سل علینا السیف “ ) جس مسلمان نے مسلمانوں کے مقابلے میں ہتھیار اٹھایا۔ یعنی حملہ کیا یا لڑائی کی ، وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ ” و معنی الحدیث حمل السلاح علی المسلمین لقتالہم بہ بغیر حق “ ( فتح ۱۳ : ۲۰ )



خود یورپین حکومتیں علی الخصوص برٹش گورنمنٹ سلطان عثمانی کی اس دینی حیثیت کا ہمیشہ اقرار کرتی آئی ہے اور جب کبھی ضرورت ہوئی ہے، قسطنطنیہ کی طاقت سے بہ حیثیت خلیفہ اسلام کام لیا گیا ہے۔ غدر سنہ ۵۷ کے موقعہ پر سلطان عبد المجید سے جو فرمان مسلمانان ہند کے نام حاصل کیا گیا تھا اور جسمیں انگریزی حکومت کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی ہدایت کی تھی، اُسکی بنا یہی تھی کہ سلطان قسطنطنیہ کو بہ حیثیت خلیفہ اسلام مسلمانان ہند کی ارشاد و ہدایت کا حق حاصل ہے۔ کورین و کتوریا کے عہد میں بارہا حج اور حاجیوں کی مشکلات کا سوال گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے اٹھایا گیا، اور پھر امپریل گورنمنٹ نے باب عالی کو اس احتجاج کے ساتھ ترجہ دلائی کہ بہ حیثیت خلیفہ اسلام ہونے کے حجاج کی تکالیف درر کرنا اُنکا مذہبی فرض ہے۔ فرانس اور روس کی جانب سے بھی سلطان عبد الحمید خاں کے زمانے میں متعدد مرتبہ ایسے اظہارات و اعترافات ہو چکے ہیں۔

( قرون متوسطہ و اخیرہ میں مرکزی حکمرانی )

ہم نے جا بجا ”اسلام کی مرکزی حکمرانی“ اور ”خلافت عظمیٰ“ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تشریح اس اجمال کی یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام کا محور و اساس مسئلہ ”توحید“ ہے۔ ”توحید“ کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہونا۔ صرف اللہ کی ذات و صفات ہی میں یہ حقیقت محدود نہیں ہے جیسا کہ بد قسمتی سے لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ عقائد و اعمال کی ہر شاخ اور ہر شکل میں اسلام کا اصل الاصل توحید ہی ہے۔ وہ مسلمانوں کی تمام اُن باتوں میں جو فرد و اجتماع سے تعلق رکھتی ہیں، ایک کامل توحیدی حالت پیدا کر دینی چاہتا ہے۔ خدا کی ذات کی طرح اُسکی خلقت اور قوانین خلقت میں بھی ہر چیز پر اور ہر جگہ یگانگی و یک عملی اور وحدت و واحدیت کا فرما ہے۔ مائتروی فی خلق الرحمن من تفارت۔ فارغ البصر هل تری من فطور؟ (ملک - قال ابن عباس ”تفارت“ ای الاختلاف اخرجہ البخاری) پس اس بنا پر اسلام نے جس طرح مسلمانوں کی ساری باتیں ایک قرار دی تھیں۔ اُنکی شریعت، اُنکا قانون، اُنکی کتاب، اُنکا نام، اُنکی زبان، اُنکی قومیت، اُنکا قبلہ، اُنکا کعبہ، اُنکا مرکز اجتماع، اُنکا مرکز ارض، اُسی طرح اُنکی حکومت بھی ایک ہی قرار دی تھی۔ یعنی تمام رے زمین پر مسلمانوں کا صرف ایک ہی فرمانروا و خلیفہ ہو۔ لیکن جہاں ساری باتوں

” لیس منا “ کے صاف معنی یہ ہیں کہ ” وہ ہم میں سے نہیں “  
 یعنی مسلمانوں میں سے نہیں - اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کی کسی  
 جماعت پر بطور جنگ و قتال کے ہتھیار اٹھانا ایک ایسا فعل ہے جسکے  
 کرنے کے بعد انسان مسلمانوں میں شمار ہونے کے قابل نہیں رہتا -

## فصل

( اقسام ثلاثہ قتل مسلم و حمل سلاح )

البتہ واضح رہے کہ قتل مسلم و حمل سلاح کی متعدد صورتیں ہیں ،  
 اور ہر صورت کا حکم شرعی دوسرے سے مختلف ہے :

( ۱ ) ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان مسلمان کو قتل کرے ، لیکن اس  
 فعل کو جائز نہ سمجھے - اسکی حرمت کا معترف ہو ، اور اس کے ارتکاب  
 پر شرمندہ و متاسف ، تو اسکا حکم زہی ہے جو گذشتہ فصل میں گزر چکا -  
 یعنی وہ عملی کفر ہے ، مگر اسکا کرنے والا ملت سے خارج نہیں ہو جائیگا -  
 دنیا میں اسلام کے قومی احکام و معاملات اس پر جاری ہونگے - عاقبت کا  
 معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے -

باقی رہی یہ بات کہ قاتل مسلم کی توبہ قبول ہوسکتی ہے یا نہیں ؟  
 تو اس بارے میں خود صحابہ و سلف سے اختلاف منقول ہے - ایک  
 جماعت اس طرف گئی کہ سورہ فرقان میں ہے : وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ  
إِلٰهَا آخِرًا وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ الْخ - پھر فرمایا :

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَبْدِلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ  
پس اس سے معلوم ہوا کہ تمام معاصی کی طرح قتل نفس کے مرتکب  
کی توبہ بھی مقبول ہوسکتی ہے - لیکن حضرت عبد اللہ ابن عباس سے  
بخاری و مسلم و غیرہما میں مروی ہے کہ جو مسلمان مسلمان کو قتل

کرے ، اسکی توبہ مقبول نہیں - وہ فجزارہ جہنم خالد فیہا الخ کے یہی  
 معنی کرتے ہیں کہ ” لا توبۃ لہ “ اور صحیح بخاری کتاب التفسیر میں  
 سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ ابن عباس سے ” إِلَّا مَنْ تَابَ “ الخ کی  
 نسبت پرچھا گیا تو کہا ” هَذِهِ مَكِيَّةٌ - نَسَخْتُهَا آيَةً مَدَنِيَّةً الَّتِي فِي النِّسَاءِ “

کے جملوں سے اسلامی ممالک اور مسلمانوں کی حفاظت کرسکے - اسلام  
 و ملت کے دشمنوں کا استیصال و انسداد ہو - کلمہ حق دنیا میں بلند اور  
 دور دور تک جاری و نافذ ہو جائے - کلمہ کفر و فساد کو خسران و ناکامی  
 نصیب ہو - یہی مقصد پہلا مقصد ہے - باقی سب فروع و توابع ہیں -  
 یہی وجہ ہے کہ تمام کتب عقائد و اصول میں خلافت کی تعریف کرتے  
 ہوئے ”اقامة الدين باقامة اركان الاسلام“ والقيام بالجهاد“ و حفظ حدود  
 الاسلام“ و ما يتعلق به من ترتيب الجيوش والفرض للمقاتله“ کے جملے  
 سب سے پہلے ملتے ہیں - یعنی وہ مسلمانوں کی ایسی حکومت ہے جو ارکان  
 اسلام کو قائم رکھے، جہاد کا سلسلہ و نظام درست کرے، اسلامی ملکوں کو  
 دشمنوں کے حملوں سے بچائے، اور ان کاموں کیلئے فوجی قوت کی ترتیب  
 اور لڑائی کا سامان وغیرہ جو کچھ مطلوب ہو، اسکا انتظام کرے - مختصر یہ  
 کہ اسلام کا خلیفہ وہ حکمران ہوسکتا ہے جو اسلام و ملت کیلئے دفاع و جہاد  
 کی خدمت انجام دیسکے - ساری باتیں ان در لفظوں میں آگئیں -

اب فیصلہ کرلو کہ گذشتہ چار صدیوں کے اندر کس حکومت اور کس قوم  
 نے دفاع و جہاد کی خدمت انجام دی ہے؟ اسلام کا جب ظہور ہوا، تو  
 دشمنوں کی پہلی جماعت قریش مکہ کی جماعت تھی - انکے مت جانے  
 کے بعد اس پوری تیرہ صدیوں میں صرف عیسائی قومیں ہی مسلمانوں  
 کی دائمی حریف رہی ہیں - دوسری غیر مسلم قوموں میں سے کوئی قوم  
 ایسی نہ تھی جس میں اسلام اور مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا داعیہ ہو۔  
 ایران کی مجوسی قوت کا ابتدا ہی میں خاتمہ ہوگیا - یہودیوں کی کوئی  
 پولیٹکل قوت نہ تھی - ہندوستان کے ہندوؤں اور بدھ مذہب کے پیروؤں نے  
 ہندوستان سے نکل کر کبھی مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا اور نہ انہیں کوئی  
 داعیانہ قوت تھی - چین کے تاریخی اُتھ اور بلاشبہ سب سے بڑی ہلاکت  
 کا باعث ہوئے لیکن بالآخر خود اسلام کے محکوم ہوگئے - یعنی ایک صدی کے  
 اندر ہی اندر مسلمان ہوگئے -

پس تمام رے زمین پر بجز مسیحی اقوام کے اور کوئی حملہ آور  
 حریف اسلام کا نہ تھا - نہ ہے - مشرقی عیسائیوں کی قوت ابتدا ہی میں  
 شکست ہوگئی تھی - صرف یورپ کی حکومتیں اور قومیں تھیں جنکو  
 خواہ مسیحیت کے نام سے مرسوم کرواوا یورپ کے نام سے - یہی آخری  
 چار صدیاں ہیں جن میں بتدریج یورپ کی طاقت ترقی کرتی گئی، اور

یہ جو آج تمام عالم اسلامی میں تقریباً درتہائی مسلمان عملاً یکقلم مرجی و جہمی زندگی بسر کر رہے ہیں اگرچہ اعتقاداً اہل سنت ہونے کا دعوا کرتے ہوں، اور اسلام کی تعریف میں ”عمل بالارکان“ کا لفظ صرف درسی کتب عقائد کے صفحات پر رہ گیا ہے، عمل میں اسکا کوئی وجود نظر نہیں آتا، تو اس کے متعدد اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی بدعت تاریل ہے۔ اسی بدعت کی وجہ سے اعمال کی اہمیت و مطلوبیت بالکل جاتی رہی اور ادعاء اسلام کا سارا دار و مدار صرف چند جزئیات عقائد کے تحفظ و نزاع پر رہ گیا۔ یہ کیا بات ہے کہ ایک شخص کتنا ہی فاسق و فاجر ہو، لیکن اگر چند نزاعی عقائد میں ہمارا ہم داستان ہوتا ہے تو ہم اسکو دنیا کی سب سے بہتر مخلوق یقین کرتے ہیں؟ اور ایک شخص کتنا ہی صاحب عمل و صلاح ہو، لیکن اگر چند اختلافی جزئیات عقائد میں ہم سے متفق نہیں، تو پھر اُس سے زیادہ شر البریہ ہماری نظروں میں اور کوئی نہیں ہوتا؟ یہی عملی مرجیہ و جہمیہ اگرچہ زبان سے ادعاء اتباع سنت و سلف!

یہی وجہ ہے کہ ائمہ سلف نے ہمیشہ ایسی تاریلوں سے انکار کیا، اور اُن تمام راہوں سے بچتے رہے جو راے اور تعمق کی بدعتوں تک لیجانے والی تھیں۔ اسی حدیث کی نسبت امام نواری اور حافظ عسقلانی وغیرہما لکھتے ہیں ”وکان سفیان بن عیینہ یکرہ قول من یفسرہ بلیس منا بلیس علی ہدینا“ و یقول بلئس هذا القول - یعنی بل یمسک عن تاریلہ“ (شرح مسلم مطبوعہ احمدی: ۶۹ - وفتح الباری ۱۳: ۲۰) یعنی سفیان بن عیینہ اس بات کو مکروہ سمجھتے تھے کہ ”لیس منا“ کی تفسیریوں کی جائے کہ ”لیس علی ہدینا“ اور اس تفسیر کی نسبت کہا کرتے کہ کیا ہی برا قول ہے۔ مقصود اُنکا یہ تھا کہ ان نصوص کی تاریل نہ کرنی چاہیے۔

اسی طرح شیخ عبد الوہاب شعرانی نے میزان میں امام سفیان ثوری کا قول نقل کیا ہے ”ومن الادب اجراء الاحادیث التي خرجت مخرج الزجر والتفیر علی ظاہرہا من غیر تاریل“ فانہا اذا اولت، خرجت من مراد الشارع، کحدیث: من غشنا فلیس منا - و لیس منا من لطم الخدود و شق الجیوب و دعی بدعوة الجاہلیہ: فان العالم اذا اولها بان المراد لیس منا فی تلك الخصلة فقط، ای و هو منا فی غیرہا، ہان علی الفاسق الوقوع فیہا، و قال مثل المخالفة فی خصلة واحدة امر سهل“

تمام مسلمانان عالم کے قلوب کیلیے ایک انجذابی اثر حاصل ہو جائے۔ اسلام کے ازمنہ متوسطہ و اخیرہ میں یہی مرکزی اقتدار خلافت عظمیٰ کا قائم مقام تھا۔ خلافت بغداد کے مٹنے کے بعد بھی ان مقامات کی حکومت خلفاء مصر ہی کے قبضہ میں رہی۔ ”مرکزی حکومت“ سے مقصود یہی مرکزی اقتدار ہے۔ خلفاء مصر کے بعد جب سلاطین عثمانیہ تمام بلاد عرب و حجاز اور مصر و شام پر قابض ہو گئے تو باوجود متعدد اسلامی حکومتوں کی موجودگی کے، اسلامی خلافت عظمیٰ کا مرکزی اقتدار بلا نزاع انہی کو حاصل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار صدی کے بعد سے تیرھویں صدی کے اوائل تک اگرچہ بڑی بڑی اسلامی حکومتیں دنیا میں قائم رہیں، لیکن خلافت عظمیٰ کے اعتقاد کے ساتھ جب کبھی کسی مسلمان کی نظر اٹھتی تو وہ صرف قسطنطنیہ ہی کی طرف دیکھ سکتا تھا۔

( ترکان عثمانیہ اور عالم اسلامی )

اب ہم چاہتے ہیں کہ اس پوری تاریخ سے قطع نظر کر لیں۔ صرف اس اعتبار سے مسئلہ پر ایک آخری نظر ڈالیں کہ احکام شرعیہ کی بنا پر سلاطین عثمانیہ کے اعمال خلافت کا کیا حال رہا ہے ؟ بحث کا یہ سب سے زیادہ قطعی اور سب سے زیادہ سہل فیصلہ ہوگا۔ اسلام نے خلیفہ کے نصب و تقرر کے خاص مقاصد قرار دیے ہیں۔ پچھلی پانچ صدیوں کے اندر متعدد اسلامی حکومتیں دنیا میں موجود تھیں اور بعض اب تک موجود ہیں۔ قوم و جماعت کے اعتبار سے متعدد مسلمان قوموں میں حکومت رہی اور بعض حکمران قومیں اب بھی باقی ہیں۔ گو انکی حکومت محض براے نام ہو۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام حکمران قوموں میں کونسی حکومت اور قوم ایسی ہے جس نے شریعت کے تہرے مقاصد خلافت انجام دیے ؟ اور جو غرض شرعی خلیفہ کے قیام اور بحکم الذین ان مکنہم فی الارض الخ تمکین فی الارض سے ہے، وہ انکے ہاتھوں پوری ہوئی ؟ جس حکومت اور جس حکمران قوم نے ایسا کیا ہو، صرف وہی حکومت اور قوم تمام مسلمانان عالم کی خلافت و امامت کا دعوا کر سکتی ہے۔

اس اہم سوال کا فیصلہ چند سطروں میں ہو جاسکتا ہے۔ ”خلافت اسلامیہ“ کا مقصد شرعی پچھلی صحبتوں میں صاف ہو چکا ہے۔ سب سے پہلا مقصد اس کا یہ ہے کہ ایک ایسی طاقتور حکومت قائم ہو جو دشمنوں



سوا کچھ نہیں ہو سکتا - اور منظور مفہوم پر مقدم ہے جب تک اسکے خلاف کوئی سبب قری موجود نہ ہو - کما تقریر فی الاصول -

ثانیاً ' یہ کہنا کہ سورۃ فرقان کی آیت نے اسکو منسوخ کر دیا ' صحیح نہیں ہو سکتا - کیونکہ آیۃ فرقان مکی ہے اور ایۃ نساء مدنی - خود ترجمان القرآن اور حبر الامۃ یعنی ابن عباس شہادت دے رہے ہیں کہ " نزلت فی آخر ما نزل وما نسخها شیء " اور معلوم ہے کہ ناسخ کیلئے تقدم زمانی ہونا ضروری ہے -

ثالثاً ' دونوں آیتوں میں حکم مشترک نہیں ہے کہ متاخرین کا مصطلح نسخ مانا جاسکے - دونوں کا مورد الگ الگ ہے - پس اگر نسخ ہو سکتا ہے تو سلف کی اصطلاح میں ہو سکتا ہے جیسا کہ ابن عباس نے کہا - یعنی عام و خاص کا نسخ - سورۃ فرقان کی آیت میں ذکر کفار کا ہے - اور حکم بھی جو دیا گیا ہے وہ انہی کفار کی نسبت ہے جو کفر سے توبہ کریں اور ایمان لے آئیں - اور چونکہ " الایمان یهدم ما قبلہ " ہے - یعنی اسلام تمام پچھلی برائیوں کو نابود کر دیتا ہے ' اسلئے جب شرک سے توبہ ہو سکتی ہے تو قتل نفس سے کیوں نہو ؟ قریش میں جو لوگ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے ' ان میں کون تھا جس نے خود مسلمانوں سے قتال نہیں کیا تھا ؟ یہی وجہ ہے کہ " الا من تاب " کے بعد " وامن " کا لفظ بھی موجود ہے - یعنی " توبہ کی اور ایمان لایا " جس سے واضح ہو گیا کہ یہ توبہ اسلام لانے والے کافر کی توبہ ہے ' نہ کہ ایک مومن کی توبہ معصیت بعد از اسلام - سورۃ فرقان کا آخری رکوع " وعباد الرحمن " سے پڑھو تو تمام آیات کا ٹھیک ٹھیک محل و مورد واضح ہو جائیگا - رہا ذکر خدا کے نیک بندوں کے اسلامی و ایمانی اوصاف کا ہے - انہی میں ان اوصاف کو بھی داخل کیا ہے کہ " نہ تو شرک کرتے ہیں " نہ کسی نفس کو قتل کرتے ہیں ' نہ زنا کا آنسو ارتکاب ہوتا ہے " - پھر بتلایا ہے کہ مسلمان جن برائیوں سے بچتے ہیں ' یہ وہ برائیاں ہیں جنکا نتیجہ عذاب جہنم ہے - اسکے بعد فرمایا " الا من تاب وامن " ہاں ' لیکن جو لوگ مسلمان ہو جائیں ' تو انہوں نے کفر کی حالت میں اس طرح کے جس قدر افعال کیے ہوں ' انکا مواخذہ نہ ہوگا - اسلام انکی برائیوں سے آلودہ زندگی کو نیکیوں اور خوبیوں سے بھر دیگا -

پس اس آیت میں توبہ کفر کی قبولیت کا ویسا ہی ایک حکم ہے جیسا مدھا مقامات میں وارد ہے - اس کو مسلمان قاتل مسلم اور مرتکب

دی ہو۔ اور جو فرض تمام مسلمانان عالم کے ذمے عائد ہوتا تھا، اُسکو سب کی طرف سے تنہا پورا کرتے رہے ہوں؟

حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جسکی نظیر قرن اڑی کے بعد مسلمانوں کی کسی حکمران قوم کی تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔ صرف صلاح الدین ایوبی کی دعوۃ اس سے مستثنیٰ ہے جس نے تمام یورپ کے متحدہ مسیحی جہاد کو شکست دی۔ تاہم وہ بھی ایک محدود زمانے کا جہاد تھا۔ مسلسل تین چار صدیوں تک صرف ترکوں ہی کی اسلامی مدافعت قائم رہی ہے۔ ان پوری چار صدیوں میں تمام روئے زمین کے مسلمان اس اولین قومی فرض سے غافل رہے۔ کسی قوم نے ایک زخم بھی اس مقدس راہ میں نہیں کھایا۔ کسی پادشاہ نے ایک قدم بھی اسکے لیے نہیں اٹھایا۔ صرف تنہا ترک ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کی جانب سے یہ پورا کام انجام دیتے رہے۔ انہوں نے تمام مسلمانان عالم کو عیش و راحت کے بستروں پر چھوڑ دیا۔ خود اپنے لیے خاک و خون کی دائمی زندگی پسند کی۔ اگر ان قرن اخیرہ میں کہ مسلمانوں کا تنزل و ادبار آخری درجہ تک پہنچ چکا تھا، اور علی الغرض فرض دفاع و جہاد کو کہ سنام دین، و عماد ملت، و اساس شرع ہے، تمام روئے زمین کے مسلمان چھوڑ بیٹھے تھے، ترکوں کی جانفروشی و سرباز جماعت تنہا نہ سنبھال لیتی، تو نہیں معلوم آج جغرافیۃ عالم میں مسلمانوں کی آبادیوں کا کیا حال ہوتا؟ اور جو مصیبت اسوقت درپیش ہے، وہ کب کی اچکی اور مسلمانوں پر سے گزر چکی ہوئی؟ تمام دنیا کے مسلمانوں پر ترکوں کا یہ وہ احسان عظیم ہے کہ اگر اسکے معارضہ میں مسلمانان عالم اپنا سب کچھ اُن پر سے قربان کردیں، جب بھی اُنکے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ اگر گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے پادشاہتیں کی ہیں تو صرف الہی کی بدولت، اور اگر آج اپنی پادشاہتیں کھو کر بھی کچھ نہ کچھ عزت کی پونجی اپنے ساتھ رکھتے ہیں تو صرف اُنہی کی بدولت۔ مسلمان خواہ دنیا کے کسی حصہ میں بستا ہو، چین میں یا افریقہ کے بعید گوشوں میں، لیکن صدیوں سے اُسکی قومی زندگی، قومی عزت، قومی عیش و آرام، اور وہ سب کچھ جو ایک قوم کیلئے ہے اور ہوسکتا ہے، صرف ترکوں ہی کے طفیل ہے اور اُنہی کا بخشا ہوا۔ یہی

یعنی اس آیت کو سورۃ نساء کی آیت ” من یقتل مومنًا “ نے منسوخ کر دیا۔ پس قبولیت توبہ پر اس سے استدلال نہیں ہو سکتا۔ مسلم کی روایت زیادہ مفصل ہے: ” لما أنزلت التي في الفرقان قال مشركوا مكة قد قتلنا النفس ودعونا مع الله الها آخر راتينا الفواحش - فنزلت الا من تاب وامن الخ - قال فهذه للرائك ' واما التي في النساء ' فهو الذي قد عرف الاسلام ثم قتل مؤمنا متعمداً ' فجزاؤه جهنم لا توبة له “ یعنی جب

سورۃ فرقان کی آیت رالذین لا یدعون مع الله الها آخر ر لا یقتلون النفس اترى تو مشرکین مکہ نے کہا - ہم تو یہ سب کام کرچکے ہیں - اب مسلمان ہوے بھی تو نجات کب ملیگی ؟ اسپر یہ آیت اترى کہ ” الا من تاب وامن “ یعنی ہاں - لیکن جس شخص نے توبہ کی ، ایمان لایا ، اچھے کام کیے ، تو اللہ اُسکی برائیوں کو محو کر دیگا - لیکن ” من یقتل مومنًا “ رالی آیت مشرکین کیلئے نہیں ہے - مسلمانوں کیلئے اترى ہے - یعنی جو شخص مسلمان ہونے کے بعد مسلمان کو قتل کرے ، تو اُسکی سزا جہنم ہے اور اسکے لئے توبہ نہیں - انتہی

اور امام احمد ر طبرانی نے سالم بن أبی الجعد سے بطریق یحیی العابر اور نسائی ر ابن ماجہ نے بطریق عمار ذہبی روایت کی ہے - ایک شخص نے ابن عباس سے اس بارے میں سوال کیا تو جواب دیا ” لقد نزلت في آخر ما نزل ر ما نسخها شيء حتى قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم ر ما نزل رحي بعد رسول الله “ اسپر سائل نے کہا ” أفرايت ان تاب وامن ر عمل عملاً صالحاً ثم اهتدى “ ؟ کہا ” ر أني له التوبة ر الهدى “ ؟ یہ لفظ یحیی العابر کا ہے - نسائی ر ابن ماجہ کے الفاظ بھی قریب قریب ایسے ہی ہیں - حاصل ان تمام روایات کا یہ ہوا کہ ابن عباس سورۃ فرقان کی آیت کو منسوخ قرار دیتے ہیں ، اور اس بارے میں آخر تنزیل سورۃ نساء کی آیت ” فجزاؤه جهنم خالداً فيها “ ہے - اور اسلئے رہ کہتے ہیں کہ مسلمان قاتل مسلم کیلئے توبہ نہیں -

اسمیں شک نہیں کہ حضرت ابن عباس کا مذہب کئی پہلوؤں سے قوی نظر آتا ہے :

اول تو اس بنا پر کہ سورۃ نساء کی آیت کا منطوق عدم قبولیت کیلئے ظاہر ر نص ہے - خالداً فيها ر غضب الله عليه ر لعنته کا مطلب اسکے

اُسکی ترقی کا دوسرا رخ یہ تھا کہ اسلام کی پولیٹکل طاقت کو روز افزوں  
تَنْزِل ہوا - اب فیصلہ کرلو کہ تمام کرۂ ارضی کے مسلمانوں میں سے کونسی قوم  
اور کونسی حکومت ہے جس نے ان چار صدیوں کے اندر یورپ کا مقابلہ  
کیا ہے ؟ اور دفاع و جہاد جاری رکھ کر اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کی  
ہے ؟ سولہویں صدی عیسوی ہی میں یورپ کی اُن تمام طاقتوں نے جو  
مشرقی ممالک کے دروازوں سے قریب تھیں ، بتدریج قدم بڑھانا شروع  
کردیا تھا - اگر کوئی طاقتور اور مقام رک موجود نہ ہوتی تو اسے در صدی  
پیشتر ہی تمام وسط ایشیا ، شام ، عرب ، اور اسلامی افریقہ یورپ کے استیلاء  
سے پامال ہوچکا ہوتا -

پھر وہ کونسی ناقابل تسخیر فوجی قوت تھی جس نے پہلے تو اپنے  
پے درپے حملوں سے تمام یورپ کو اس طرح پامال کر دیا کہ پوری در صدیوں  
تک سنبھلنے اور قدم اٹھانے کی مہلت ہی نہ ملی ، اور پھر تمام ایشیا و  
بلاد اسلامی کے عین دروازہ پر مغربی مدافعت کی ایک آہنی دیوار قائم  
کر دی ، اور اس طرح حکم جہاد کے فرض ہجوم اور فرض دفاع ، دونوں کو تنہا  
انجام دیا ؟

کیا ہندوستان کی سلطنت مغلیہ نے جس نے اپنی پوری تاریخ میں  
ایک بار بھی ہندوستان سے باہر قدم نہ نکالا ؟ اور جسکی تلوار پانچ صدیوں کے  
اندر ایک مرتبہ بھی کسی حریف ملت کے خون سے رنگین نہ ہوئی ؟  
عین اکبر اعظم کے زمانے میں ہندوستان کے حاجیوں کو پرتکالیوں اور  
دُشمنوں کے جرگے ساحل ہند کے سامنے لوٹ رہے تھے اور وہ اُنکے انسداد سے  
عاجز تھا !

کیا ایران کے سلاطین نے ، جنکے عقبی حملوں نے ہمیشہ سلاطین عثمانیہ کو  
مجبور کیا کہ یورپ کا فتح مندانہ اقدام ترک کر کے ایشیاء کی طرف متوجہ  
ہوجائیں اور جسکی وجہ سے یکایک یورپ کو ترکی تلواروں سے مہلت ملگئی  
اور تمام وسط یورپ فتح ہوتے ہوتے رہ گیا ؟

کیا یمن کے خود مختار قبائل اور عرب آئمہ نے ، جنکو اسلام کے اس  
سب سے بڑے حریف کا شاید حال بھی معلوم نہ تھا ؟

ہر انسان جو در اور در کو صرف چارہی کہنا چاہتا ہو ، اسکا اقرار کریگا  
کہ بجز سلاطین عثمانیہ اور ترکوں کے مسلمانوں کی کوئی حکومت اور قوم  
نہیں ہے جس نے قرون اخیرہ میں حفظ اسلام و ملت کی یہ خدمت انجام



رابعاً ، احادیث سے بھی اس مذہب کی تائید ہوتی ہے ۔  
مثلاً امام احمد و نسائی کی روایت معاریہ بطریق ادريس خولاني مرفوعاً  
”كل ذنب عسى الله أن يغفره إلا الرجل يموت كافراً“ ار الرجل يقتل مؤمناً  
متعمداً ” یعنی تمام گناہ اللہ بخشدی سکتا ہے لیکن وہ شخص جو حالت کفر  
میں مرے ، یا وہ جس نے جان بوجھ کر مومن کو قتل کر دالا ۔

باقی رہیں وہ احادیث جن میں وسعت رحمت ، و عموم عفو و بخشش ،  
و عدم جواز یاس و قنوط وغیرہ کا ذکر ہے ، تو اس مذہب کی بنا پر کہا جا  
سکتا ہے کہ وہ بھی مثل تمام عمومات قرآن کے ہیں ، جنکی تخصیص آیہ نساء  
اور اسکی مزیادات فی السنۃ نے کر دی ۔ دونوں میں کوئی تعارض نہیں ۔  
قبل از اسلام معاصی کی بخشش تو مسلم ہی ہے ۔ بحث بعد از اسلام ارتکاب  
قتل میں ہے ۔ اسی طرح اگر حدیث اسرائیلی ”الذي قتل تسعة و تسعين  
نفساً ثم اتى تمام المائۃ ثم تاب“ پیش کی جائے ، تو جواب یہ ہوگا  
کہ اس کا محل بھی توبۃ اسلام ہے ۔ نہ کہ توبۃ مسلم ، اور وہ بھی مثل عمومات  
بشارات رحمت و بخشش کے ہے ۔ مشخصات پر اسکا کوئی اثر نہیں پڑتا ۔  
غرض کہ اس مذہب کی قوت میں کوئی شبہ نہیں ، لیکن عام طور پر  
علماء نے دوسرے مذہب کو اختیار کیا ۔ یعنی قبولیت توبہ کو ۔ اور خوارج  
و معتزلہ کے غلو کی وجہ سے اہل سنت کا رجحان اسی کی طرف بڑھتا گیا ۔  
وہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کا معاملہ بڑا ہی سخت ہے لیکن توبہ قبول  
ہو سکتی ہے ۔ اللہ کے ہاتھ میں ہے ۔ چاہے بخشدے چاہے نہ بخشے ۔ اس  
میں شک نہیں کہ احتیاط حکم امید ہی میں ہے نہ کہ پیام یاس و قنوط میں ۔  
ان الله لا يغفر ان يشرك به و يغفر ما دون ذلك لمن يشاء کے حکم کا عموم  
بڑا ہی امید افزا ہے ، اور اگر اس پر نظر ڈالی جائے ، تو کچھ شک نہیں  
کہ دوسرا مذہب ہی محتاط معلوم ہوتا ہے ۔

( ۲ ) قتل مسلم کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس فعل کو حلال سمجھے ۔  
اور اس پر نادم و متاسف نہ ہو ۔ مثلاً کوئی مسلمان فوج ہو ۔ وہ یہ سمجھے  
کہ لڑائی لڑنا تو ہمارا کام ہی ہے ۔ مسلمان سامنے ہونگے تو انہی سے لڑینگے ۔  
یعنی مسلمانوں پر تلوار اٹھانا کوئی گناہ کی بات نہیں ۔ یا یوں سمجھیں کہ  
ہمارے مالکوں کا یہی حکم ہے ۔ ہم نے انکا نمک کھایا ہے ، اسلیے ہمیں ایسا  
ہی کرنا چاہیے ۔ یعنی اگر کوئی اپنا نمک کھلا کر حکم دے کہ مسلمانوں کو قتل  
کردر ، تو قتل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ تو اس صورت میں تمام امت



جو مسلمان یورپ کے مسیحی و سیاسی اثر سے مختل ہو کر ترکوں پر اعتراض کرتے ہیں، انکو چاہیے کہ پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ صدیوں سے انکی منافقانہ غفلت و اعراض کا کیا حال رہا ہے؟ علی الخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کو جو تعداد میں ہر جگہ کے مسلمانوں سے زیادہ ہیں، غور کرنا چاہیے کہ جس ارادین فرض دینی کیلئے ترک چار سو برس سے اپنا خون بہا رہے ہیں، انہوں نے اس کے لیے کیا کیا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ کبھی کبھار چند لاکھ سکے ترک زخمیوں کی مرہم پٹی کیلئے بھیج دیے جو ایک ترک بیوہ کی مصیبت اور ایک ترک یتیم کے آنسوؤں کی قیمت بھی نہیں ہوسکتے؟ کیا ایسے لوگوں کو جو رات بستر پر اردن آرام و بے فکری کی چھتوں کے نیچے بسر کرتے ہوں، یہ حق پہنچتا ہے کہ ان لوگوں پر زبان طعن کھولیں جو چار سو برس سے اپنی لاشیں خاک و خون میں تڑپا رہے ہیں؟

بہر حال منصب خلافت کا پہلا مقصد دفاع و جہاد ہے۔ وہ پچھلی چار صدیوں میں بجز ترکوں کے آرر کسی اسلامی حکومت نے انجام نہیں دیا۔ پس اگر آرر دلائل و شواہد نہ ہوتے، جب بھی صرف یہی ایک بات سلاطین عثمانیہ کی خلافت و امامت کیلئے کفایت کرتی تھی۔

اور پھر یہ بھی واضح رہے کہ یہ تمام مباحث اس سوال سے تعلق رکھتا تھا کہ گذشتہ صدیوں میں متعدد اسلامی حکومتوں کے رہتے ہوئے سلاطین عثمانیہ ہی کیوں خلافت عظمیٰ کے حقدار تسلیم کیے گئے؟ لیکن موجودہ زمانے میں جبکہ تمام اسلامی حکومتیں مت چکی ہیں، مسلمانان عالم کیلئے بجز سلطان عثمانی کے کسی دوسری خلافت کا وجود ہی نہیں۔

[ بقیہ نرت صفحہ ۹۰ ]

نجات کرتے، ایک سال جہاد میں شرکت فرماتے۔ حضرت فضیل اُس عہد کے مشہور عباد و زہاد میں سے ہیں۔ حاصل ان اشعار کا یہ ہے ”اے حرمین کے گوشہ نشین عابد! اگر تو نے ہمارا حال دیکھا ہوتا تو معلوم کر لیتا کہ جس زہد و عبادت میں مشغول رہتا ہے وہ تو ایک طرح کا کھیل ہے۔ جو شخص اپنے رخسار آنسوؤں سے (عبادت میں) تر کرتا ہے، اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری عبادت وہ ہے جس میں رخسار آنسوؤں سے نہیں بلکہ گردنیں خون سے رنگین ہوا کرتی ہیں“! حضرت فضیل نے جب یہ اشعار پڑھے تو انکی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور فرمایا ”صدق ابو عبد الرحمن“ عبد اللہ بن مبارک نے سچ کہا!

حمل سلاح علی المسلم کے معاملہ سے کیا تعلق ؟ اور اگر اسکا ذکر کسی دوسری آیت میں آیا ہے تو کیوں نسخ و منسوخ ہونے کی ضرورت پیش آئے ؟ دونوں صورتیں بالکل مختلف ہیں ۔

لیکن سورۃ نساء میں قتل نفس کی ایک خاص حالت کا ذکر ہے ۔ یعنی اگر ایک مسلمان باوجود مسلمان ہونے کے مسلمانوں کو قتل کر دالے تو اسکا کیا حکم ؟ فرمایا جزاء جہنم خالداً فیہا چنانچہ اس آیت سے پہلے ہے ۔ وما کان لمومن ان یقتل مومناً الا خطا ۔ الخ پس زیادہ سے زیادہ دونوں آیتوں میں عام و خاص کا تعلق ہے ۔ یعنی اس آیت نے آیت فرقان کی تخصیص کر دی ۔ اسی لیے حضرت ابن عباس نے کہا ” نسختها آية مدنیة فی النساء “ کیونکہ سلف کی اصطلاح میں ” نسخ “ کا اطلاق ہر طرح کی تخصیص و تقیید پر ہوتا تھا ۔ وہ معنی نہ تھے جو بعد کو اصولیوں نے قرار دیے ۔ اور اسی اختلاف حالت و حکم کو واضح کرنے کیلئے انہوں نے کہا ” فہذہ لاولئک “ یعنی آیت فرقان میں حکم کفار کیلئے ہے ۔ اور امام بخاری کی روایت ابن جبیر بطریق شعبہ مندرجہ کتاب التفسیر میں کہا ” کانت ہذہ فی الجاہلیۃ “ یہ حکم مشرکین جاہلیۃ کیلئے تھا ۔ نہ کہ مسلمانوں کیلئے ۔

اور یہ جو انہوں نے کہا کہ والذین لا یدعون مع اللہ الہا اخر ولا یقتلون النفس الخ کے نزول پر مشرکین مایوس ہو گئے تھے ، اسلیئے ۔ ” الا من تاب “ اترے ، تو اسکی تائید مفسرین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ” نزلت فی قوم ییسوا من التوبۃ “ یعنی اُن لوگوں کے حق میں اُتری جو زمانۂ کفر کی بد عملیوں کی بخشش سے مایوس ہو گئے تھے ۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ آیت اور سورۃ نساء کی ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء اور سورۃ زمر کی آیۃ رحمت : یا عبادي الذین اسرفوا علی انفسہم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ الخ وحشی قاتل حمزہ کے بارے میں اُتریں ۔ وہ کہتا تھا کہ شرک میں ساری عمر کٹی ، پیغمبر کے چچا کو قتل کیا ، فواحش میں ہمیشہ مبتلا رہا ۔ انہی تین برائیوں سے اجتناب کا خاص طور پر آیت فرقان میں ذکر ہے ۔ اب اگر میں مسلمان بھی ہو گیا تو کیا فائدہ ؟ مجمع تو نجات مل ہی نہیں سکتی ۔ اسپر ” الا من تاب و امن “ اترے ، اور پھر مزید بشارت امید کیلئے سورۃ نساء اور سورۃ زمر کی آیات نازل ہوئیں ۔ تعجب ہے کہ بعض شارحین حدیث کو مذهب ابن عباس کی شرح و تطبیق میں مشکلات کیوں پیش آئیں ؟ انکا بیان تو بالکل صاف اور واضح ہے ۔

رجہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا فرض ہوا کہ ترکوں کی مدد کریں۔ لیکن ترکوں کیلئے یہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ ہندوستان یا افریقہ میں بانٹنے کیلئے روپیہ بھیجتے رہیں۔ وہ تو چار صدیوں سے وہ کام انجام دے رہے ہیں جسکے تصور سے بھی ہم مسلمانان ہند کے دل کانپتے اور جسکے وہم سے ہی ہم پر موت طاری ہو جاتی ہے؟ یعنی اپنی جانیں اسلام کی حفاظت کی راہ میں قربان کر رہے ہیں۔ اس سے بڑھکر اور کونسا کام ہے جو اسلام اور مسلمانوں کیلئے کیا جا سکتا ہے؟ اور اسکے بعد کیا رہ گیا جسکی طلب اور سوال ہو؟ بہت ممکن ہے کہ کسی دوسرے حصے کے مسلمانوں نے ترکوں سے زیادہ نمازیں پڑھی ہوں، لیکن نماز کے بقا کی راہ میں ان سے زیادہ اپنا خون کسی کے نہیں بہایا۔ بہت ممکن ہے کہ عرب اور ہندوستان کے مسلمانوں کی زبانوں نے ان سے زیادہ قرآن کی تلاوت کی ہو، لیکن قرآن کی حفاظت کی راہ میں چار سو برس سے زخم صرف انہی کے سینے کھا رہے ہیں۔ اگر اللہ کی شریعت حق ہے، اور اگر قرآن و سنت کا فیصلہ باطل نہیں، تو ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ دوسرے ملکوں کے ہزاروں عابد و زاہد مسلمانوں سے جنکے دلوں میں کبھی جہاد فی سبیل اللہ کا خطرہ بھی نہیں گذرتا، ترکوں کا ایک گناہگار و معصیت آلود فرد اللہ کے آگے کہیں زیادہ فضیلت و محبوبیت رکھتا ہے۔ ہماری مدۃ العمر کی عبادتیں بھی انکے سینے کے ایک خونچکاں زخم اور اس سے بہنے والے ایک قطرہ خون کی عظمت نہیں پاسکتیں۔ ”حرس لیلة فی سبیل اللہ افضل من الف لیلة یقام لیلہا و یصام نہارہا“ (۱) یعنی آنحضرت نے فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ کی ایک رات ہزار دنوں کے روزوں اور ہزار راتوں کی عبادت سے بھی افضل ہے! ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانہم نبیان مرصوص۔ حضرت عبد اللہ بن مبارک نے حضرت فضیل بن عیاض کو ایک مرتبہ یہ اشعار لکھکر بھیجے تھے:

یا عابد العزمین لو ابصرتنا \* تعلمت انک فی العبادۃ تلعب!  
من کان یخضب خدہ بدموعہ \* فذکورنا بدمائنا تتخضب!  
ریح العبیر لکم، ونحن عبیرنا \* ریح السناک والغبار الاطیب (۲)

(۱) اخرجہ الامام احمد عن مصعب بن زبیر۔

(۲) حافظ ابن عساکر نے امام موصوف کے ترجمہ میں یہ اشعار نقل

کیے ہیں۔ امام موصوف ایک سال درس حدیث دیتے، ایک سال

معارفہ کی حکومت کے خلاف کیوں خرچ کیا ؟ اور کیوں انکو ہر سر حق اور شہید ظالم و جور تسلیم کیا جاتا ہے ؟

پس گو بحث کے اس حصے کا طول بقیہ مطالب کی تشریح میں منغل ہو گا ، لیکن چونکہ اس معاملہ میں عام طور پر ایک سخت غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے ، اسلیئے صاف کر دینا ضروری ہے ۔ یہ بالکل غلط ہے کہ حضرت امام حسین اُس حالت میں لڑے ، جبکہ وہ یزید کی حکومت کے مقابلے میں خود مدعی امامت اور طالب خلافت تھے ۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں ، انہوں نے واقعہ کربلا کا وقت نظر کے ساتھ مطالعہ نہیں کیا ۔ حالات میں اچانک ایسی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ اس غلط فہمی کا پیدا ہوجانا عجیب نہیں ۔ حضرت امام جب مدینہ سے چلے ، تو انکی حیثیت دوسری تھی ۔ جب کربلا میں حق پرستانہ لڑکر شہید ہوئے ، تو انکی حیثیت دوسری تھی ۔ دونوں حالتیں مختلف ہیں ۔ اس لیے دونوں کا حکم بھی شرعاً مختلف ۔

جب وہ مدینہ سے چلے ہیں تو حالت یہ تھی کہ نہ تو ابھی یزید کی حکومت قائم ہوئی تھی ، نہ اہم مقامات و مراکز نے اسکو خلیفہ تسلیم کیا تھا ، نہ اہل حل و عقد کا اسپر اجماع ہوا تھا ۔ ابتدا سے معاملہ خلافت میں سب سے پہلی آواز اہل مدینہ کی رہی ہے ، پھر حضرت علی کے زمانے میں مدینہ کی جگہ کوفہ دارالخلافہ بنا ۔ اہل مدینہ اسوقت تک متفق نہیں ہوئے تھے ۔ کوفہ کا یہ حال تھا کہ تمام آبادی یکقلم مخالف تھی اور حضرت امام حسین سے بیعت کرنے کیلئے پیہم اصرار و الحاح کر رہی تھی ۔ انہوں نے خود خلافت کی حرص نہ کی ، بلکہ ایک ایسے زمانے میں جب تخت حکومت سابق حکمران سے خالی ہوچکا تھا اور نئے حکمران کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی ، ایک بہت بڑی مرکزی و موثر آبادی ( یعنی کوفہ و عراق ) کے طلب و سوال کو منظور کر لیا ۔ البتہ اس منظوری میں یہ مصلحت ضرور پیش نظر تھی کہ یزید جیسے نا اہل کی حکومت سے امت کو بچایا جائے ۔

اگر کہا جائے کہ امیر معارفہ نے اپنی زندگی میں یزید کو ولی عہد مقرر کر دیا ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شرعاً اولاد کی ولی عہدی کوئی شے نہیں ہے ۔ اصلی شرط خلافت کی انعقاد حکومت ہے ۔ یزید کو گورلی عہد

بعض مفسرین نے سورہ بقرہ کی حسب ذیل آیت کو اذن قتال کا پہلا حکم قرار دیا ہے :

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ  
الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا -  
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ -  
وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ  
وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ  
أَخْرَجُوكُمْ - وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ  
الْقَتْلِ - ( ۲ : ۱۸۷ )  
اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو  
مسلمانوں سے لڑائی لڑ رہے ہیں - مگر  
زیادتی نہ کرو - اللہ حد سے گزر جانے والوں کو  
پسند نہیں کرتا - اور ایسا کرو کہ جہاں کہیں  
بھی رہے جمع ہوئے ملیں ، قتل کردہ - اور  
جہاں کہیں سے انہوں نے مسلمانوں کو  
نکالا ہے ، تم بھی نکال باہر کرو - ایسا کرنا اگرچہ  
خونریزی ہے ، مگر خونریزی کی برائی سے بھی بڑھکر برائی ظلم و فساد کا  
فتنہ ہے -

امام ابن جریر نے ابو العالیہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنگ کی نسبت  
یہی پہلی آیت ہے جو نازل ہوئی ” اُنہا اول آية نزلت في القتال بالمدينة  
فلما نزلت كان رسول الله صلعم يقاتل من قاتله ويكف عمن كف عنه “  
حتیٰ نزلت سورۃ برآۃ ” پس اذن قتال کی پہلی آیت یا سورہ حج کی ہے  
با بقرہ کی -

ان دونوں آیتوں اور انکے ہم مطلب آیات میں قرآن حکیم نے حکم قتال کے  
اُس حصہ کو صاف صاف مسلمانوں پر فرض کر دیا ہے جسکا مقصد دفاع  
( دیفنس ) ہے ( ۱ ) - یعنی جب کبھی غیر مسلموں کی کوئی جماعت  
مسلمانوں کی کسی حکومت اور آبادی پر حملہ کرے ، یا اُس پر  
خود قابض ہرجانا چاہے ، تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائیوں کی  
مدد کیلئے اُٹھ کھڑے ہوں - جس طرح حملہ آوروں نے حملہ کیا ہے ، یہ

[ بقیہ نوٹ صفحہ ۹۲ ]

لیہلکن “ فانزل الله اذن للذين يقاتلون الخ و هي اول آية نزلت في القتال -  
اسنادہ علی شرط الصحیحین -

( ۱ ) یعنی حکم جہاد کی مختلف قسموں اور صورتوں میں سے ایک  
قسم قتال ہے - پھر قتال کی بھی دو قسمیں ہیں - دفاع اور ہجوم - ان  
آیات میں دفاع کا حکم ہے - ہجوم کا حکم دوسری آیتوں میں ہے - اور  
اسکے مواقع و بواعث اور شرائط دوسرے ہیں -



کا اجماعی فیصلہ یہ ہے کہ وہ شخص قطعاً کافر ہے - یعنی اُس کفر کا مرتکب ہوا ہے جو ملت سے خارج کر دیتا ہے - اسکا حکم شرعاً وہی ہوگا جو تمام کفار و مشرکین کا ہے - دنیا میں بھی اور عاقبت میں بھی - کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اس کو مسلمان سمجھے اور اس سلوک کا حقدار کہے جو مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ کرنا چاہیے - یہ حکم خاص اس مسئلہ ہی پر موقوف نہیں ہے - ہر محلل حرام غیر مائل کے لیے یہی حکم ہے -

( ۳ ) تیسری صورت قتل مسلم کی یہ ہے کہ کوئی مسلمان کافروں کے ساتھ ہو کر انکی فتح و نصرت کیلئے مسلمانوں سے لڑے ، یا لڑائی میں انکی اعانت کرے - اور جب مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جنگ ہو رہی ہو ، تو وہ غیر مسلموں کا ساتھ دے - یہ صورت اس جرم کے کفر و عدوان کی انتہائی صورت ہے ، اور ایمان کی موت اور اسلام کے نابود ہوجانے کی ایک ایسی اشد حالت ، جس سے زیادہ کفر و کفری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا - دنیا کے وہ سارے گناہ ، ساری معصیتیں ، ساری ناپاکیاں ، ہر طرح اور ہر قسم کی نافرمانیاں ، جو ایک مسلمان جسم دنیا میں کر سکتا ہے ، یا انکا وقوع دھیان میں آسکتا ہے ، سب اسکے آگے ہیچ ہیں - جو مسلمان اسکا مرتکب ہو ، وہ قطعاً کافر ہے ، اور بدترین قسم کا کافر - اسکی حالت کو قتل مسلم کی پہلی صورت پر قیاس کرنا درست نہ ہوگا - اس نے صرف قتل مسلم ہی کا ارتکاب نہیں کیا ہے ، بلکہ اسلام کے برخلاف دشمنان حق کی اعانت و نصرت کی ہے - اور یہ بالاتفاق و بالاجماع کفر صریح و قطعی مخرج عن الملة ہے - جب شریعت ایسی حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ کسی طرح کا علاقتہ محبت رکھنا بھی جائز نہیں رکھتی ، تو پھر صریح اعانت فی الحرب اور حمل سلاح علی المسلم کے بعد کیونکر ایمان و اسلام باقی رہ سکتا ہے ؟

## فصل

( راقعہ امام حسین علیہ السلام )

بعض لوگوں کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر سلطان اسلام کو خلیفہ مان لینا چاہیے گو نا اہل ہو ، تو پھر حضرة امام حسین علیہ السلام نے یزید بن

## ( فَرِیضَةُ عَظِیْمَةُ دِفَاعِ )

نتائج بحث تک پہنچنے میں اب صرف ایک منزل آرر باقی رہ گئی ہے ۔  
 اُمید ہے کہ آپ صبر و سکون کے ساتھ میرا ساتھ دینگے ۔ اسلام کے شرعی  
 واجبات و فرائض میں ایک نہایت اہم اور اکثر حالتوں میں  
 ایمان و کفر تک کا فیصلہ کر دینے والا فرض ”دفاع“ ہے ۔ تشریح اسکی  
 یہ ہے کہ جب کبھی کسی مسلمان حکومت یا کسی مسلمان آبادی پر کوئی  
 غیر مسلم گروہ یا حکومت حملہ کرے ، تو یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے  
 مسلمانوں پر شرعاً فرض ہو جاتا ہے کہ دفاع ( دِیفنس - Defence )  
 کیلئے اُٹھ کھڑے ہوں ، اس حکومت اور آبادی کو غیر مسلم قبضہ سے لڑ کر  
 بچائیں ۔ اگر فوری قبضہ ہو گیا ہے تو اس سے نجات دلائیں ، اور اس کام  
 کیلئے اپنی ساری قوتیں اور ہر طرح کی ممکن کوششیں وقف کر دیں ۔  
 اس بارے میں قرآن و حدیث کے احکام اس کثرت سے موجود ہیں ، اور  
 اسلامی فرائض میں سے یہ اسدرجہ مشہور فرض ہے کہ شاید ہی دنیا میں  
 کوئی مسلمان اس سے نا واقف نکلے ۔ یہی باہمی مددگاری و یارپی اور دفاع  
 اعداء کا قانون ہے جس پر اسلام نے شریعت و امت کی حفاظت کی ساری  
 بنیادیں استوار کی ہیں ۔ لڑائی لڑنے کی نسبت سب سے پہلی آیت جو  
 نازل ہوئی ، وہ سورہ حج میں ہے :

ان الله يدافع عن الذين آمنوا ، ان الله لا يحب كل  
 خوان كفور - اذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا ، و ان  
 الله على نصرهم لقدير  
 الذين اخرجوا من ديارهم  
 بغير حق الا ان يقولوا ربنا  
 الله - ( ۲۲ : ۴۲ )  
 ان الله تعالى مومنون پر سے اُنکے دشمنوں کو ہٹاتا  
 رہتا ہے ۔ وہ اُن لوگوں کا ساتھی نہیں جو اُسکی  
 بخشی ہوئی طاقت کے امانت دار نہیں ہیں ،  
 اور شکرگزاری کی جگہ کفران نعمت میں سرشار  
 ہیں ۔ جن مسلمانوں سے کافر لڑ رہے ہیں ،  
 اب اُن مسلمانوں کو بھی کافروں سے لڑنے کی  
 اجازت دی جاتی ہے کیونکہ اُنپر ظلم ہو رہا ہے  
 اور اللہ مظلوموں کی مدد کرنے پر قادر ہے ۔  
 یہ وہ لوگ ہیں کہ بلا کسی حق کے اپنی آبادیوں سے نکال دیے گئے ۔ انکا کوئی  
 قصور نہ تھا ۔ صرف یہ کہ اپنے پروردگار کے ماننے والے ہیں ۔ ( ۱ )

( ۱ ) رومی الحاکم من حدیث الاعمش عن ابن عباس - قال : لما خرج  
 رسول الله صلعم من مكة قال ابوبکر ” اخرجوا نبیہم - انا لله و انا الیہ راجعون -

# فصل

( شرط قرشیة )

مندرجہ بالا فصول سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انتخاب خلیفہ و امام کیلئے متعدد شرطیں ہیں - ازاجملہ ایک عرصہ تک علماء کی رائے رہی کہ خلیفہ کو خاندان قریش میں سے ہونا چاہیے - لیکن اگر امت کے لیے انتخاب کا موقعہ باقی نہ رہا ہو تو خلیفہ تسلیم کر لینے کیلئے بجز اسلام اور انعقاد حکومت ( یعنی حکومت کے جماؤ اور جگہ پکڑ لینے ) کے اور کوئی شرط نہیں ہے - خلفاء راشدین کے بعد جامع الشروط سلسلہ خلافت کوئی بھی قائم نہ ہوا - بنو امیہ و عباسیہ میں اگر ایک شرط قرشیہ کی پائی جاتی تھی تو اور بہت سی اہم شرطیں مفقود تھیں - بنیادی شرط یہ ہے کہ حکومت تلوار کے زور سے نہ منوائی جائے بلکہ امت کے انتخاب و اجماع سے ہو، سو یہ شرط کسی کی خلافت میں بھی نہ تھی - پھر خلیفہ کو عادل و منصف ہونا چاہیے - حکومت نظام شوری کے ساتھ کرنی چاہیے - سنت رسول اور سنت خلفاء راشدین پر عامل ہونا چاہیے - بجز عمر بن عبدالعزیز ( رح ) کے کوئی بھی ان سب کا جامع نہ تھا - عباسیہ کے بعد حکومت عجمیوں کے ہاتھ آئی - پھر مصر کے عباسی خلفاء کے بعد ترکوں کا خاندان عثمانیہ خلافت پر قابض ہوا - آخری مصری خلیفہ نے خود سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت کی - یہ خلافت بلا نزاع آج تک قائم اور تمام عالم اسلامی کیلئے شرع و امت کا مرکزی اقتدار ہے - اگر بنو امیہ و عباسیہ میں پانچ شرطیں نہیں پائی جاتی تھیں تو ان میں سات نہ سہی - یعنی یہ عرب بھی نہیں اور قرشی بھی نہیں - لیکن چونکہ سوال خلیفہ کے انتخاب کا نہیں ہے بلکہ ایک قائم و نافذ خلافت کے ماننے کا، اسلئے شرائط کی بحث کا یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا -

منجملہ شروط خلافت کے ایک متفق علیہ شرط حریت کی ہے - یعنی خلیفہ آزاد ہو - غلام نہ ہو - مصلحت و ضرورت بھی اسکی ظاہر ہے، مگر معلوم ہے کہ تمام دنیا کی تاریخ میں صرف مسلمانوں ہی کی تاریخ اسکی

لہذا حکم دیا کہ جب تک دنیا جنگ اور براءت جنگ سے باز نہ آجائے، جنگ کرتے رہو۔ کبھی اس سے نہ تھکو۔ یہاں تک کہ دنیا میں جنگ کا نام و نشان ہی باقی نہ رہے ”تضع الحرب ارزارها“ جنگ اپنے ہتیار ڈال دے۔ یعنی جنگ بالکل موقوف ہو جائے۔ فساد و بطلان کی رہ قوتیں ہی باقی نہ رہیں جو خدا کی زمین کو ہمیشہ انسانی خون سے رنگتی رہتی ہیں۔ قرآن کا دعوا ہے کہ عالمگیر امن کا یہ وقت دنیا پر ضرور آئیگا۔ مگر اسی وقت آئیگا جب تمام دنیا اسلام کی دعوت امن و اخوت کے آگے جھک جائیگی : هو الذي ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليعظه على الدين كله و لو كره المشركون ( ۹ : ۶۱ )

اسلامی احکام میں یہ حکم ”دفاع“ جو اہمیت رکھتا ہے، وہ عقائد ضروریہ کے بعد کسی حکم، کسی فرض، کسی رکن، کسی عبادت کو حاصل نہیں۔ قرآن و حدیث میں بار بار یہ بات بتلائی گئی ہے کہ قومی زندگی اسی عمل کے بقاء پر موقوف ہے۔ جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ باقی رہیگا اور اس کام کی راہ میں ہر فرد اپنی زندگی اور اپنا مال قربان کر دینے کیلئے طیار رہیگا، اس وقت تک دنیا کی کوئی قوم اُنپر غالب نہ آسکیگی۔ جس دن یہ جذبہ مردہ ہو جایگا، اُسی دن سے مسلمانوں کی قومی موت شروع ہو جائیگی۔ چنانچہ قرآن نے مثال میں یہودیوں کی تاریخ پیش کی ہے۔ جب تک یہودیوں میں اعتقاداً و عملاً یہ جذبہ باقی رہا، حکومت و عزت اُنہی کیلئے تھی۔ جب چند گھڑیوں کے عیش و راحت کا عشق قومی زندگی و عزت کے دائمی عیش کی طلب پر غالب آگیا، اور اس چیز کو چھوڑ بیٹھے، ذلت و محکومیت کا داغ ہر یہودی کی پیشانی پر لگ گیا، اور ہمیشہ کیلئے خوار و ذلیل ہو کر رہ گئے : ضربت عليهم الذلة والمسكنه و باؤا بغضب من الله !

کیا بنی اسرائیل کا حال نہیں دیکھتے کہ موسیٰ کے بعد کیا ہوا؟ پہلے تو خود ہی اپنے عہد کے نبی سے درخواست کی ”کسی کو ہم پر پادشاہ بنادو کہ اُسکے ماتحت اللہ کی راہ میں لڑیں“ انہوں نے کہا ”اگرچہ تم ایسا کہتے ہو لیکن امید نہیں کہ وقت پر پورے آؤ۔ اگر تم کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو

الم تر الى الملاء من بني اسرائيل من بعد موسى ؟  
ان قالوا لنبي لهم ”ابعث لنا ملكا نقاتل في سبيل الله“ قال ”هل عسيتم ان كتب عليكم القتال الا تقاتلوا“ قالوا ”وما لنا



مقرر کر دیا ہو، لیکن جب تک اسکی خلافت بالفعل قائم نہ ہو جاتی صرف یہ بات کوئی حجتہ نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب یزید کی رلی ۴۰-۴۱ء کے لیے حضرت عبد اللہ بن عمر سے بیعت طلب کی گئی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا ” لا أبایع لامیرین “ میں دو امیروں سے بہ یک وقت بیعت نہ کررنگا۔ یعنی خلیفہ کا اپنی زندگی میں رلی ۴۰-۴۱ء کے لیے بیعت لینا ایک وقت میں دو امیروں کی بیعت ہے جسکی شرعاً کوئی اصل نہیں۔ ( رواہ ابن حبان و نقلہ فی الفتح )

لیکن جب وہ کوفہ پہنچے، تو یکایک نظر آیا کہ حالت بالکل بدل چکی ہے۔ تمام اہل کوفہ ابن زیاد کے ہاتھ پر یزید کیلئے بیعت کر چکے ہیں، اور سرزمین عراق کی وہ بے وفائی و غداری جو حضرت امیر کے عہد میں بارہا ظاہر ہو چکی تھی، بدستور کام کر رہی ہے۔ یہ حال دیکھ کر وہ معاملۂ خلافت سے دست بردار ہو گئے، اور فیصلہ کر لیا کہ مدینہ واپس چلے جائیں۔ لیکن ابن سعد کی فوج نے ظالمانہ محاصرہ کر لیا اور مع اہل و عیال کے قید کرنا چاہا۔ وہ اس پر بھی آمادہ ہو گئے تھے کہ مدینہ کی جگہ دمشق چلے جائیں اور براہ راست یزید سے اپنے معاملے کا فیصلہ کرائیں، مگر ظالموں نے یہ بھی منظور نہ کیا۔

اب امام کے سامنے صرف دو راہیں تھیں۔ یا اپنے تئیں مع اہل و عیال قید کرادیں۔ یا مردانہ وار لڑکر شہید ہوں۔ شریعت نے کسی مسلمان کو مجبور نہیں کیا ہے کہ ناحق ظالموں کے ہاتھ اپنے تئیں قید کرادے۔ پس انہوں نے دوسری راہ کمال عزیمت و دعوت کی اختیار کی، اور خود فرورشانہ لڑکر حالت مظلومی و مجبوری میں شہید ہوئے۔

پس جس وقت کربلا میں میدان کارزار گرم ہوا ہے، اسوقت حضرت امام حسین مدعی خلافت و امامت نہ تھے۔ نہ اس حیثیت سے لڑ رہے تھے۔ انکی حیثیت محض ایک مقدس اور پاک مظلوم کی تھی جسکو ظالموں کی فوج ناحق گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے آپکو زندہ گرفتار کرادینا پسند نہیں کرتا، اور چاہتا ہے کہ طاقتور ظلم کے مقابلے میں بے سر و سامان حق کی استقامت کا ایک یادگار منظر دنیا کو دکھلا دے۔ تعجب ہے کہ یہ غلط فہمی صدیوں سے پھیلی ہوئی ہے۔ جسکو مفصل اور محققانہ بحث دیکھنی ہو، وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی منهاج السنہ جلد ۲ - کا مطالعہ کرے۔



بھی کریں - قتل و جنگ کی رہ جو جو چال چلے ہیں ' یہ بھی چلیں -  
 البتہ یہ جائز نہیں کہ اس بارے میں رحم و عدل کے جو حدود شریعت نے  
 باندھ دیے ہیں ( مثلاً ضعیفوں ' بوڑھوں ' نہتوں ' عورتوں ' راہبوں ' مذہبی  
 عبادتگاہوں وغیرہ سے تعرض نہ کرنا ) اُنسے قدم باہر نکالیں - پھر اس حکم کی  
 علت بھی بتلا دی کہ الفتنۃ اشد من القتل - بلاشبہ یہ جنگ قتل ہے اور  
 انسانی قتل بہت بُری برائی ہے ' لیکن اس برائی سے بھی بڑھ کر برائی یہ  
 ہے کہ لوگ اپنی آبادیوں اور حکومت پر قانع نہیں رہتے - دُرسروں کے حقوق  
 آزادی و حکومت چھیننا چاہتے ہیں - توحید کی جگہ کفر و شرک کے ماتحت  
 مسلمانوں کو لانا چاہتے ہیں ' قوموں کا قدرتی حق حریت پامال کر رہے  
 ہیں - اگر اسکے دفع کا انتظام نہ کیا جائے ' تو پھر دنیا میں کوئی قوم زندہ  
 و باقی نہیں رہ سکتی - پس بُری برائی کے دور کرنے کیلئے چھوٹی برائی  
 اختیار کر لینا چاہیے - یہ خود نیچر کا عالمگیر قانون اور کارخانہ حیات کا  
 دائمی عمل ہے - اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کبھی جنگ کا حکم نہ دیتا -

سورۃ محمد ( ص ) میں قرآن نے حکم قتال اور جواز جنگ کی اصلی  
 علت بھی بتلا دی ہے :

حتیٰ تضع الحرب لرتے رہو ' یہاں تک کہ لڑائی موقوف  
 اور اڑھا - ( ۴۷ : ۶ ) ہو جائے -

یعنی اسلام کا اصلی مقصد یہ ہے کہ دنیا میں عالمگیر صلح و امن قائم  
 ہو جائے - ساری دنیا ایک قوم ' اور تمام نوع انسانی ایک گھرانے کی طرح  
 زندگی بسر کریں - لیکن جب تک جنگ کرے والی ظالم و حریص قوتیں  
 باقی ہیں ' یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا - پس پہلے مفسد و جابر قوتوں کا  
 مقابلہ کرنا اور اُنکو فنا کر دینا ضروری ہوا - مضبوط اور مستقل امن اُسی  
 رقت قائم ہوگا ' جب پہلے امن کی خاطر اچھی طرح جنگ کر لی جائے :  
 حتیٰ اذا اٹخنتہم - وہم یہاں تک لڑو کہ جنگ آزما دشمن چور چور  
 ہو جائیں - ( ۴۷ : ۵ )

قاتلوں کا جب تک خون نہ بہایا جائیگا ' مقتولوں کا خون بہنا بند  
 نہ ہوگا :

ولکم فی القصاص حیاۃ یا تمہارے لیے قصاص کی موت میں  
 ارلی الالباب - ( ۲ : ۱۷۹ ) امن کی زندگی پوشیدہ ہے !

# باب

”الا ائمة من قریش“

## فصل

( تحقیق امارۃ قریش و شرط قرشیۃ )

جہان تک قرآن و سنت، آثار صحابہ، اور تمام دلائل شرعیہ و عقلیہ کا تعلق ہے، کوئی نص قطعی موجود نہیں، جس سے ثابت ہو کہ اسلام نے معاملۂ خلافت و امامت صرف خاندان قریش کیلئے شرعاً مخصوص کر دیا ہے۔ احادیث اس بارے میں جس قدر موجود ہیں، سب صحیح ہیں۔ یہ بھی مرئی ہے کہ حضرت ابوبکر نے مجمع صحابہ میں اسکو پیش کیا اور کسی نے انکار نہ کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ صحابہ میں ہمیشہ اس بات کی شہرت رہی۔ اور یہ بھی غلط نہیں کہ جب تک خاندان عباسیہ باقی رہا، لوگ اسکو بطور ایک شرط کے سمجھتے رہے۔ با ایں ہمہ ان ساری باتوں کی حقیقت رہ نہیں ہے جو اب سمجھی جاتی ہے۔ ان ساری باتوں کے سچ ہونے کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اسلام نے خلافت کو نہ کسی قوم میں مخصوص کیا ہے، نہ کسی خاندان میں۔ اسلام جو اس طرح کی تمام قومی و نسلی امتیازات مٹانے، اور ہمیشہ کیلئے صرف انسانیت کی بے قید و عام عظمت کو قائم کر دینے، اور ”عمل“ کے قانون الہی کے آخری اعلان کیلئے آیا تھا، اس کے نام سے ساری باتیں مان لی جا سکتی ہیں، لیکن اسکا وہم و گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ آسنے خاندان و نسل کا کوئی امتیاز تسلیم کیا ہو۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ امتیاز نسب کے جس بت کو خود اس نے توڑا ہو، اسی کے ٹکروں کو پھر جوڑ کر از سر نو ایک نیا بت خانہ قائم کر جائے؟

تفصیل و دلائل کی ضرورت نہیں۔ یہ بات ہر اُس شخص پر جو اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، روشن ہے کہ ہر طرح کی نسلی و خاندانی

محبوب ہو اور کرنے والے کو اسکی دائمی محبوبیت سے سرفراز کر دے - ہزاروں نمازیں اور ہزاروں روزے بھی اُس ایک قطرۂ خزن کی فضیلت و تقدیس نہیں پاسکتے جو اس راہ میں بہایا گیا ، اور عمر بھر کی صدقات و خیرات بھی اُس ایک درہم کے اجر کا مقابلہ نہیں کرسکتیں جو اس راہ میں خرچ کیا گیا - حتیٰ کہ یہی عمل اسلام و ایمان کی اصلی پہچان قرار پایا - جس مسلمان کا دل اس کے ولولہ و طلب سے خالی ہوا ، وہ ایمان و اسلام کی روشنی سے محروم ہو گیا - نفاق کی ظلمت اُسپر چھا گئی - صحیح مسلم میں ہے :

من مات ولم يغز ولم يحدث نفسه به ، مات علي شعبۃ من النفاق  
جو مسلمان اس حالت میں دنیا سے گیا کہ نہ تو کبھی اللہ کی راہ میں لڑائی لڑی ، اور نہ اُس کے دل میں اس بات کی طلب رہی ، تو اُسکی موت ایسی حالت میں ہوئی جو نفاق کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے -  
( عن ابی ہریرہ )

قرطبی نے اسکی شرح میں کہا ” فیہ دلیل علی وجوب العزم “ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جہاد کا عزم اور ارادہ ہر مسلمان پر واجب ہے - اس کے عزم اور طلب سے بھی اگر دل خالی ہو گیا تو وہ مومن نہیں ہے ، منافق ہے -

ترمذی میں ہے - ایک مرتبہ صحابہ کی ایک جماعت میں اس بات کا چرچا ہوا ” اے اعمال احب الی اللہ “ ؟ ساری نیکیوں اور عبادتوں میں سب سے زیادہ کونسا عمل اللہ کے نزدیک محبوب و مقبول ہے ؟ اسپر سورۂ صف نازل ہوئی ( ۱ )

ان الله يحب الذين يقاتلون في سبيله صفا كانهم بنيان مرصوص  
اللہ تعالیٰ تو اُن لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اُسکی راہ میں صف باندھ کر اس استقامت اور جماؤ سے لڑتے ہیں ، گویا ایک دیوار ہے جو تلواروں کے سامنے کھڑی کر دی گئی ہے ، اور دیوار بھی کیسی ؟ ایسی جسکی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سیسہ ڈال کر جوڑ دی گئی ہو !

( ۱ ) و اخرجہ ایضا امام احمد عن عبد الله بن سلام ، و ابن ابی حاتم و ابن حبان ، و الحاکم و قال صحیح علی شرط الصحیحین ، و البیہقی فی شعب الایمان و السنن ، و الطبري فی التفسیر -

نظیر پیش کر سکتی ہے کہ غلاموں نے امامت کی ہے، پادشاہت کی ہے، اور تمام سادات و قریش اور شرفاء عرب و عجم نے انکے آگے اطاعت کا سر جھکایا ہے۔ خود حدیث میں وارد ہے ”اسمعوا و اطیعوا“ ان استعمال علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیدہ“ اور روایت ابو ذر عند مسلم کہ ”ان کان عبداً مجرد الاطراف“ اور روایت ابن حصین کہ ”ولو استعمل علیکم عبد یقول کم بکتاب اللہ“ اسمعوا لہ و اطیعوا“ یعنی اگر ایک ذلیل سے ذلیل حبشی غلام بھی تمہارا امیر ہو جائے تو اسکی سنو اور اطاعت کرو۔ حافظ نواری اسکی شرح میں لکھتے ہیں ”و المراد اخس العبد - ای اسمع و اطیع و ان کان دنی النسب“ حتی لو کان عبد اسود مقطوع الاطراف، فطاعته واجبة، و یتصور امارۃ العبد اذا ولاہ بعض الائمہ، او یغلب علی البلاد بشوکتہ و اتباعہ، و لا یجوز ابتداء عقد الولاية لہ مع الاختیار، بل شرطها الحریۃ“ (جلد ۲ : ۱۲۵) یعنی یہ جو فرمایا کہ اگرچہ حبشی غلام ہو، تو مقصود اس سے یہ ہے کہ اگرچہ امیر نہایت ذلیل نسب و خاندان کا ہو، لیکن اگر خلیفہ ہو گیا ہے تو اطاعت کرو، اور اسی بنا پر غلام امیر ہو سکتا ہے اگر کسی امام نے مقرر کر دیا ہو۔ یا خود وہ شہروں پر غالب آکر مسلط ہو گیا ہو۔ البتہ جائز نہیں کہ ابتدا میں کسی غلام کو امیر منتخب کیا جائے کیونکہ آزاد ہونا شرائط امامت میں سے ہے۔ اور فتح الباری میں ہے ”لو تغلب حقیقۃ بطریق الشوکیۃ“ فان طاعته تجب اخماداً للفتنہ“ (۱۳ : ۱۰۹)

جب غلبہ و تسلط کی صورت میں خود حافظ نواری (جو شرط قرشیۃ کے سب سے بڑے حامیوں میں سے ہیں) نص حدیث کی بنا پر تسلیم کرتے ہیں کہ ایک دنی النسب، خسیس الحال، حبشی غلام، امیر ہو سکتا ہے اگرچہ آزاد ہونا شرط ابتدائی ہے، تو پھر ظاہر ہے کہ ایک غالب و مسلط خلیفہ کی خلافت کیلئے شرط قرشیۃ کا موجود نہ ہونا کیوں مغل ہو اگرچہ قرشیۃ ایک شرط ابتدائی مان لی جائے؟

پس یہ مان لینے کے بعد بھی کہ قرشی ہونا شرائط شرعیہ میں سے ہے، ترکان عثمانی کی خلافت مسلمہ و منعقدہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور شرائط کی پوری بحث موجودہ مسئلہ سے یکقلم غیر متعلق ہے، تاہم تحقیق مقام کے خیال سے بہتر ہوگا کہ اس شرط کی حقیقت پر بھی ایک فیصلہ کن نظر نظر دال لی جائے۔

الا نقاتل في سبيل الله وقد اخرجنا من ديارنا وابنائنا ؟ ” فلما كتب عليهم القتال، تولوا الا قليلاً منهم، والله عليهم بالظالمين -  
 بزدلی دکھلا کے نافرمانی کرجاؤ گے “  
 ان لوگوں نے جواب دیا ” نہیں ایسا نہیں ہو سکتا - ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ حق کی راہ میں ظالموں سے جنگ نہ کریں ؟ حالانکہ انہوں نے ہم کو اور ہماری اولاد کو ہمارے شہروں سے نکال دیا ہے “ لیکن دیکھو، جب

( ۲ : ۱۲۲ )

لڑائی کا حکم دیا گیا تو بجز چند حق پرستوں کے سب اپنے قول و قرار سے پھر گئے - رقت پر انکا دعوا سچا ثابت نہ ہوا -

سنن ابوداؤد میں ہے ” اذا ضن الناس بالدينار والدرهم و تبايعوا بالعين و اتبعوا اذئاب بقر “ و تركوا الجهاد في سبيل الله ‘ انزل الله بهم بلاء ‘ فلم يرفعه حتى يراجعوا “ يعنى جب کوئی جماعت جہاد في سبيل الله ترک کر دیتی ہے تو اس پر بلائیں نازل ہوتی ہیں جو کبھی دور نہیں ہو سکتیں -  
 الا یہ کہ وہ اس معصیت سے باز آئیں -

چونکہ شریعت و ملت کے قیام کی اصلی بنیاد یہی چیز تھی ‘ اسلیے ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے اس پر زور دیا گیا ‘ اور سارے عملوں اور نیکیوں سے جو ایک مسلمان دنیا میں کرسکتا ہے ‘ اس عمل کا مرتبہ و اجر افضل و اعلیٰ ٹھرایا - جس عمل میں جسقدر زیادہ ایثار و قربانی ہوگی ‘ اتنا ہی زیادہ اُسکا اجر و ثواب بھی ہوگا - ظاہر ہے کہ اس عمل سے بڑھکر اور کس عمل میں مال و جان کا ایثار ہو سکتا ہے ؟

کوئی خاص وقت اور عہد اسکے لیے مخصوص نہیں - ہر حال اور ہر زمانے میں ایک مسلم و مومن زندگی کے ایمان و صداقت کی بنیاد یہی چیز اور اسی کا سچا عشق و ولولہ ہے - یہی سنام دین ہے - یہی عماد ملت ہے - یہی اساس شرع ہے - یہی ملاک اسلام ہے - یہی ایمان و نفاق کی اصلی کسوٹی ہے - یہی مومن کو منافق سے الگ کر دینے کیلئے اصلی پہچان ہے - نماز اسی سے ہے - روزہ اسی سے ہے - حج اسی سے ہے - زکوٰۃ کا سب سے پہلا اور افضل مصرف یہی ہے - سب اسکے لیے ملتوی ہو جاسکتے ہیں - اسکو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جاسکتا - نماز دین کا ستون ہے اور روزہ برائیوں سے بچنے کی قہال ‘ لیکن یہ دین کی بنیاد ہے اور برائیوں کو معدوم کر دینے والی تلوار - پس اسکی فضیلت کو نہ نماز پہنچ سکتی ہے نہ روزہ - نہ اس سے بڑھکر کوئی دوسرا عمل ہے جو اللہ کی نظر میں



معمورہ دے اگر تہست ، باز گورے  
کین جا سخن بہ ملک فریدون نمی رود

عملاً یہ حال تھا کہ آپؐ اپنی زندگی میں سب سے آخری فوجی مہم جو بھیجی ، اسکی سرداری اُسامہ کو دی جنکے والد زید آپکے غلام تھے ۔ بعض ظاہر بینوں پر یہ بات گراں گزری تو فرمایا ” لقد طعنتم فی امارۃ ابیہ و قد کان لہا اہلاً “ و ان اُسامہ لہا اہل “ تم لوگ پہلے زید کی سرداری پر بھی طعن کرچکے ہو ، حالانکہ وہ اس کام کا اہل تھا ، اور اب اُسامہ سردار بنایا گیا ہے اور وہ اس کام کا اہل ہے ۔ ” اہل “ کے لفظ پر زور دیا ۔ یعنی طعن بیکار ہے ۔ کیونکہ بنیاد معاملۂ امارت و سرداری کی صرف اہلیت و قابلیت ہے ۔ اور کچھ نہیں ۔ حضرت عائشہ کا قول مشہور ہے ” لو کان زید حیاً ، ما استخلف رسول اللہ غیرہ “ اگر آنحضرتؐ کے غلام زید زندہ رہتے تو آپؐ انکے سوا اور کسی کو اپنا جانشین نہ بناتے ۔ ( ۱ ) اُسامہ کو جس لشکر کی سرداری دی گئی تھی ، جانٹے ہو اسمیں کیسے کیسے لوگ شریک تھے ؟ برے برے مہاجرین و قریش اور سادات عرب ۔ جن میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام نظر آتا ہے ۔ وہی ابوبکر ( رض ) جو چند دنوں کے بعد رسول اللہؐ کے جانشین اور تمام امت کے امیر ہونے والے ہیں !

بندۂ عشق شدی ، ترک نسب کن جامی  
کین دریں راہ فلاں ابن فلاں چہیزے نیست !

( ۱ ) اللہ اللہ ! اس بارے میں اسلام و پیروان اسلام کے معاملات کیسے عجیب و غریب رہ چکے ہیں ؟ آج مسلمانوں کو جو طرح طرح کے خاندانی امتیازات و تفریقات کی بت پرستانہ پرستش کر رہے ہیں ، کیونکر یاد دلایا جائے کہ کسی زمانے میں اللہ اور اُسکے رسولؐ کے رشتہ کے سوا نہ کوئی رشتہ مقبول تھا ۔ نہ عمل کی بزرگی کے سوا کوئی بزرگی تسلیم کی جاتی تھی ۔ حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ انہی اُسامہ کی نسبت ناقابل فراموش ہے ۔ انکے لڑے عبد اللہ نے ایک بار شکایت کی کہ تقسیم اموال میں اُسامہ بن زید سے مجھے کم درجہ پر کیوں رکھا جاتا ہے ؟ حضرت عمرؓ نے کہا ” کان ابوہ احب الی رسول اللہ من ابوک “ و کان احب الی رسول اللہ منک “ اسلیے کہ تیرے باپ سے زیادہ اُسکا باپ اللہ کے رسولؐ کو پیارا تھا ، اور اسلیے کہ وہ خود بھی تجھ سے

اور فرمایا ” حرمت النار علی عین دمع من خشية الله “ و حرمت النار علی عین سہرت فی سبیل اللہ “ ( ایضاً ) جو آنکہ اللہ کے خوف سے اشکبار ہوئی، یا جہاد میں کام کرتے ہوئے جاگی، اسپر دوزخ کی آگ حرام ہے ! ایک شخص نے پوچھا - یا رسول اللہ ! کوئی ایسا عمل بتلا دیجیے کہ مجاہدین کا ثواب حاصل ہو - فرمایا ” هل تستطيع ان تصلى فلا تفتر “ و تصور فلا تظفر ؟ ” اسکی طاقت رکھتے ہو کہ برابر نماز پڑھتے رہو اور قضا نہو، برابر روزہ رکھتے رہو، اور کبھی بیچ میں افطار نہ کرو ؟ عرض کیا ” انا اضعف من ان استطیع ذلک “ یہ تو میری طاقت سے باہر ہے - فرمایا ” فالذي نفسي بيده ! لو طوقت ذلک “ ما بلغت فضل المجاہدین فی سبیل اللہ - اما علمت ان فرس المجاہد لیستن فی طوله فيكتب له بذلك الحسنات ؟ ” خدا کی قسم ! اگر تم ایسا کرنے کی طاقت بھی رکھتے اور کر دکھاتے، جب بھی اُن لوگوں کی فضیلت کہاں پاسکتے تھے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں ؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجاہد کا گھوڑا بندھا رہتا ہے، اور اسکے لیے بھی اسکے نامہ اعمال میں نیکیاں درج ہوتی رہتی ہیں ؟ ( رواہ احمد و الحاکم و قال علی شرط الصحیحین )

بخاری و مسلم میں ہے - تین مرتبہ آپ سے پوچھا گیا - ” ما يعدل الجہاد فی سبیل اللہ ؟ تینوں مرتبہ فرمایا ” لا تستطیعونہ “ پھر فرمایا ” مثل المجاہد کمثل الصائم القائم القانت بایات اللہ لا یفتر عن صلاتہ ولا صیامہ حتی یرجع “

اور فرمایا ” من اغبرت قد ماہ فی سبیل اللہ ساعة من نہار، فہما حرام علی النار “ ( رواہ احمد ) جس کے پاؤں اللہ کی راہ میں ایک گھنٹہ کیلیے بھی گرد آلود ہوئے، دوزخ کی آگ اُن قدموں پر حرام ہے -

اور فرمایا ” ما من میت یموت الا ختم عملہ “ الا من مات مرابطا فی سبیل اللہ، فانہ ینمو لہ عملہ الی یوم القیامۃ و امن من فتنۃ القبر “ ( رواہ اصحاب السنن ) کوئی ایسی موت نہیں جسکے ساتھ اعمال کا سلسلہ بھی ختم نہ ہو جاتا ہو، الا وہ شخص کہ جہاد کی راہ میں دشمن کے حملے کا انتظار کرتا ہوا دنیا سے گیا - سو اسکا عمل ایسا ہے جو مرنے کے بعد بھی قیامت تک بڑھتا رہیگا - یعنی عمل جہاد بھی حسنات جاریہ میں سے ہے - حسنات جاریہ بموجب نص حدیث مسلم تین ہیں -

امتیازات کے مٹانے میں اسلامی احکام و اعمال کا کیا حال رہا ہے ؟ اسلام کا ظہور عرب میں ہوا جن کے غرور قوم و نسب کا یہ حال تھا کہ وہاں کا ایک چرواہا اپنے نسبی و خاندانی شرف کے سامنے قیصر و کسریٰ کو بھی ذلیل و حقیر سمجھتا تھا - عرب کے علاوہ بقیہ دنیا بھی طرح طرح کے قومی و وطنی امتیازات کی پرستش کر رہی تھی - اسلام نے اپنی دعوت کی سب سے پہلی اور کاری ضرب اسی غرور نسل و قوم کے بت پر لگائی اور اللہ کے اس قانون فطرت کی عام منادی بلند کی کہ : یا ایہا الناس ! انا خلقناکم من ذکر

وانثیٰ و جعلناکم شعوباً و قبائل لتعارفوا - ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ( ۱۴ : ۴۹ ) یعنی بنیاد ہر طرح کی فضیلت و بزرگی کی صرف عمل ہے اور کوئی شے نہیں - قوموں اور خاندانوں کی تفریق صرف اسلیے ہے کہ باہمدگر پہچان اور تمیز کا ذریعہ ہو - اسلیے نہیں ہے کہ ایک دوسرے پر اپنی برائی جتلائے - سب سے بڑا انسان وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو - اور فرمایا : لا تزر وازرة الذر اخریٰ و ان لیس للانسان الا ما سعیٰ

ان سعیہ سوف یری - ( ۵۳ : ۴۶ ) ہر انسان اپنے کاموں کا خود ذمہ دار ہے اور انسان کی تمام کامیابیوں اور سعادتوں کی بنیاد صرف اسکی کوشش اور اسکا عمل ہے - آنحضرت ( صلی اللہ علیہ وسلم ) کا زندگی بھر قول و فعل یہ رہا کہ ” لیس منا من دعی الی عصبیة “ اور ” لیس منا من قاتل علی عصبیة “ اور ” لیس منا من مات علی عصبیة “ یعنی وہ ہم میں سے نہیں جو نسل و قوم کی خصوصیت کے تعصب کی طرف لوگوں کو بلائے - وہ ہم میں سے نہیں جو اس تعصب کی حالت میں دنیا سے جئے - وہ ہم میں سے نہیں جو اس تعصب کی بنا پر لوگوں سے جنگ کرے ! دنیا کو چھوڑنے سے پہلے حجة الوداع میں جو آخری پیام امت کو سنایا ، اُس میں بھی سب سے پہلی چیز یہی تھی - یعنی نوع انسانی کی عام مسارات کا اعلان : ” لا فضل لعربی علی عجمی “ و لا لعجمی علی عربی - کلکم ابناء آدم ( شیخان ) اور فرمایا ” لیس لاحد فضل علی احد الا بدین و تقویٰ - الناس کلہم بنو آدم “ و آدم من تراب “ ( رواہ الجماعة ) یعنی اسلام کا ظہور و قیام نوع انسانی کی مسارات اور باہمدگر برابری کا اعلان ہے - اب نہ کسی عرب کو عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو عرب پر ملک و قوم کی وجہ سے فضیلت ملسکتی ہے - سب ایک ہی آدم کی اولاد ہیں اور وہی سب سے بڑا ہے جو عمل میں بڑا ہو :

پھر اسی سورۃ میں آگے چل کر فرمایا - یہی وہ عمل ہے جسکے کرنے کے بعد تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں - کوئی خطا، کوئی معصیت، کوئی برائی باقی نہیں رہتی - ابدی نجات کا دروازہ ہمیشہ کیلیے کھل

جاتا ہے : یا ایہا الذین آمنوا - هل ادکم علی تجارة تنجیکم من عذاب

الیم ؟ تؤمنون باللہ ورسولہ و تجاهدون فی سبیل اللہ باموالکم و انفسکم ذلکم

خیر لکم ان کذتم تعلمون - یغفر لکم ذنوبکم و یدخلکم جنات تجری من

تحتها الانهار و مساکن طیبۃ فی جنات عدن - ذلک الفوز العظیم !

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے - آنحضرت سے سوال کیا گیا - ” اے عمل افضل “ ؟ کونسا عمل سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے ؟ فرمایا ” ایمان باللہ ورسولہ “ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا - پوچھا - ” تم ماذا “ ؟ اس کے بعد ؟ - فرمایا ” الجہاد فی سبیل اللہ “ -

حد ہو گئی کہ جن لوگوں نے جنگ بدر میں جاں نثاریاں کی تھیں ، اگر کبھی ان سے کوئی لغزش ہو گئی اور معصیت میں مبتلا ہو گئے تو اپنے سزا دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا ” لعل اللہ اطلع علی اهل بدر فقال اعملوا ما شئتم “ یہ وہ جاں نثار حق ہیں جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی ہے - عجب نہیں کہ اس ایک عمل کے صلے میں اللہ نے انکی ساری پچھلی اور آئندہ خطائیں بخشدی ہوں اور کھدیا ہو کہ جو جی میں آئے کر رہے !

ترمذی میں ہے ” من رابط لیلة فی سبیل اللہ “ کانت لہ کالف لیلة صیامہا و قیامہا “ جس مسلمان نے ایک رات بھی جہاد کرتے ہوئے دشمن کے انتظار میں کاٹی ، اس کے لیے ایسا اجر ہے ، گویا ہزار دنوں کا روزہ اور ہزار راتوں کی عبادت !

اور فرمایا ” مقام احدکم فی سبیل اللہ خیر من عبادۃ احدکم فی اہلہ ستین سنة “ ( ترمذی ) ساٹھ برس تک اپنے گھر میں عبادت کرنے سے بھی یہ افضل ہے کہ جہاد کے میدان میں کھڑے نظر آؤ -

اور فرمایا ” حرس لیلة فی سبیل اللہ “ افضل لہ من الف لیلة “ یقام لیلہا و یصام نہارہا “ ( رواہ احمد ) جہاد کی ایک رات اس سے افضل ہے کہ ہزار راتیں عبادت میں اور ہزار دن روزہ میں بسر کیے جائیں !

صرف اپنے ہی خاندان کیلئے مخصوص کر دے ؟ وہ تمام نوع انسانی سے کہے کہ تمہارے سارے بڑے ہوئے حق چھوٹے ہیں ۔ سچا حق صرف عمل اور اہلیت کا ہے ۔ لیکن خود اپنے لیے یہ کر جائے کہ نہ تو عمل اور نہ اہلیت ، بلکہ صرف ملک ، صرف قوم ، صرف نسل ، اور صرف خاندان ؟ کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی عجیب بات ہو سکتی ہے ؟

خیر ، یہ بات کتنی ہی عجیب ہوتی ، لیکن ہم بلا تامل بارر کر لیتے اگر فی الحقیقت قرآن و سنت سے ٹھیک ٹھیک ثابت ہوتی ۔ ہمارے نزدیک کسی اسلامی اعتقاد کی صحت و عدم صحت کا معیار صرف یہ ہے کہ کتاب و سنت سے بطریق صحیح ثابت ہو ۔ یہ کچھ ضروری نہیں کہ ہماری نارسا سمجھ اُسکا احاطہ و ادراک بھی کر سکے ۔ لیکن استعجاب کی ساری بنیاد ہمارا عقلی و قیاسی استبعاد نہیں ہے ۔ یہی ہے کہ کسی نص سے ایسا ثابت نہیں ، اور چونکہ ثابت نہیں ، اس لیے ہم کو یقین ہے کہ اسلام کیلئے کوئی ایسی بات ثابت بھی نہیں ہونی چاہیے ۔

شارع کے بیانات ، انسان کی عام بول چال کی طرح مختلف قسموں کے واقع ہوئے ہیں ۔ از انجملہ ایک صورت احکام و اراہم اور تشریع کی ہے ۔ یعنی بہ حیثیت شرع و دین کے کوئی حکم دینا اور قانون ٹہرا دینا ۔ دوسری صورت اخبار و اطلاعات کی ہے ۔ یہ دوسری صورت مجرد بیان واقعہ و حال ہے ، اور اگر آئندہ کی نسبت ہے تو پیشین گوئی ہے ۔ حکم اور تشریع نہیں ہے ۔ یعنی صرف ایک خبر ہے کہ ایسا ہوگا ۔ یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنا چاہیے ۔ قریش کی خلافت کی نسبت جس قدر روایات موجود ہیں ، سب دوسری قسم میں داخل ہیں ۔ نہ کہ پہلی قسم میں ۔ اور جب اس حدیث کے تمام طریقوں اور لفظوں کو جمع کر کے دیکھا جائے ، تو بلا کسی اضطراب کے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے :

(۱) یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ ، ابو ہریرہ ، کثیر بن مرہ ، جابر بن عبد اللہ ، جابر بن سمرہ ، معاریہ بن سفیان ، وغیرہم مختلف صحابہ سے مروی ہے ، اور عمدہ طریقہ وہ ہیں جو بخاری و مسلم نے اختیار کیے ہیں ۔ لیکن کسی طریق روایت میں بھی کوئی ایسا لفظ مروی نہیں جس سے ثابت ہو کہ مقصود پیشین گوئی نہ تھا ۔ تشریع و امر تھا ۔



فلہ بکل درہم سبع مائۃ الف درہم - ثم تلا هذه الاية - واللہ یضاعف لمن یشاء“  
یعنی جو مسلمان ایسے وقتوں میں گھر سے نہ نکلا، صرف اپنے رویہ سے  
جہاد میں مدد دی، تو اسکو ہر ایک رویہ کے بدلے سات سو روپیوں کا  
اجر ملیگا۔ یعنی اس اتفاق میں سات سو درجہ زیادہ اجر ہے۔ اور جس نے  
رویہ بھی لگایا اور خود شریک کار بھی ہوا، تو اس کے لیے سات ہزار درجہ زیادہ  
اجر۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ”اللہ جس کسی کا اجر و ثواب چاہتا ہے  
درگنا کر دیتا ہے“

اسلام نے حقوق العباد پر جس قدر زور دیا ہے، معلوم ہے۔ علی الخصوص  
والدین اور اقرباء کے حقوق کہ ساری نیکیوں اور ہر طرح کی عبادتوں سے  
مقدم ٹھہرائے گئے۔ لیکن صرف یہی وہ عمل عظیم ہے جس کے لیے یہ حقوق بھی  
روک نہیں ہو سکتے۔ امت اور شریعت کی حفاظت ہی پر تمام افراد کی  
حفاظت موقوف ہے۔ پس اگر امت دشمنوں کے نرغہ میں ہے، تو نیکی کا  
سب سے بڑا کام جو زمین پر ہو سکتا ہے مسلمانوں کے سامنے آگیا۔ اب اس  
بڑے کام کے لیے سارے چھوٹے کام چھوڑ دینے چاہئیں۔ ماں، باپ، بھائی،  
بہن، بیوی، بچے، رشتے ناتے، اپنی اپنی جگہ سب حق ہیں۔ سب کا  
حق ادا کرنا چاہیے۔ لیکن خدا اور اس کی سچائی کا حق سب سے بڑا حق  
ہے۔ اس کے رشتہ کے سامنے سارے رشتے ہیچ ہیں۔ پس اگر اس کے کام کا وقت  
آگیا تو سب کو اس کی خاطر چھوڑ دینا پڑیگا :

قل ان کان اباؤکم، و انباؤکم،  
و اخوانکم، و ازواجکم، و عشیرتکم،  
و اموال اقترفتموھا، و تجارۃ  
تخشون کسادھا، و مساکن  
ترضونها، احب الیکم من اللہ  
و رسوله و جہاد فی سبیلہ فترہبوا  
حتی یاتی اللہ بامرہ و اللہ  
لا یہدی القوم الفاسقین (۲۵ : ۹)

مسلمانوں سے کہہ دو کہ تمہارے والدین  
تمہاری اولاد، تمہارے بھائی، تمہاری  
بیویاں، تمہارا خاندان اور اس کے تمام رشتے،  
یہ مال و متاع جو تم نے کمایا ہے، یہ کاروبار  
و تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے  
ہو، یہ تمہارے رہنے کے محل جن میں  
تمہارا دل اتکا ہوا ہے، اگر تمہیں اللہ اور  
اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے

سے زیادہ پیارے ہیں، اور تمہارے پائوں ان زنجیروں میں ایسے بندھ گئے ہیں  
کہ اللہ کی پکار بھی انہیں نہیں ہلا سکتی، تو جان لو کہ اللہ کا کام بھی تمہارا  
محتاج نہیں۔ نتائج کا انتظار کرو۔ یہاں تک کہ اللہ کو جو کچھ کرنا منظور ہے  
کر دکھائے۔ اللہ کا قانون ہے کہ وہ نافرمانوں پر کامیابی کی راہ نہیں کھولتا !

بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی ( رض ) کا جو حال تھا، معلوم ہے۔ بلال کو عمر فاروق جیسے قرشی نے ”ہمارا آقا و سردار“ کہا۔ اور صہیب کو دیکھتے تو کہتے ”نعم العبد صہیب ! لو لم يخف الله لم يعصه“ صہیب اللہ کا کیا نیک بندہ ہے ! اگر خوف عذاب نہ ہوتا جب بھی اُسکی فطرۃ بدی پر مائل نہ ہوتی ! مرنے کے وقت وصیۃ کی کہ نماز جنازہ بھی پڑھائیں۔ سلمان کا یہ حال تھا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ”سلمان منا اهل البيت“ سلمان تو ہم اہل بیت نبوت میں سے ہے ! اسی چیز کا نتیجہ تھا کہ ایک صدی کے اندر ہی اندر عرب کی نسلی عصبیۃ کا نام و نشان باقی نہ رہا، اور وہ زمانہ آگیا جب بزرگی و فصیلت کے ہر میدان میں سرداری و ریاست عجمیوں اور غلام زادوں کے ہاتھ میں تھی۔ عرب اُنکے علم و عمل کے آگے اسی طرح جھک گئے تھے جس طرح ایک قرشی و ہاشمی کے آگے جھک سکتے تھے۔ حتیٰ کہ خلیفہ ہشام بن عبد الملک کو امام زہری سے کہنا پڑا ”والله ليسون الموالي العرب“ و یخطب لهم علی المنابر، و العرب تحتهم !“ ( عقد الفرید )

پھر کیا ایسی حالت میں ایک لمحہ کیلئے بھی بارر کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کا داعی تملہ دنیا کو تو قومی و نسلی امتیازات کی غلامی سے نجات دلانا چاہتا ہو اور مسارات عامہ کی طرف بلا رہا ہو، لیکن ( نعوذ باللہ ) خود اس درجہ خود غرض ہو کہ قیامت تک کیلئے پادشاہی و خلافت

( بقیہ نوت صفحہ ۹۳ )

زیادہ رسول اللہ کے نزدیک محبوب تھا ! یعنی بذاتہ استحقاق ہماری آپس کی رشتہ داریاں نہیں ہوسکتیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک جو محبوب ہو، وہی سب سے زیادہ حقدار ہے، اور اُسی کو ہر طرح کی بڑائی پہنچتی ہے۔ ایسے صدہا واقعات اُن عہدوں میں گزر چکے ہیں۔ اسلام نے یہ انقلاب اُس ملک میں پیدا کر دیا تھا جہاں کا بچہ بچہ غرور نسل و خاندان کے نشہ میں بدمست رہتا تھا۔ جو مغرور قریش کل تک قبائل یثرب کے شرفاء کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے تھے کہ جنگ بدر میں اُنسے مقابل ہوں، وہ اب غلاموں اور غلام زادوں کی سرداری بھی مان لینے کیلئے بلا چون و چرا طیار ہیں۔ سلطان اسلام کے لڑکے کے استحقاق پر ایک غلام زادہ کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ وہ گردن جھکا دیتا ہے اور تسلیم کر لیتا ہے !

ارلاد صالح ، علم نافع ، ارقاف و تعمیرات خیرہ - مثلاً مساجد و مدارس وغیرہ جو بعد کو باقی رہیں - اس حدیث اور اسکی ہم معنی احادیث سے معلوم ہوا کہ جہاد کا ہر کام بھی اسی قسم میں داخل ہے - علت اسکی بالکل واضح ہے - عمل جہاد کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اپنے بعد کے زمانے اور آنے والی نسلوں کی حفاظت و سعادت کیلئے اپنا وجود قربان کر دیا جائے - پس کوئی عمل نہیں جو اس سے زیادہ سچی اور بے لاگ انسانی خدمت اور نوع پرستی کے جذبات رکھتا ہو - اور اسی لیے ضروری ہوا کہ اسکا اجر بھی وقتی نہ ہو ، دائمی ہو - عمل کا اجر تو عمل کے نتائج پر موقوف ہے - جب نتائج بعد کے زمانوں اور نسلوں کو ملینگے ، تو صاحب عمل کا اجر بھی فوراً کیوں منقطع ہو جائے ؟ اس حدیث میں ”مرابطاً فی سبیل اللہ“ کا لفظ آیا ہے - اور دوسری حدیثوں میں بھی جا بجا ”رباط“ کا لفظ وارد ہے - ”رباط“ سے مقصود یہ ہے کہ کسی مقام میں تھر کر دشمن کے حملہ کا انتظار کرنا - تاکہ جب دشمن آجائے تو اللہ کی راہ میں مقابلہ کیا جائے - نہایہ میں ہے ”ہو الاقامة فی مکان یتوقع هجوم العدو فیہ لقصد دفعه لله“ پس ”مرابطاً فی سبیل اللہ“ کا مطلب یہ ہوا کہ اگر لڑکر شہید ہونے کا موقعہ نہیں بھی ملا ، اور حملہ کے انتظار ہی میں موت آگئی ، جب بھی اسکا اجر مرنے کے بعد برابر بڑھتا رہیگا - اور وہ ہزار دنوں کے روزہ و نماز سے افضل ہے !

قرآن بھی ہر جگہ اور بار بار یہی کہتا ہے :

|                             |   |
|-----------------------------|---|
| الذین آمنوا وجاهدوا         | جو لوگ ایمان لائے ، حق کی راہ میں       |
| فی سبیل اللہ باموالہم       | اپنا گھر بار چھوڑا ، اپنی جان و مال سے  |
| وانفسہم اعظم درجۃ عند اللہ  | جہاد کیا ، سو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ |
| واللائک ہم الفائزون -       | اور اونچا درجہ انہی کا ہے - یہی لوگ     |
| یبشرہم ربہم برحمة منہ       | ہیں کہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہونگے - |
| ورضوان و جنات لہم فیہا نعیم | اللہ کی طرف سے انکے لیے بشارت ہے -      |
| مقیم - خالدين فیہا ابدًا -  | اسکی رحمت ، اسکی محبت ، بہشتی           |
| ان اللہ عنده اجر عظیم !     | زندگی کی نعمتیں ، اور انکی دائمی اور    |
| ( ۹ : ۲۳ )                  | ہمیشگی ، سب کچھ انہی کیلئے ہے !         |

ابن ماجہ میں ہے ”من ارسل بنفقة فی سبیل اللہ و اقام فی بیتہ ، فلہ بكل درہم سبع مائة درہم“ و من غزا بنفسہ فی سبیل اللہ و أنفق فی وجہہ ذلک ،

طریقوں اور لفظوں سے تمام اصحاب سنن و مسانید نے روایت کی ہے۔ صحیح مسلم میں سفیان بن عیینہ کے طریق سے ”لا یزال امر الناس ماضیا ما رلیہم اثنا عشر رجلا۔ ثم تکلم النبی بکلمة خفیت علی۔ فسئلت ابی ماذا قال؟ فقال کلہم من قریش“ اور حصین بن عمران کے طریق سے ”ان هذا الامر لا ینقضی حتی یمضی فیہم اثنا عشر خلیفة“ اور سماک بن حرب سے ”لا یزال الاسلام عزیزاً منیعاً الی اثنی عشر خلیفة“ مرروی ہے۔ شعبی کے طریق عند ابی داؤد میں ہے ”فکبر الناس و ضجوا“ اور اسماعیل بن ابی خالد عن ابیہ سے اسی میں ہے ”لا یزال هذا الدین قائماً حتی یكون علیکم اثنا عشر خلیفة کلہم یجتمع الامة علیہ“ طبرانی نے اسود بن سعید کے طریق سے اسپر زیادت کی ”لا تضرہم عداۃ من عاداہم“ بعض طریق میں ہے ”لا یزال هذا الامر صالحاً“ اور ”ماضیاً“ (روا ہما احمد) اور بزار و طبرانی نے ابو جحیفہ سے روایت کی ہے ”لا یزال امر امتی قائماً حتی یمضی اثنا عشر خلیفة کلہم من قریش“ یہی روایت ابو داؤد میں اس اضافہ کے ساتھ ہے ”فلما رجع الی منزله اتته قریش فقالوا ثم یكون ما ذا؟ قال ثم یكون الهرج“ حاصل تمام روایتوں کا یہ ہے کہ آپ آئندہ کی نسبت خبر دے رہے ہیں اور فرماتے ہیں۔ ضرور ہے کہ بارہ خلیفہ ہوں۔ سب قریش سے ہونگے۔ کسی دشمن کی دشمنی انکو نقصان نہیں پہنچا سکیگی۔ جب تک یہ بارہ خلیفہ حکمران رہینگے، اسلام با عزت رہیگا، اور لوگ خوشحال۔

اس طرز بیان کی وضاحت نے ظاہر کر دیا کہ اس بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس سے صرف آئندہ کی نسبت اطلاع دینا مقصود ہے۔ حکم و تشریع نہیں ہے۔ ہم نے تمام روایات و طریق نقل کر دیے۔ کسی روایت اور طریق سے بھی ایسا لفظ ثابت نہیں جس سے حکم و تشریع نکل سکے۔

(۳) ان سب کے بعد وہ حدیث آتی ہے جسکو امام بخاری نے باب ”الامراء من قریش“ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ تمام روایات کے ساتھ یہ حدیث سامنے رکھ لی جائے، تو پوری طرح اصلیت روشن ہو جائیگی۔ امیر معاویہ کی مجلس میں ایک مرتبہ ذکر آیا کہ عبد اللہ بن عمرو کہا کرتے ہیں ”سیکون ملک من قحطان“ قحطان میں سے ایک پادشاہ ہوگا۔ امیر معاویہ یہ ستر غضبناک ہوئے اور خطبہ دیا: ”بلغنی ان رجلاً منکم یحدثون احادیث لیست فی کتاب اللہ و لا تؤثر عن رسول اللہ“ الخ۔ مجھے تک

آنکس کہ ترا بخواست ، جانرا چہ کند ؟  
 فرزند ر عیال ر خانمان را چہ کند ؟  
 دیوانہ کذی ہر در جہانش بخشی  
 دیوانہ تو ہر در جہان را چہ کند ؟

قبوک نامی مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا مسلمانوں کی دلیوانہ طیاروں  
 حال سنکر رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور فوجیں منتشر کر دی گئیں۔  
 آنحضرتؐ نے ایک ماہ قیام فرمایا اور پھر مدینہ واپس آ گئے ۔

اس دفاع میں بجز منافقین کے تمام مسلمان شریک ہوئے تھے ۔ صرف  
 تین شخص نہ جاسکے ۔ کعب بن مالک ۔ ہلال بن امیہ ۔ مرارہ بن ربیع ۔  
 کعب بن مالک سابقین انصار میں سے ہیں ، اور ان ۷۳ سابقین مخلصین  
 میں سے جو عقبہ کی بیعت میں حاضر ہوئے تھے ۔ انکے ایمان ر اخلاص میں  
 کیا شبہ ہو سکتا ہے ؟ انکا شریک نہ ہونا کسی بری نیت سے نہ تھا ۔ سستی  
 اور کاہلی سے آج کل کرتے رہے اور فوج کے ساتھ ملنے کا مرقعہ نکل گیا ۔

با ایں ہمہ یہ معاملہ اللہ اور اسکے رسول کی نظروں میں اسدرجہ  
 اہم ہے کہ یہ سستی اور کاہلی بھی ایک سخت جرم قرار پائی ۔ معذرت کرنے  
 کیلئے حاضر ہوئے تو توبہ قبول نہ ہوئی ۔ حکم ہوا کہ گھر میں بیٹھو اور  
 فیصلہ وحی کا انتظار کرو ۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تمام تعلقات اسے  
 ترک کر دیں ۔ نہ کوئی بات چیت کرے ۔ نہ ملے جلے ۔ نہ آور کسی طرح  
 کا واسطہ رکھے ۔ پھر انکی بیویوں کو حکم ملا کہ وہ بھی الگ ہو جائیں اور  
 کوئی واسطہ نہ رکھیں ۔ امام بخاری نے ایک طویل روایت خود حضرت  
 کعب بن مالک کی زبانی نقل کی ہے اور اس واقعہ کیلئے خاص باب  
 باندھا ہے ۔ کعب کہتے ہیں ، ہمارا یہ حال ہو گیا تھا کہ سارا مدینہ انسانوں  
 سے بھرا تھا ، مگر ہمارے لیے نہ ایک آنکھ دیکھنے والی تھی نہ ایک زبان  
 بات کرنے والی ۔ خود عزیز و اقارب نے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا ۔ حسرت سے  
 ایک ایک کا منہ تکتے اور دیوانوں کی طرح پھرتے تھے ۔ ایک دن اپنے  
 چچیرے بھائی ابو قتادہ کے یہاں گیا ۔ مجھے دیکھتے ہی منہ دوسرے طرف  
 پھرا لیا ۔ سلام کیا تو جواب نہ ملا ۔ اللہ اللہ ! کیا مسلمان تھے کہ انکا رشتہ تھا  
 تو اللہ اور اسکے رسول کا رشتہ ۔ زندگی تھی تو صرف اسی کے حکم پر العجب  
 فی اللہ والبغض فی اللہ کی مجسم تصویر تھے !



عن ابی ہریرہ " الناس تبع لقریش فی هذا الشان - مسلمہم لمسلمہم  
 و کافرہم لکافرہم " (مسلم) دوسرے طریق میں زیادہ وضاحت ہے " مسلمہم  
 تبع لمسلمہم " و کافرہم تبع لکافرہم " (مسلم) جابر کی روایت میں  
 " الناس تبع لقریش فی الخیر و الشر " ہے - امام نواری اسکی شرح میں  
 لکھتے ہیں " معناه فی الاسلام و الجاہلیۃ - لانہم کانوا فی الجاہلیۃ  
 رؤساء العرب و اصحاب حرم اللہ و اہل الحج " و كانت العرب تنتظر اسلامہم  
 فلما اسلموا و فتحت مکہ " تبعہم الناس " رجاءت و فود العرب من کل جہۃ  
 و دخل الناس فی دین اللہ افواجا " (جلد ۲ : ۱۱۹) پس معلوم ہوا  
 کہ اس حدیث کو مسئلۂ خلافت کے اختصاص و شرائط سے کوئی تعلق نہیں -  
 مقصود یہ ہے کہ عرب میں خاندان قریش حج کے اہتمام اور بیت اللہ کی  
 ہمسایگی کی وجہ سے تمام قبائل کی سرداری رکھتا تھا " اور ہر کام میں سب  
 کی نظریں اُسی پر اُٹھتی تھیں - جب تک مکہ فتح نہوا اور قریش  
 مسلمان نہ ہوئے " تمام عرب کے قدم رکے رہے - جونہی قریش مسلمان  
 ہوئے " سب نے اُنکی پیروی کی " اور اپنے اپنے وفد بھیجنا شروع کر دیے -  
 حتیٰ کہ تمام عرب مسلمان ہو گیا - پس فرمایا " الناس تبع لقریش " لوگ  
 جاہلیۃ اور اسلام دونوں حالتوں میں قریش کے تابع ہوئے - وہ بگڑے رہے  
 تو سارا عرب بگڑا رہا " وہ سنورے تو سب سنور گئے - اور یہ بالکل حق و معلوم  
 ہے - ہمیشہ اور ہر ملک میں سردار جماعتوں اور بڑے لوگوں کا ایسا ہی اثر  
 ملک و قوم پر ہوتا ہے - اچھی بری " ہر طرح کی باتوں میں لوگ اُنہی کی  
 پیروی کرتے ہیں - حضرت ابو بکر کی روایت سے یہی حدیث مسند امام  
 احمد میں یوں مرزی ہے " بر الناس تبع لبرہم " و فاجرہم تبع لفاجرہم " -  
 اور بیہقی نے حضرت علی سے روایت کیا " کان هذا الامر فی حمیر فنزعه اللہ  
 منہم و جعلہ فی قریش " لیکن اس سے یہ بات کیونکر ثابت ہوئی کہ  
 مسلمانوں کا خلیفہ بجز اُنکے کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا ؟ اسلام صرف عرب  
 ہی کا اسلام نہ تھا جس کے سردار قریش تھے - اسلام تمام عالم کیلئے اسلام  
 ہے جسکی سرداری ریاست صرف علم و عمل حق ہی کو مل سکتی ہے اور  
 یہ سرداری اسلام ہی نے دلائی ہے !

( ۲ ) امام بخاری نے جابر بن سمرہ سے بطریق شعبہ ایک اور حدیث  
 روایت کی ہے " سمعت النبی صلع یقول یکرن اثنا عشر امیراً - فقال  
 کلمۃ لم اسمعہا - فقال ابی اَنہ قال کلہم من قریش " یہ حدیث مختلف

اگرچہ عمل کے اعتبار سے اس فرض کی تعمیل اُس وقت لازم سے الزم ہو جاتی ہے جب حملہ اعداء کی وجہ سے خاص طور پر ضرورت پیش آجائے، لیکن عزم و استعداد کے لحاظ سے یہ حکم کسی خاص وقت میں محدود نہیں۔ ہمیشہ اور ہر حال میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ دفاع اعداء کیلئے طیار رہیں اور طیاری کرتے رہیں۔ اور حدیث گزر چکی ہے کہ جو دل اسکے عزم و طلب سے خالی ہوا، اُس پر ایمان کی جگہ نفاق کا قبضہ ہو گیا:

و اعدوا لهم ما استطعتم من قوة      جسددر بھی تم سے ممکن ہو دشمنوں  
و من رباط الخيل ترهبون به      کے مقابلے کیلئے اپنی قوت اور ساز  
عدو الله وعدوكم و آخرين من      سامان سے طیار رہو۔ تاکہ اللہ اور اُسکی  
دوّنهم لا تعلمونهم ( ۸ : ۶۰ )      اُمت کے دشمنوں پر تمہاری مستعدی  
دیکھ کر خوف اور رعب چھا جائے۔ تم پر حملہ کرنے کی ہر کسی کو جرأت نہ ہو۔

( عہد نبوت کا ایک واقعہ )

یہ قرآن و سنت کے احکام ہیں۔ اب دیکھیں، صاحب شریعت کا اس بارے میں طرز عمل کیا رہا ہے ؟

۱ / ہجرت کے نوویں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ  
رومیوں کی فوج مسلمانوں پر حملہ کرنے کیلئے اکتھی ہو رہی ہے۔ یہ سنکر  
آپؐ بھی طیاری کا حکم دیدیا، اور تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے  
کوچ کر دیا۔ چونکہ یہ فوج بڑی ہی تنگدستی اور بے سر سامانی کے  
حال میں نکلی تھی۔ اٹھارہ آدمیوں کے حصے میں صرف ایک سواری  
آئی تھی۔ جنگل کے پتے کہا کر مسلمانوں نے گزارہ کیا، اسلئے اس فوج  
کا نام ”جیش العسرة“ مشہور ہوا۔ الذین اتبعوه في ساعة العسرة ( ۱۱۹ : ۹ )  
آج تم خدا اور اُسکے ایمان کی جگہ لوہے اور گندھک کے سامان و اسلحہ کی پرستش کر رہے ہو۔ لیکن ایک وقت رہے بھی تھا، جب بے سر سامان مسلمانوں کی یہ بھیڑ نکلی تھی، تاکہ کرۂ ارضی کی سب سے بڑی متمدن قوم یعنی رومیوں سے مقابلہ کرے !

حضرت ابوبکر ( رض ) نے اسی دفاع کیلئے اپنا تمام مال و متاع پیش کر دیا تھا۔ جب اُسے پوچھا گیا ” ما ابقیت لاهلک “ ؟ اپنے بیوی بچوں کیلئے کیا چھوڑ آئے ہو ؟ تو اس پیکر ایمان و مجسمۂ عشق حق نے جواب دیا تھا ” ابقیت لهم الله و رسوله “ ! اللہ اور اُسکے رسول کو !

کی قید موجود ہے - اس سے ثابت ہوا کہ جب قریش میں ایسے لوگ نہ رہیں گے جو دین قائم رکھ سکیں تو پھر کوئی غیر قرشی مسلط ہو جائیگا -

( ۴ ) صحیح بخاری کے ترجمہ باب سے واضح ہوتا ہے کہ امام بخاری کا بھی مذہب یہی ہے - انہوں نے باب باندھا ہے ”الامراء من قریش“ قریش میں امارت اور امراء - اس مضمون کا باب نہیں باندھا کہ امارت ہمیشہ قریش ہی میں ہونی چاہیے -

( ۵ ) امام بخاری نے ایک دوسری روایت ابن عمر کی درج کی ہے جو مسلم وغیرہ میں بھی ہے : ”لا یزال هذا الامر فی قریش ما بقی منهم اثنان“ یعنی یہ چیز قریش ہی میں رہیگی جب تک دو آدمی بھی اُن میں باقی رہیں گے -

اس روایت سے ہمارے بیان کی اور مزید تصدیق ہوگئی - حدیث کا منظور صریح پیشین گوئی کا ہے - اگر اسکا یہ مطلب قرار دیا جائے کہ جب تک دو انسان بھی خاندان قریش میں باقی رہیں گے ، خلافت انہی کے قبضہ میں رہیگی ، تو یہ واقعات کے بالکل خلاف ہے - دو کی جگہ ہزاروں قرشی انسان موجود رہے اور خلافت قریش سے نکل گئی - پس ضرور ہے کہ ”ما بقی منهم اثنان“ کے منظور پر مفہوم کو ترجیح دی جائے - اور یہ بھی ہے کہ اگر قریش میں دو آدمی بھی ایسے باقی رہیں گے ، جو خلافت کے اہل ہوں گے ، تو کبھی خلافت کے شرف سے یہ خاندان محروم نہ ہوگا - مگر جب انقلاب حال سے ایسا وقت آجائے کہ دو آدمی بھی اہل نہ رہیں ، تو مشیت الہی اپنے قانون انتخاب اصلاح کے مطابق دوسروں کو اس کام پر مامور فرمادیگی ، اور قریش خلافت سے محروم ہو جائیں گے - چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی ہوا - معتصم کے بعد سے عباسیہ کا زوال شروع ہو گیا تھا - آخر میں یہاں تک پہنچ گیا کہ حکومت دوسروں کی تھی ، عباسی خلیفہ صرف اپنے عشرت کدوں کیلئے رہ گیا تھا - تاہم اقتدار خلافت انہی کا رہا - کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ خلافت کا دعوا کر سکے - کیسی کیسی طاقتور اور باجبروت عجمی و سلجوقی حکومتیں قائم ہوئیں ؟ لیکن سب اپنا بوا سے بڑا شرف یہی سمجھتے رہے کہ مقام خلافت سے انہیں خدمت و یاروبی خلافت کا کوئی لقب ملجائے ، اور بس - اگر ایک قرشی ، فاطمی ، عباسی ، تن تنہا کسی ہنگامہ و قتال سے بچکر

اگر مشکلوں اور مجبوروں کے عذر سنے جاسکتے ہیں تو ان حالات سے بڑھکر اور کونسے حالات عذر داری کے لیے مناسب ہوسکتے ہیں ؟ مگر دفاع کا فرض ایسا سخت اور اٹل ہے کہ نہ کوئی عذر سنا گیا ، نہ کوئی مشکل رکاوٹ ہوسکی ۔ حکم ہوا کہ سب کچھ چھوڑ دو ۔ ساری مصیبتیں جھیل لو ۔ اور دشمنوں کو روکنے کیلئے نکل کھڑے ہو ۔ سورہ توبہ میں اسکا دُعا ہی عبرت انگیز تذکرہ ہے ۔ یہ موقعہ تفصیل کا نہیں ۔ قالوا لاندفعروا فی الحر ۔ فل نار جہنم اشد حرا لو کالوا یففہون [ ۸۳ : ۹ ]

( ۲ ) یہ تینوں مسلمان جو شرکت دفاع سے رہ گئے ، مخلصین مومنین میں سے تھے ۔ انکی زندگیاں اسلام کی بے شمار خدمتوں اور جان نثاروں میں بسر ہوئی تھیں ۔ عبادتوں اور نیکوں کا کیا پوچھنا کہ شب و روز اللہ کے رسول کے سایہ تربیت میں رہتے تھے ، انہی کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے ، انہی کے ساتھ روزے رکھتے تھے ۔ صحابہ کے ایک ادنیٰ فرد کی عبادت کا مقابلہ ہم اپنی پوری نسلوں اور قوموں کی عبادت گزاریاں پیش کر کے بھی نہیں کر سکتے ۔ حضرت کعب بن مالک سے بقرون الاولون میں سے ہیں ۔ جب اسلام کا کوئی ساتھی نہ تھا تو مدینہ کے انصار نے ساتھ دیا ۔ عقبہ کی بیعت ثانیہ میں ۷۳ جان نثاروں نے بیعت کی تھی ۔ یہ انہی عشاق اسلام میں سے ہیں ۔ خود کہتے ہیں کہ کسی اسلامی خدمت میں دوسروں سے پیچھے نہ رہا ۔ ہر جنگ میں شرکت کی ۔ ہر موقعہ پر جان و مال نثار کیا ۔ اس دفاع کی شرکت سے بھی جو رہ گئے ، تو دل کی کسی کمزوری اور نیت کے فساد کی وجہ سے نہیں ۔ چلنے کا تو پورا سامان کر لیا تھا ۔ صرف یہ قصور ہوا کہ سستی اور کاہلی کی ۔ پوری طرح مستعدی سے کام نہ لیا ۔ تاہم دیکھو ، یہ سستی اور کاہلی بھی خدا کے حضور کیسا بڑا جرم قرار پائی کہ نہ تو کوئی پچھلی خدمت آئے آسکی ، نہ مدۃ العمر کی نیکیوں اور عبادتوں ہی نے کچھ کام دیا ۔ نہ کوئی بزرگی اور بڑائی اس معاملہ میں شفیع ہوسکی ۔ نہ ایک ایسے بکے اور پرکے ہوئے مخلص مسلمان کیلئے عذر و معذرت کی گنجائش نکل سکی ۔ سخت سے سخت سزا جو دی جاسکتی تھی ، دی گئی ۔ مسلمانوں سے اسلامی برادری کا رشتہ ہی توڑ دیا گیا ۔ پچاس دنوں کیلئے جماعت سے باہر کر دیے گئے ۔ یہ سارا زمانہ گریہ و زاری اور عبادت و استغفار میں بسر ہوا ۔ تب کہیں جا کر توبہ قبول کی گئی ۔



یہ بات پہنچتی ہے کہ تم میں کچھ لوگ ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہیں کہ نہ تو قرآن میں ہیں نہ رسول سے ثابت ہیں : ” انی سمعت رسول اللہ يقول : ان هذا الامر في قریش لا يعاديهم احد “ الا كبدہ اللہ علی وجہہ ” ما اقاموا الدین “ میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ یہ بات ( یعنی حکومت ) قریش ہی میں رہیگی جب تک وہ دین قائم رکھیں گے - جو انکی مخالفت کرے گا ، اُلٹا رسوا ہوگا - یعنی کامیاب نہوگا -

اس روایت نے سارا معاملہ حل کر دیا - معلوم ہو گیا کہ ایک خاص وقت تک کے لیے یہ پیشین گوئی تھی ، اور حرف بہ حرف پوری ہوئی - یعنی آپ نے بتلادیا تھا کہ قریش میں جب تک دین قائم رکھنے کی قابلیت رہیگی ، حکومت انہی کے قبضے میں رہیگی - جو انکے خلاف اُٹے گا ، ناکام رہیگا - چنانچہ ایسا ہی ہوا - جب تک عرب و قریش میں صلاحیت رہی ، اسلامی خلافت کے وہی مالک رہے - جب اسکے اہل نہ رہے ، عجم و ترک نے یہ بار اُٹھالیا - بحکم ان یشايد هبکم ریات بخلق جدید ، و ما ذلک

علی اللہ بعزیز ( ۳۰ : ۱۶ ) اور يستبدل قومًا غیر کم الخ - باقی رہا امیر معاویہ کا ابن عمر پر انکار ، تو یہ بھی صحیح نہ تھا - وہ صرف یہ بات سنکر گھبرا اُٹھے کہ دوسری پادشاہت بننے والی ہے - اصلیت پر غور نہیں کیا - قحطانی والی حدیث بطریق رفع ثابت ہے ، اور قریش والی حدیث میں ” ما اقاموا الدین “ کی قید موجود ہے - پس دونوں میں کوئی تعارض نہیں - اسی بنا پر ائمہ حدیث نے حدیث قحطانی اور حدیث قریش میں تطبیق دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا کہ امارۃ قریش والی روایت تشریع نہیں ہے - محض خبر ہے - اور وہ بھی ” ما اقاموا الدین “ کے ساتھ مقید - شیخ الاسلام لکھتے ہیں ” هذا انکار من معاویہ بلا تأمل ، والا ، فقد جاء حدیث القحطانی مرفوعاً ، و ما ذکر فی المعارضہ “ فہر جحة لما فیہ من التقدید بقولہ : ما اقاموا الدین “ اور حافظ عسقلانی نے فتح میں ابن التین کا قول نقل کیا ہے ” الذی انکرہ معاویہ فی حدیث ما یقریہ لقولہ ما اقاموا الدین فرما کان فیہم من لا یقیمہ فیتسلط القحطانی علیہ و هو کلام مستقیم “ ( ۱۰۲ : ۱۳ ) یعنی امیر معاویہ کا انکار کر دینا انکی بے غوری کا نتیجہ تھا - ورنہ قحطانی والی بات ثابت ہے - امیر معاویہ نے جو حدیث معارضہ میں پیش کی ، اس کا آخری تکرار خود انہی پر حجت ہے اور ابن عمر کی تصدیق کر رہا ہے - یعنی اس میں ” ما اقاموا الدین “



غسان کے عیسائی پادشاہ نے یہ حال سنا تو خوش ہوا کہ مسلمانوں میں پھرت ڈالنے کا اچھا مرقعہ نکل آیا ہے - کعب کے نام اس مضمون کا خط بھیجا کہ تمہارے آقا نے تمہاری ساری عمر کی خدمتوں کا یہ معارضہ دیا - میرے پاس چلے آؤ - دیکھو یہاں تمہاری کیسی عزت ہوتی ہے ؟ کعب بن مالک کو خط ملا تو ایلچی کے سامنے آگ میں جھونک دیا اور کہا جواب میں کہہ دینا - ہم نے جس آقا کی چوکھٹ پر سر رکھا ہے اس کی گيرائيوں اور دلربائيوں کا حال تمہیں کیا معلوم ؟ اُسکی بے التفاتی بھی دسروں کی محبت و عزت سے ہزار درجہ ہمیں زیادہ عزیز ہے :

اے جفا ہاے تو خوشتر ز رفائے دگران !

ان مومنین صادقین کی یہ آزمائش پورے پچاس دن تک جاری رہی - بالآخر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی اور سورۃ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی :

و علی الثلثة الذین خلفوا حتی ضاقت علیہم الارض بما رحبت و ضاقت علیہم انفسہم و ظنوا ان لا ملجأ من اللہ الا الیہ - ثم تاب علیہم لیتوبوا - ان اللہ هو التواب الرحیم ! ( ۱۲۰ : ۹ )

اور وہ تین آدمی جن کا معاملہ فیصلۃ الہی کیلئے ملتوی کر دیا گیا تھا ، سرجب ان کا یہ حال ہو گیا کہ تمام مسلمانوں نے اُنکو چھوڑ دیا ، زمین باوجود اپنی وسعت کے انپر تنگ ہو گئی ، اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے ، اور انہوں نے دیکھ لیا کہ اللہ سے پناہ نہیں ہے مگر صرف اسی کی طرف ، تو پھر اللہ نے انکی توبہ قبول کر لی - یقیناً اللہ ہی ہے جو توبہ قبول کرتا اور خطا کاروں کیلئے مہربانی رکھتا ہے !

حضرت کعب کو جب قبولیت توبہ کی بشارت ملی تو بے اختیار سجدہ میں گر پڑے اور اپنا سارا مال و متاع شکرانۃ قبولیت میں لٹا دینا چاہا -

اس واقعہ میں متعدد باتیں قابل غور ہیں :

( ۱ ) رومیوں نے حملے کی طیاریاں کیں تو اسلام و امت کی حفاظت کیلئے دفاع کرنا ہر مسلمان پر فرض ہو گیا - موسم سخت گرمی کا تھا - سفر در دراز کا - بے سروسامانی حد درجہ کی - مقابلہ اس حکومت سے جو نصف دنیا پر حکمران تھی - حجاز میں فصل پک چکی تھی اور کٹائی کا اصلی وقت تھا - یہی فصل ملک کیلئے سال بھر کی خوراک تھی -

معلوم ہے کہ آج تک نہ کسی نے ایسا کہا ، نہ یہ مطلب سمجھا ، نہ قضاہ و اذان کیلئے کوئی شرعی اشتراط ملک و نسل کا تسلیم کیا گیا ہے ۔  
 پس جو مطلب اُن در باتوں کا ہے ، وہی خلافت قریش کا بھی ہے ۔  
 یا تو یہ بیان حال ہے ۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایسا ہوا کہ آپ خود قرشی تھے اور مسلمانوں کے امیر و رئیس کل ۔ قضاہ پر اکثر انصار مامور ہوئے ، اور اذان حضرت بلال دیتے تھے ۔ پس ” الملک فی قریش “ و ” القضاہ فی الانصار “ و ” الاذان فی الحبشہ “ کی تقسیم ہوگئی تھی ۔ یا آئندہ کی نسبت خبر ہے کہ حکومت قرشیوں کے ہاتھ میں رہیگی ، قضاہ پر انصاری مامور ہونگے ، اور اکثر ایسا ہوگا کہ موذن حبشی ہوں ۔ کوئی خاص آنے والا عہد پیش نظر ہوگا ۔ اسی کی نسبت یہ خبر آپ کی زبان مبارک پر طاری ہوگئی ۔

( ۷ ) اس حدیث کے جومتون و اسناد صحیحین نے اختیار کیے ہیں ، اُنکے بعد سب سے زیادہ مشہور روایت یہ ہے جسکو ابو داؤد طیالسی ، امام احمد ، ابو یعلیٰ ، طبرانی ، وغیرہم نے حضرت ابو ہریرہ اور انس سے روایت کیا ہے ” الائمة من قریش ما حکموا فعدلوا ، و وعدوا ، فوفوا ، واسترحموا “ اور طبرانی نے حضرت علی سے مرفوعاً روایت کیا ہے ” الا ان الامراء من قریش ما اقاموا ثلاثا “ الخ ۔ اسی متن کو امام بخاری نے تاریخ میں اور طیالسی و ہزار نے مسند میں حضرت انس سے یوں بھی روایت کیا ہے ” الائمة من قریش ما اذا حکموا فعدلوا “ نسائی و حاکم نے بھی ایک دوسرے طریق سے یہ روایت لی ہے ۔ حاصل ان سب کا یہ ہے کہ فرمایا ۔ امرا اور ائمہ قریش میں سے ہیں ۔ جب تک ان میں عدل گسٹری ، ایفاء عہد ، اور رحم و شفقت کے اوصاف باقی رہینگے ۔

اس حدیث سے بھی ثابت ہوگیا کہ قریش کی خلافت اہلیت و صلاحیت کے ساتھ مشروط تھی ۔ یعنی پہلے ہی سے کہ دیا گیا تھا کہ جب تک صفات حسنہ اُن میں باقی رہینگے ، خلافت انہی کے قبضہ میں رہیگی ۔ یہ بات نہ تھی کہ تشریعاً ہر حال میں خلافت کو انہی کا حق بتلایا ہو ۔

( ۸ ) اس سے بھی بڑھکر یہ کہ بعض روایات میں قریش کی نسبت بصورت ظلم و جور و عدم اتباع شریعت ، سخت کلمات رعید بھی آئے ہیں ۔ حتیٰ کہ کلمۃ ” لعن “ بھی آیا ہے ۔ یہ بھی صاف صاف موجود ہے کہ

محدود کر دینا ہے۔ ”جہاد“ کے معنی اکمال درجہ کوشش کرنے کے  
ہیں قرآن و سنت کی اصطلاح میں اس کمال سعی کو جو ذاتی اغراض کی  
 جگہ حق پرستی اور سچائی کی راہ میں کی جائے ”جہاد“ کے لفظ سے  
 تعبیر کیا ہے۔ یہ سعی زبان سے بھی ہے، مال سے بھی ہے، صرف رقت  
 و عمر سے بھی ہے، محنت و تکالیف برداشت کرنے سے بھی ہے، اور  
 دشمنوں کے مقابلے میں لڑنے اور اپنا خون بہانے سے بھی ہے۔ جس  
 سعی کی ضرورت ہو، اور جو سعی جسکے امکان میں ہو، اُس پر فرض ہے۔  
 اور جہاد فی سبیل اللہ میں لغۃ و شرع، دونوں اعتبار سے داخل۔  
 یہ بات نہیں ہے کہ ”جہاد“ سے مقصود مجرد لڑائی ہی ہو۔ جہاد تو دل  
 سے بھی ہے، زبان سے بھی ہے، ہاتھ سے بھی ہے۔ دشمنوں کی  
 فوج سے ایک خاص رقت ہی میں مقابلہ ہو سکتا ہے، لیکن ایک مومن  
 انسان اپنی ساری زندگی اور زندگی کی ہر صبح و شام جہاد حق میں بسر  
 کرتا ہے ”المجاهد من جاهد نفسه فی ذات اللہ“ و المہاجر من ہجر  
 ما نہی اللہ عنہ“ سورۃ فرقان میں ہے فلا تطع الکافرین و جاهد ہم بہ جہاداً  
 کبیراً (۲۵ : ۵۵) یعنی کفار کے مقابلہ میں کمال درجہ جہاد کر۔ سورۃ  
 فرقان بالاتفاق مکی ہے، اور معلوم ہے کہ جہاد بالسیف یعنی لڑائی کا  
 حکم ہجرت مدینہ کے بعد ہوا۔ پس مکی زندگی میں کونسا جہاد تھا  
 جس کا اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے ؟ جہاد بالسیف تو ہو نہیں  
 سکتا۔ یقیناً وہ حق کی استقامت اور اسکی راہ میں تمام مصیبتیں اور  
 شدتیں جھیل لینے کا جہاد تھا۔ مکی زندگی میں جس طرح یہ جہاد جاری  
 رہا، معلوم ہے۔ حق کی راہ میں دنیا کی کسی جماعت نے ایسی تکلیفیں  
 اور مصیبتیں نہیں اٹھائیں، جیسی اللہ کے رسول اور اُسکے ساتھیوں نے  
 مکی زندگی میں۔ اسی پر جہاد کبیر کا اطلاق ہوا۔ اسی طرح منافقوں کے  
 ساتھ بھی جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ”جاہد الکفار و المنافقین و اغلظ علیہم  
 (۹ : ۶۶) حالانکہ منافق تو خرد اسلام کے ماتحت مقہورانہ و محکومانہ زندگی  
 بسر کر رہے تھے۔ جنگ و قتال کی ضرورت ہی نہ تھی، اور نہ اُنسے جنگ  
 کی گئی۔ سو یہ جہاد بھی تبلیغ حق و اتمام حجت و مقارمۃ فساد کا جہاد تھا  
 جو قلب و زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ بخاری و ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت  
 عائشہ نے پوچھا ”علی النساء جہاد ؟“ کیا عورتوں کیلئے بھی جہاد ہے ؟  
 فرمایا ”نعم جہاد“ لا قتال فیہ۔ الحج و العمرہ“ ہاں، جہاد ہے مگر اسمیں

نکل جاتا ، تو جس گوشۂ عالم میں پہنچ جاتا ، ایک عالم اُسکے ساتھ ہو جاتا اور اپنی حکومت قائم کر لیتا ۔ گویا ہر قرشی کے وجود میں ایک خلافت پنہاں تھی ۔ ایک اموی شہزادہ شام کے قتل عام سے بچ کر نکلا اور افریقہ ہو کر یورپ جا پہنچا ۔ وہاں پانچ صدیوں تک کیلیے اسپین کی عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم ہو گئی ۔ لیکن جب عرب و قریش کے تنزل و ادبار کا وہ آخری وقت آگیا کہ ہر قرشی بھی دنیا میں حکمرانی کے اہل و لائق باقی نہ رہے ، تو تاریخ خلافت نے معاً صفحہ اُلٹ دیا ، اور یکقلم غیر عربی و غیر قرشی خلافت کا دور شروع ہو گیا ۔ ر کان وعداً مفعولاً !

( ۶ ) اشتباہ و اضطراب کے تمام پردے اُٹھ جاتے ہیں جب ترمذی کی وہ روایت سامنے آجاتی ہے جس میں امارت قریش کے ساتھ دو اور باتوں کا بھی ذکر ایک ہی سلسلے اور ایک ہی اسلوب میں کیا گیا ہے ، اور گویا روایت امارت کے متن کا وہ ایک متمم و مکمل ٹکڑہ ہے جو بقیہ طرق میں رہ گیا تھا ، اس طریق میں مل جاتا ہے تا کہ اسکو جوڑ کر مضمون حدیث کامل کر لیا جائے ۔ قریش والی حدیث اگرچہ مختلف زاریوں سے مرزی ہے ، لیکن سب سے زیادہ اور مشہور طرق ابو ہریرہ ، جابر بن سمرہ ، اور ابن عمر پر جا کر ختم ہوتے ہیں ۔ اور امام مسلم ، احمد ، ابو داؤد طیالسی ، بزار ، طبرانی کے تمام طریق تو حضرت ابو ہریرہ ہی کی روایت سے نکلے ہیں ۔ انہی ابو ہریرہ سے بطریق ابو مریم انصاری ترمذی نے روایت کیا ہے : ” المملک فی قریش ، والقضاء فی الانصار ، والاذان فی الحبشہ “ ( اسنادہ صحیح ) اور امام احمد کثیر بن مرہ سے یوں روایت کرتے ہیں ” الخلافة فی قریش ، والحکم فی الانصار ، والدعوة فی الحبشہ “ ( رجالہ موثقون ۔ و ایضاً رواہ الطبرانی و البزار من وجہ آخر )

اس روایت میں ایک ساتھ تین باتوں کا ذکر ہے ۔ خلافت قریش میں ۔ قضاء و حکم انصار میں ۔ اذان و دعوة اہل حبش میں ۔ پس جو معنی ایک بات کے ہونگے ، وہی بقیہ دو کے ہونگے ۔ اور جو مطالب دو باتوں کا ہوگا ، وہی پہلی بات کا بھی ہوگا ۔ اگر پہلی بات ( یعنی قریش کی حکومت ) بیان حال اور پیشین گوئی نہیں ہے ۔ امر و تشریع ہے ۔ تو بقیہ دو جملوں کو بھی امر و تشریع قرار دینا پڑیگا ۔ یعنی ماننا پڑے گا کہ قاضی ہمیشہ انصاری ہی ہونا چاہیے ، اور مؤذن بجز حبشی کے دوسرا ہو نہیں سکتا ۔ لیکن

( ۳ ) اسلام کے احکام کا قبولیت توبہ کے بارے میں جو حال ہے معلوم ہے ۔ خدا کا دروازہ رحمت کسی آنے والے کا اتنا انتظار نہیں کرتا ، جسقدر اس مضطرب روح کا جو توبہ کیلئے اُسکی طرف بڑھے ۔ ” لو اخطاتم حتی تملأ خطایاکم ما بین السماء و الارض “ ثم استغفرتم ” اللہ یغفر لکم “ ( رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ ) اگر تم نے اتنے گناہ کیے ہوں کہ زمین و آسمان کا فاصلہ انسے بھر دیا جاسکے ، پھر بھی توبہ کا آنسو بہاتے ہوئے آؤ تو دروازہ مغفرت کھلا پاؤ گے ۔ لیکن دیکھو ، امت کی حفاظت و مدافعت سے غفلت کرنا اللہ کی نظروں میں کیسا سخت جرم ہے کہ یکایک توبہ بھی قبول نہوئی ۔ تینوں صحابی آپکی واپسی کے بعد پہلی ہی صحبت میں عفو تقصیر کیلئے حاضر ہو گئے تھے ، مگر حکم ملا کہ ابھی نہیں ۔ انتظار کرو ۔ پچاس دن سزاؤ و عقوبت کے گذر چکے تب کہیں توبہ قبول ہوئی !

( ۴ ) جب اُن پاک انسانوں کا یہ حال ہوا کہ ایمان اُنکا ایمان تھا ، اور نیکیاں اُنکی نیکیاں ۔ اُن کے بستر خواب کے اجر و ثواب کا بھی ہماری بڑی بڑی عبادتیں مقابلہ نہیں کر سکتیں ، تو خدا را بتلاؤ ، ہم بدبختوں اور سیہ کاروں کا کیا حشر ہوگا کہ نہ ایمان کی دولت ساتھ ہے نہ طاعت و حسنات کی پونجی دامن میں ۔ زندگی یکسر برباد غفلت و معصیت ، اور عمریں یکقلم تاراج نفس پرستی و نافرمانی ۔ وہاں عزم و ایمان کے ساتھ سہو و نسیان تھا مگر عذر قبول نہ ہوا ۔ یہاں اعراض و نفاق کے ساتھ صریح نافرمانی و انکار ہے اور پھر نہ ندامت ہے نہ توبہ و انابت ! اُنکے ساتھ سب کچھ تھا اور کام نہ آیا ۔ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے ۔ پھر کیا ہے جس نے آنے والے دن کی طرف سے ہماری روحوں کو بے فکر کر دیا ہے اور ہمارے غافل دلوں پر بیخوفی کی موت چھا گئی ہے ؟ بتلاؤ ، زمین و آسمان میں کون ہے جو اُس دن ہمیں بچا سکیگا جب خدا کے غضب کا ہاتھ ہماری طرف بڑھیگا ؟ یقول الانسان یومئذ این المفر ؟

( ایک عام غلط فہمی )

البتہ یاد رہے کہ ” جہاد “ کی حقیقت کی نسبت سخت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جہاد کے معنی صرف لڑنے کے ہیں ۔ مخالفین اسلام بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ۔ حالانکہ ایسا سمجھنا اس عظیم الشان مقدس حکم کی وسعت کو بالکل



ہیں کہ الفاظ حدیث میں صورت خبر کی ہے - امر کی نہیں - اور جب کوئی دلیل قوی و ظاہر موجود نہیں - نہ قرآن میں ، نہ سنت میں ، نہ اقوال صحابہ میں ، تو پھر کیا مجبوری پیش آئی ہے کہ یہ تاریخات اختیار کی جائیں ، اور نص کو بلا وجہ ظاہر و منطوق سے مصروف کیا جائے ؟

( ۱۰ ) اس حدیث کی تمام روایات و طرق پر ہم نے نظر ڈال لی - اب صرف دو روایتیں آر رہ گئیں جو مناقب قریش میں آئی ہیں ، اور جن سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے - بیہقی و طبرانی نے جبیر بن مطعم اور ابن سائب سے روایت کیا ” قدموا قریشاً و لا تقدموها “ یعنی قریش کو مقدم رکھو - یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ قریش کو ہر بات میں آگے رکھو - خود پیچھے رہو -

لیکن قطع نظر قوت و ضعف روایت کے ، اس سے بھی یہ بات نہیں نکلتی کہ قریش کے سوا دوسرے کی خلافت جائز نہیں - قریش کو عرب میں ہر طرح تقدیم و ریاست حاصل تھی - لوگ انکی ریاست سے متاثر تھے - پس فرمایا کہ اس بات کا لحاظ رکھا کرو - اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ امامت و خلافت کے حقدار ہمیشہ قریش ہی ہیں ؟

دوسری روایت امام احمد نے عمرو بن العاص سے روایت کی ہے - آنحضرتؐ نے فرمایا ” قریش قادة الناس “ قریش لوگوں کے سردار ہیں - لیکن اسکو بھی اختصاص خلافت کے سوال سے کوئی تعلق نہیں - یہ تو معلوم ہے کہ سردار قوم تھے - لیکن اسکا حکم کہاں ہے کہ مسلمانوں کا خلیفہ صرف انہی میں سے ہو سکتا ہے ؟ کیا ایک ایسے اہم مسئلہ کیلئے اس طرح کی باتیں ” نص “ کا کام دیسکتی ہیں ؟

( ۱۱ ) باقی رہی حدیث ” الاثمة من قریش “ اور یہ استدلال کہ حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ بنی ساعدہ کے مجمع میں بر خلاف انصار پیش کی اور سب نے تسلیم کر لیا ، تو اس سے بھی شرعاً اختصاص قریش کے دعوے کو کوئی مدد نہیں مل سکتی -

اولاً ، یہ الفاظ اور حضرت ابوبکرؓ والی روایت بطریق اتصال ثابت ہی نہیں - فتح الباری میں ہے ” الاثمة من قریش - رجالہ رجال الصحیح لکن فی سندہ انقطاع “ ( ۱۰۱ : ۱۳ )

ثانیاً ، اس سے بھی یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ خلافت کا شرعاً حق بجز قریش کے اور کسی مسلمان کو نہیں ؟ یہ بھی آئندہ کی نسبت خبر ہے ،

زبان ہمیشہ اعلان حق، و دعوت الی اللہ، اور دفع و مقاومت کفر و ضلالت میں مشغول رہتی ہے۔ اُنکے ہاتھ اور اُنکے تمام جوارح کبھی اس راہ کی سعی و محنت سے نہیں تھکتے۔ اسکے بعد جہاد کا کونسا کام رہ گیا جو انہوں نے نہیں کیا؟ اور کونسا مرتبہ رہ گیا جو انہوں نے نہیں پایا؟ و دالک فصل اللہ یوریدہ من یشاء و اللہ دوا فصل العظیم!

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا  
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں؟

جہاد کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کرو، کہ انسانی اعمال کی کونسی بڑائی اور عظمت ہے جو اسکے دائرہ سے باہر رہ گئی؟ اور نوع انسانی کی ہدایت و سعادت کا کونسا عمل حق ہے جو اسکے بغیر انجام پا سکتا ہے؟ پس یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اسکی اہمیت و فضیلت پر اسقدر زور دیا کہ ساری نیکیاں ساری عبادتیں اس سے پیچھے رہ گئیں۔ سب کا حکم شاخوں کا ہوا۔ جڑ یہی عمل قرار پایا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل فضیلت ہو سکتی ہے کہ خود اللہ کے رسول نے فرمایا: ”الذی نفسی بیدہ“ لودت نبی اقل فی سبیل اللہ ثم احیا، ثم اقل ثم احیا، ثم اقل ثم احیا، ثم اقل“ رواہ البخاری، خدا کی قسم! اگر ممکن ہوتا تو میں یہ چاہتا کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں۔ پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں۔ پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ ہوں۔ تاکہ اُسکی راہ میں جان دینے کی لذت و سعادت ایک ہی مرتبہ میں ختم نہ ہو جائے!

تمنت سلیمہ ان نموت بحبہا  
واہون قبی عذنا ما تمنت!

( احکام قطعیدۃ دفاع )

غرضکہ ”دفاع“ اسلام کے اُن بنیادی حکموں میں سے ہے، جنکو ایک مسلمان مسلمان رہ کر کبھی ترک نہیں کر سکتا۔ اگر ایک مسلمان کے دل میں رائی برابر بھی ایمان کی محبت باقی رہ گئی ہے، تو اُسکی طاقت سے باہر ہے کہ اللہ کی یہ صدائے حق سنے، اور اُسکا قلب غافل چوبک نہ اُٹے: یا ایہا الذین آمنوا! مالکم اذا قیل لکم انفرورا تم سے کہا جاتا ہے ”اللہ کی راہ میں نکل

اللہ تعالیٰ اپنی سنت عادلہ کے مطابق ایسے لوگوں کو اُنپر مسلط کر دیگا جنکا تسلط اُنکے لیے سخت اذیت و عقوبت کا موجب ہوگا۔ چنانچہ طبرانی کی سابق الذکر روایت ”ما اقاموا ثلاثاً“ الخ میں یہ بھی ہے ”فمن لم يفعل ذلك فعليه لعنة الله“ یعنی تین رصف عدالت، ایفاء عہد، اور رحم و شفقت کے بیان کر کے فرمایا۔ اور جس نے ایسا نہ کیا تو اسپر اللہ کی پھٹکار۔ اور احمد و ابو یعلیٰ نے حضرت ابن مسعود سے مرفوعاً روایت کیا ”یا معشر قریش! انکم اهل هذا الامر ما لم تحدثوا“ فاذا غیر تم، بعث اللہ علیکم من یلحاکم کما یلحی القضیب“ (رجالہ ثقات الا انه من رواية عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بن مسعود، عن عم ابیہ عبد اللہ ابن مسعود، و لم یدرکہ۔ و ایضاً أخرجه احمد عن ابی مسعود الانصاری من طریق عبید اللہ و فی سماعہ نظر، و له شاهد من مرسل عطاء بن یسار۔ أخرجه الشافعی و البیہقی بسند صحیح) یعنی اے جماعت قریش! جب تک تم کوئی نئی روش اختیار نہ کرو، تم ہی اس بات کے اہل ہو۔ لیکن اگر تم نے اپنی حالت بدل دی تو یاد رکھو۔ اللہ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دیگا جو تم کو چھڑی کی طرح موڑ دینگے۔

پس ان روایات سے دونوں باتوں کی مزید تصدیق ہو گئی۔ اول یہ کہ خلافت قریش کے تمام بیانات محض خبر ہیں۔ تشریع و امر نہیں۔ ثانیاً، پہلے سے خبر دیدی گئی ہے کہ ہمیشہ خلافت انہی میں نہیں رہیگی۔ چنانچہ حرف بہ حرف یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اور قریش پر یکے بعد دیگرے ایسے لوگ مسلط ہوئے، جنہوں نے انکا سارا زور توڑ دیا۔ حتیٰ کہ حکومت قریش کا دنیا میں نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ فصلی اللہ علی الصادق المصدوق الذی لا ینبخر عن شیء، الا رجاء مثل فلق الصبح!

(۹) چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے خلافت کو قریش میں مخصوص ثابت کرنا چاہا، انکو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ان تمام روایات کا منطوق خبر کا ہے نہ کہ امر کا۔ اور کوئی حدیث ایسی قوی ظاہر الدلالة موجود نہیں جس سے انکا مدعا ثابت ہو سکے۔ وہ مجبور ہوئے ہیں کہ انہی احادیث کو تاویل و توجیہ کر کے امر پر محمول کریں۔ حافظ ابن حجر نے قرطبی کی نسبت لکھا ہے ”کانہ جنم الی انہ خدع بمعنی الامر“ (۱۳: ۱۰۵) اور ابن منیر نے کہا ”والحدیث وان کان بلفظ الخبر فہو بمعنی الامر کانہ قال ائتوا بقریش خاصہ“ (ایضاً) پس اسپر سب متفق

لڑنا نہیں ہے - حج اور عمرہ - اس حدیث میں اُس سعی اور ترک وطن کی ~~معصیت~~ کو جو حج و عمرہ میں پیش آتی ہے ' عورتوں کیلئے جہاد فرمایا ' اور کہا ایسا جہاد جسمیں لڑائی نہیں - اُس سے معلوم ہوا کہ لڑائی کے الگ کر دینے کے بعد بھی حقیقت "جہاد" باقی رہتی ہے -

اگر اُمت کیلئے دفاع و جنگ کا وقت آگیا ، یا کسی جماعت مفسدین ارض پر امام نے حملہ کیا ، تو ایسے وقتوں میں بھی صرف نفس جنگ ہی نہیں بلکہ سعی و کوشش کی ساری بانیں شریعت کے نزدیک جہاد ہیں - جسکی طاقت میں جنگ کرنا نہیں ہے اور اُس نے مال دیا تو رہ بھی مجاہد ہے - جس نے زبان سے دُعا و تبلیغ کی رہ بھی مجاہد ہے - جس نے اس راہ میں اور کسی طرح کی تکلیف و محنت اُٹھائی ، رہ بھی مجاہد ہے - البتہ اسے وقتوں میں اگر کوئی مسلمان لڑائی کی طاقت رکھتا ہے اور اس سے پہلے ہی کہے ' تو اُسکا کوئی عذر نہیں سنا جائیگا - اسکا شمار مومنوں کی جگہ مدافعوں میں ہوگا - جو مال دے سکتا ہے اور نہ دیا ، اور نہ بھی ایمان و اخلاص کی زندگی سے نکل گیا - زمین پر گو مسلمان کہلائے پر اللہ کے حضور مذاق کہلائیگا - جس شخص کی زبان اعلان حق اور دُعا الی الجہاد میں کھل سکتی ہے مگر نہ کھلی ، تو اُس نے بھی ایمان چھوڑ کر نفاق کی راہ اختیار کر لی - گو شیطان حیل و نفس خادع اسکو ہزاروں فریب دیتا رہے - "افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائز" (رواہ الترمذی و ابو داؤد و ابن ماجہ و ابن حبان) سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والا جہاد وہ کلمۃ حق ہے جو شاہان جور و ظلم کے سامنے بے ہنگام کہا جائے -

اور پھر ان سب سے بالا تر مرتبہ اُن مجاہدین کا ملین اور اصحاب عزیمتہ عمل کا ہے ، جنکی زندگی سرتا سر جہاد فی سبیل اللہ ، اور جنکا وجود یکسر خدمت حق ، و شیفگی صدق ، و عشق دُعا ہے - جو اس عمل مقدس کیلئے کسی خاص صدائے نفیر اور اعلان رقت کے منتظر نہیں رہتے - بلکہ ہر صبح جو اُپڑ آتی ہے ، جہاد فی سبیل اللہ کی صبح ہوتی ہے ، اور ہر شام کی تاریکی جو اُپڑ پھیلتی ہے ، وہ اسے راہ کی شام ہوتی ہے - انکی زندگی پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جو جہاد کے مرتبہ علیا و فضیلة عظمیٰ کے اجر و ثواب سے خالی ہو - کائنات ہستی کے ہر عمل کی طرح یہ عمل بھی تین عنصروں سے مرکب ہے - دل ، زبان ، اعضا و جوارح - سو انکا دل ہمیشہ عشق حق اور عزم مقصد کی آتش شوق میں پھنکتا رہتا ہے - انکی

# فصل

( دعوتِ اجماع )

اب صرف ایک بات رہگئی - یعنی علماء اسلام کا شرط قرشیہ پر زور دینا ، اور قاضی عیاض وغیرہ کا دعوتِ اجماع ، تو اس بارے میں چند امور قابل غور و نظر ہیں :

اولاً اس امر کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ صحابہ خلافت کا شرعاً مستحق صرف قریش ہی کو یقین کرتے تھے ، بلکہ اسکے خلاف شواہد موجود ہیں - امام احمد نے حضرت عمر کا قول نقل کیا ہے - اگر معاذ بن جبل میری وفات تک زندہ رہے تو اپنے بعد انہی کو خلیفہ بنائوں گا - یہ ظاہر ہے کہ معاذ قرشی نہ تھے - انصار مدینہ میں سے تھے - اگر خلافت کیلئے قرشیہ شرط ہوتی تو حضرة عمر جیسا محرم اسرار خلافت کیونکر انکی خلافت کا تصور بھی کرسکتا تھا ؟ مسند امام احمد میں حضرة عمر کا ایک اور قول بھی ابرارافع کی روایت سے موجود ہے ”لو ادرکني احد رجلین ثم جعلت هذا الامر اليه“ اور ثقّت به - سالم مولیٰ حذیفہ و ابو عبیدۃ الجراح “ اگر سالم مولیٰ حذیفہ اور ابو عبیدۃ الجراح میں سے کوئی ایک میری وفات تک زندہ رہتا اور خلافت اُسکے سپرد کردیتا ، تو مجھے اس بارے میں پورا اطمینان و اعتماد ہوتا - اگر حضرة عمر صدها صحابہ و مہاجرین قریش کی موجودگی میں سالم مولیٰ حذیفہ کو خلافت سپرد کردینے کا ارادہ کرسکتے ہیں ، تو پھر کیسے بارر کیا جاسکتا ہے کہ شرعاً خلافت غیر قرشی کو نہیں ملسکتی اور صحابہ کا اس پر اجماع ہوگیا تھا ؟

چنانچہ اس بات کا خود آئمۃ متاخرین کو اعتراف کرنا پڑا - حافظ ابن حجر قاضی عیاض کا قول نقل کرکے لکھتے ہیں ”قلت و یحتاج من نقل الاجماع الی تاریخ ما جاء عن عمر من ذلك - فقد اخرج امام احمد عن عمر بسند رجاله ثقات ان ادرکني اُجلی الخ“ ”إلی ان قال فیحتمل ان یقال لعل الاجماع انعقد بعد عمر علی اشتراط ان یكون الخلیفۃ قرشیاً“ اور تغیر اجتہاد عمر فی ذلك - و اللہ اعلم “ ( ۱۳ : ۱۰۶ ) یعنی یہ جو قاضی عیاض نے کہا کہ خلافت کے مخصوص



اور اسی بنا پر مسلمانوں کا فرض تھا کہ اگر دنیا کے کسی ایک اسلامی حصہ پر غیر مسلم حملہ کریں اور وہاں کے مسلمان اُنکے مقابلہ کی کافی قوت نہ رکھتے ہوں، یا بالکل مغلوب و مقہور ہو گئے ہوں، تو تمام دوسرے حصص عالم کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ انکی یارپی و اعانت کیلئے اُسی طرح اُتھ کھڑے ہوں۔ جس طرح خود اپنی آبادیوں کی حفاظت کیلئے اُتھتے۔ اور اپنی جان و مال سے اُسی طرح مدد دیں، جس طرح خود اپنے گھر بار کی حفاظت کیلئے مدد دیتے۔

یہ نہ کوئی نیا مذہبی اجتہاد ہے، نہ کوئی پولیٹیکل فتویٰ۔ تمام دنیا کے مسلمان فقہ و قوانین شریعت کی جو کتابیں صدیوں سے پڑھتے پڑھائے آئے ہیں، اور جو چھپی ہوئی بازاروں میں ہر جگہ ملتی ہیں، اور جن پر خود ہندوستانی عدالتوں میں عمل کیا جا رہا ہے، اُن سب میں یہ احکام موجود ہیں۔ اسلامی دینیات کا کوئی طالب علم ایسا نہیں ملیگا جو ان حکموں سے بے خبر ہو۔ اور پھر ان سب کے اوپر مسلمانوں کی کتاب اللہ ہے جو اپنے ہر پارہ اور ہر سورۃ کے اندر اس حکم کا اعلان اور اس قانون کی پکار تیرہ صدیوں سے بلند کر رہی ہے۔ نوع انسانی کی کامل بیس نسلیں گزر چکیں، اور یہ احکام اپنی یکساں، غیر مبدل، اٹل، اور لا انتہا طاقت کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں!

”جہاد“ کی بہت سے قسموں میں سے ایک قسم ”قتال“ یعنی لڑائی ہے۔ اور اُسکی بھی دو صورتیں ہیں۔ ”ہجوم“ اور ”دفاع“۔ یعنی افسو (Offensive) اور دیفنسو (Defensive) دراصل ہجوم کی بنیاد بھی دفاع ہی ہے۔ یعنی جب تک دنیا میں عالمگیر صلح و امن اور عام اخوت قائم نہ ہو جائے، ضروری ہوا کہ حریف و مفسد قوتوں سے ہمیشہ مقابلہ جاری رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائیگا تو دشمن مسلمانوں کو چین سے بیٹھنے نہ دینگے اور اسلام کی اشاعت اور اسکے مشن کی تبلیغ و تکمیل میں ہمیشہ مانع ہونگے۔

فقہاء کی اصطلاح میں فرائض شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ”کفایہ“ اور ”عین“۔ یہ وہی اعمال انسانی کی قدرتی تقسیم ہے جسکو ”جماعتی فرائض“ اور ”شخصی فرائض“ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ”فرض

اور انہی حدیثوں کا ایک ٹکڑہ ہے جو دوسرے طریقوں سے صریح پیشین گوئی کے لفظوں میں پتہ چکے ہو۔ حضرت ابوبکر نے یہ بات اسلیے پیش کی تھی کہ پیشتر سے ہونے والے واقعات کی خبر دیدی گئی ہے۔ پس ایسا ہی ہونا ضروری ہے۔ اس کے خلاف بات نہ اٹھاؤ۔ یہ سنکر انصار مایوس ہو گئے اور تسلیم کر لیا۔

ثالثاً ”الذاس تبع لقریش“ والی روایت سے مدد لی جائے تو بالکل کھل جاتا ہے کہ سقیفہ میں حضرت ابوبکر کا استدلال صرف قریش کی بزرگی و عظمت اور عرب میں ان کی ریاست و سرداری سے تھا۔ نہ کہ شرعاً شرائط امامت سے۔ وہ بتلانا چاہتے تھے کہ خود آنحضرت نے فرمادیا ہے۔ جاہلیۃ اور اسلام دونوں میں لوگ قدرتی طور پر قریش کی سرداری سے متاثر ہیں اور رہینگے، اسلیے یہ معاملہ بھی انہی کے قبضہ میں رہیگا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر کا یہ مشہور جملہ اس مطلب کو پوری طرح کھول دیتا ہے جو سقیفہ میں کہا تھا ”ان العرب لا تعرف هذا الامر لغير هذا الحي“ یعنی اہل عرب قریش کے سوا اور کسی قبیلہ کی سرداری سے آشنا نہیں۔ پس یہاں سرے سے شرائط شرعیہ کا سوال ہی نہ تھا۔ صرف ملکی و رقتی مصالح کی بنا پر استدلال تھا کہ کس قبیلہ و خاندان سے امام ہونا چاہیے جسکی سرداری عرب کے تمام قبائل بلا چون و چرا تسلیم کر لیں؟

رابعاً، یہی روایت بعض دیگر طرق سے صاف صاف خبر کی صورت میں آئی ہے۔ امر و تشریع کی اسمیں گنجائش ہی نہیں۔ ابن اسحاق نے کتاب الکبیر میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر نے سقیفہ کے مجمع میں فرمایا ”ان هذا الامر في قریش ما اطاعوا الله واستقاموا على امره“ (فتح ۱۳ : ۱۰۳) یعنی یہ بات قریش میں رہیگی جب تک وہ اللہ کی اطاعت کریں گے اور اسمیں مستقیم رہیں گے۔ پس معلوم ہوا کہ امام احمد والی روایت میں راوی نے بقیہ ٹکڑہ چھوڑ دیا ہے۔ صرف ”الاۃ من قریش“ لے لیا۔ ورنہ حضرت ابوبکر نے وہی بات فرمائی تھی جو دیگر احادیث مرفوعہ میں بطور خبر کے ثابت ہو چکی ہے۔ علی الخصوص بخاری کی روایت معاریہ میں۔



فِي سَبِيلِ اللَّهِ ،  
 إِذَا قُلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ  
 ارْضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا  
 مِنَ الْآخِرَةِ ؟ فَمَا مَتَاعُ  
 الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ  
 الْاَقْلِيلُ - [ ۳۹ : ۹ ]

کہتے ہو " تو تمہارے قدموں میں حرکت  
 نہیں ہوتی اور زمین پر ڈھیر ہو جاتے  
 ہو ؟ کیا تم نے آخرت چھوڑ کر صرف دنیا  
 ہی کی زندگی پر قناعت کر لی ؟ اگر  
 یہی بات ہے تو یاد رکھو ، جس زندگی  
 پر رجوع بیٹھے ہو ، وہ تو آخرت کے مقابلہ میں  
 بالکل ہی ہیچ ہے !

اسکے بعد فرمایا :

الَا تَنْفَرُوا ، يَعْذِبُكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا  
 رِيَسْتَبْدِلَ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ،  
 وَلَا تَضُرُّهُ شَيْئًا - رَ اللّٰهُ عَلَى  
 كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ! ( ۳۰ : ۹ )

یاد رکھو ! اگر تم نے حکم الہی سے سرتابی  
 کی ، اور وقت کے آنے پر بھی راہ  
 حق میں کمر بستہ نہ ہو ، تو اللہ نہایت  
 ہی سخت عذاب میں ڈال کر اسکی سزا  
 دیگا ، اور تمہارے بدلے کسی دوسری قوم کو خدمت اسلام کیلئے کہتا کر دیگا -  
 تم چھانت دیے جاؤ گے - کلمۂ حق تمہارا محتاج نہیں ہے - تم ہی اپنی  
 زندگی و نجات کیلئے اسکے محتاج ہو !

اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت ، آنکی حکومتوں کے مٹانے ، اور آنکی  
 آبادیوں اور شہروں کو آپسمیں بانٹ لینے کیلئے کفار ایک دوسرے کے  
 ساتھی اور حامی ہیں :

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ  
 أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ -  
 جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی تو وہ ایک  
 دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہیں -

مسلمانوں کی مخالفت میں خزانوں کے خزانے خرچ کر دالتے ہیں :

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَنْفَقُونَ أَمْوَالَهُمْ  
 لِيَصُدَّوْا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ -  
 جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ، تو وہ حق  
 کی مخالفت میں اپنا مال خرچ کر رہے ہیں -

پس مسلمانوں کی بھی سب سے بڑی اسلامی و ایمانی خصلت یہ  
 قرار پائی کہ :

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ  
 أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ - ( ۷۲ : ۹ )  
 مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں باہم  
 ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں !

اندلس اور افریقہ میں عبد المومن صاحب ابن توہمرت نے خلافت کے دورے کے ساتھ حکومت قائم کی اور اُسکی نسل میں عرصہ تک قائم رہی۔ ابن توہمرت کی نسبت کون کہہ سکتا ہے کہ معتزلی تھا؟ وہ امام غزالی کا شاگرد اور پکا اشعری تھا۔ عقائد اشاعرہ میں اسکا ایک رسالہ موجود ہے۔ مراکشی نے تاریخ مراکش میں تصریح کی ہے کہ بلاد مغرب میں اشعریۃ اُسکے ذریعہ پہنچی اور اسی لیے خاندان عبد المومن کا سرکاری مذہب ہمیشہ اشعری رہا۔ لیکن یہ لوگ بھی قرشی نہ تھے۔ علامہ بریس خود ائمۃ اشاعرہ میں سے بعض نے اس شرط سے انکار کیا ہے۔ جیسا کہ امام ابوبکر باقلانی کی نسبت ابن خلدون نے تصریح کی ہے۔ پس غور کرنا چاہیے کہ جس اجماع کی نسبت دعوا کیا جا رہا ہے، اور جو کبھی حضرۃ ابوبکر کی بیعت سے پہلے مجلس سقیفہ میں رونما ہوتا ہے، کبھی وہاں سے درپوش ہو کر سارے گیارہ برس تک مفقود ہو جاتا ہے اور حضرۃ عمر غیر قرشی کے استخلاف کا ارادہ کرنے لگتے ہیں، پھر انکے بعد یکایک نمایاں ہونا چاہتا ہے، لیکن پھر بھی اُسکا کچھہ پتہ نہیں چلتا۔ حتیٰ کہ غیر قرشیوں کو ہزاروں مسلمان خلیفہ مان لیتے ہیں، اور ائمۃ عقائد و کلام مختلف فیہ نظر آتے ہیں، فی الحقیقت اُسکا کوئی وجود ہے بھی یا نہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ نہیں ہے۔

ثانیاً، یہ ظاہر ہے کہ قریش میں خلافت ہونے کی نسبت جو کچھ فرمایا گیا، وہ محض آیندہ کی پیشتر سے اطلاع تھی۔ یعنی پیشین گوئی تھی۔ اور پیشین گوئیوں کا یہ حال ہے کہ جب تک اُنکا ظہور کامل طور پر نہ ہو جائے، اُنکے معانی و مطالب کی نسبت کسی قطعی بات کا اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اجتہاد و قیاس کیلئے کسی چیز میں اتنی وسعت نہیں جسقدر پیشین گوئیوں میں ہوتی ہے۔ علی الخصوص جبکہ عموماً پیشین گوئیوں کا ایک خاص مبہم انداز بیان ہوتا ہے، اور نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ محض اشارات کیے جاتے ہیں۔ جب تک اُنکا ظہور نہ ہو جائے، اشارات کی تفصیل اور اوصاف کے انطباق میں طرح طرح کی لغزشیں پیش آجاسکتی ہیں۔

ظہور دجال کی پیشینگوئی اس معاملہ کیلئے ایک واضح مثال ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کے تمام غیر معمولی اوصاف بیان کر دیے تھے۔ با این ہمہ خود صحابہ کرام میں اختلاف ہوا، اور اپنے عہد کے مختلف اشخاص کو

اقرل لاينبغي ان يفهم منه  
ان الوجوب على جميع  
اهل الارض كافة حتى  
يسقط عن اهل الهند بقيام  
اهل الروم ' ان لا يندفع  
بقيامهم الشر عن الهند  
المسلمين - ر ان قوله  
تعالى قاتلوا الذين يلوونكم  
من الكفار يدل على ان  
الوجوب على اهل كل قطر  
يقربون الكفار - ( مجموعة  
فتح القدير - ۴ : ۲۸۰ )

ہدایہ کی عبارت کا یہ مطلب نہ سمجھا  
جائے کہ اگر ایک ملک کے مسلمانوں نے یہ  
فرض ادا کر دیا تو دوسرے ملک کے مسلمانوں  
پر سے بھی ساقط ہو گیا۔ مثلاً اگر روم کے ترکوں نے  
جہاد قائم رکھا تو ہندوستان کے مسلمانوں پر  
سے ساقط ہو گیا۔ کیونکہ مقصود قیام جہاد سے  
یہ ہے کہ مسلمانوں پر سے دشمنوں کے حملوں  
اور شر کو دور کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ  
مسلمانان روم کے جہاد کرنے سے مسلمانان  
ہند محفوظ نہیں ہو جاسکتے۔ وہ توجہی ہونگے  
جب خود اپنے ملک میں اسکا انتظام کریں۔  
پس مطلب یہ ہے کہ ہر ملک کے مسلمانوں  
پر فرض کفایہ ہے۔ اگر اس ملک کے تمام مسلمانوں میں سے ایک جماعت یہ  
فرض انجام دیتی رہی ' تو وہانکے بقیہ مسلمانوں پر سے ساقط ہو گیا۔ لیکن  
دوسرے ملکوں کے مسلمانوں پر فرضیت باقی رہی۔ قرآن میں ہے :  
قاتلوا الذين يلوونكم من الكفار - اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان  
مسلمانوں پر جو دشمنوں سے قریب ہوں ' قتال واجب ہے۔ انتہی۔

اور فتح الباری میں ہے " ہر فرض کفایۃ علی المشہور " الا ان تدعو  
الحاجة اليه " اسکے بعد کہا " ر ان جنس جہاد الکفار متعین علی کل  
مسلم " إما بیدہ ر إما بلسانہ ر إما بمالہ ر إما بقلبہ " [ جلد ۶ : ۲۸ ] یعنی  
جہاد کی یہ قسم فرض کفایہ ہے۔ باقی رہا نفس جہاد ' تورہ ہر مسلمان  
پر فرض ہے ' کسی کیلئے ہاتھ سے ' کسی کیلئے مال سے ' کسی کیلئے  
دل سے۔

یہ صورت تو اس قتال کی ہے جسکی صورت حملہ و هجوم کی ہوگی ' اگرچہ مقصد اسکا بھی دفاع ہی ہے۔ دوسری قسم " دفاع " ہے۔ یعنی جب  
کوئی غیر مسلم حکومت یا جماعت مسلمانوں کی آبادیوں اور حکومتوں پر  
حملہ کا قصد کرے ' تو اس حملہ و تسلط کو ہر طرح مقابلہ کر کے رکنا ' اور  
اسلامی ملکوں اور آبادیوں کو غیر مسلموں کی حکومت اور ہر طرح کے  
قبضہ و اثر سے محفوظ رکھنا۔



بہ قریش ہونے پر اجماع ہو چکا ہے ، تو اجماع ماننے کی صورت میں حضرة عمر کے قول کی تائید کرنی پڑیگی جو امام احمد نے بسند صحیح معاذ بن جبل کے استخلاف کی نسبت روایت کیا ہے ۔ پھر کہتے ہیں کہ اس کی یوں تائید کی جا سکتی ہے کہ شاید یہ اجماع حضرة عمر کے بعد ہوا ہو ۔ یا یوں کہا جائے کہ حضرة عمر کا اجتہاد اس بارے میں بدل گیا ۔

لیکن یہ تاریخیں جس قدر نا قابل التفات ہیں ، اہل نظر سے مخفی نہیں ۔ ارل توجب اختصاص قرشیۃ کیلئے کوئی نص شرعی موجود نہیں تو تائید کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ ثانیاً کہاں تو یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ حضرة ابوبکر کی بیعت کے وقت سقیفہ کے مجمع ہی میں اس مسئلہ کا فیصلہ ہو گیا ، اور تمام صحابہ نے اجماع کر لیا کہ خلافت کے حقدار صرف قریش ہی ہیں ۔ اور کہاں اب یہ تاریخ کی جاتی ہے کہ حضرت ابوبکر کا پورا زمانہ خلافت گزر گیا اور اجماع نہ ہوا ، حضرة عمر کی زمانہ خلافت کے دس برس گزر گئے اور صحابہ اس حکم سے بے خبر رہے ، لیکن اسکے بعد یکایک اس پر اجماع ہو گیا ؟ پھر اگر اجماع ہوا تو کب ؟ اور کونسی دلیل اس بارے میں موجود ہے ؟

اگر سقیفہ بنی ساعد میں اجماع نہیں ہوا ، نہ خلافت صدیقی کے دہائی سال میں یہ مسئلہ چھڑا ، اور نہ عہد فاروقی کے بہترین دس سالوں میں صاف ہوا جو فقہ و علوم کی تنظیم و تحقیق کا اصلی عہد تھا ، تو پھر کیا یہ اجماع اُس وقت منعقد ہوا جب حضرت عثمان کی شہادت کا ہنگامہ ہوا تھا ، یا اُس وقت جب جمل و صفین کے میدان کارزار گرم ہوئے تھے ؟

اصل یہ ہے کہ واقعات کے تسلسل و تواتر سے خود بخود ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ لوگوں کو اجماع کا خیال پیدا ہو گیا ۔ یعنی چونکہ ابتدا سے خلافت پر قریش ہی کا قبضہ ہوا ، اور یکے بعد دیگر تمام سلاسل حکومت قرشی ہی ہوئے ، اس لیے لوگوں نے سمجھ لیا کہ شرعی فیصلہ بھی یہی ہے ، اور اس پر اجماع ہو گیا ہے ۔ ورنہ اجماع صحابہ کا کوئی ثبوت موجود نہیں ۔ اور نہ عرصہ تک کسی خاص خاندان میں حکومت کا رہنا دلیل تشریع و انعقاد اجماع ہو سکتا ہے ۔ خود خلفاء عباسیہ کے عہد میں متعدد غیر قرشی مدعی اُٹھے ، اور بعضوں کا ساتھ ہزاروں مسلمانوں نے دیا ۔ وہ نہ خوارج میں سے تھے ۔ نہ معتزہ میں ۔ مگر یقین کرتے تھے کہ غیر قرشی خلیفہ ہو سکتا ہے ۔ حجاج کے زمانہ میں ابن الاشعث نے خروج کیا اور امیر المومنین کا لقب اختیار کیا ۔ حالانکہ قرشی نہ تھا ۔

کفایہ“ سے مقصود وہ احکام ہیں جو بہ حیثیت جماعت و اجتماع قوم پر فرض ہیں ۔ نہ کہ بہ حیثیت فرد و انفراد ۔ یعنی ایسے فرائض جو مسلمان جماعتوں اور آبادیوں کے ذمے عائد کر دیے گئے ہیں کہ انکا انتظام کر دیں ۔ پس انتظام ہو جانا چاہیے ۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر فرد بہ ذات خاص اُس میں حصہ لے ۔ اگر ایک گروہ نے ایک وقت میں انجام دیدیا تو باقی مسلمانوں پر سے اُس وقت ساقط ہو گیا ۔ جیسے تجہیز و تکفین اموات اور نماز جنازہ ۔ البتہ ایک مسلمان کیلئے عزیمة اسی میں ہوگی کہ اداء فرض کفایہ میں بھی شخصاً حصہ لے ۔

دوسری قسم ” اعیان “ کی ہے ۔ یعنی وہ فرائض جنکی فرضیت جماعت پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے ۔ اور ایک کے کرنے سے دوسرا بری الذمہ نہیں ہو جاسکتا ۔ جیسے پانچ رقت کی نماز ، روزہ ، زکوٰۃ ، حج ۔

شروعاً قتال کی پہلی صورت ( یعنی ہجوم و مقابلہ کا دائمی سلسلہ ) فرض کفایہ ہے ۔ ضروری نہیں کہ بہ یک وقت ہر مسلمان اس میں حصہ لے ۔ ہر عہد میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو یہ فرض انجام دیتی رہے ۔ اگر ایک جماعت انجام دے رہی ہے تو کافی ہے ۔ جو مسلمان شریک ہوگا ، اُسکے لیے بڑا اجر ہے ۔ جو شریک نہ ہوگا ، اُسکے لیے کوئی گدہ نہیں ۔ صاحب ہدایہ ( جسکا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور ہندوستانی عدالتوں میں محمدن لا کی بنیادی کتاب ہے ) لکھتے ہیں :

|                               |  |
|-------------------------------|--|
| الجهاد فرض علی الکفایہ - اذا  | جہاد فرض کفایہ ہے ۔ جب مسلمانوں کی       |
| قام فریق من الناس ، سقط       | کوئی ایک جماعت اُسکے لیے کہڑی            |
| عین الباقین * * فان           | ہوگئی ، تو باقی مسلمانوں کیلئے ضروری     |
| لم یقسم بہ أحد ، اثم          | نہ رہا ۔ لیکن اگر کوئی گروہ اُسکے لیے نہ |
| جميع الناس بترکہ - لان الوجوب | آٹھا ، تو پھر تمام مسلمان جہاد ترک       |
| علی الكل ( کتاب السیر )       | کر دینے کی وجہ سے گناہگار ہونگے ۔        |
|                               | کیونکہ فرض پوری قوم پر ہے ۔              |

سعدی چلیپی حاشیہ عنایہ میں اسکی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ہوا۔ آنحضرت صلعم کے زمانے سے اب تک خلافت بغیر کسی رکارت کے قریش ہی میں رہی۔ اور آئندہ بھی ہمیشہ انہی میں رہیگی جب تک در قریشی بھی دنیا میں باقی رہینگے۔

حافظ نواری کا سال وفات سنہ ۶۷۶ھ ہے۔ اور سال پیدائش سنہ ۶۳۱ھ۔ یا اس سے بھی پہلے۔ آخری خلیفہ بغداد المستعصم کو ہلا کرنے سنہ ۶۵۶ میں قتل کیا۔ پس گو انکی وفات فتنہ تاتار کے بعد ہوئی، لیکن تصنیف و تالیف کا زمانہ مستعصم کی خلافت ہی کا زمانہ ہے۔ اگر شرح مسلم وغیرہ بالکل آخری عمر کی تصنیف ثابت ہو جائے تو پھر خلفاء عباسیہ مصر کا زمانہ ہوگا کہ فی الجملہ قریش کی خلافت قائم تھی۔ پس وہ اپنے زمانے تک خلافت کو صرف قریش ہی میں قائم دیکھ کر احادیث باب کے اسی مطلب پر قانع اور جمے ہوئے ہیں، اور اسی لیے ”ما بقی منہم اثنان“ کا بھی یہی مطلب سمجھتے ہیں کہ جب تک خاندان قریش کے در انسان بھی دنیا میں باقی رہینگے، خلافت انہی میں رہیگی۔

لیکن اگر انکو اپنے بعد کا حال معلوم ہوتا تو کیا ایسا دعوا کر سکتے تھے؟ کیا اُس صورت میں اپنی تمام رائے پر نظر ثانی نہ کرتے؟ وہ کیا جانتے تھے کہ عنقریب صفحہ الدنۃ والا ہے، اور خلافت نہ صرف قریش سے، بلکہ عرب ہی سے رخصت ہو جانے والی ہے۔

اس سے بھی زیادہ بہتر مثال حافظ سیوطی کی ہے۔ حافظ موصوف عباسیہ مصر کے آخری عہد میں تاریخ الخلفاء اور حسن المحاضرہ لکھ رہے ہیں۔ یعنی ہزاروں صدی کے اراذل میں۔ چونکہ اسوقت تک مصر میں عباسی خاندان منصب خلافت پر ممتاز تھا، اور گو عالم اسلامی بہت سی نئی عجمی حکومتوں میں بہت چکا تھا، تاہم لقب خلافت بجز عباسیہ مصر کے اور کسی کے قبضہ میں نہ تھا، اس لیے انہوں نے تاریخ الخلفاء کے ابتدا میں ایک باب باندھا ہے ”احادیث المبشرۃ بخلافة بنی العباس“ اسمیں وہ تمام روایتیں جمع کی ہیں جنہیں عباسیہ کو خلافت پانے کی بشارت دی ہے، اور کہا ہے کہ تمہاری خلافت حضرة عیسیٰ کے نزل تک رہیگی۔ چنانچہ ابو نعیم کی روایت میں ہے۔ جب حضرة عبد اللہ بن عباس پیدا ہوئے تو آنحضرت نے فرمایا ”ہو ابو الخلفاء“ حتیٰ یكون منہم السفاح، حتیٰ یكون منہم المہدی، حتیٰ یكون منہم من یصلی بعیسیٰ بن مریم“

شہر کی خدمت اور چاکر کیلئے آقا کی خدمت مقدم ہے - لیکن اگر دفاع کی ضرورت پیش آگئی ہو تو اسکی فرضیۃ ایسی ہمہ گیر اور بالا تر ہے کہ بچوں اور معذوروں کے سوا کوئی گروہ، کوئی فرد، مستثنیٰ نہیں ہوسکتا - بیوی بلا شہر کی اجازت کے نکل کھڑی ہو - غلام بلا آقا کے اذن کے مشغول جہاد ہو جائے - ہدایہ میں ہے :

فان هجم العدر علی بلد  
رجب علی جمیع الناس  
الدفع، تخرج المرأة بغیر اذن  
زوجها والعبد بغیر اذن  
المولی - لانه صار فرض  
عین و ملک الیمین ورق  
النکاح لا یظهر فی حق  
فروض الاعیان کما فی الصلوة  
والصوم - بخلاف ما قبل  
النفیر، لان بغیرهما مقنعا  
فلا ضرورة الی ابطال حق  
المولی والزوج ( کتاب  
السیر )

لیکن اگر دشمنوں نے کسی شہر پر حملہ کیا، تو پھر تمام لوگوں پر دفاع فرض ہو گیا - بیوی بلا شہر کی اجازت کے اور غلام بلا آقا کے اذن کے دفاع میں حصہ لینگے - اسلیے کہ اب جہاد فرض عین ہو گیا، اور جو فرائض ایسے ہیں، انپر مالکیت اور زوجیۃ کے حقوق موثر نہیں ہوسکتے - جیسے نماز اور روزہ - اگر نماز کا وقت آگیا ہے تو عورت پر نماز فرض ہوگئی - شہر کے اذن پر موقوف نہیں - البتہ نفیر سے پہلے یہ صورت نہ تھی - اسوقت عورتوں اور غلاموں کی شرکت کے بغیر بھی یہ فرض ادا ہوسکتا تھا - پس ضرورت نہ تھی کہ شہر اور آقا کے حقوق باطل کیے جائیں -

ہم نے ہدایہ اور متداول کتب فقہ کی عبارتیں سب سے پہلے اسلیے نقل کیں کہ ان کتابوں کے نام سے ہندوستان کی سرکاری عدالتیں بھی آشنا ہیں - اور ہر انگریز قانون داں جانتا ہے کہ محمّدن لا کیلئے ہندوستانی عدالتوں میں سب سے زیادہ معتبر اور بنیادی کتاب یہی ہے - اسکا انگریزی ترجمہ بھی ہوچکا ہے - پس بآسانی دیکھ لیا جاسکتا ہے کہ فی الحقیقت اسلام کے احکام شرعی یہی ہیں یا نہیں؟ ررنہ تمام کتب تفسیر و حدیث میں یہ احکام موجود ہیں - امام بخاری نے باب باندھا ہے ”رجوب النفیر“ یعنی جب حفظ ملت کی ضرورت پیش آجائے

تو قتال کیلئے سب کا اُتھ کھڑا ہونا واجب ہے - پھر آیۃ انفرأ خفافاً و ثقلاً اور ما لکم اذا قیل لکم انفرأ الخ سے رجوب پر استدلال کیا ہے - اسکے بعد حضرت ابن عباس کی روایت درج کی ہے ”لا هجرة بعد الفتح ولكن جهاد ونية اذا استنفرتم فاستنفرأ“ یعنی وہ جو اراٹل اسلام میں ایک

بعض اوصاف کے اشتراک کی وجہ سے دجال سمجھتے رہے - آنحضرتؐ کے زمانے ہی میں ابن صیاد کی نسبت حضرت عمر کو خیال ہوا تھا - حتیٰ کہ اسکو قتل کرنا چاہا جیسا کہ امام بخاری کی روایت ابن عمر مندرجہ کتاب الجنائز میں موجود ہے - اور ایک دوسری روایت مندرجہ کتاب الاعتصام بالسندہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کو اسپر اسدرجہ یقین تھا کہ قسم کھا کر کہتے تھے - یہی دجال ہے - اور اسی لیے ابن جابر کو بھی اسپر پورا یقین تھا ”روایت جابر بن عبد اللہ یحلف باللہ ان ابن الصیاد الدجال“ اسی طرح ابو داؤد کی روایت نافع میں حضرت عبد اللہ بن عمر کی نسبت مروی ہے کہ قسم کھا کر کہتے تھے ”واللہ ما أشک ان المسیح الدجال ہو ابن صیاد“ لیکن دیگر صحابہ کو اس سے اختلاف تھا - ابو سعید خدری سے جب ابن صیاد کی صحبت ہوئی تو انکا شک دور ہو گیا حتیٰ کہ معذرت کرنے کیلئے آمادہ ہو گئے (کما فی المسلم) اور مسلم میں قصہ تمیم دارمی موجود ہے جسکی بنا پر لوگوں کو ابن صیاد کے دجال ہونے سے انکار تھا -

پس چونکہ یہ پیشین گوئی تھی ، اسلیے مشکل تھا کہ جب تک تمام واقعات پوری پوری طرح ظاہر نہ ہو جائیں ، انکا تھیک تھیک مطلب متعین کیا جاسکے - خلافت کا یہ حال رہا کہ گرا ابتدا سے بہت مدعی اُتے ، مگر فی الجملہ نوویں صدی ہجری تک قریش ہی میں رہی ، اور اسی بات کی احادیث میں خبر بھی دی گئی تھی - جن علماء کی رائے پیش کی جاتی ہے ، وہ سب وہی ہیں جنکا ظہور ساتویں صدی اور اُس سے پیشتر یعنی عہد خلافت قریش میں ہوا - پس ضرور تھا کہ معاملہ خلافت کو ابتدا سے قریش ہی میں محدود دیکھ کر یہ خیال پیدا ہو جاتا کہ خلافت اسی خاندان سے شرعاً بھی مخصوص ہے ، اور یہی مطلب تمام احادیث کا ہے - اگر وہ بعد کا حال دیکھتے تو معلوم کر جاتے کہ مقصود تشریع و حکم نہ تھا - محض خبر دی گئی تھی - وہ ان حدیثوں کا مطلب صرف اپنے وقت تک کے حالات کی روشنی ہی میں دیکھ رہے تھے ، اور اسکی لیے مجبور و معذور تھے -

حافظ نواری شرح مسلم میں لکھتے ہیں ”و قد ظہر ما قالہ صلعم - فمن زمنہ الی الان الخلفۃ فی قریش من غیر مزاحمة لهم فیہا“ و تبقی کذا لک ما بقی منہم اثنان“ (جلد ۲ : ۱۲۹) یعنی جیسا فرمایا تھا ، ویسا ہی



یہ فرض کفایہ نہیں ہے، بلکہ بالاتفاق مثل نماز روزہ کے ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ ایک گروہ کے دفاع کرنے سے باقی مسلمان بری الذمہ نہیں ہو جاسکتے۔ جس طرح ایک گروہ کے نماز پڑھ لینے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ نماز ساقط نہیں ہو جاتی۔ اسی ہدایہ میں ہے - ”الا ان یکن النفییر عاماً فحینئذ یصیر من فرض الاعیان“ نفیر ”نفر“ سے ہے۔ ”نفر“ کے معنی ہیں تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ دوڑ جانا۔ پس قوم کے ایسے ہلارے اور اجتماع پر جو لڑائی کیلئے ہو ”نفیر“ کا اطلاق ہوا۔ قرآن میں ہے - انفروا خفافاً وثقالاً۔ اور الا تنفروا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حفظ و دفاع کی ضرورت سے عام اجتماع و قیام کا وقت آگیا، تو پھر جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے۔ ابن ہمام اسکی شرح میں لکھتے ہیں :

هذا اذا لم یکن النفییر عاماً ، فرض کفایہ کی صورت اسوقت تک ہے  
فاذا کان النفییر عاماً بان کہ عام نفیر کی حالت نہ ہو۔ لیکن اگر  
هجموا علی بلدة من بلاد مسلمانوں کے شہروں میں سے کسی شہر  
المسلمین ، فیصیر من پر غیر مسلموں نے حملہ کیا ، تو اسوقت  
فرض الاعیان سواء کان جنگ کرنا ہر مسلمان فرد پر فرض عین  
المستنفر عدلاً او فاسقاً۔ ہو جائیگا۔ خواہ جنگ کیلئے دعوت  
( فتح القدیر - ۴ : ۲۸۰ ) دینے والا عادل ہو یا فاسق۔

اور عذایہ میں ہے :

ثم الجهاد یصیر فرض عین ثم الجہاد یصیر فرض عین  
عند النفییر العام علی عند النفییر العام علی  
من یقرب من العدو و هو من یقرب من العدو و هو  
یقدر علیہ - ( مجموعہ یقدر علیہ - ( مجموعہ  
فتح القدیر - ۴ : ۲۸۱ )

اسی طرح سراجیہ ، در المختار ، شامی وغیرہ تمام کتب فقہ میں ہے ”اذا جاء النفییر انما یصیر فرض عین علی من یقرب من العدو“ اور ”الجهاد فرض کفایہ اذا لم یکن النفر عاماً“ فاذا اقام به البعض ، یسقط عن الباقین۔ فاذا صار النفییر عاماً ، فحینئذ یصیر من فرض الاعیان“ الخ۔ جملہ و هجوم کے دائمی جہاد میں ( جب قتال فرض کفایہ ہے ) بعض جماعتیں مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً عورتیں اور نوکر۔ عورتوں کیلئے

علماء نے جب دیکھا کہ ”ما اقاموا الدین“ کی شرط کا ظہور شروع ہو گیا ہے اور حکومت قریش کے قبضہ سے نکل گئی ہے، تو انکی رائے بدل گئی، اور قاضی عیاض والے اجماع کے دعوے میں شامل کرنے لگے۔ علامہ ابن خلدون (المتولد سنہ ۷۳۲) مقدمہ تاریخ میں شرط قرشیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”لما ضعف امر قریش“ و تلاشت عصبیتهم بما نالهم من الترف و النعم و بما انفقتهم الدولة في سائر اقطار الارض، عجزوا عن حمل الخلافة، و تغلبت عليهم الاعاجم و صار الحل و العقد لهم، فاشتبه ذلك على كثير من المحققين، حتى ذهبوا الى نفي اشتراط القرشية و عولوا على ظواهر في ذلك مثل قوله صلعم: اسمعوا و اطيعوا و ان امر عليكم عبد حبشي ما اقام فيكم كتاب الله“ یعنی جب قریش کی قوت کمزور ہو گئی۔ عیش پرستیوں میں پڑ کر اپنی عصبیہ مٹا دی۔ خلافت کا بوجھ اُٹھانے سے عاجز ہو گئے، تو عجمیوں نے انپر غلبہ حاصل کر لیا، اور خلافت کا فیصلہ انہی کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ یہ انقلاب دیکھ کر بہت سے محققین کے نزدیک قرشیہ کی شرط مشتبہ ہو گئی۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس شرط سے انکار کر دیا۔ انتہی۔

اشاعرہ کے امام الائمہ قاضی ابوبکر باقلانی نے بھی یہی مذہب اختیار کیا تھا کہ قرشیہ کی شرط ضروری نہیں۔ یہی ابن خلدون لکھتے ہیں ”و من القائلین بنفي اشتراط القرشية“ القاضی ابوبکر الباقلانی“

عباسیہ بغداد کے انقراض کے بعد مصر میں عباسی خلافت کا دوسرا دور شروع ہوا، اسلیے اس عہد کے علماء مصر نے (مثلاً حافظ ابن حجر، قاضی عینی، جلال الدین سیوطی و غیرہم) قرشی خلافت کو فی الجملہ قائم پایا۔ لیکن جب یہ نقش بھی مٹ گیا، اور وہ زمانہ آیا جسکی خبر دیدی گئی تھی کہ ”بعث الله عليكم من يلحاكم كما يلحي القضيب“ تو جو اہل نظر اس انقلاب کے بعد پیدا ہوئے، انہوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ اشتراط قرشیہ کا کوئی ثبوت نہیں، اور نہ خلافت قریش کا وہ مطلب ہے جو اب تک سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ تیرھویں صدی کے مشہور مجدد فقہ و حدیث امام شوکانی یمنی ربل الغمام میں شرط قرشیہ کے دلائل نقل کر کے لکھتے ہیں ”لاریب ان في بعض هذه الالفاظ ما يدل على الحصر“ و لکن قد خصص مفهوم الحصر احادیث و جوب الطاعة لغير القرشي“ الی ان قال ”والاخبار منه صلعم بان الائمة

مسلمان ، تو اگر زیرِ جنگ مقامات کے مسلمان دشمن کے مقابلہ کیلئے کافی قوت نہیں رکھتے - دشمن بہت زیادہ قوی ہے - یا رکھتے ہیں اور غفلت و تساہل کرنے لگے ہیں ، تو اُس حالت میں یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پر بھی دفاع فرض عین ہو جائیگا - بالکل اسی طرح جیسے نماز اور روزہ - مگر صورت اُسکی یوں ہوگی کہ پہلے اُن مقامات سے قریب تر مقام کے مسلمانوں پر - پھر اُن سے قریب تر پر - پھر اُن سے قریب تر پر - حتیٰ کہ مغرب و مشرق جنوب و شمال ، تمام اکثاف عالم کے مسلمانوں پر فرض ہو جائیگا - اُسوقت سارے فرائض ، سارے وظائف ، سارے کام ، ملتوی کر دینے چاہئیں - بمجرد اطلاع ہر مسلمان کو اپنی تمام قوتوں اور تمام سامانوں کے ساتھ وقف دفاع ملت و جہاد فی سبیل اللہ ہو جانا چاہیے - اگر ایسا نہ کیا گیا تو سب اللہ کے حضور جوابدہ ہونگے - سب مبتلائے معصیت و فسق ہونگے - ایسی معصیت ، ایسا فسق ، ایسا عدوان ، ایسا نفاق ، جسکے بعد صرف کفر ہی کا درجہ ہے - اگر قیامت کا آنا حق ہے ، اور یہ جھوٹ نہیں کہ خدا کا وجود ہے ، تو مسلمانان عالم کے پاس اُسوقت کیا جواب ہوگا ، جب قیامت کے دن پوچھا جائیگا کہ تم کزروں کی تعداد میں زندہ سلامت موجود تھے - تمہارے جسموں سے روح کھینچ نہیں لی گئی تھی - تمہاری قوتوں کو سلب نہیں کر لیا گیا تھا - تمہارے کان بہرے نہ تھے - نہ ہاتھ کٹے ہوئے اور پانوں لنگڑے - پھر تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تمہارے سامنے تمہارے بھائیوں کی گردنوں پر دشمنوں کی تلواریں چل گئیں - وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر ہو گئے - اسلام کی آبادیاں غیروں کے قبضہ و تسلط سے پامال ہو گئیں - پر نہ تو تمہارے دلوں میں جنبش ہوئی ، نہ تمہارے قدموں میں حرکت - نہ تمہاری آنکھوں نے ایک آنسو بخشا ، نہ تمہارے خزانوں پر سے بخل و زر پرستی کے قفل توڑے ؟ تم نے چین اور آرام کے بستر پر پر لیت کر بربادی ملت اور پامالی اسلام کا یہ خونیں تماشہ اس طرح دیکھا ، جیسے بے درد تماشاخی سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر دہکتے ہوئے جہازوں اور بہتی ہوئی لاشوں کا نظارہ کرتے ہیں !

ارضیتم بالحیاء الدنیا من الآخرة ؟ فما حیاء الدنیا الا قلیل !

فتح القدیر میں ہے :

فیجب علی جمیع اہل تلک  
البلدۃ النفر ، کذا من یقرب  
اگر غیر مسلموں نے حملہ کیا تو پھر اُس  
شہر کے تمام باشندوں پر دفاع کیلیے

یعنی اپنے فرمایا عبد اللہ بن عباس خلفاء کا باپ ہے یہاں تک کہ انہی خلفاء میں سے سفاح ہوگا، اور انہی میں سے مہدی ہوگا، اور انہی میں وہ ہوگا جو حضرت عیسیٰ کے ساتھ نماز پڑھیگا۔

اگرچہ یہ تمام روایتیں قطعاً جھوٹی ہیں۔ ابو مسلم خراسانی وغیرہ عباسی داعیوں کی بنائی ہوئی ہیں، اور تمام ائمہ حدیث و نظر نے انکے خرافات و وضعی ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ لیکن چونکہ اسوقت تک عباسیوں میں خلافت کا انتساب باقی تھا، اور واقعات کی بنا پر اس پیشین گوئی کی تکذیب نہیں ہو سکتی تھی۔ نیز عباسی خلافت کا حاکمانہ اثر ان روایات کی مقبولیت کا باعث ہو رہا تھا، اسلیے حافظ سیوطی انکے لیے ایک خاص باب قائم کرتے ہیں، اور اگر کسی روایت کو سنبھالنے کا ذرا سا بھی موقعہ مل جاتا ہے تو نہیں چوکتے۔ چنانچہ ابو نعیم اور دیلمی کی روایات سے کچھ تعرض نہیں کیا ہے، حالانکہ حافظ مزنی، ابن دقیق العید، ابن کثیر، وغیرہم نے سخت انکار کیا ہے، اور ابن جوزی کتاب الموضوعات میں لے لے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دیباچہ میں بنو عبید کی خلافت پر بحث کرتے ہوئے ان احادیث سے یقین کے لہجہ میں استدلال کرتے ہیں ”ان الحدیث رد بان ہذا الامر اذا وصل الی بنی العباس لا یخرج عنہم حتی یسلمون الی عیسیٰ بن مریم از المہدی“ (تاریخ الخلفاء ۸۰) یعنی یہ بات حدیث میں اچکی ہے کہ جب خلافت آل عباس تک پہنچے گی تو پھر انہی کے قبضہ میں رہیگی۔ یہاں تک کہ وہ حضرت عیسیٰ یا امام مہدی کے سپرد کر دیں۔

لیکن اگر حافظ سیوطی پچیس برس اور زندہ رہتے اور دیکھ لیتے کہ خلافت و حکومت کا نام و نشان تک عباسیہ میں باقی نہ رہا، تو پھر انکو پورا پورا یقین ہو جاتا کہ عباسیہ کو آخر عہد تک خلافت و پادشاہت کی کوئی بشارت نہیں دی گئی ہے، اور یقیناً یہ تمام حدیثیں وضعی ہیں جیسا کہ ائمہ اثر فیصلہ کر چکے ہیں۔

چنانچہ یہ بات صاف صاف تتبع و نظر سے واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت عباسیہ بغداد کے تنزل اور عجمی حکومت کے ظہور و عروج کے ساتھ ہی علماء کی آراء میں بھی تدریجی تغیر شروع ہو گیا تھا، اور اشتراط قرشیہ میں وہ زور باقی نہ رہا تھا، جو قاضی عیاض وغیرہ کی مصنغات میں پایا جاتا ہے۔ اکثر

خاص طرح کی ہجرت فرض ہوئی تھی، تو فتح مکہ کے بعد اسکی ضرورت نہیں رہی۔ البتہ جہاد اور عزم جہاد قیامت تک باقی ہے۔ تو جب جمع ہونے کیلئے پکارے جاؤ، جمع ہو جاؤ اور جہاد کرو۔

فتح الباری میں ہے ”الا ان تدعو الحاجة اليه كان يد هم العذر ويتعين على من عيذه الامام“۔ (جلد ۶ : ۲۸)

اور موطا امام مالک میں ہے ”اذا كان الكفار مستقرين ببلاد هم فالجهد فرض كفاية“ ان اقام به بعضهم سقط الحرج عن الباقيين، و اذا قصدا بلادنا و استنفر الامام المسلمين، و جب على الاعيان “ شاه ولي الله اسکی شرح میں لکھتے ہیں ”نزدیک استنفر جہاد فرض على الاعيان مي شود۔ استنفر را چون منقم كنيم حاصل شود حالتی كه مقتضای استنفر شده است از قصد كفار بلاد مارا، و قيام حرب درميان جيوش مسلمين و كافرين، و عدم كفايه ازاں مسلمانان، و آنچه بذاں ماند“ (مسوی جلد ۲ - ۱۲۹)

شاه صاحب کے بیان سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ نفیر کی صورت کیا ہے؟ تو یہ ضرور نہیں کہ کوئی خاص شخص مسلمانوں کو یہ کہہ کر پکارے کہ آؤ جہاد کرو۔ مقصود یہ ہے کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے جو مقتضای نفیر ہے۔ پس جب غیر مسلموں نے اسلامی ملکوں کا قصد کیا تو جہاد فرض ہوگیا اور جب دشمنوں کی طاقت ان ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ قوی ہو اور انکے شکست کا خوف ہو، تو یکے بعد دیگرے تمام مسلمانان عالم پر فرض ہو جائیگا۔ خواہ کوئی پکارے یا نہ پکارے۔ پکارنے والا نہیں ہے تو یہ مسلمانوں کی بدنظمی و بدحالی ہے۔ انکا فرض ہوگا کہ داعی کا انتظام کریں۔ یہی حال تمام فرائض کا ہے۔ نماز کا جب وقت آجائے تو خواہ موزن کی صداے ”حي على الصلاة“ سناؤی دے یا نہ دے، وقت کا آ جانا وجوب کیلئے کافی ہے۔

جب دفاع کا فرض عین ہونا واضح ہوگیا، تو اب معلوم ہونا چاہیے کہ اس فرض کی انجام دہی کیلئے شریعت نے ایک خاص ترتیب اختیار کی ہے۔ عقل و حکمت کی بنا پر وہی اس معاملہ کی قدرتی اور صحیح ترتیب ہوسکتی تھی۔ صورت اُسکی یہ ہے کہ جب غیر مسلموں نے کسی اسلامی حکومت اور آبادی کا قصد کیا، تو اُس شہر کے تمام مسلمانوں پر بہ مجرد قصد اعداء، دفاع فرض عین ہوگیا۔ باقی رہے دیگر ممالک کے



افضلیت اسفار جمہور کا قول ہے - بعضوں نے اجماع تک کہہ دیا - لیکن شوافع و محدثین کہتے ہیں کہ قرآن فاتحہ ہی جمہور کا مذہب ہے اور اسی پر جماہیر علماء کا اتفاق ہے - انہی حافظ نواری کی ( جو اشتراط قرشیہ کو جمہور کا مذہب بتلاتے ہیں ) شرح مسلم دیکھ لی جائے - کس طرح شافعیہ کا ہر مذہب ان کے نزدیک ”جمہور“ کا مذہب ہے ، اور مخالف کا ہر قول شان - شافعیہ اور حنفیہ کی خلافت میں تقریباً درتہائی مسائل تو ضرور ایسے ہونگے جن کی نسبت ہر جگہ شرح مسلم میں پاؤ گے : ”ہذا مذہب الشافعی و الجماہیر“ و مخالف فیہ ابو حنیفہ “ یعنی امام شافعی اور جمہور کا مذہب یہی ہے مگر امام ابو حنیفہ نے اس سے خلاف کیا - اگر ہمارے علماء احناف حافظ نواری کی ان تمام جمہوریات و اجماعیات کو تسلیم کر لینے کیلئے طیار ہیں ، تو خیر ، اشتراط قرشیہ کا ایک اجماع اور سہی - لیکن یاد رہے کہ یہ وہی بات ہوگی : گو مشیت خاک ما ہم برباد رفتہ باشد !

ثانیاً ، ہمارا خیال ہے کہ یہ بات بھی آورے شمار باتوں کی طرح وقت کے سیاسی اثرات کا نتیجہ تھی - یہ ظاہر ہے کہ معاملہ خلافت ابتدا سے سخت کشمکش و نزاع میں رہا - جو خاندان قابض ہوا ، اسکو رقیبوں اور دعویداروں کی طرف سے ہمیشہ کھٹکا لگا رہا - پس جبکہ خلافت اہل عرب کے ہاتھ میں تھی ، تو وہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ عجمیوں کے رولوں کی اس بارے میں جرأت افزائی کی جائے ؟ اور عرب میں سے بھی جب خاص خاندان قریش میں تھی جو ہر طرح سیادت و بزرگی رکھتا تھا ، تو وہ کیونکر پسند کر سکتے تھے کہ غیر قرشی خلافت کا وجود تسلیم کر کے غیر قرشیوں کو ہمتیں دلائی جائیں اور مادی طاقت کے ساتھ شریعت کی حمایت کا سہارا بھی انہیں حاصل ہو جائے ؟ بخاری کی روایت میں پڑھ چکے ہو کہ امیر معاویہ نے قحطانی پادشاہ کے ظہور کی روایت سنی تو کس درجہ مضطرب اور غضب ناک ہوئے ؟ اور کس طرح فوراً قریش زالی روایت کا اعلان کر دیا تاکہ پہلے ہی سے سد باب ہو جائے ؟ جن علماء کے اقوال پر متاخرین فقہاء و متکلمین کا اعتماد ہے ، وہ سب کے سب وہی ہیں جن کا ظہور آخر عہد عباسیہ میں ہوا ہے جب قرشی خلافت قائم تھی - مثلاً قاضی عیاض و امام نواری و غیرہم - پس وقت کی حکومت کا جو پولیٹیکل اثر سب پر پڑ رہا تھا ، وہ بھی یہی تھا کہ خلافت کو حکمران خاندان کی قوم اور

قابض ہونا چاہیں جنکو ہمیشہ غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہو۔ یعنی جزیرہ عرب - تفصیل اسکی آگے آتی ہے۔

( جزیرہ عرب و بلاد مقدسہ )

کوئی قوم زندہ نہیں رہسکتی، جب تک اسکا کوئی ارضی مرکز نہ ہو۔ کوئی تعلیم باقی نہیں رہسکتی، جب تک اسکی ایک زندہ و قائم درسگاہ نہ ہو۔ کوئی دریا جاری نہیں رہسکتا، جب تک ایک محفوظ سرچشمہ سے اسکا لگاؤ نہ ہو۔

نظام شمسی کا ہر ستارہ روشنی اور حرارت صرف اپنے مرکز شمسی ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اسی کی بالاتر جاذبیت ہے جو یہ پورا معلق کارخانہ سنبھالے ہوئے ہے ! اللہ الذی رفع السموات بغیر عمدہ ترزنها، ثم استوی علی العرش، و سخر الشمس و القمر، کل یجری لاجل مسمى ! (۱۳ : ۲)

یہی قانون الہی ہے جسپر اسکی شریعت کے تمام جماعتی احکام مبنی ہیں۔ پس جس طرح اسلام نے امت کے بقا اور حق و ہدایت کے قیام کیلئے ہر طرح کے مرکز قرار دیے، ضرور تھا کہ ایک ارضی مرکز بھی قیامت تک کیلئے قرار دیدیا جاتا۔ اُن بے شمار مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر جنکی تشریح کا یہ موقعہ نہیں، اسلام نے اس غرض سے سرزمین حجاز کو منتخب کیا۔ یہی ناف زمین دنیا کی آخری اور دائمی ہدایت و سعادت کیلئے مرکزی سرچشمہ اور روحانی درسگاہ قرار پائی۔ اور چونکہ سرزمین حجاز جزیرہ عرب میں واقع تھی، رہی اسلام کا اولین موطن، رہی اسکا سب سے پہلا سرچشمہ تھا، اسلئے ضرور تھا کہ اسلامی مرکز کے قریبی گرد و پیش کا بھی وہی حکم ہوتا جو اصل مرکز کا۔ لہذا یہ تمام سرزمین بھی کہ حجاز کی ”رادی غیر ذی زرع“ کو گھیرے ہوئے ہے، اسی حکم میں داخل ہوگئی۔ ذلک تقدیر العزیز العظیم !

”مرکز ارضی“ سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی دعوت ایک عالمگیر اور دنیا کی بین الملی دعوت تھی۔ وہ کسی خاص ملک اور قوم میں محدود نہ تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کے اجزاء تمام کرۂ ارضی میں بکھر جانے اور پھیل جانے والے تھے۔ پس ان بکھرے ہوئے اجزاء کو ایک دائمی متحدہ قومیت کی ترکیب میں قائم رکھنے کیلئے ضروری تھا کہ کوئی ایک مقام

من قریش ' ہو کالخبار منہ بان الاذان فی الحبشہ و القضاء فی الازد ' و ما ہو الجواب عن هذا ' فہر الجواب عن ذلك - و تخصیص کون الائمة من قریش ببعض بطونہم ' لا یتم الا بدلیل ' و الاخذ بما وقع علیہ الاجماع لا شک انہ احوط ' و اما انہ یتحتم المصیر الیہ ' فلیس بواضح ' و لو صح ذلك ' لزم بطلان اکثر ما دونہ من المسائل و المقام و المراکز ' و ما احقہ بان لا یدون كذلك " یعنی اگرچہ امامت قریش کی روایات میں ایسے الفاظ ہیں جن سے قریش کی خصوصیت معلوم ہوتی ہے ' لیکن رجوب طاعت امام کے عام احکام کتاب و سنت میں موجود ہیں - وہ دلالت کرتے ہیں کہ غیر قرشی کی بھی اطاعت امت پر قرشی ہی کی طرح واجب ہے - باقی رہی یہ بات کہ آنحضرت نے قریش میں امامت کی خبر دی ' تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے سوا کوئی دوسرا امام ہو ہی نہیں سکتا - یہ ویسی ہی خبر ہے جیسی اس بارے میں خبر دی کہ اذان کا کام اہل حبش میں ہے اور قضاء از دیون میں - جس طرح ان روایتوں سے یہ بات نہیں نکلتی کہ مؤذن اور قاضی صرف حبشی اور از دی ہی ہونے چاہئیں ' اسی طرح یہ بات بھی ثابت نہیں ہوتی کہ امام صرف قرشی ہی ہو سکتا ہے - جو جواب انکا دیا جائیگا ' وہی اسکا ہوگا -

یہ واضح رہے کہ جن جن علماء حدیث و کلام کے اقوال سے یہ اجماع ثابت کیا جاتا ہے ' وہ سب کے سب اسی عہد کے ہیں جبکہ خلافت عباسی قائم تھی - بعد والوں نے جو کچھ لیا ہے ' انہی سے لیا ہے - سب سے زیادہ اعتماد اس بارے میں قاضی عیاض کے بیان پر کیا جاتا ہے جنکا قول نواری نے شرح مسلم اور منہاج میں نقل کیا ہے - انکا سال وفات سنہ ۵۴۴ ہجری ہے -

پھر یہ بھی واضح رہے کہ اجماع کے دعوے نے عام طور پر جو رسعت اختیار کر لی ہے ' اور جس طرح بتدریج اس لفظ کا استعمال اپنے لغوی و اصولی معنی سے ہٹ کر مختلف مصطلحہ معنوں میں ہونے لگا ہے ' اسکو فراموش نہیں کرنا چاہیے - علی الخصوص فقہاء مذاہب کے استعمالات متکلمین اور ارباب اصول کے مصطلحہ اجماع سے بالکل مختلف ہیں - ہر مذہب کے فقہا بلا تامل اپنے مسلک کو " جمہور " اور " اجماع " کے لفظ سے تعبیر کر دیتے ہیں - اسمیں کسی کا مطلب کچھ ہوتا ہے کسی کا کچھ - صاحب ہدایہ وغیرہ کے نزدیک عدم رجوب قرأۃ فاتحہ خلف امام اور

منہم ان لم یکن باہلہا کفایۃ ‘  
 رکذا من یقرب ممن یقرب  
 ان لم یکن بمن یقرب کفایۃ ‘  
 ارتکاسلوا ‘ ارعصوا ‘ رکذا ‘  
 الی ان یجب علی جمیع  
 اہل الاسلام شرقاً و غرباً -  
 ( جلد ۴ - صفحہ ۸۲۰ )

اُتھہ کہڑا ہونا فرض عین ہو جائیگا - اور اگر  
 دشمن زیادہ طاقتور ہیں اور مقابلہ  
 کیلیے وہاں کے مسلمان کافی نہیں ‘ تو  
 جو مسلمان اُنسے قریب ہونگے ‘ انپر بھی  
 فرض عین ہو جائیگا - اور اگر وہ بھی  
 کافی نہیں ‘ یا انہوں نے سستی کی ‘  
 یا دانستہ انکار کیا ‘ تو پھر اُن لوگوں پر  
 جو ان سے قریب ہوں یہ فرض عائد ہوگا -  
 اسی طرح یکے بعد دیگرے - حتی کہ تمام مسلمانوں پر مشرق میں ہوں یا مغرب  
 میں ‘ دفاع کیلیے اُتھہ کہڑا ہونا فرض ہو جائیگا - انتہی -

ایسا ہی تمام کتب معتمدہ فقہ میں ہے - عبارتوں کے نقل و ترجمہ  
 میں طول ہوگا - ردالمحتار وغیرہ شرح میں ذخیرہ سے نقل کیا ہے ” فاما من  
 راثہم ببعد من العدر ‘ فہو فرض کفایۃ علیہم حتی یسعہم ترکہ ‘ اذا لم یحتج  
 الیہم بان عجز من کان یقرب من العدر عن المقارمۃ ‘ ازلہم یعجزوا عنہا لکنہم  
 تکاسلوا ‘ فانہ یفترض علی من یشاہد فرض کالصلوۃ و الصوم لا یسعہم ترکہ ‘ ثم  
 رثم ‘ الی ان یفترض علی جمیع اہل الاسلام شرقاً و غرباً “

اور عنایہ شرح ہدایہ میں ہے ” ثم الجہاد یصیر فرض عین عند النفیر  
 العام علی من یقرب من العدر و ہو یقدر علیہ ‘ و اما من راثہم فلا یكون فرضا  
 علیہم الا اذا احتجج الیہم ‘ اما لعجز القریب و اما للتکاسل ‘ فخیئذ یفرض  
 علی من یشاہد “ الخ -

اور شرح موطا میں ہے ” فان لم تقع الکفایۃ بمن نزل بہم ‘ یجب علی  
 من بعد منہم من المسلمین عونہم “ ( جلد ۲ ص ۱۲۹ )

البتہ یاد رہے کہ یہ دفاع کی عام صورت ہے - لیکن درحالتیں شرعاً ایسی  
 بھی ہیں ‘ جن میں یکے بعد دیگرے اس ترتیب و جوب اور الاقرب فالاقرب  
 کی ضرورت باقی نہیں رہتی - تمام مسلمانان عالم کیلیے ایک وقت میں اور  
 ایک ہی دفعہ دفاع ضروری ہو جاتا ہے - پہلی حالت یہ ہے کہ خلیفہ وقت  
 تمام مسلمانان عالم سے طالب اعانت ہو یا اُسکی بے بسی و بے چارگی کی  
 ایسی حالت ہو جائے کہ بلا مسلمانان عالم کی مجموعی اعانت کے مخلصی  
 ممکن نہ ہو - دوسری صورت یہ ہے کہ اسلام کے عین مرکزی مقام پر غیر مسلم

# باب

خلافت آل عثمان

## فصل

( چند لمحات تاریخیہ )

اب بہتر ہوگا کہ تھوڑی دیر کیلئے ہم آگے بڑھنے سے رک جائیں، اور گذشتہ تیرہ صدیوں کی طرف مڑ کے دیکھیں کہ خلافت اسلامیہ کے مختلف دوروں کا کیا حال رہا ہے ؟

”الخلافة بعدی ثلاثون سنة“ ( میرے بعد خلافت خامہ ۳۰ برس تک رہیگی ) کی خبر کے مطابق خلفاء راشدین کا دور ۳۰ - برس تک رہا - سنہ ۱۱ - ہجری سے شروع ہوا اور تھیک سنہ ۴۰ - تک باقی رہا - اسی سنہ سے بنو امیہ کی خلافت کا دور شروع ہوتا ہے اور سنہ ۴۰ - ۵۰ سے سنہ ۱۳۲ - تک قائم رہتا ہے - اس کے بعد خلافت نے ایک نیا ورق الٹا، از خاندان عباسیہ کا سلسلہ شروع ہوا - خلافت کا سب سے بڑا سلسلہ یہی ہے جو سنہ ۱۳۲ - سے ۶۵۶ - تک قائم رہا - چونکہ کامل پانچ صدیوں تک حکمرانی ایک ہی گھرانے میں رہی، اسلئے وہ تمام ذہنی و جسمانی اور اجتماعی و مدنی فسادات کمال درجہ تک پیدا ہو گئے، جو ہمیشہ امتداد سلطنت اور عروج تمدن کے لازمی نتائج رہے ہیں - قریش کی نسبت فرمایا تھا ”ما اقاموا الدین“ جب تک وہ دین قائم رکھیں گے، حکومت انہی میں رہیگی - سو اب تھیک تھیک وہ وقت آگیا تھا - قریش زعراب میں دین قائم رکھنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی - قیام دین کا کام دوسری قومیں اور طاقتیں انجام دے رہی تھیں - پس رہی ہوا جو تاریخ عالم کے ہر ایسے دور میں ہوتا آیا ہے - سنہ ۶۵۶ - میں ہلاکو خان تاتاری نے بغداد پر حملہ کیا اور آخری خلیفہ عباسی المستعصم



گناہ نبی کلماتوں سے اُردہ جسم جب رہا لے جانے \* اور مہر رمی  
رنا مرادی کی مایوسیوں سے گھائل دل جب چیلنے اور ترپنے ہوئے اُسکی  
جانب درڑے، تو اُسکی پاک ہوا امید و مراد کی عطر بیزی سے مشکبار  
ہوجاتی، اس کے پہاڑوں کی چوٹیاں خدا کی محبت و بخشش کے بادلوں  
میں چھپ جاتیں، اور اُسکی مقدس فضاء میں رحمت کے فرشتے غول در  
غول اُتر کر اپنی معصوم مسکراہٹ اور اپنے پاک نغموں کے ساتھ مغفرت  
و قبولت کی بشارتیں بانٹتے !

شاخوں کی شادابی جز پر موقوف ہے - درختوں کی جزا اگر سلامت ہے  
تو شاخوں اور پتوں کے مرجھا جانے سے باغ اجڑ نہیں سکتا - دس ٹہنیاں  
کات دی جائیں گی، تو بیس نئی نکل آئینگی - اسی طرح قوم کا مرکز اگر  
محفوظ ہے، تو اس کے بکھرے ہوئے ٹکروں کی بربادی سے قوم نہیں مت  
جاسکتی - سارے ٹکرے مت جائیں، مگر مرکز باقی ہے تو پھر نئی نئی  
شاخیں پھوٹیں گی اور نئی نئی زندگیاں پھیلیں گی - پس جس طرح  
مسلمانوں کے اجتماعی دائرہ کیلیے خلیفہ و امام کے وجود کو مرکز ٹھرایا،  
اُسی طرح اُنکی ارضی رسعت و انتشار کیلیے عبادت گاہ ابراہیمی کا کعبۃ اللہ،  
اُسکی سر زمین حجاز، اور اُسکا ملک جزیرہ عرب مرکز قرار پایا - یہی معنی  
ان آیات کریمہ کے ہیں کہ :

جعل اللہ الکعبۃ      اللہ نے کعبہ کو کہ اسکا محترم گھر ہے، لوگوں  
البيت الحرام قیاماً      کے بقاؤ قیام کا باعث ٹھرایا -  
للناس ( ۵ : ۱۰۰ )

اور

واذ جعلنا البيت مثابة      اور جب ایسا ہوا کہ ہم نے خانۂ کعبہ کو انسانوں  
للناس و امنا ( ۲ : ۱۲۵ )      کیلیے اجتماع کا مرکز اور امن کا گھر بنایا -

اور

من دخلہ کان امناً      جو اس کے حدود کے اندر پہنچ گیا تو اس کے لیے  
( ۳ : ۹۷ )      پھر کسی طرح کا خوف اور تر نہیں -

اور یہی علت تھی تعزیر قبلہ کی - نہ وہ جو لوگوں نے سمجھی :

و حیث ما کنتم فلولوا      اور تم کہیں بھی ہو، لیکن چاہیے کہ اپنا رخ  
وجہکم شطرہ ( ۲ : ۱۵۰ )      اسی کی جانب رکھو !

خاندان سے مخصوص سمجھا جائے اور تمام ایسی باتوں میں جس میں اجتہاد رائے کو دخل ہو، فکر و قیاس کا میلان قدرتی طور پر اُسی جانب ہو جائے۔ علی الخصوص جبکہ اسکے لیے کسی غلط بیانی یا تحریف احکام کی ضرورت نہ تھی۔ واقعی احادیث موجود تھیں۔ صرف مفہوم کی تعین میں اجتہاد کو کام کرنا تھا۔ اس مسئلہ پر موقوف نہیں، رقت کے پولیٹیکل اثرات بے شمار چیزوں میں اندر ہی اندر کام کر چکے ہیں، اور آج اُنکا پتہ لگانا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں جب خلافت بغداد کا خاتمہ ہو گیا، تو آہستہ آہستہ اس اثر سے افکار خالی ہونے لگے، اور بتدریج بحث و نظر کی صورت دوسری ہو گئی۔ حافظ عسقلانی اور قاضی عینی جو آٹھویں صدی میں یا نوویں کے اوائل میں بخاری کی شرح لکھ رہے ہیں، اُنکے مباحث پڑھو تو قاضی عیاض اور نواری سے اُنکا رنگ مختلف نظر آئیگا۔

قاضی عینی بخاری کی حدیث معاویہ ”ما اقاموا الدین“ کی شرح میں لکھتے ہیں ”ابی مدۃ اقامتہم امور الدین۔“ قیل یحتمل ان یكون مفہومہ فاذا لم یقیموہ لا یسمع لہم“ یعنی یہ جو حدیث میں ہے کہ ”جب تک دین قائم رکھینگے“ تو اسکا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جب وہ رقت آجائے کہ قریش اقامت دیں نہ کریں تو اُنکی بات نہیں سنی جائیگی۔ حافظ عسقلانی کو اشتراط قرشیۃ سے صاف صاف انکار نہیں کرتے۔ لیکن طرز بحث و نظر کے اضطراب و ضعف نے خود بخود مسئلہ کا مخالف پہلو قوی کر دیا ہے اور بہ یک نظر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اس بارے میں کوئی مضبوط رائے نہیں رکھتے اور اگر مائل ہیں تو انکار کی طرف۔ اشتراط قرشیۃ کے مویدین کے جس قدر دلائل ہیں، اُن میں سے کوئی دلیل ایسی نہیں جس پر اُنہوں نے سنگین اعتراضات نہ کیے ہوں اور وہ مجروح ہو کر نہ رہ گئی ہو۔ جو صاحب مزید بصیرت حاصل کرنی چاہیں، فتح الباری جلد ۳۔ کتاب الاحکام کے ابواب ”الامراء من قریش“ اور ”السمع والطاعة للامام“ ملاحظہ فرمائیں۔

غرض کہ جہاں تک تمام احادیث و دلائل پر نظر دالی جاتی ہے، اشتراط قرشیۃ کیلئے کوئی نص موجود نہیں، اگرچہ بصورت اشتراط بھی موجودہ مسئلہ خلافت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ موجودہ مسئلہ انتخاب امام کا نہیں ہے۔ امام قائم و نافذ کی امامت و اطاعت کا ہے۔

یسا مخصوص کر دیا جاتا ' جو ان تمام متفرق و منتشر اجزاء کیلئے اتحاد و انضمام کا مرکزی نقطہ ہوتا - سارے بکھرے ہوئے اجزاء وہاں پہنچ کر سمت جاتے - تمام پھیلی ہوئی شاخیں وہاں اکٹھی ہو کر جڑ جاتیں - ہر شاخ کو اُس جڑ سے زندگی ملتی ' ہر نہر اُس سرچشمہ سے سیراب ہوتی - ہر ستارہ اُس سورج سے روشنی اور گرمی لیتا - ہر دوری اُس سے قرب پاتی - ہر فصل کو اُس سے مواصلت ملتی - ہر انتشار کو اُس سے اتحاد و یگانگی حاصل ہوتی - رہی مقام تمام اُمت کی تعلیم و ہدایت کیلئے ایک وسطی درسگاہ کا کام دیتا - رہی تمام کرۂ ارضی کی پھیلی ہوئی کثرت کیلئے نقطۂ وحدت ہوتا - ساری دنیا تہذیبی پڑ جاتی ' پر اُسکا تنور کبھی نہ بجھتا - ساری دنیا تاریک ہو جاتی ' مگر اُسکی روشنی کبھی نہ بجھتی - اگر تمام دنیا ارلاد آدم کے باہمی جنگ و جدل اور فتنہ و فساد سے خون ریزی کی دوزخ بن جاتی ' پھر بھی ایک گوشہ ایسا ہوتا جو ہمیشہ امن و رحمت کا بہشت ہوتا ' اور انسانی فتنہ و فساد کی وہاں پر چھائیں بھی نہ پڑ سکتی - اُسکا ایک ایک چپہ مقدس ' اُسکا ایک ایک کونہ خدا کے نام پر محترم ' اور اُسکا ایک ایک ذرہ اس کے جلال و قدسیت کا جلوہ گاہ ہوتا - خونریز اور سرکش انسان ہر مقام کو اپنے ظلم و فساد کی نجاست سے آلودہ کر سکتا ' پر اُسکی فضاء مقدس ہمیشہ پاک و محفوظ رہتی ' اور جب زمین کے ہر گوشے میں انسانی سرکشی اپنی مجرمانہ خداندی کا اعلان کرتی تو وہ خدا کی سچی پادشاہت کا تخت گاہ ہوتی - دنیا پر کفر و شرک کے جماؤ اور اُٹھان کا کیسا ہی سخت اور برا وقت آجاتا ' مگر سچی توحید اور بے میل خدا پرستی کا وہ ایک ایسا گھر ہوتا ' جہاں خدا اور اُسکی صداقت کے سوا نہ کسی خیال کی پہنچ ہوتی ' نہ کسی صدا کی گونج اُٹھ سکتی - وہ انسان کی پھیلی ہوئی نسل کیلئے ایک مشترک اور عالمگیر گھر ہوتا کہ کت کت کر قومیں وہاں جڑیں ' اور بکھر بکھر کے نسلیں وہاں سمٹتیں - پرند جس طرح اپنے اشیانوں کی طرف اڑتے ہیں ' اور پروانوں کو تم نے دیکھا کہ روشنی کی طرف دڑے ' ٹھیک اُسی طرح انسانوں کے گردہ اور قوموں کے قافلے اُسکی طرف دڑتے ' اور زمین کی خشکی و تری کی وہ ساری راہیں جو اُس تک پہنچتیں ' ہمیشہ مسافروں اور قافلوں سے بھری رہتیں - دنیا بھر کے زخمی دل وہاں پہنچتے اور شفا اور تندرستی کا مرہم پاتے ' اور بیقرار و مضطرب روحوں کیلئے اُسکے آغوش گرم میں آرام و سکون کی تہذک ہوتی -

عباسی خاندان کے دو چار آدمی بغداد کے قتل عام سے بچ کر نکل گئے تھے۔ انہی میں مستعصم کا چچا احمد بن ظاہر عباسی بھی تھا۔ وہ سنہ ۴۶۰ میں مصر پہنچا۔ وہاں ایوبی خاندان کے ممالیک کی حکومت قائم تھی اور ملک ظاہر بیدرس حکمران تھا۔ اسکو احمد کے خاندان کا حال معلوم ہوا تو منصب خلافت کا حقدار تسلیم کر لیا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

احمد بن ظاہر نے المستنصر باللہ کا لقب اختیار کیا اور بیدرس کی معیت و اعانت حاصل کر کے کوشش کی کہ دار الخلافۃ بغداد کو تاتاریوں کے تسلط سے نجات دلاے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی اور لڑائی میں شہید ہوا۔

اب پھر وہ وقت آگیا تھا کہ قریش سے خلافت کا انتساب بالکل معدوم ہو جائے، لیکن ”ما بقی منہم ائذان“ کی پیشین گوئی آخر تک اپنے عجائب دکھلانے والی تھی۔ قتل عام بغداد سے ایک اور عباسی شہزادہ ابو العباس احمد بن علی بچ کر نکل گیا تھا اور حلب میں مخفی تھا۔ اس کا حال بیدرس کو معلوم ہوا تو برے اعزاز و اکرام سے مصر لایا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ حاکم بامر اللہ کے لقب سے وہ مشہور ہوا۔ اسی کی نسل میں مصر کی عباسی خلافت ۲۹۱ برس تک قائم رہی۔ یعنی سنہ ۴۶۰ ھ سے سنہ ۹۲۳ ھ ہجری تک۔

اس عرصہ میں عالم اسلامی در صدیوں تک طرح طرح کے انقلابات و حوادث سے تہہ و بالا ہو کر بالآخر ایک نئے دور میں منتقل ہو چکا تھا۔ عثمانی ترکوں کی حکومت قسطنطنیہ میں قائم ہو کر یورپ و ایشیا کے اندر ہر طرف پھیل رہی تھی۔ سنہ ۹۲۳ ھ (۱۵۱۷ - مسیحی) میں سلطان سلیم خاں اول نے مصر و شام پر قبضہ کیا، اور آخری عباسی خلیفہ المتوکل نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے تمام حقوق و امتیازات خلافت سپرد کر دیے۔ حقوق خلافت کے علاوہ جو چیزیں اس سلسلہ میں سلطان سلیم کو دی گئیں، ان میں سب سے بڑی چیز مقامات مقدسہ و حرمین کی کنجیاں تھیں، اور بعض آثار نبویہ۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار - جھنڈا - ایک چادر - یہ آثار اس وقت تک قسطنطنیہ میں بطور سند خلافت کے موجود ہیں۔ اسی تاریخ سے عثمانی سلاطین نمایاں طور پر ”خلیفہ“ کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے اور حجاز اور مصر و شام کے منبروں پر انکا ذکر بہ حیثیت امیر المومنین کے ہونے لگا۔ حج کی امارت بھی انہی کے قبضہ میں آگئی جو شرعاً خلافت کے اہم ترین فرائض میں سے ہے۔

اور یقتل میدھا ” رواہ مسلم - اور روایت اس متفق علیہ کہ ” اللہم ان ابراہیم حرم مکہ “ رانی احرم ما بین لا بتیم ” (۱) -  
 یہ احکام تو خاص اس مرکز کی نسبت تھے - باقی رہا اسکا گرد و پیش ،  
 یعنی جزیرہ عرب ، تو گو اس کے لیے اس قدر اہتمام کی ضرورت نہ تھی کہ  
 اسمیں غیر مسلم کا داخلہ تک روک دیا جائے ، تاہم اسکا خالص اسلامی  
 ملک ہونا ضروری تھا - تاکہ اسلامی مرکز ارض کا گرد و پیش اور اسکا مولد  
 و منشاء ہمیشہ غیروں کے اثر سے یکقل محفوظ رہے -

اسلام کا جب ظہور ہوا تو علامہ مشرکین عرب کے یہود و نصارا کی بھی  
 ایک بڑی جماعت جزیرہ عرب میں آباد تھی - مدینہ میں یہودیوں کے  
 متعدد قبیلے تھے - خیبر میں انہی کی ریاست تھی - یمن میں نجران  
 عرب عیسائیوں کا بڑا مرکز تھا - مدینہ کی سرزمین خود آپ کی زندگی  
 ہی میں یہودیوں سے خالی ہو گئی - آخری جماعت جو مدینہ سے خارج  
 کی گئی بنو قینقاع اور بنو حارثہ کا گروہ تھا - امام مسلم نے ابن عمر کا  
 قول نقل کیا ہے ” ان یہود بنی النضیر حاربوا رسول اللہ صلعم فاجلی  
 بنی النضیر و اقر قریظہ و من علیہم “ حتی حاربت قریظہ فقتل رجالہم  
 و قسم اولادہم و نسائہم بین المسلمین الا بعضہم لحقوا برسول اللہ فامنہم  
 و اسلموا “ و اجلی یہود المدینۃ کلہم بنی قینقاع و ہم قوم عبد اللہ بن سلام  
 و یہود بنی حارثہ و کل یہودی کان بالمدینہ “

بخاری و مسلم میں اس آخری اخراج کا واقعہ برایت حضرت ابو ہریرہ  
 مروی ہے - آپ صحابہ کو ساتھ لیکر یہودیوں کی تعلیم گاہ میں تشریف  
 لیگئے اور فرمایا ” یا معشر الیہود اسلموا تسلموا “ اسلام قبول کرو - نجات  
 پاؤ گے - پھر فرمایا ” اعلموا ان الارض للہ و رسولہ و انی ارید ان اجلیکم من  
 ہذہ الارض فمن وجد منکم بمالہ شیئاً فلیبعہ “ والا فاعلموا ان الارض  
 للہ و رسولہ “ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ تم کو اس ملک سے خارج کردوں  
 پس اپنا مال و متاع فروخت کرنا چاہو تو کرو - ورنہ جان رکھو کہ اس  
 ملک کی حکومت صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کیلئے ہے -

---

( ۱ ) زیادہ مفصل بحث رسالہ جامع الشواہد میں لکھ چکا ہوں - اس  
 رسالہ کا اصل موضوع مسئلہ خلافت ہے - یہ ٹکڑہ ضمناً آگیا ہے - پس  
 اشارات پر اکتفا کیا گیا -



باللہ کے خون نے بہرہر ہمیشہ کیلیے عربی و قرشی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا - مستعصم کا قتل فی الحقیقت عربی خلافت کا قتل تھا : (۱)

و ما کن قیس ہلکہ ہلک واحد

و لکنہ بنیان قوم تہدما !

یہ سب کچھ ہو چکا ، مگر ابھی پیشیں گوئی کی ایک آخری سطر باقی تھی - یعنی ”ما بقی منہم ائذان“ قریش سے حکومت نکل جائیگی - پر نکل جانے پر بھی انکی عظمت رفتہ کا یہ اثر باقی رہیگا کہ اگر دو قرشی بھی کسی گوشہ میں نکل آئیں گے تو لوگ خلافت کا انہی کو مستحق مانیں گے - بغداد میں قرشی خلافت مٹی ، لیکن مٹتے مٹتے بھی ایک آخری نقش چھوڑ گئی - وہ بغداد کی خون آلود خاک سے اٹھتا اور تین سو برس تک کیلیے مصر میں جا کر جم گیا - البتہ یہ جماؤ قرشی حکومت کا جماؤ نہ تھا - محض اس کے نقش قدم کا تھا :

گو کہ ہم صفحہ ہستی پہ تم اک حرف غلط

لیکن آتم بھی تو اک نقش بتھا کے آتم !

( ۱ ) فتنۃ تاتار کا ظہور مسلمانوں کیلیے وہی معاملہ تھا جو بنی اسرائیل

کے لیے بخت نصر کے ظہور میں تھا - ثم بعثنا علیکم عباداً لنا اولی باس شدید -

فجاسوا خلال الدیار - و کان وعداً مفعولاً ( ۱۷ : ۶ ) بحکم ”یأني علی امتی

ما اتی علی بنی اسرائیل حذر النعل بالفعل“ ( صحیحین ) اس امت

پر بھی وہ سب کچھ گزرنے والا ہے جو بنی اسرائیل پر گزر چکا - بنی اسرائیل

پر غفلت و ضلالت کے دو سب سے بڑے دور آئے - اس لیے دو ہی مرتبہ

عام بربادی بھی چھائی اور انکی تعذیب کیلیے دو جابر و قاہر قومیں

مسلط ہوئیں : و قضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب لتفسدن فی الارض

مرتین و لتعلن علواً کبیراً ( ۱۷ : ۵ ) پہلی بربادی بخت نصر کے ہاتھوں

ہوئی : عباداً لنا اولی باس شدید - اور دوسری تیقس قیصر روم کے ہاتھوں -

معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح اس امت پر بھی طغیان و عصیان کے دو بڑے

وقت آنے والے تھے اور انکے نتائج دو معذب قوموں کی شکل میں ظاہر ہوئے -

قوم تاتار اور اقوام یورپ - بنی اسرائیل کی پہلی بربادی خود ایشیاء ہی

کی ایک قوم کے ہاتھوں ہوئی - یعنی اہل بابل کے ہاتھوں - اور دوسری

کا ظہور یورپ سے ہوا - یعنی روم سے - تھیک اسی طرح اس امت کیلیے

بھی پہلا فتنہ ایشیاء کا تھا ، دوسرا یورپ کا - پہلا ہو چکا - دوسرا ہو رہا ہے -

گیونگہ جب یہی ارضی مرکز قرار پایا تو تمام افراد قوم کیلیے لازمی ہوا کہ جہاں کہیں بھی ہوں ' رخ آنکھ اسی طرف رہے - دن میں پانچ مرتبہ اپنے قومی مرکز کے طرف متوجہ ہوتے رہیں - اور من جملہ بے شمار مصالح و حکم کے ایک قریب ترین حکمت فریضہ حج میں یہی ہے کہ ساری امت ' تمام کرہ ارضی ' اور تمام اقوام عالم کو ' حج فرض کر کے اس نقطہ مرکز سے دائمی پیوستگی بخشدی :

واذن فی الناس بالحج اور لوگوں میں حج کا اعلان کردہ - پھر ایسا  
یا توک رجلا رعلی کل ہوگا کہ ساری دنیا کو یہ گوشہ برکت کہینچ  
ضامریاتین من کل فج بلایگا - درر دور سے لوگوں کے پیادے اور سوار  
عمیق ( ۲۲ : ۲۸ ) قافلے اور گرہ پہنچیں گے !

( احکام شرعیہ )

اس مرکز کے قیام و بقاء کیلیے سب سے پہلی بات یہ تھی کہ ہمیشہ کیلیے اسکو صرف اسلام کیلیے مخصوص کر دیا جائے - جب تک یہ خصوصیت قائم نہ کی جاتی ' امت کیلیے اس مرکزیت کے مطلوبہ مصالح حاصل نہیں ہوسکتے تھے -

چنانچہ اسی بنا پر مسلمانوں کو حاکم دیا گیا کہ انما المشرکون نجس فلا یفریو المسجد الحرام بعد عامہم ہدا - مسجد حرام کے حدود صرف توحید کی پاکی کیلیے مخصوص ہیں - اب آئندہ کوئی غیر مسلم اسکے قریب بھی نہ آنے پائے - یعنی نہ صرف یہ کہ وہاں غیر مسلم نہ رہیں ' بلکہ کسی حال میں داخل بھی نہ ہوں - جمہور اہل اسلام نے اتفاق کیا کہ مسجد حرام سے مقصود صرف احاطہ کعبہ ہی نہیں ہے ' بلکہ تمام سرزمین حرم ہے - اور اسی طرح احادیث صحیحہ و کثیرہ سے جو حضرة علی ' سعد بن رقاہ ' انس ' جابر ' ابوہریرہ ' عبد اللہ بن زید ' رافع بن خدیج ' سہل بن حذیف ' وغیرہم اجلہ صحابہ سے مروری ہیں ' ثابت ہوچکا ہے کہ مدینہ کی زمین بھی مثل مکہ کے حرم ہے اور غیر و ثور اسکے حدود ہیں - " المدینہ حرام ما بین غیر الی ثور " أخرجه الشیخان - اور روایت سعد کہ " انی احرم ما بین لابتی المدینہ ان یقطع اعضا ہا

صدیوں سے اسلام و بلاد اسلام کی حفاظت کی تلوار صرف انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ صدیوں سے صرف انہی کا سینہ اسلام کی راہ میں زخمی ہے، صرف انہی کی لاشیں اسلام کیلئے خاک و خون میں ترپتی ہیں، اور صرف انہی کی ذمہ داری پر تمام کرۂ ارضی کے مسلمانوں نے اسلام کی مرکزی حفاظت کا کاروبار چھوڑ رکھا ہے۔ دنیا کے خواہ کسی گوشے میں کوئی مسلمان ہو، اگر وہ بہ حیثیت ایک مسلمان کے اسلام کا چوتھا رکن حج ادا کرنے کیلئے نکلتا ہے، تو عرفات کے میدان میں کھڑے ہر کراسکو عثمانی امامت کی دینی ریاست قبول کرنی پڑتی ہے اور حج کا فریضہ عثمانی خلیفہ ہی کے بھیجے ہوئے نائب کے ماتحت انجام دیتا ہے۔ شریف حسین نے غیر مسلم محاربین کا ساتھ دیکر اگر بغارت کی اور حجاز کو قسطنطنیہ کے اقتدار حکومت سے الگ کر لیا، تو یہ فساد و عداوت کی ایک عارضی حالت ہے جو شرعاً معتبر نہیں۔ حجاز حکماً اب بھی خلیفۂ قسطنطنیہ کی حکومت ہی کا ایک جزء ہے۔ اور تمام مسلمانان عالم کا شرعاً فرض ہے کہ حرمین کو باغیوں کے تصرف سے نکالنے کی کوشش کریں، اور اسوقت تک کرتے رہیں جب تک بغارت اور باغیوں کا بالکل استیصال نہ ہو جائے۔ اگر ایسا نہ کریں گے تو ہر مسلمان اس کے لیے عند اللہ جوابدہ ہوگا۔

تمام کرۂ ارضی کے مسلمان آرام و عیش کے دن بسر کرنے اور فارغ البالی کے بستر پر سونے کیلئے ہیں، لیکن صرف وہی ایک ہیں جو سارے مسلمانوں کی عزت و زندگی کے بچاؤ کیلئے صدیوں سے تلواروں کے سایے تلے زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں، اور چاروں طرف سے دشمنوں کی زد میں ہیں۔ کامل پانچ صدیوں سے یورپ اور ایشیا کا سب سے بڑا رقبہ ان کے خون سے رنگین ہو رہا ہے۔ ایک چوتھائی صدی بھی آج تک ایسی نہیں گزری کہ دشمنوں کی تلواروں نے انہیں مہلٹ دی ہو۔ انکا جرم اس کے سوا کچھ نہیں کہ جب اسلام کا محافظ دنیا میں کوئی نہ رہا۔ ساری تلواریں ثوت گئیں۔ سارے بازار شل ہو گئے۔ تو پانچ صدیوں سے وہ کیوں اسلام کے بچاؤ کیلئے باقی ہیں؟ اور کیوں وہ رقت آنے نہیں دیتے جب اسلام کی پولیٹیکل طاقت کا بالکل خاتمہ ہو جائے؟

بددستی تو خصمِ عالمی بامعنی  
ہزار دشمن و یک درست مشکل آفتاب است!

کا باب استدلالاً کافی سمجھا۔ لیکن حافظ مہذبی نے تلخیص مسلم میں ”اخراج الیہود والنصری من جزیرۃ العرب“ کا الگ باب بائد مگر جزیرۃ عرب والی روایتیں روایات اجلاء یہود سے الگ کر دی ہیں۔ یہ وصیت تبری علامہ طرق بالا کے مسند امام احمد، مسند حمیدی، آرر سنن بیہقی وغیرہ میں بھی مختلف طریقوں سے مرزی ہے، اور سب کا مضمون متعدد اور باہم دگر اجمال و تبیین اور اعتضاد و تقویت کا حکم رکھتا ہے۔

احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم اُن احکام کی ہے جنکا تعلق افراد کی اصلاح و تزکیہ سے ہوتا ہے۔ جیسے تمام ارامر و نواہی اور فرائض و واجبات۔ دوسرے وہ ہیں جنکا تعلق افراد سے نہیں بلکہ امت کے قومی اور اجتماعی فرائض اور ملکی سیاسیات سے ہوتا ہے۔ جیسے فتح ممالک و قوانین سیاسیہ و مالکیہ۔ سنۃ الہی یوں واقع ہوئی ہے کہ پہلی قسم کے احکام خود شارع کی زندگی ہی میں بتدریج تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں، اور وہ دنیا نہیں چھوڑتا مگر اُنکی تکمیل کا اعلان کرے۔ لیکن دوسری قسم کیلئے ایسا ہونا ضروری نہیں۔ بسا احکام ایسے ہوتے ہیں جنکے نفاذ و وقوع کیلئے ایک خاص وقت مطلوب ہوتا ہے اور وہ شارع کے بعد بتدریج تکمیل و تنفیذ تک پہنچتے ہیں۔ پس اُنکی نسبت یا تو بطریق پیشین گوئی کے خبر دیدی جاتی ہے۔ یا اپنے جا نشینوں اور امت کو وصیت کر دی جاتی ہے۔

یہ معاملہ اسی دوسری قسم میں داخل تھا۔ پس ضرور نہ تھا کہ اسکا پورا پورا نفاذ خود آنحضرت صلعم کی حیات طیبہ ہی میں ہو جاتا۔ آپ نے یہود مدینہ کے اخراج سے نفاذ شروع کر دیا۔ یہود خیبر سے ابتدا ہی میں شرط کر لی تھی کہ جب ضرورت ہوگی، اس سر زمین سے خارج کر دیے جاؤ گے۔ پھر تکمیل کیلئے اپنے جا نشینوں کو وصیت فرمادی۔ چنانچہ حضرۃ عمر (رض) کے زمانے میں تکمیل کا وقت آ گیا۔ اور یہود خیبر نے طرح طرح کی شرارتیں اور نافرمانیاں کر کے خود ہی اسکا موقعہ بہم پہنچا دیا۔ پس حضرۃ عمر نے اس وصیت کی تحقیق کی، اور جب پوری طرح تصدیق ہو گئی تو تمام صحابہ کو جمع کر کے اعلان کر دیا۔ سب نے اتفاق کیا، اور یہود خیبر و فدک خارج کر دیے گئے۔ اسی طرح نجران سے عیسائیوں کا اخراج بھی عمل میں آیا۔ امام زہری نے ابن عتبہ سے اور امام مالک نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے ”ما زال عمر حتی رجد الثبت عن رسول اللہ انہ قال لا یجتمع بجزیرۃ العرب دینان“ فقال من کان



سلسلہ خلافت کی یہ ایک مجمل تاریخ ہے - بالفرض خلیفہ متوکل عباسی نے سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت نہ کی ہوتی ' جب بھی آئندہ پیش آنے والے واقعات کا قدرتی نتیجہ یہی تھا کہ تمام اسلامی کی خلافت کا منصب عثمانی سلاطین ہی کے قبضہ میں آجائے - وقت کی جو اسلامی سلطنت سب سے بڑی اور سب سے زیادہ شرع و ملت کی حفاظت کی طاقت رکھتی ہو ' رہی شرعاً خلافت کا منصب رکھ سکتی ہے - گذشتہ چار صدیوں کے اندر اسلامی حکومتوں کے انقلابات کا جو حال رہا ہے ' انکو دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ حق بجز اس سلطنت کے اور کسی سلطنت کو مل سکتا تھا ؟ خود ہندوستان میں سلاطین مغلیہ کی حکومت قائم تھی - وہ ہندوستان کے اندر اپنے ہی کو امام سمجھتے تھے ' لیکن عالم اسلامی کی خلافت عظمیٰ کا دعویٰ کبھی انکے وہم و خیال میں بھی نہیں گزرا ' اور اگر گزرتا تو دنیا ماننے کیلئے طیار نہ تھی - ابتدا سے لیکر آخر تک مقام خلافت کی جو اہم و مشترک خصوصیات رہی ہیں اور جنکو تمام دنیا کے مسلمانوں نے عملاً بطور اسناد خلافت کے تسلیم کر لیا ہے ' وہ خلفاء عباسیہ کے بعد صرف عثمانی سلاطین ہی کو حاصل ہوئیں - کوئی دوسری اسلامی حکومت اس عام اقتدار و اختیارات کے ساتھ قائم نہ ہو سکی -

## فصل

( خلافت و امامت سلاطین عثمانیہ )

اس عارضی وقفہ کے بعد اب ہم پھر آگے بڑھتے ہیں - سلطان سلیم خان اول کے عہد سے لیکر آج تک بلا نزاع سلاطین عثمانیہ ترک تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام ہیں - ان چار صدیوں کے اندر ایک مدعی خلافت بھی انکے مقابلہ میں نہیں آتا - بنو امیہ اور عباسیہ کے عہدوں میں بے شمار رقیبوں اور دعویداروں کی کشمکش نظر آتی ہے ' لیکن سلاطین عثمانیہ کی خلافت کی پوری تاریخ میں کسی ایک مدعی خلافت کا نام بھی نہ ہونہر نہیں نکالا جا سکتا - حکومت کے دعویدار سیکڑوں آئے ہوں ' مگر اسلام کی مرکزی خلافت کا دعویٰ کوئی نہ کر سکا -



جب آپ دنیا سے تشریف لینگے تو در مقام ایسے رہ گئے تھے جہاں سے یہود و نصاریٰ کا اخراج نہ ہو سکا تھا۔ خیبر اور نجران۔ پس آپے وصیت فرمائی کہ ایک دن جزیرہ عرب صرف اسلام کیلئے مخصوص کر دیا جائے۔ جو غیر مسلم اس ملک میں باقی رہ گئے ہیں، خارج کر دیے جائیں۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے ”اخراج الیہود من جزیرۃ العرب“ اسمیں پہلی روایت یہود مدینہ کے اخراج کی لے ہیں جو ارپر گزر چکی۔ دوسری روایت حضرت ابن عباس کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے مرض الموت میں تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی۔ ایک یہ تھی ”اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب“ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں ”اقتصر علی ذکر الیہود لانہم یوحذرون اللہ تعالیٰ الا القلیل و مع ذلک امر باخراجہم“ فیکون اخراج غیرہم من الکفار بطریق اولیٰ “ (فتح الباری۔ ۶ : ۱۹۴) یعنی امام بخاری نے عنوان باب میں صرف یہود کا ذکر کیا۔ اسمیں استدلال یہ ہے کہ تمام غیر مسلم اقوام میں یہودی سب سے زیادہ توحید کے قائل ہیں۔ انکو خارج کیا گیا تو دیگر مذاہب کے اخراج کا رجوب بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا۔ حضرت عمر کی روایت میں ”یہود و نصاریٰ“ کا لفظ ہے ”لا تخرجن الیہود و النصارى من جزیرۃ العرب حتی لا ادع الا مسلما“ رواہ مسلم و احمد و الترمذی و صحیحہ۔ ابو عبیدہ بن جراح سے امام احمد نے روایت کیا ہے ”اخر ماتکم بہ رسول اللہ صلعم اخرجوا یہود اہل الحجاز و اہل نجران من جزیرۃ العرب“ حضرت عائشہ کی روایت میں اسکی علت بھی واضح کر دی ہے ”آخر ما عهد رسول اللہ صلعم ان قال لا یترک بجزیرۃ العرب دنیاں“ رواہ احمد۔ یعنی سب سے آخری وصیت رسول اللہ کی یہ تھی کہ جزیرہ عرب میں در دین جمع نہ ہوں۔ یعنی صرف اسلام کیلئے مخصوص ہو جائے۔ امام مالک کے موطا میں عمر بن عبد العزیز اور ابن شہاب کے مراسیل نقل کیے ہیں اور مضمودی و غیرہم نے باب باندھا ہے ”اخراج الیہود و النصارى من جزیرۃ العرب“ عمر ابن عبد العزیز کی روایت میں ہے ”کان من آخر تکلم بہ رسول اللہ صلعم انہ قال قاتل اللہ الیہود و النصارى“ اتخذوا قبور انبیائہم مساجد۔ لا یبقیان دنیاں بارض العرب“ اور ابن شہاب کا لفظ ہے ”لا یجتمع دنیاں فی جزیرۃ العرب“ حضرت عمر ابن عبد العزیز نے آخر تکلم ”قاتل اللہ الیہود و النصارى“ جو نقل کیا ہے، تو حضرت عائشہ سے صحیحین وغیرہا میں بطریق رفع بھی ثابت ہے۔ حافظ نواری نے گرامام بخاری کا اتباع کیا اور ”اجلاء الیہود“

ہم یہاں قصداً ترکوں کی سیاسی و تمدنی کارگزاریوں کی بحث نہیں چھیڑینگے۔ ہم کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی تمام حکمران جماعتوں میں ترکوں ہی کی جماعت وہ بد قسمت جماعت ہے جسکے لیے کوئی یورورپین دماغ منصف نہیں ہو سکتا۔ یورپ کا پچھلا مورخ ہو ' خواہ موجودہ عہد کا مدبر ' وہ گذشتہ عہد کے بدتر سے بدتر مسلمانوں کی مدح و توصیف کر سکتا ہے جو اب موجود نہیں ہیں ' لیکن اُن ترکوں کی نہیں کر سکتا ' جنکی تلواریں پانچ صدیوں سے یورپ کے دل و جگر میں پیوست ہونے کیلئے چمکتی رہی ہیں۔ وہ خلافت بنو امیہ کی ایک بہتر تاریخ لکھ سکتا ہے۔ عباسیہ کے دور علم و تمدن کی مدحت سرائی کر سکتا ہے۔ صلاح الدین ایوبی تک کو ایک بت کی طرح پوچ لے سکتا ہے۔ لیکن وہ اُن ترکوں کیلئے کیونکر انصاف کر سکتا ہے جو نہ تو عرب پر قانع ہوئے ' نہ ایران و عراق پر۔ نہ شام و فلسطین کی حکومت اُنکو خوش کر سکی ' نہ وسط ایشیا کی ' بلکہ تمام مشرق سے بے پروا ہو کر یورپ کی طرف بڑھے ' اسکے عین قلب ( قسطنطنیہ ) کو مسخر کر لیا ' اور اُسکی اندرونی آبادیوں تک میں سمندر کی موجوں کی طرح در آئے۔ حتیٰ کہ دار الحکومت استریا کی دیواریں اُنکے جولان قدم کی ترکتازیوں سے بارہا گرتے گرتے بچ گئیں !

ترکوں کا یہ وہ جرم ہے جو یورپ کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کا کوئی موجودہ حکمران خاندان اس جرم ( فتح یورپ ) میں انکا شریک نہیں ہے۔ اسلیئے ہر حکمران مسلمان اچھا تھا جو یورپ کی طرف متوجہ نہ ہو سکا ' مگر ہر ترک وحشی و خونخوار ہے۔ اسلیئے کہ یورپ کا طلسم سطورت اُسکی شمشیر بے پناہ سے ٹوٹ گیا۔

ترکوں نے پانچ صدیوں تک جس آزادی و فیاضی کے ساتھ حکومت کی ہے ' اُسکا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ چار صدیوں کی متصل حکمرانی کے بعد بھی محکوم عیسائیوں کی مذہبی و قومی عصبیت ویسی ہی زندہ و توانا رہی ' جیسی کسی متعصب سے متعصب مسیحی حکومت کے ماتحت رہ سکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ترکوں کی کمزوری کے ساتھ ہی آزاد و خود مختار ہو گئے ' اور آج ایک حریف و مقابل کی طرح لڑ رہے ہیں۔

ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے پورے تسلط کو ابھی پورے سو سال بھی نہیں ہوئے۔ اتنے ہی عرصہ کی حکومت نے قومی عظمت

رہا ہے ۔ پس جو مطالب اسکا سمجھا جاتا تھا اور سمجھا جاتا ہے  
 رہی سمجھا جایگا ۔ تمام مورخین و جغرافیہ نگاران قدیم و جدید متفق ہیں  
 کہ عرب کو ” جزیرہ “ اسلیے کہا گیا کہ تین طرف سمندر اور ایک جانب  
 دریا کے پانی سے محصور ہے ۔ یعنی تین طرف بحر ہند ، خلیج فارس ، اور  
 بحر احمر و قلزم واقع ہیں ، اور ایک جانب دریائے دجلہ و فرات ۔ فتح الباری  
 وغیرہ میں ہے ” قال الخلیل سمیت جزیرۃ العرب لان بحر فارس و بحر  
 العشبہ و الفرات و الدجلہ احاطت بہا “ ( ۱۱۸ : ۶ ) اور اصمعی کا قول ہے  
 ” لاحاطۃ البحار بہا “ یعنی بحر الہند و القازم و بحر فارس و بحر العشبہ و دجلۃ  
 ( ایضاً ) اور نہانہ میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے ” سمیت جزیرہ لان  
 بحر الفارس و بحر السودان احاط بجانبيہا “ و احاط بالجانب الشمالي دجلۃ  
 و الفرات ” یہی قول ارباب لغۃ کا ہے ۔ قاموس میں ہے ” جزیرۃ العرب  
 ما احاط بہ بحر الہند و الشام ثم دجلہ و الفرات “ پروفیسر پطرس بستانی نے  
 ( جو زمانہ حال میں شام کا ایک مشہور مسیحی مصنف گزرا ہے اور جنس  
 نے عربی میں انسائیکلو پیڈیا لکھنی شروع کی تھی ) محیط المحيط میں  
 جزیرہ عرب کی یہی تعریف کی ہے ۔ حاصل سب کا یہی ہے کہ جزیرہ عرب  
 وہ سرزمین ہے جسکے تین جانب سمندر ہیں اور شمالی جانب دریائے  
 دجلہ و فرات ۔

سب سے زیادہ مفصل جغرافیہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں  
 دیا ہے جس سے زیادہ جامع و معتبر کتاب عربی میں جغرافیہ و تقویم بلدان کی  
 کوئی نہیں ۔ اور اسکو بروایت ابو المنذر حضرۃ ابن عباس سے نقل کیا ہے ۔  
 ” قال انما سمیت بلاد العرب جزیرۃ لاحاطۃ الانہار و البحار “ و ذلک ان الفرات  
 اقبل من بلاد الروم ، فظهر بناحیۃ قنسرین ، ثم انحط علی أطراف الجزیرہ  
 و سواد العراق ، حتی وقع فی البحر فی ناحیۃ البصرۃ و الابلہ ، و امتد الی  
 عبادان ، و اخذ البحر فی ذلک الموضع مغرباً منعطفاً ببلاد العرب “ الخ ۔  
 خلاصہ اس کا یہ ہے کہ عرب اسلیے جزیرہ مشہور ہوا کہ سمندروں اور دریاؤں  
 سے وہ گھرا ہوا ہے ۔ صورت اسکی یوں ہے کہ دریائے فرات بلاد روم سے شروع  
 ہوا اور قنسرین کے نواح میں عرب کی سرحد پر ظاہر ہوا ۔ پھر عراق میں  
 ہوتا ہوا بصرہ کے پاس سمندر میں جا ملا ۔ وہاں سے پھر سمندر نے عرب کو  
 گھیرا ، اور قطیف و ہجر کے کناروں سے ہوتا ہوا عمان اور شہر سے گزر گیا ۔  
 پھر حضر موت اور عدن ہوتا ہوا یحہم کی جانب یمن کے ساحلوں سے

پس تیرہ سو برس کے متفقہ عقیدہ و عمل کے مطابق رہی آج تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام اور ”اولو الامر“ ہیں۔ انکی اطاعت و حمایت اللہ اور اُسکے رسول کی اطاعت و حمایت ہے۔ اُنسے پھرنا اور انکو اپنے جان و مال سے مدد نہ دینا، اللہ اور اُسکے رسول سے پھرنا ہے اور اللہ اور اُسکے رسول کو اپنی جان و مال کی طرف سے صاف جواب دیدینا ہے۔ جو انکی اطاعت سے باہر ہوا، اگرچہ صرف بالشت بھر باہر ہوا ہو، اور اسی حالت میں مرگیا، اُسکی موت اسلامی زندگی کی موت نہوگی۔ جاہلیہ کی موت ہوگی۔ اگرچہ نماز پڑھتا ہو، اگرچہ روزہ رکھتا ہو، اگرچہ اپنے زعم باطل میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔ جس نے اُنکے مقابلہ میں تلوار اُٹھائی، وہ مسلمانوں میں سے نہیں اگرچہ دنیا اُسکو مسلمانوں میں سے سمجھتی ہو۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی شہادت، اُسکی شریعت کی اُن گنت اور بے شمار دلیلیں، ایک ہزار تین سو برس سے مانا ہوا اسلام کا حکم و عقیدہ، اسلام کی سیکڑوں نسلوں اور لا تعداد گھرانوں کا تعامل و اجماع، اور سورج کی کرنوں کی طرح یقینی اور قطعی حقیقت، یہی بتلا رہی ہے اور ہر مسلمان کے دل پر نقش ہے۔ ایک مسلمان کیلئے (بشرطیکہ وہ ساری باتوں سے مقدم اپنے اسلامی تعلق کو سمجھتا ہو، اور دنیا سے ایک مومن اعتقاد و عمل ساتھ لے جانا چاہتا ہو) اس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ جاہل سے لیکر عالم تک، مزدور سے لیکر نظام دکن تک، کوئی نہیں جس کا دل اس اعتقاد سے خالی ہو۔ زندگی کا عشق اور نفس کی پرستش جس انسان سے چوری کرا لیتی ہے، داکے دلاتی ہے، قتل کراتی ہے، اُس انسان سے کیا بعید ہے کہ آج کسی طمع یا خوف سے عثمانی خلافت کا انکار کر دے، یا عثمانی خلیفہ کی اطاعت و حمایت کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے؟ دنیا کی پوری تاریخ انسانی کمزوریوں کی درد انگیز مثالوں سے لبریز ہے۔ پس یہ کوئی عجیب واقعہ نہ ہوگا اگر آج چند نئی مثالوں کا مزید اضافہ ہو جائے۔ لیکن حقیقت ہر حال میں حقیقت ہے۔ اُس سے انکار کیا جا سکتا ہے لیکن اُس کو چھپایا نہیں جاسکتا۔ اُس سے اغماض کیا جاسکتا ہے، لیکن اُس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اُس سے آنکھیں بند کر لی جاسکتی ہیں لیکن اُس کی زبان بند نہیں کی جاسکتی!

”لہ میں اہل الکتابین مہد فلیات بہ“ انفذ لہ“ والا فانی مجلیکم“ فاجلاہم“  
 (اخریٰ ابن ابی شیبہ) امام بخاری نے یہود خیبر کے اخراج کا واقعہ  
 کتاب الشرط کے باب ”اذا اشترط فی المزارعہ اذا شئت اخرجتک“ میں  
 درج کیا ہے، اور ترجمہ باب میں استدلال ہے کہ یہود خیبر کا تقرر پہلے ہی سے  
 غرضی و مشروط تھا۔ بالاستقلال نہ تھا۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ حضرت  
 عمر کے اجلاء کردہ اہل کتاب کی تعداد چالیس ہزار منقول ہے۔ (۱)

پس صاحب شریعت کے قول و عمل، انکے آخرین لمحات حیات کی  
 وصیت، حضرت عمر کے فحوص و تصدیق، تمام صحابہ کے اجماع و اتفاق سے  
 یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسلام نے ہمیشہ کیلئے جزیرہ عرب کو صرف اسلامی  
 آبادی ہی کیلئے مخصوص کر دیا ہے۔ الا یہ کہ کسی مصلحت سے خلیفہ  
 وقت غرضی طور پر کسی گروہ کو داخل ہونے کی اجازت دیدے۔ اور ظاہر  
 ہے کہ جب غیر مسلموں کا قیام از در دینوں کا اجتماع وہاں شریعت کو  
 منظور نہیں، تو غیر مسلم کی حکومت یا حاکمانہ نگرانی و بالا دستی کو  
 جائز رکھنا کب شرعاً مسلمانوں کیلئے جائز ہو سکتا ہے؟

### ( جزیرہ عرب کی تحدید )

باقی رہا یہ مسئلہ کہ جزیرہ عرب سے مقصود کیا ہے؟ تو یہ بالکل صاف  
 و واضح ہے۔ اسکے لیے کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں۔ نص  
 حدیث میں ”جزیرہ عرب“ کا لفظ وارد ہے۔ اور عقلاً و اصولاً ظاہر ہے کہ  
 جب تک کوئی سبب قوی موجود نہ ہو، کسی لفظ کے منطوق اور عام  
 و متعارف مدلول سے انحراف جائز نہ ہوگا۔ اور نہ بلا مخصص کے قیاساً  
 تخصیص جائز۔ شارع نے ”جزیرہ“ کا لفظ کہا، اور دنیا میں اسوقت سے  
 لیکر اب تک جزیرہ عرب کا اطلاق ایک خاص ملک پر ہر انسان کر رہا اور جان

---

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیری و صایا شمار کیے گئے تو  
 مختلف روایات میں سات کلمات ملے۔ انکے زامی کہتے ہیں کہ یہ منجملہ  
 آخر ما تکلم بہ کے ہیں۔ پھر ان کے فقہ و اسرار پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ  
 فی الحقیقت وہی کلمات خاتم النبیین کی حیات طیبہ کے اخیری ارشادات  
 ہو سکتے تھے۔ اس فصل کے لکھتے ہوئے طبیعت بے اختیار اُس طرف مائل  
 ہوگئی اور رسالہ کی تحریر ملتوی کر کے انکی شرح لکھنی شروع کردی۔  
 اور در دن میں ختم ہوئی۔ فالحمد للہ علی ذلک۔



بہر حال ہماری صحبت سے یہ موضوع باہر ہے ۔ ترکوں کی حکمرانی جیسی کچھ بھی رہی ہو۔ ہر ترک سلطان حجاج بن یوسف اور خالد قسری جیسے اشرار بنو امیہ سے بھی بدتر کیوں نہ رہا ہو ( ۱ ) لیکن مسلمانوں کو اپنے مسلمان حاکموں کی اطاعت کا ہر حال میں حکم دیا گیا ہے ۔ اور انکا از روئے شرع یہی عقیدہ ہے کہ وہ خلیفۃ اسلام ہیں ۔ اسمیں کسی دوسرے کو دخل دینے کا حق نہیں :

( ۱ ) آج ترکوں کی وحشت و تمدن کا فیصلہ علم و تحقیق کے ہاتھ میں نہیں ہے ۔ حریف حکومتوں کے اُن مغرور وزراء کے قبضہ میں ہے جو میدان جنگ سے واپس آکر اپنے ایک جنگی دشمن کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں ۔ پس امید نہیں کہ ڈریپر ( Draper ) جیسے زمانہ حال کے مورخوں کی شہادت اس بارے میں سنی جائے ۔ یہ امریکن مصنف اپنی مشہور کتاب History of The Conflict Between Religion And Science میں لکھتا ہے کہ انصاف و عدالت اور مذہبی بے تعصبی میں اپنے عہد کی تمام عیسائی دنیا پر ترکوں کو وہی فوقیت رہی ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کو تذل یافتہ بیزنطائن پر حاصل تھی ۔ ایڈورڈ کریسی نے تاریخ روم میں ترکوں کو تہذیب و تمدن اور علمی ایجادات و اختراعات کے لحاظ سے پذیر ہوئے اور سولہویں صدی کے تمام یورپ میں سب سے برتر قوم تسلیم کیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ انسائیکلو پیڈیا کے قسم کی کتابیں لکھنے کا ترکوں ہی کی تقلید سے یورپ میں رواج ہوا ۔ یورپ کی زبانوں میں سب سے پہلی انسائیکلو پیڈیا ڈالامبرٹ ( D'alambert ) نے لکھی ۔ لیکن اُسکو ایک ترک مصنف کلبی بے کی قاموس العلوم ہی کے مطالعہ سے رہنمائی ملی تھی ۔ کمسریٹ ' رسد رسائی ' اور فوجی شفا خانوں کا باقاعدہ انتظام ' ترکوں ہی سے یورپ نے سیکھا ۔ قلعہ کی تعمیرات میں تمام یورپ ترکوں کا شاگرد ہے ۔ فوجی باجا تمام یورپ نے ترکوں سے حاصل کیا ۔ چیچک کے تیکہ کا اصلی موجد ایک ترک تھا ۔ یہ ڈریپر ' کریسی ' کدگم ' کلفرد ' وغیرہ مورخوں کی تحقیق ہے جنہوں نے اپنے کتب خانوں میں بیٹھ کر ترکوں کے اعمال پر نظر ڈالی تھی ۔ قدرتی طور پر مسٹر ایسکویتھ اور مسٹر لائڈ جارج کی رائے اس سے مختلف ہونی چاہیے جو ابھی ابھی گیلی پولی اور عمارہ میں ترکوں کی تلوار کا کاری زخم کھا کر نکلے ہیں ' اور کتب خانوں کی جگہ نظارت خانوں کے اندر فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں !

اسکے بعد بحر متوسط ہے جسکے ابتدائی حصہ کو قدیم جغرافیہ نویس بحر مصر و شام سے تعبیر کرتے تھے۔ اسی پر بیرت واقع ہے اور ساحل سے اندر کی جانب دیکھو گے تو پھر وہی مقام سامنے ہوگا، جہاں سے دریائے فرات نمودار ہو کر خلیج فارس کی جانب بہتا تھا۔ پس ایک پورا مثلث نما ٹکڑہ ہے جو اس تمام بحری احاطہ کے اندر واقع ہے۔ صرف خشکی کا ایک حصہ شمال میں فرات کے بائیں جانب نظر آتا ہے۔ یعنی شام۔ یہی مثلث ٹکڑہ جزیرہ عرب ہے۔ قدیم و جدید جغرافیہ نگار دونوں اسمیں متفق ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے ”جزیرہ“ اور ”جزیرہ نما“ ہونے میں سب سے زیادہ اہم رجوع دریائے دجلہ و فرات کا ہے۔ کیونکہ اگر یہ عرب کے حدود سے کوئی متصل تعلق نہیں رکھتے، تو پھر اسکی ایسی صورت ہی باقی نہیں رہتی جس پر جزیرہ کا اطلاق ہو سکے۔ شمال کی جانب بالکل خشک رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کسی نے عرب کی تعریف کی، احاطہ بحر و نہر کا لفظ کہہ کر واضح کر دیا کہ جانب شمال دجلہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جنہوں نے مقامات کے نام لیکر حدود متعین کیے، انہوں نے صاف کہہ دیا کہ شمالی حد دجلہ ہے۔ نہایت معجم البلدان اور فتح الباری میں اسمعی کا قول منقول ہے ”من اقصى عدن ابین الی ریف العراق طولاً“ و من جدہ و ساحل البحر الی اطراف الشام عرضاً ”کرمانی نے کہا ”ہی ما بین عدن الی ریف العراق طولاً“ و من جدہ الی الشام عرضاً“ یہی قاموس میں ہے۔ ایسا ہی ابن کلبی سے مرزی ہے۔ رفاعہ بک طہطہاری نے قدیم و جدید کتب سے اخذ کر کے عربی میں ”تعریفات النافعة لمريد الجغرافیه“ لکھی۔ اسمیں بھی یہی حدود ہیں۔ پس صاحب معجم کی تفصیل اور تمام اقوال سے ثابت ہوا کہ عرب طول میں عدن سے لیکر عراق کی ترائی تک، اور عرض میں ساحل بحر احمر سے خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے۔ اسکی حد شمال میں دھنی جانب دجلہ ہے، اور بائیں جانب عرض کا خط کہیچیں تو شام۔ آجکل کے جغرافیوں میں بھی عرب کے حدود یہی بتلائے جاتے ہیں کہ پچھم میں بحر احمر، جنوب میں بحر ہند، پورب میں خلیج فارس، اور دکھن میں ملک شام ہے۔

ر عصبیۃ کے جذبات ان لوگوں کے دلوں سے بھی کھینچ لیے ہیں جنکے آباؤ اجداد ساتھ ستر برس پہلے اسی سرزمین میں حکمران تھے - صرف یہی ایک چیز یورپ کے طرز حکومت ' اور ترکوں کے طرز حکومت کا فرق واضح کر دینے کیلئے کافی ہے !

ترکوں کے دھم و خیال میں بھی ظام و خونخواری کی رہ ہیبت ناک صورتیں اور قومی تعصب و نفرت کی رہ وحشت ناک ہلاکیاں نہیں آسکتیں ' جو یورپ کے تمدن و تہذیب کا مغرور بت عین آنیسویں اور بیسویں صدی کے سورج کی روشنی میں ایشیاء افریقہ کے اندر کرچکا ہے - ان در صدیوں کے اندر جنگل کے درندے آرام کی نیند سوے ' اور سانپوں کو آنکھ غاروں سے باہر نہیں نکالا گیا ' لیکن ایشیاء افریقہ میں یورپ کے ہاتھوں زمین کا ایک ٹکڑہ بھی ایسا نہ بچ سکا جسکو وہانکی بد بخت مخلوق اپنی زمین کہہ سکے ' اور جہاں ایک مالک و مختار کی طرح امن و عزت کی زندگی بسر کر سکے !

خود اسہم آخری جنگ میں یورپ کے ہر درندے نے دوسرے درندے کو جس طرح پہاڑا ' اور ہر سفید بھیڑیے نے دوسرے سفید بھیڑیے پر جس طرح پنچہ مارا ' نہ صرف ترکوں کی تاریخ میں بلکہ تمام ایشیا کی خونریزیوں کی مجموعی تاریخ میں اسکی کوئی مثال نہیں مل سکتی -

با ایں ہمہ ترک خونخوار اور وحشی ہیں ' اور یورپ تہذیب و تمدن اور امن و رحم کا پیغمبر ہے ! علی الخصوص برطانیہ کے مقدس جزیرہ میں تو جس قدر فرشتے بستے ہیں ' وہ صرف انسانی آزادی کی حفاظت اور چھوٹی قوموں کی حمایت ہی کیلئے آسمان سے اتارے گئے ہیں !

یہ کرۂ ارضی کی تاریخ میں حق و باطل کا سب سے بڑا مقابلہ ہے - آج اسکی فتح و شکست کا اصلی فیصلہ نہیں ہو سکتا - زمین فوجوں کے بوجھ سے دبے ہوئی ہے - فضاء ہوائی جہازوں کی قطاروں سے بھری ہوئی ہے - اسکا فیصلہ کل ہوگا جب خدا کا دائمی قانون نتائج و عواقب کی زبان میں حقیقت کا اعلان کریگا ' اور مورخ کا قلم لکھے گا کہ یہ طاقت اور گھمنڈ کا سب سے بڑا چیلنج تھا جو سچائی کو دیا جاسکتا ہے - تاہم سچائی ہی سب سے بڑی طاقت ہے - اور بالآخر فیصلہ اسی کا فیصلہ ہے - سنة الله في الدين

جا آکر آیا۔ حتیٰ کہ جدہ نمودار ہوا جو مکہ و حجاز کا ساحل ہے۔ پھر ساحل طرر اور خلیج ایلہ پر جا کر سمندر کی شاخ ختم ہو گئی۔ پھر سرزمین مصر شروع ہوتی ہے، اور قلزم نمودار ہوتا ہے اور اسکا سلسلہ بلاد فلسطین سے سواحل عسقلان ہوتا ہوا سرزمین صرور ساحل اردن تک بیروت پر پہنچتا ہے، اور آخر میں پھر قنسرین تک منتهی ہو کر رہ جگہ آ جاتی ہے جہاں سے فرات نے عرب کا احاطہ شروع کیا تھا۔ پس اس طرح چاروں طرف پانی کا سلسلہ قائم ہے۔ بحر احمر اور قلزم کی درمیانی خشکی بھی پانی سے خالی نہیں۔ کیونکہ سودان سے دریائے نیل وہاں آ پہنچا ہے اور قلزم میں گرتا ہے۔ یہی جزیرہ ہے جس سے عرب کی سرزمین عبارت ہے اور یہی عرب اقوام کا مولد و منشاء ہے ” انتہی ملحظاً - ( جلد ۳ - ۱۰۰ )

اس تفصیل سے بالکل واضح ہو گیا کہ جزیرہ عرب کے حدود کیا ہیں؟ عرب کا نقشہ اپنے سامنے رکھو اور اس پر مندرجہ بالا تخطیط منطبق کر کے دیکھو۔ اوپر شمال ہے۔ دھنہ مشرق اور بائیں مغرب۔ شمال میں دریائے فرات مغرب سے خم کھاتا ہوا نمودار ہوتا ہے اور صحرائے شام کے کنارے سے گزرتا ہوا دجلہ سے مل جاتا ہے۔ پھر دونوں ملکر خلیج فارس میں گرتے ہیں۔ فرات کے پیچھے دجلہ کا خط ہے اور اسی پر بغداد واقع ہے۔ خلیج فارس کے مشرق میں ایران ہے اور مغربی ساحل میں قطیف و احساء۔ پھر یہ خلیج تنگ نائے هرمز سے نکل کر مسقط و عمان کے کناروں سے گزرتا ہے اور اسکے بعد ہی بحر عمان نمودار ہو جاتا ہے۔ اسکے بعد حضرموت کا ساحل دیکھو گے۔ پھر عدن آ گیا، اور باب المندب سے جنوبی آگے بڑھے، بحر احمر شروع ہو گیا۔ چونکہ اسکا مغربی ساحل افریقہ و حبش سے متصل ہے، اسلیے قدیم جغرافیہ میں اسکو بحر حبش بھی کہتے تھے۔ بحر احمر کے کنارے پہلے یمن اور پھر جدہ ملیگا۔ اسکے بعد ساحل حجاز۔ حتیٰ کہ سمندر کی شاخ یتلی ہو کر طور سینا تک منتهی ہو گئی، اور اسکے ساتھ ہی خلیج عقبہ کی شاخ نظر آئیگی۔ اب مصر کی سرزمین شروع ہو گئی۔ نہر سوئیس کے بننے سے پہلے یہ خشکی کا ایک ٹکڑہ تھا جس نے بحر احمر کو بحر متوسط سے جدا کر دیا تھا۔ اسلیے صاحب معجم نے یہاں دریائے نیل کا ذکر کیا ہے جو اسی درمیانی تختہ خشک کے بالیں جانب دیکھ رہے ہو۔ قاہرہ سے ہوتا ہوا اسکندریہ کے پاس سمندر سے جا ملا ہے۔ پس اگرچہ اُس زمانے میں یہ ٹکڑہ خشک تھا مگر سمندر کی جگہ دریائے نیل کا خط آبِی موجود تھا۔



” در مدت شش سال در کثرت از امیر المؤمنین منشور اولو الامری و خلعت شاہی و لواء سلطنت بدر رسید ‘ و حق جل و علی پادشاہ دین پرور ما را در عزت داشت منشور و خلعت و فرستادگان توفیق بخشید ‘ و شرائط حرمت مراحم امیر المؤمنین بالغاً ما بلغ بجا آورد ‘ و ہم چنین دانست کہ منشور و خلعت امیر المؤمنین از آسمان منزل شدہ ‘ و از درگاہ مصطفی صلعم رسیدہ - عرضداشتے با تحفہ و ہدایاء در نہایت تواضع بندگی امیر المؤمنین روان کرد “ الخ (صفحہ - ۵۹۸)

یعنی سلطان فیروز شاہ کے فضائل و مفاخر میں سے ایک بڑی بات یہ سمجھی گئی کہ خلیفہ مصر نے اجازت حکومت کا پروانہ اور لواء و خلعت بھیجا ‘ اور پادشاہ کو اسکی اطاعت و حرمت کی توفیق ملی - فیروز شاہ نے اس بات کی اس درجہ قدر کی - گویا آسمان سے یہ عزت نازل ہوئی ہے ‘ اور خود بارگاہ حضرت محمد الرسول اللہ صلعم سے اسکو قبولیت کی سند ملگئی ہے !

شمس الدین سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے لکھا ہے - جب خلیفہ کے سفراء شہر کے قریب پہنچے تو فیروز شاہ خود استقبال کیلئے پیدل نکلا - فرمان خلافت کو دوڑوں ہاتھوں میں لے لیا - پھر بوسہ دیکر سر پر رکھا ‘ اور اسی طرح سر پر دھرے ہوئے دربار حکومت تک واپس آیا -

غور کرو ! مقام خلافت کی عظمت و جبروت کا اثر کس درجہ عالمگیر رہا ہے ؟ خلافت بغداد کے مٹنے کے بعد بھی خلافت کی صرف برائے نام نسبت اس درجہ ہیبت و جبروت رکھتی تھی کہ ہندوستان جیسے بعید گوشہ میں ایک عظیم الشان فرمان رواے اقلیم ‘ اذن و اجازت حاصل ہوجانے پر فخر کرتا ہے - ‘ اور مٹنے پر بھی اس مقام کی عظمت تمام عالم اسلامی پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ وہاں کا فرمان آسمانی فرمان ‘ اور وہاں کا حکم بارگاہ نبوت کا حکم سمجھا جاتا ہے !

مغلیہ سلطنت خلفاء مصر کے آخری عہد میں قائم ہوئی - ہندوستان میں بابر شاہ کی قسمت آزمائیوں کا زمانہ تھا جب سلطان سلیم خان کے ہاتھ پر خلیفہ متوکل عباسی نے بیعت کی اور جحاز و شام میں سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا اعلان ہوا - شاہان مغلیہ اگرچہ ہندوستان میں خود اپنے ہی کر





نمی دانم ز منع گریه مطلب چیست ناصم را ؟  
دل از من، دیده از من، آستین از من، کنار از من !

## فصل

( مسلمانان هند اور خلافت سلاطین عثمانیہ )

جب تک بغداد کی خلافت باقی رہی، ہندوستان کے تمام حکمران خاندان اسی کے زیر اثر اور فرمانبردار رہے۔ عباسیہ بغداد کی خلافت جب مت گئی، اور سنہ ۶۶۰ھ میں مصر کی عباسی خلافت کا سلسلہ شروع ہوا، تو اگرچہ یہ عباسیہ کے کاروان رفتہ کا محض ایک نمود غبار تھا، تاہم تمام سلاطین ہند اسکی حلقہ بگوشی و غلامی کو اپنے لیے موجب فخر و امتیاز سمجھتے رہے، اور مرکزی خلافت کی عظمت دینی نے مجبور کیا کہ اپنی حکومت کو شرعی طور پر منوادینے کیلئے مقام خلافت سے پروانہ نیابت حاصل کرتے رہیں۔ سلطان محمد بن تغلق شاہ کے غرور حکومت کا یہ حال تھا کہ مشہور مورخ ضیاء الدین برنی اسکو ”ہمت فرعونی و نمرودی“ سے تعبیر کرنا چاہتا ہے۔ تاہم اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ غرور جوہ کرسکا، یہی تھا کہ اپنے تئیں خلیفہ مصر کا سب سے بڑا فرمانبردار غلام اور چا کر ظاہر کرے، اور رعایا کو یقین دلائے کہ بلا اس کے حکم کے میں تم پر حکومت نہیں کرتا۔ تاریخ برنی میں ہے :

”امیر المؤمنین خلیفہ را بندہ ترین ہمہ بندگان بود، ر بے امر ر بے فرمان اور دست در امور اولو الامری نہ زد“ (مطبوعہ ایشیاٹک سوسیٹی - صفحہ - ۱۴۰)

برنی نے سلطان فیروز شاہ کے فضائل و سوانح کیلئے گیارہ مقدمے ترتیب دیے ہیں۔ ان میں نوراں مقدمہ یہ ہے :

”مقدمہ نہم در آنکہ در کرت از حضرت امیر المؤمنین خلعت اولو الامری ر منشور اذن و لواء شاہی بر سلطان عصر فیروز شاہ رسیدہ، و بادشاہی ر اولو الامری خداوند عالم بدان استحکام گرفتہ“  
پھر اسی مقدمہ میں لکھتا ہے :

اسی معجم البلدان میں عراق کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ”ای انہا اسفل ارض العرب“ (جلد ۹ : ۱۳۳) یعنی عراق اسلیے نام ہوا کہ زمین عرب کا سب سے زیادہ نچلا حصہ ہے ۔ اس سے بھی واضح ہو گیا کہ عراق عرب میں داخل ہے ۔ البتہ عراق کا وہ حصہ جو دجلہ کے پار واقع ہے ، اس میں داخل نہ ہوگا ۔

ہم یہاں عرب کا ایک نقشہ تفسیر البیان کے مسودہ سے لیکر درج کرتے ہیں ۔ اس نقشہ میں ظہور اسلام کے وقت جزیرہ عرب کی حالت دکھلائی ہے ۔ یہ نقشہ دراصل یورپ کے بعض مشہور مستشرقین (ارنٹیلست) نے قدیم نقشوں اور تعریفات سے مدد لیکر طیار کیا تھا جسکو سنہ ۱۸۵۰ء میں پروفیسر فردیننڈ ریسن فیلڈ (Ferdinand Wustenfled) نے لیڈن یونیورسٹی سے شائع کیا ۔ جزیرہ عرب کے تمام قدیم نقشوں میں یہ سب سے زیادہ صحیح اور مستند ہے ۔ نقطوں کے خطوط سے تجارتی قافلوں کی وہ سڑکیں دکھلائی ہیں جو چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے اندرونی مقامات سے سرحال تک جاتی تھیں ۔

#### ( مسجد اقصیٰ و ارض مقدس )

مقامات مقدسہ اسلامیہ کے سلسلہ میں بیت المقدس اور اسکی سر زمین کا مسئلہ مسلمانوں کیلئے اس سے کم اہمیت نہیں رکھتا جسقدر حرم مکہ اور حرم مدینہ ۔ اسلام نے جن تین مقامات کے لیے بہ نیت طاعت و ثواب سفر کرنے کی اجازت دی ہے ، اُن میں جس طرح مکہ و مدینہ کا ذکر ہے ، اسی طرح بیت المقدس کا بھی ہے ۔ مسلم و بخاری کی مشہور روایت میں ہے ”لا تشد الرحال الا الی ثلاثہ مساجد : المسجد الحرام ، و مسجدی هذا ، و المسجد الاقصی“ یعنی بہ نیت زیارت و طاعت سفر کا قصد و اہتمام نہیں ہے مگر ان تین جگہوں کیلئے ۔ مسجد حرام ، مسجد مدینہ ، اور مسجد اقصیٰ ۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام دنیا میں مسلمانوں کیلئے شرعاً یہی تین مقام سب سے زیادہ مقدس و محترم ہیں ۔ انہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انکی زیارت کیلئے نیت کر کے اپنے وطنوں سے نکلتے ہیں ، سفر کی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کرتے ہیں ، اور یقین کرتے ہیں کہ اسکی معارضہ میں اُنکے لیے بڑا ہی اجر ہے ۔ اسی بنا پر جمہور ائمہ اسلام کا مذہب ہے کہ مسجد اقصیٰ کی زیارت

مدیوں پہلے سے تفرقہ و انتشار کی عالمگیر مصیبت تمام عالم اسلامی کو ٹکرے ٹکرے کرچکی تھی - لیکن ان ممالک کے علاوہ جہاں کہیں بھی مسلمان آباد تھے اور اپنی مقامی اسلامی حکومت نہیں رکھتے تھے ' وہ اگرچہ ترکی حکومت سے کتنے ہی دور دراز گوشوں میں واقع ہوں ' لیکن عثمانی سلاطین ہی کو اسلام کی مرکزی خلافت عظمیٰ پر قابض و متصرف تسلیم کرتے تھے ' اور اسی لیے جمعہ و عیدین کے خطبوں میں ان کے لیے خاص طور پر دعا مانگنا اپنا فرض سمجھتے تھے - خود ہندوستان کے قرب و جوار اور بحر چین کے جزائر میں مسلمانوں کا ایک ایک فرد خلیفہ قسطنطنیہ کی اس حیثیت دینی کا پورا پورا اعتقاد رکھتا تھا -

جزائر سیلون ہندوستان ہی کا ایک بحری گوشہ ہیں - سنہ ۱۱۷۵ھ ( سنہ ۱۷۶۱ع ) میں دکن کے ایک مشہور عالم سید قمرالدین اورنگ آبادی حج سے واپسی میں کولمبو پہنچے اور وہاں کی سیر کی - میر غلام علی آزاد بلگرامی ان کے معاصر ہیں - اپنی کتاب سبحة المرجان میں ان کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ ساحلی مقامات میں قچروں کی حکومت ہے - اندرونی جزائر میں ہندو راجہ ہے - کولمبو میں مسلمانوں کے دو محلے ہیں - جمعہ کی نماز تین مرتبہ سید موصوف نے وہاں پڑھی - خطبہ میں انام نے پادشاہ ہند اور سلطان روم کیلئے دعا مانگی تھی " لکونہ خادمہ الحرمین الشریفین " یعنی اسلیے کہ وہ خادم الحرمین ہیں - ( سبحة المرجان مطبوعہ بمبئی صفحہ ۲۳ )

یہ اب سے قیصر سو برس پیشتر کا واقعہ ہے - سیلون کے جزیروں میں اگر مسلمان ایک غیر مسلم حاکم کے ماتحت رہ کر شاہ ہند کا ذکر کرتے تھے ' تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی - ہندوستان بالکل ان سے متصل تھا - لیکن قسطنطنیہ کے سلطان کیلئے دعا مانگنا جو بحر ہند سے استقدر بعید فاصلہ پر واقع ہے ' کیا معنی رکھتا ہے ؟ کیا اس کے سوا کوئی معنی ہو سکتے ہیں کہ تمام عالم اسلامی میں وہی خلیفۃ المسلمین ہے ' اور اسلیے گو آج بھی بہت سی اسلامی حکومتیں موجود ہوں ' مگر ہر گوشہ عالم کے مسلمانوں کے دلی تعلق و اطاعت کا اصلی مرکز صرف وہی ہو سکتا ہے ؟

صاحب تحفۃ العالم چین کوچک کے ایک سیاح سے اپنی ملاقات کا حال لکھتے ہیں جس نے عجیب عجیب جزیروں اور وہاں کے رسم و رواج کا مشاہدہ کیا تھا - " چین کوچک " سے مقصود بحر چین کے جزائر سمائرا '

کی اگر نذر مانی ہو، تو اسکا ادا کرنا اسی طرح واجب ہے جس طرح زیارت مسجد نبوی رح و عمرہ کا ادا کرنا۔ لیکن ان تین جگہوں کے علاوہ کسی دوسری زیارتگاہ کے سفر کیلئے نذر مانی ہو، تو اسکا ادا کرنا باتفاق ائمہ واجب نہ ہوگا۔ اس سے اندازہ کر لیا جاسکتا ہے کہ بیت المقدس کی سرزمین مسلمانوں کے مذہبی احکام و اعتقاد میں کیا درجہ رکھتی ہے؟ یہی وہ مقدس سرزمین ہے جسکا اللہ نے یہودیوں سے وعدہ کیا تھا، اور بالآخر وعدہ پورا ہو کر رہا۔ لیکن وہ اسکے اہل ثابت نہ ہوئے، اور دنیا کی حکومت و عزت کے ساتھ یہاں کی پادشاہت بھی اُنسے جاتی رہی۔ پھر مسیحی دور شروع ہوا۔ اسکے بعد مسلمان اسکے وارث ہوئے۔ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ اس وراثت کی بشارت دی تھی: و لقد کتبنا فی الزبور

من بعد الذکر، ان الارض یرثها عبادي الصالحون۔ ان فی هذا لبلاغاً لقوم عابدین۔ وما ارسلناک الا رحمة للعالمین (۲۱: ۱۰۵) حضرت ابن عباس وغیرہ سے مراد یہ ہے کہ اس آیت میں ”الارض“ سے مقصود بیت المقدس اور فلسطین ہے۔ اسمیں خبر دی گئی تھی کہ اب اسکی پادشاہت مسلمانوں کے حصے میں آئیگی۔ اسی لیے کہا: ان فی هذا لبلاغاً السخ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اس سرزمین کی خدمت کو اللہ کی طرف سے ایک مخصوص عطیہ و امانت سمجھا، اور اسکی حفاظت کو حرمین کی طرح ساری دنیا کی حکومت و فرماں روائی سے بھی زیادہ عزیز رکھا۔ یہی اعتقاد دینی تھا جس نے مسیحی جہاد کی اُن آٹھ لڑائیوں کو کامیاب ہونے نہ دیا جن میں تمام یورپ کی طاقت اکٹھی ہو گئی تھی، حالانکہ وہ وقت مسلمانوں کی پولیٹکل طاقت کے عروج کا نہیں بلکہ تنزل و انحطاط کا تھا، اور تمام عالم اسلامی مختلف حکومتوں میں متفرق ہو چکا تھا۔ اسوقت سے لیکر اُجٹک وہاں کی حکومت خلیفہ اسلام کے ماتحت رہی ہے، اور خود یورپ نے مسیحی مذاہب کے امن و سکون کیلئے اسے بہتر سمجھا ہے۔ پس اگر آج پھر ازمندہ مظلمہ (مدل ایجز) کی تاریخ دہرائی جائیگی، اور اسلام کی جگہ اُسے مسیحیت یا یہودیت کے زیر اثر لانے کی کوشش کی جائیگی، تو مسلمانوں کیلئے ناممکن ہے کہ گوارا کر سکیں۔ اُنکا فرض ہوگا کہ جب گذشتہ کر سید کا ایک حصہ دہرایا گیا ہے، تو دوسرا حصہ بھی ظہور میں آجائے۔ وہ مسلمانوں کی دینی زیارت گاہ ہے۔ وہ اُنکا مقدس مقام ہے۔ اسکی



امام سمجھتے تھے ' اور بابتدار حکومت کے یہ حق انہیں حاصل بھی تھا ۔  
 تاہم عام اسلامی خلافت کا انہوں نے کبھی دعوا نہ کیا ۔ ہمیشہ عرب و شام  
 کے مسلمہ خلفاء ہی کو خلیفہ تسلیم کرتے رہے ۔ شہنشاہ اکبر اور  
 شاہجہاں بھی اگر حج کیلئے جاتے ' تو انکو قسطنطنیہ کے خلیفہ  
 ہی کی امارت میں حج ادا کرنا پڑتا ۔ میدان عرفات میں وہ خود خطیب نہ  
 ہوتے ۔ قسطنطنیہ کا نائب السلطان خطبہ دیتا ۔ وہ کہتے ہوئے اسی طرح سنتے  
 جس طرح ایک عام مسلمان انکے بغل میں کہتا سن رہا ہوتا ۔ شرعاً و عقلاً  
 تسلیم خلافت کیلئے اس سے زیادہ اور کونسی بات ہوسکتی ہے ؟

بعض یورپین اخبارات کے مشرقی نامہ نگاروں نے بار بار یہ خیال ظاہر  
 کیا ہے کہ ترکی حکومت سے باہر ترکی خلافت کا اعتقاد زیادہ تر  
 سلطان عبد الحمید خاں مرحوم کی سعی سے پیدا ہوا ' اور انکا مقصود  
 اس سے یہ تھا کہ نام نہاد " پان اسلامزم " تحریک کو تمام مسلمانان  
 عالم میں پھیلایا جائے ۔ یہاں ہم یورپ کے متخیلے و متوہمہ  
 " پان اسلامزم " کی حقیقت سے بحث کرنا نہیں چاہتے ۔ " پان اسلامزم " سے  
 اگر مقصود مسلمانوں کی بلا امتیاز وطن و قومیت باہمی برادری ہے  
 تو اسکی تاریخ سلطان عبد الحمید کے زمانے سے نہیں بلکہ نزل قرآن و ظہور  
 اسلام سے شروع ہوتی ہے ۔ لیکن عثمانی خلافت کے عالمگیر اسلامی اعتقاد  
 کو سلطان عبد الحمید سے منسوب کرنا ایک ایسی بات ہے جو یا تو حد  
 درجہ جہل کا نتیجہ ہے یا حد درجہ دروغ گوئی کا ۔ اور ہم نہیں جانتے  
 کہ دونوں میں سے کس چیز کو محققین یورپ کیلئے پسند کریں ؟  
 سنہ ۱۹۲۳ء میں جب بعد سلطان سلیم خاں سلاطین عثمانیہ خلیفۃ المسلمین  
 تسلیم کیے گئے ' تو اسوقت عالم اسلامی کا یہ حال تھا کہ ایران میں سلاطین  
 صفویہ کی حکومت تھی ' ہندوستان میں مغلیہ کی ' اندرون یمن میں  
 آلہ زیدہ کی ' اور اندرون عرب میں خود مختار قبائل اور بعض شیوخ  
 کی ۔ پس جہاں جہاں اسلامی حکومتیں موجود تھیں ' وہاں کے مسلمانوں  
 کی اطاعت و انقیاد کا محل و مرکز خود مقامی اسلامی حکومت ہوگئی تھی  
 اور احکام شرعیہ کے نفاذ و اجراء کیلئے بھی وہ کسی بیرونی حکومت کے  
 محتاج نہ تھے ۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ ان ممالک میں مرکزی خلافت کا  
 تعلق کسی نمایاں شکل میں یکایک ظاہر نہیں ہوسکتا تھا ۔ سلطنت  
 کے رقبہ جذبہات بھی اپنی اذیتناہی حالت میں سب پر چھائے ہوئے تھے ۔

حتى المباريب تبكي وهي جامدة      حتى المنابر ترثي وهي عیدان !



کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی سلاطین عثمانیہ کا ذکر ایسے پیرایہ میں کرتے ہیں جس سے انکی اسلامی خلافت و امامت کا مسلمہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً سلطان کو مخاطب کر کے یہ کہنا کہ جو شخص آج روے زمین پر تمام مسلمانوں کا خلیفہ و امام کہلائے، اس کے گورنر اس طرح رعایا کے ساتھ سلوک کریں؟ جسکے صاف معنی یہی ہیں کہ سلاطین عثمانیہ تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام تسلیم کیے جاتے تھے۔

یہ موقعہ مزید اطناب و تفصیل کا نہیں ہے۔ سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا زمانہ ہزار صدی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ پس اگر اسکا ذکر ملسکتا ہے تو پچھلی تین صدیوں کی مصنفات میں۔ چونکہ ان عہدوں کی تصنیفات عام طور پر علماء ہند کے مطالعہ میں نہیں آئی ہیں، اسلیے مسئلہ کے تاریخی شواہد سے عموماً لوگ بے خبر ہیں۔ تلاش کیا جائے تو ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہو جا سکتا ہے۔

یہ یورپین حکومتیں علی الخصوص برٹش گورنمنٹ سلطان عثمانی کی اس دینی حیثیت کا ہمیشہ اقرار کرتی آئی ہے، اور جب کبھی ضرورت ہوئی ہے، قسطنطنیہ کی طاقت سے بہ حیثیت خلیفہ اسلام کے کام لیا گیا ہے۔ غدر سنہ ۵۷ کے موقعہ پر سلطان عبد المجید سے جو فرمان مسلمانان ہند کے نام حاصل کیا گیا تھا اور جسمیں انکو انگریزی حکومت کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی ہدایت کی تھی، اُسکی بنا بھی یہی تھی کہ سلطان قسطنطنیہ کو بہ حیثیت خلیفہ اسلام مسلمانان ہند کی ارشاد و ہدایت کا حق حاصل ہے۔ کوئین وکٹوریا کے عہد میں بارہا حج اور حاجیوں کی مشکلات کا سوال گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے اُٹھایا گیا، اور پھر امپیریل گورنمنٹ نے باب عالی کو اس احتجاج کے ساتھ توجہ دلائی کہ بہ حیثیت خلیفہ اسلام ہونے کے حجاج کی تکالیف دُزر کرنا اُنکا مذہبی فرض ہے۔ فرانس اور روس کی جانب سے بھی سلطان عبد الحمید خان کے زمانے میں معتدد مرتبہ ایسے اظہارات و اعترافات ہو چکے ہیں۔



( ۵ ) صرف خلیفہ اسلام ہی کے لیے یہ حکم مخصوص نہیں ہے جب کبھی مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں لڑائی ہو، تو کسی مسلمان کیلئے شرعاً جائز نہیں کہ غیر مسلمان فوج کا ساتھی ہو کر مسلمانوں سے لڑے۔ یا انکی مدد کرے۔ اگر کریگا تو بحکم ”من حمل علینا السلاح فلیس منا“ اور نص قرآنی من قتل مومنًا متعمداً فجزاه جہنم خالدین فیہا وہ اسلامی جماعت سے خارج ہو جائیگا۔ اسکا ٹھکانا درزخ ہے۔ البتہ خلیفہ اسلام کے مقابل ہو کر لڑنے کا جرم سب سے زیادہ سنگین جرم ہے۔

( ۶ ) جب کسی اسلامی حکومت یا جماعت پر غیر مسلم حملہ کریں، یا حملہ کا قصد کریں، یا انکی آزادی و خود مختاری کو کسی دوسری طرح نقصان پہنچانا چاہیں، تو ہر ملک کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے اپنے بھائیوں کی مدد کرنا، اور انپر حملہ کرنے والوں سے لڑنا، فرض ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص ایسی حالت میں جبکہ حملہ آور زیادہ طاقتور ہوں، اور انکے مقابلہ کی کافی طاقت اُن مسلمانوں یا رہاں کی اسلامی حکومت میں نہ ہو۔ اس صورت میں جہاد کی فرضیۃ علی الکفایہ نہ ہوگی، بلکہ مثل نماز روزہ کے فرض عین۔

( ۷ ) اگر خلیفہ اسلام کو دشمنوں کا ایسا طاقتور گروہ گھیر لے کہ انکا مقابلہ کرنا اسکی طاقت سے باہر ہو، اور بلا تمام مسلمانان عالم کی فوری مدد و نصرت کے اسلامی ممالک کی حفاظت نہ کرسکے، تو اُس صورت میں تمام دنیا کے مسلمانوں کا بہ یک وقت فرض ہوگا کہ جس طرح بھی ممکن ہو، اسکی مدد کریں۔ اور اُسکے دشمنوں سے پیکار۔

( ۸ ) اسلام کا حکم شرعی ہے کہ جزیرۂ عرب کو غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھا جائے، جس میں عرق کا ایک حصہ اور بغداد داخل ہے، پس اگر کوئی غیر مسلم حکومت اس پر قابض ہونا چاہے، یا اُسکو خلیفہ اسلام کی حکومت سے نکالکر اپنے زیر اثر لانا چاہے، تو یہ محض ایک اسلامی ملک کے نکل جانے ہی کا مسئلہ نہ ہوگا، بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں کے لیے ایک مخصوص سنگین حالت پیدا کر دیگا۔ یعنی اسلام کی مرکزی سرزمین پر کفر کا اثر چھا رہا ہے۔ اس حالت میں تمام مسلمانان عالم کا اولین فرض ہوگا کہ اس قبضہ کو وہاں سے ہٹانے کیلئے اُٹھ کھڑے ہوں، اور اپنی تمام قوتیں اسکے لیے وقف کر دیں۔



ملایا، جازا، وغیرہ ہیں۔ سیاح مذکور کہتا ہے کہ اکثر جزائر میں مسلمان آباد ہیں اور مسجدیں معمور ہیں۔ جمعہ کے خطبوں میں سلطان روم کیلئے دعا مانگتے ہیں اور وہاں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ یہ واقعہ بھی بارہویں صدی ہجری کے اوائل کا ہے۔

باقی رہا یہ خیال کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں سلاطین عثمانیہ کی خلافت کا اعتقاد حال کی پیداوار ہے، تو یہ بھی صحیح نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک خود ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم تھی، کسی بیرونی اسلامی حکومت سے مسلمانوں کو بلا واسطہ تعلق رکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ البتہ سلطنت مغلیہ کے انقراض کے بعد وہ مجبور ہو گئے کہ بلا واسطہ خلافت قسطنطنیہ سے اپنا رشتہ انقیاد و عقیدت قائم کر لیں۔ تاہم اسلام کی مرکزی خلافت پر سلاطین عثمانیہ کا قابض ہونا ایک ایسی مسلم و معروف بات ہے جو ہمیشہ علماء ہند کے علم و اعتقاد میں رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا سال وفات سنہ ۱۱۷۴ - ہجری ہے۔ انکا زمانہ احمد شاہ ابدالی کی آمد و رفت کا زمانہ تھا اور ہندوستان میں اسلامی حکومت ابھی قائم تھی۔ انہوں نے تفہیمات الہیہ میں درجہ سلاطین روم کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

”از زمان سلطان سلیم خان کہ در اراذل سنہ الف بود، اکثر بلاد عرب و مصر و شام تحت تصرف سلاطین روم اند، و خدمت حرمین الشریفین زاد ہما اللہ شرفاً و کرامتہ، و امارت موسم، و ریاست حجاج، و اہتمام محامل و قوافل بر ایشان استقرار یافت، و بہ ہمین جہت بر منابر عرب و شام خصوصاً حرمین شریفین ہر یکے از ایشان بہ لقب امیر المومنین مذکور است“

یمن میں اگرچہ ائمہ زیدیہ سلاطین عثمانیہ کے رقیب و حریف تھے، اور انہوں نے اندرون ملک میں کبھی انکی حکومت چمنے نہ دی۔ با این ہمہ گیارہویں سے تیرہویں صدی تک کے علماء یمن کی مصنفات کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، ان سے پوشیدہ نہیں کہ اکثروں نے سلاطین عثمانیہ کی مرکزی حیثیت تسلیم کی ہے جس کے معنی بجز خلافت اسلامیہ کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ علامہ صالح مقبلی صاحب العلم الشامخ المتولد سنہ ۱۰۴۷، علامہ فلانی صاحب ایفاظ الہم، شیخ عبد الخالق زبیدی صاحب صفوۃ الاخبار وغیرہم اپنی کتابوں میں جا بجا ترکی گورنروں کے جبر و ستم کی شکایتیں



مذہبی وابستگی اُنکے ایمان و مذہب کا جزء ہے ۔ اگر وہاں یہودیوں کا اقتدار بڑھایا جاتا ہے ، یا کسی مسیحی حکومت کو نگرانی و بالا دستی کے نام سے قائم کیا جاتا ہے ، تو یہ مسلمانوں کی جماعت اور آبادیوں ہی کو نہیں بلکہ انکی شریعت کو چیلنج دینا ہے ، اور مسلمانوں کو مجبور کر دینا ہے کہ یا تو اسلام کی جانب سے اس چیلنج کو قبول کر لیں ، یا اسکی اطاعت و حمایت سے دست بردار ہو جائیں ۔

( خاتمہ سخن و نتائج بحث )

گذشتہ مباحث و تفصیلات کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

( ۱ ) اسلام کا قانون شرعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ و امام ہونا چاہیے ۔ ” خلیفہ “ سے مقصود ایسا خود مختار مسلمان پادشاہ اور صاحب مملکت ہے جو مسلمانوں اور اُنکی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے اجراء و نفاذ کی پوری قدرت رکھتا ہو اور دشمنوں کے مقابلے کیلئے پوری طرح طاقتور ہو ۔

( ۲ ) اُسکی اطاعت و اعانت ہر مسلمان پر فرض ہے ۔ اور مثل اطاعت خدا و رسول کے ہے ۔ تاریکیہ اُس سے کفر بواج ( صریح ) ظاہر نہو ۔ جو مسلمان اسکی اطاعت سے باہر ہوا ، وہ اسلامی جماعت سے باہر ہو گیا ۔ جس مسلمان نے اُسکے مقابلہ میں لڑائی کی ۔ یا لڑنے والوں کی مدد کی ، اُس نے اللہ اور اسکے رسول کے مقابلے میں تلوار کھینچی ۔ وہ جماعت اسلام سے باہر ہو گیا اگرچہ نماز پڑھتا ہو ، روزہ رکھتا ہو ، اور اپنے تئیں مسلم سمجھتا ہو ۔

( ۳ ) ایک خلیفہ کی حکومت اگر جم چکی ہے ، اور پھر کوئی مسلمان اُسکی اطاعت سے باہر ہوا اور اپنی حکومت کا دعویٰ کیا ، تو وہ باغی ہے ۔ اسکو قتل کر دینا چاہیے ۔

( ۴ ) صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب سلاطین عثمانیہ کو حاصل ہے ، اور اسوقت از روئے شرع تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام وہی ہیں ۔ پس اُنکی اطاعت و اعانت تمام مسلمانوں پر فرض ہے ۔ جو انکی اطاعت سے باہر ہوا ، اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا ، اور اسلام کی جگہ جاہلیہ مول لی ۔ جس نے انکے مقابلے میں لڑائی کی ، یا انکے دشمنوں کا ساتھ دیا ، اسنے خدا اور اسکے رسول سے لڑائی کی ۔

گوشہ عالم میں قائم ہوگئی تھیں، مگر ہمیشہ ایک خاص مقام ایسا ضرور رہا جہاں کی حکمرانی دنیا کی تمام اسلامی حکمرانیوں میں ایک مرکزی اقتدار کی حیثیت رکھتی تھی۔ دوسرے مقامات کے فرمانروا اپنے دائرہ حکومت سے باہر کوئی اثر نہیں رکھتے تھے، لیکن وہاں کا حکمران تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک خاص کشش و دعوت اپنے اندر رکھتا تھا۔ یہ بلاد شام و عراق اور عرب و حجاز کی حکومت تھی۔ عرب اسلام کا اصلی سرچشمہ و مبداء ہے۔ حجاز اسلامی قومیت کا دائمی مرکز اور اسلام کے رکن حج کا کارگاہ ہے۔ شریعت نے عرب ہی کو یہ شرعی خصوصیت دی ہے کہ ہمیشہ غیر مسلم اقوام کے اثر سے محفوظ رکھی جائے۔ شریعت کے اس حکم کی تعمیل بغیر حکومت کے ممکن نہیں۔ جو حکومت اس پر قابض ہوگی، وہی اس شرعی حکم کی تعمیل و نفاذ کی ذمہ دار اور اقامۃ حج کی بھی کفیل ہوگی۔ پس قدرتی طور پر یہ بات ہوئی کہ یہاں کی حکومت کو تمام اسلامی حکومتوں میں مرکزی اقتدار اور تمام مسلمانان عالم کے قلوب کیلئے ایک انجذابی اثر حاصل ہو جائے۔ اسلام کے ازمئہ متوسطہ و اخیرہ میں یہی مرکزی اقتدار خلافت عظمیٰ کا قائم مقام تھا۔ خلافت بغداد کے مرنے کے بعد بھی ان مقامات کی حکومت خلفاء مصر ہی کے قبضہ میں رہی۔

”مرکزی حکومت“ سے مقصود یہی مرکزی اقتدار ہے۔ خلفاء مصر کے بعد جب سلاطین عثمانیہ تمام بلاد عرب و حجاز اور مصر و شام پر قابض ہو گئے تو اسلامی خلافت عظمیٰ کا مرکزی اقتدار بلا نزاع انہی کو حاصل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار صدی کے بعد سے تیرھویں صدی کے اوائل تک اگرچہ بڑی بڑی اسلامی حکومتیں دنیا میں قائم رہیں، لیکن خلافت عظمیٰ کے اعتقاد کے ساتھ جب کبھی کسی مسلمان کی نظر اٹھتی تو وہ صرف قسطنطنیہ ہی کی طرف دیکھ سکتا تھا۔

## فصل

( ترکان عثمانی اور عالم اسلامی )

اب ہم چاہتے ہیں کہ اس پوری تاریخ سے قطع نظر کر لیں۔ صرف اس اعتبار سے مسئلہ پر ایک آخری نظر ڈالیں کہ احکام شرعیہ کی بنا پر سلاطین

آئیگی ۔ ہماری جنگ موجودہ ترکی وزارت سے ہے جو جرمنی کے زیر اثر کام کر رہی ہے ۔ نہ کہ خلیفۃ المسلمین سے ۔ گورنمنٹ برطانیہ نہ صرف اپنی جانب سے بلکہ اپنے تمام حلیفوں کی جانب سے ان باتوں کی ذمہ داری لیتی ہے ۔

یہ خلاصہ اُس سرکاری اعلان کا ہے جو پہلی نومبر سنہ ۱۹۱۴ء کو اعلان جنگ کی اطلاع کے ساتھ ہی گورنمنٹ آف انڈیا نے شائع کیا تھا ، اور پھر تمام صوبوں میں سرکاری طور پر اسکی اشاعت کی گئی تھی ۔ حتیٰ کہ ہر کمشنری ، ہر ضلع ، ہر صدر مقام ، ہر شہر کے مسلمانوں کو جمع کر کے مقامی حکام نے اسکی نقلیں بانٹی تھیں اور زبانی پڑھکر سنایا تھا ۔ برٹش انڈیا کا کوئی مسلمان گھر ایسا نہیں ملیگا جو اس اعلان سے بے خبر چھوڑ دیا گیا ہو ۔ بعد کو ” نیر ایست “ وغیرہ اخبارات سے ہمیں معلوم ہوا کہ مصر و سوڈان میں بھی بجنسہ یہی اعلان شائع کیا گیا ہے ۔

اس اعلان کے بعد بھی ہمیشہ ذمہ دار حکام ہند و انگلستان کی زبان سے یہ دونوں باتیں بار بار ظاہر ہوتی رہیں ۔ اگر کسی اظہار و بیان کی مضبوطی میں اعلان کے تکرار اور اشاعت کی کثرت و وسعت کو دخل ہے ، تو بلا خوف رد کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں باتیں جسقدر وسعت کے ساتھ اور جس طرح بار بار زمانۂ جنگ میں کہی گئی ہیں ، اس سے زیادہ کسی انسانی بیان کے اعلان اور کسی انسانی وعدہ کے تکرار کی کوئی صورت دنیا میں نہیں ہوسکتی ۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ اسوقت میدان جنگ کا کیا حال تھا ؟ برٹش گورنمنٹ کو اپنی زندگی کیلئے لاکھوں سپاہیوں اور توپوں کی جسقدر ضرورت تھی ، اس سے کہیں زیادہ اس اعلان اور اسکی کامیابی کی ضرورت تھی ۔ اگر اسوقت ہندوستان کے مسلمانوں میں ذرا بھی بے چینی پیدا ہوجاتی ، تو نہیں معلوم جنگ کی تاریخ کیسا پلٹا کھاتی ، اور آج نتائج کا حال کیا ہوتا ؟

اس اعلان کا نتیجہ بھی نکلا جو مطلوب تھا ۔ یعنی مسلمانان ہند پر صورت حال بالکل مشتبہ ہوگئی ۔ علماء اس دھوکے میں پڑ گئے کہ جب ترکوں نے انگلستان پر حملہ کیا ہے ، تو شرعاً صورت دفاع کی نہیں ہے بلکہ حملہ

## فصل

( قرین متوسطہ و اخیرہ میں مرکزی حکمرانی )

ہم نے جا بجا ” اسلام کی مرکزی حکمرانی “ اور ” خلافت عظمیٰ “ کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ تشریح اس اجمال کی یہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام کا محور و اساس مسئلہ ” توحید “ ہے ۔ ” توحید “ کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہونا ۔ صرف اللہ کی ذات و صفات ہی میں یہ حقیقت محدود نہ تھی جیسا کہ بد قسمتی سے لوگوں نے سمجھ رکھا ہے ، بلکہ عقائد و اعمال کی ہر شاخ اور ہر شکل میں اسلام کا اصل الاصول توحید ہی ہے ۔ وہ مسلمانوں کی تمام اُن باتوں میں جو فرد و اجتماع سے تعلق رکھتی ہیں ، ایک کامل توحیدی حالت پیدا کر دینی چاہتا ہے ۔ جس طرح خدا کی ذات کی طرح اُس کی خلقت اور قوانین خلقت میں بھی ہر چیز پر اور ہر جگہ یکتائی و یک عملی اور وحدت و واحدیت کا فرما ہے ۔ مَا تَرَىٰ قَبْلَ خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِن تَفَارُتٍ - فارجع البصر . هل ترى من فطور ؟ (ملک)

اس بنا پر اسلام نے جس طرح مسلمانوں کی ساری باتیں ایک قرار دی تھیں ۔ اُنکی شریعت ، اُنکا قانون ، اُنکی کتاب ، اُنکا نام ، اُنکی زبان ، اُنکی قومیت ، اُنکا قبلہ ، اُنکا کعبہ ، اُنکا مرکز اجتماع ، مرکز ارض ، اُسی طرح اُنکی حکومت بھی ایک ہی قرار دی تھی ۔ یعنی تمام روئے زمین پر مسلمانوں کا صرف ایک ہی فرمانروا و خلیفہ ہو ۔ لیکن جہاں ساری باتوں میں انحراف اور تفرقہ و انتشار ہوا ، وہاں یہ بات بھی جاتی رہی ۔ خلفاء راشدین کے بعد صرف بنو امیہ کے ابتدائی عہد تک وحدۃ حکومت نظر آتی ہے ۔ اُسکے بعد کوئی زمانہ ایسا نہ آیا جب تمام عالم اسلامی کی حکومت کسی ایک طاقت میں جمع رہی ہو ۔ مختلف گوشوں میں مختلف دعویدار اُٹھے اور جسکا قدم جہاں جم گیا ، خود مختارانہ فرمانروائی کرنے لگا ۔

با این ہمہ ایک خاص مرکزی اقتدار ہر زمانے میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور مورخ کی بصیرت محسوس کر لیتی ہے کہ اس تفرقہ و انتشار کی عام سطح میں ایک مرکزی قوت ابھری ہوئی ہے ۔ اسلامی حکومتیں ہر

( ۹ ) اسلام کے مقامات مقدسہ میں بیت المقدس اُسی طرح محترم ہے جس طرح حرمین شریفین - اسکے لیے لاکھوں مسلمان اپنی جانوں کی قربانیاں اور یورپ کے آٹھ صلیبی جہادوں کا مقابلہ کرچکے ہیں - پس تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس مقام کو دوبارہ غیر مسلموں کے قبضہ میں جانے نہ دیں - علی الخصوص مسیحی حکومتوں کے قبضہ و اقتدار میں - اور اگر ایسا ہو رہا ہے تو اسکے خلاف دفاع کرنا صرف وہاں کی مسلمان آبادی ہی کا فرض نہ ہوگا - بلکہ بہ یک وقت دفعہ تمام مسلمانان عالم کا -

( خلیفۃ المسلمین اور گورنمنٹ برطانیہ )

جبکہ اسلام کے اٹل اور اپنے پیروں کیلئے دائمی احکام کا یہ حال ہے تو یکایک اگست ۱۹۱۴ کو عالمگیر جنگ عالم کا شرارہ وسط یورپ میں چمکا اور دیکھتے ہی دیکھتے مغربی تمدن کا تمام آتشگیر مادہ جنگ بھڑک اُٹھا : نار اللہ الموقدۃ التي تطلع علی الافئدة اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جنگ نے مسلمانان ہند کیلئے ایک ایسی نازک صورت اختیار کر لی جو برطانیہ کی حکومت ہند کی پوری تاریخ میں آج تک کبھی پیش نہیں آئی تھی - یعنی خلیفۃ المسلمین کی فوجیں بھی میدان جنگ میں مشغول پیکار نظر آئیں اور ترکی کے برخلاف برطانیہ نے اعلان جنگ کر دیا -

اس اعلان جنگ کی اطلاع جب سرکاری طور پر ہندوستان میں مشہر کی گئی تو ساتھ ہی حسب ذیل امور کا بھی اعلان کیا گیا تھا :

( ۱ ) ترکی حکومت کے ساتھ ہماری جنگ دفاعی ہے - نہ کہ حملہ آورانہ - ہم نے دو ماہ تک ہر طرح کا مخالفانہ اور جنگ جویانہ سلوک برداشت کیا اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح یہ جنگ ٹل جائے لیکن ترکی گورنمنٹ نے برابر اپنے حملے جاری رکھے - اب مجبوراً ہم کو بھی اعلان جنگ کرنا پڑا ہے -

( ۲ ) ہندوستان کے مسلمانوں کو پوری طرح بھروسہ رکھنا چاہیے کہ اس جنگ میں ہمارے یا ہمارے ساتھیوں کی جانب سے کوئی ہلت ایسی نہ ہوگی جو انکے مذہبی محسوسات کو صدمہ پہنچائے - اسلام کے تمام مقدس مقامات محفوظ رہیں گے - انکے احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائیگا - اسلام کے مقدس مقام خلافت کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہ



اسلام کا جب ظہور ہوا ، تو دشمنوں کی پہلی جماعت قریش مکہ کی جماعت تھی ۔ انکے مت جانے کے بعد اس پوری تیرہ صدیوں میں صرف عیسائی قومیں ہی مسلمانوں کی دائمی حریف رہی ہیں ۔ دوسری غیر مسلم قوموں میں سے کوئی قوم ایسی نہ تھی جس میں اسلام اور مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کا داعیہ ہو ۔ ایران کی مجوسی قوت کا ابتدا ہی میں خاتمہ ہو گیا تھا ۔ یہودیوں کی کوئی پولیٹیکل قوت نہ تھی ۔ ہندوستان کے ہندوؤں اور بدھ مذہب کے پیروؤں نے ہندوستان سے نکل کر کبھی مسلمانوں پر حملہ نہیں کیا اور نہ ان میں کوئی داعیانہ قوت تھی ۔ چین کے تاتاری اُتے اور بلاشبہ سب سے بڑی ہلاکت کا باعث ہوئے لیکن بالآخر خود اسلام کے محکوم ہو گئے ۔ یعنی ایک صدی کے اندر ہی اندر مسلمان ہو گئے ۔

پس تمام روئے زمین پر بجز مسیحی اقوام کے اور کوئی حملہ آور حریف اسلام کا نہ تھا ۔ نہ ہے ۔ مشرقی عیسائیوں کی قوت ابتدا ہی میں شکست ہو گئی تھی ۔ صرف یورپ کی حکومتیں اور قومیں تھیں جنکو خواہ مسیحیت کے نام سے موسوم کروا خواہ یورپ کے نام سے ۔ یہی آخری چار صدیاں ہیں جن میں بتدریج یورپ کی طاقت ترقی کرتی گئی ، اور اُسکی ترقی کا دوسرا رخ یہ تھا کہ اسلام کی پولیٹیکل طاقت کو روز افزوں تنزل ہوا ۔

تمام کرۂ ارضی کے مسلمانوں میں سے کونسی قوم ہے جس نے ان چار صدیوں کے اندر یورپ کا مقابلہ کیا ہے ، اور دفاع و جہاد جاری رکھ کر اسلام اور مسلمانوں کی اُس کے سب سے بڑے حریف کے مقابلے میں حفاظت کی ہے ؟ سولہویں صدی عیسوی ہی میں یورپ کی اُن تمام طاقتوں نے جو مشرقی ممالک کے دروازوں سے قریب تھیں ، بتدریج قدم بڑھانا شروع کر دیا تھا ۔ اگر کوئی طاقتور اور مقام رک موجد نہ ہوتی تو اسے در صدی پیشتر ہی تمام رسط ایشیا ، شام ، عرب ، اور اسلامی افریقہ یورپ کے استیلاء سے پامال ہو چکا تھا ۔

پھر وہ کونسی نا قابل تسخیر فوجی قوت تھی جس نے پہلے تو اپنے پے درپے حملوں سے تمام یورپ کو اس طرح پامال کر دیا کہ پوری در صدیوں تک سنبھلنے اور قدم اُٹھانے کی مہلت ہی نہ دی ، اور پھر تمام ایشیا و

برطانی وعدوں کے اعتماد اور انکے ایفاء کی اخلاقی نمائش کا یہ پہلا ہی مرقعہ نہیں ہے۔ ۱۵ - جولائی سنہ ۱۸۱۵ء کو جب نپولین نے بلرافان نامی انگریزی جہاز پر قدم رکھا تھا تو اُس نے بھی انگلستان کے وعدوں پر اعتماد ہی کیا تھا۔ بے اعتمادی نہیں کی تھی۔ لیکن خود اُسی کے لفظوں میں ”انگلستان نے ہاتھ بڑھا کر اپنا مہمان بنانے کیلئے بلایا، اور جب وہ آگیا تو اسکا خاتمہ کر دیا“ سینٹ ہلینا کی سنگلاخ چٹانیں آج تک سمندر کے طرفانوں کے اندر انگریزی مواعید کی اخلاقی قدر و قیمت کا اعلان کر رہی ہیں !

۴ - اگست سنہ ۱۸۱۵ء کو جنگ واٹرلو کے بعد جب شہر پیرس متحدہ افواج کے حوالے کیا گیا، اور اس عہد نامہ کو فرانسیسیوں نے عہد نامہ سمجھا جس پر انگلستان کے نامور ہیرو دیوک آف ویلنگٹن کے دستخط تھے، تو یقیناً انہوں نے بھی انگلستان پر اعتماد ہی کیا تھا۔ لیکن قبضہ کے بعد جو نتیجہ نکلا، اس پر تاریخ کا اٹل فیصلہ صادر ہو چکا ہے، اور خود انگریز مورخوں کی زبانی اُسکا افسانہ سن لیا جاسکتا ہے۔

خود ہندوستان کے گذشتہ سو سالوں کی تاریخ ہی اس کے لیے کافی ہے۔ دوسرے ملکوں کی سرگذشتوں کی طرف نظر اُٹھانے کی ضرورت نہیں۔

تاہم مسلمانوں نے بہرہ کیا۔ اور جنگ کے نتائج کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ اُنکا رویہ، اُنکی جانیں، اُنکے ملک کی تمام قوتیں، بے دریغ خرچ کی گئیں۔ دنیا کی آخری اسلامی حکومت و خلافت کے خاتمہ میں اُنکی ہر چیز نے پورا پورا کام دیا۔ یہاں تک کہ برٹش گورنمنٹ اپنی تاریخ حیات کے سب سے بڑے مہلک وقت سے بچ گئی، اور وہ فتح مندی مکمل ہو گئی جسکا پہلا نتیجہ اسلامی خلافت کی بربادی و تباہی ہے۔

اٹنائے جنگ ہی میں اس اعتماد کے تمام نتائج ظاہر ہو گئے تھے۔ بغداد پر انگریزی فرج قابض ہو گئی تھی جو جزیرہ عرب کی مقدس سرزمین میں داخل ہے۔ عین حدود حرم مکہ کے اندر سازشیں کر کے بغارت کرائی گئی اور اسکی وجہ سے جسقدر توحیدیں اس مقدس مقام کی ہونی تھیں وہ ہو کر رہی۔ پھر بھی مسلمانان ہند اپنے اعتماد سے دست بردار نہ ہوئے اور اس انتظار میں رہے کہ یہ جنگ کی عارضی حالتیں ہیں۔ صلح کے بعد ہی برطانی اعلان و مواعید کی مقدس صداقت تمام عالم پر آشکارا ہو جائیگی۔

عثمانیہ کے اعمال خلافت کا کیا حال رہا ہے ؟ بحث کا یہ سب سے زیادہ قطعی اور سب سے زیادہ سہل فیصلہ ہوگا ۔

اسلام نے خلیفہ کے نصب و تقرر کے خاص مقاصد قرار دیے ہیں ۔ پچھلی پانچ صدیوں کے اندر متعدد اسلامی حکومتیں دنیا میں موجود تھیں اور بعض اب تک موجود ہیں ۔ قوم و جماعت کے اعتبار سے متعدد مسلمان قوموں میں حکومت رہی اور بعض حکمران قومیں اب بھی باقی ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام حکمران جماعتوں میں کونسی حکومت ایسی ہے جس نے شریعت کے تہرے ہوئے مقاصد خلافت انجام دیے ؟ اور جو غرض شرعی خلیفہ کے قیام اور بحکم ”الذین ان مکنا ہم فی الارض“ الخ تمکین فی الارض سے تھی ، وہ انکے ہاتھوں پوری ہوئی ؟ جس حکومت اور جس حکمران قوم نے ایسا کیا ہو ، صرف وہی حکومت اور قوم تمام مسلمانان عالم کی خلافت و امامت کا دعوا کر سکتی ہے ۔

اس اہم سوال کا فیصلہ چند سطور میں ہو جا سکتا ہے ۔ ”خلافت اسلامیہ“ کا مقصد شرعی پچھلی صحبتوں میں صاف ہو چکا ہے ۔ سب سے پہلا مقصد اس کا یہ ہے کہ ایک ایسی طاقتور حکومت قائم ہو جو دشمنوں کے حملوں سے اسلامی ممالک اور مسلمانوں کی حفاظت کر سکے ۔ اسلام و ملت کے دشمنوں کا استیصال و انسداد ہو ۔ کلمۃ حق دنیا میں بلند اور دور دور تک جاری و نافذ ہو جائے ۔ کلمۃ کفر و فساد کو خسران و ناکامی نصیب ہو ۔ یہی مقصد پہلا مقصد ہے ۔ باقی سب فروع و توابع ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ تمام کتب عقائد و اصول میں خلافت کی تعریف کرتے ہوئے ”اقامة الدین باقامة اركان الاسلام“ و ”القیام بالجہاد“ و حفظ حدود الاسلام“ و ما يتعلق به من ترتیب الجیش و الغرض للمقاتلہ“ کے جملے سب سے پہلے ملتے ہیں ۔ یعنی وہ مسلمانوں کی ایسی حکومت ہے جو ارکان اسلام کو قائم رکھے ، جہاد کا سلسلہ و نظام درست کرے ، اسلامی ملکوں کو دشمنوں کے حملوں سے بچائے ، اور ان کاموں کیلئے فوجی قوت کی ترتیب اور لڑائی کا سامان وغیرہ جو کچھ مطلوب ہو ، اسکا انتظام کرے ۔ مختصر یہ کہ اسلام کا خلیفہ وہ حکمران ہو سکتا ہے جو اسلام و ملت کیلئے دفاع و جہاد کی خدمت انجام دے سکے ۔ ساری باتیں ان دو لفظوں میں آگئیں ۔

اب فیصلہ کرلو کہ گذشتہ چار صدیوں کے اندر کس حکومت اور کس قوم نے دفاع و جہاد کی خدمت انجام دی ہے ؟

رہنمائی کی ہے اور اس لیے اس کی شرکت فرض کفایہ کا حکم رکھتی ہے۔ نہ کہ فرض عین کا۔ پس شرعاً ضروری نہیں کہ مسلمانان ہند بھی اس میں حصہ لیں۔ عام مسلمانوں پر یہ اثر پڑا کہ برٹش گورنمنٹ صرف اپنا بھاؤ کر رہی ہے۔ اس کا مقصود اسلامی ممالک پر قبضہ و تصرف کرنا یا خلیفہ اسلام کی حکومت کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔ نیز اسلام کے مقدس مقامات یعنی جزیرہ عرب اور بیت المقدس وغیرہ ہر حال میں محفوظ رہینگے۔ ان تمام باتوں کا نہ صرف انگلستان کی جانب سے وعدہ کیا جاتا ہے بلکہ تمام حلیف حکومتوں کی جانب سے بھی۔

نہایت افسوس و رورسیاھی کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا نہ یہ مذہبی فیصلہ صحیح تھا۔ نہ وعدوں اور اعلانوں پر اعتماد۔ انہوں نے اپنی سیزدہ صد سالہ تاریخ حیات میں شاید ہی کوئی ایسی قومی و مذہبی غلطی کی ہوگی، جیسی اس موقع پر کی، اور جس کے نتائج کی پہلی قسط آج آنکے سامنے ہے۔ فما کان اللہ لیظلمہم و لکن کانوا انفسہم یظلمون !

تھوڑی دیر کیلئے اس سے قطع نظر کرلو کہ احکام شرع کی بنا پر یہ راے کہانتک صحیح تھی؟ صرف اس پہلو سے دیکھو کہ جن وعدوں پر بھروسہ کیا گیا، ان کا کیا حال تھا؟ پرانے وقتوں کی طرح موجودہ زمانے کی سروسائٹی بھی اشخاص کیلئے ضروری سمجھتی ہے کہ ایفاء عہد میں اپنے نڈیں شریف ثابت کریں، لیکن بیسویں صدی کی تہذیب میں حکومتوں کیلئے شریف ہونا کوئی ضروری وصف نہیں ہے، اور اگر طاقت موجود ہے تو پھر اخلاقی صداقت کے مطالبہ کا وہم و گمان بھی نہیں کرنا چاہیے۔ جب وعدوں کا ایفاء اور عہد پیمان کی پابندی کمزور حکومتوں کے ساتھ ضروری نہیں سمجھی جاتی، تو پھر محکوم و بے سروسامان رعایا کے ساتھ کیوں ضروری سمجھی جائے، جو اپنی وفاداری میں کتے کی طرح قابل تعریف مگر بے زبانی میں اسی کی طرح بے بس بھی ہو؟

انگلستان کی حکومت نے نپولین کے عہد سے لیکر آج تک اپنے وعدوں کو جس طرح پورا کیا ہے، ان کی عبرۃ انگیز سرگذشت صفحات تاریخ پر ثبت ہے۔



مسلمانوں کی جانب سے یہ پورا کام انجام دیتے رہے۔ انہوں نے تمام مسلمانان عالم کو عیش و راحت کے بستر پر چھوڑ دیا۔ خود اپنے لیے خاک و خون کی دائمی زندگی پسند کی۔ ان قرون اخیرہ میں اگر ترکوں کی جانفروشی و سر باز جماعت تن تنہا اس فرض کو نہ سنبھال لیتی، تو نہیں معلوم آج جغرافیہ عالم میں مسلمانوں کی آبادیوں کا کیا حال ہوتا؟ اور جو مصیبت اسوقت درپیش ہے، وہ کب کی آچکی اور مسلمانوں پر سے گزر چکی ہوتی؟ تمام دنیا کے مسلمانوں پر ترکوں کا یہ وہ احسان عظیم ہے کہ اگر اسکے معارضہ میں مسلمانان عالم اپنا سب کچھ اُن پر سے قربان کر دیں، جب بھی اُنکے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ اگر گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے پادشاہتیں کی ہیں تو صرف اُنہی کی بدولت، اور اگر آج پادشاہتیں کھو کر بھی کچھ نہ کچھ عزت کی پونجی اپنے ساتھ رکھتے ہیں تو صرف اُنہی کی بدولت۔ مسلمان خواہ دنیا کے کسی حصہ میں بستا ہو، چین میں ہو یا افریقہ کے بعید گوشوں میں، لیکن صدیوں سے اُسکی قومی زندگی، قومی عزت، قومی عیش و آرام، اور وہ سب کچھ جو ایک قوم کیلئے ہے اور ہوسکتا ہے، صرف ترکوں ہی کے طفیل ہے اور اُنہی کا بخشا ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا فرض ہوا کہ ترکوں کی مدد کریں۔ لیکن ترکوں کیلئے یہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ ہندوستان یا افریقہ میں بانٹنے کیلئے روپیہ بھیجتے رہیں۔ وہ چار صدیوں سے وہ کام انجام دے رہے ہیں جسکے تصور سے بھی ہم مسلمانان ہند کے دل کانپ اُٹھتے اور جسکے وہم ہی سے ہم پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ یعنی اپنی جانیں اسلام کی حفاظت کی راہ میں قربان کر رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کونسا کام ہے جو اسلام اور مسلمانوں کیلئے کیا جاسکتا ہے؟ اور اسکے بعد کیا رہ گیا جسکی طلب اور سوال ہو؟ بہت ممکن ہے کہ کسی دوسرے حصے کے مسلمانوں نے ترکوں سے زیادہ نمازیں پڑھی ہوں، لیکن نماز کے قیام کی راہ میں اُنسے زیادہ اپنا خون کسی نے نہیں بہایا۔ بہت ممکن ہے کہ عرب اور ہندوستان کے مسلمانوں کی زبانوں نے انسے زیادہ قرآن کی تلاوت کی ہو، لیکن قرآن کی حفاظت کی راہ میں چار سو برس سے زخم صرف اُنہی کے سینے کھا رہے ہیں۔ اگر اللہ کی شریعت حق ہے، اگر قرآن و سنت کا فیصلہ باطل نہیں، تو ہمیں یقین کرنا چاہیے کہ دوسرے ملکوں کے ہزاروں عابد و زاہد



اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی - یعنی وہ شکست کھاچکے ہیں اور بعض مقامات کے مسلمانوں کی درماندگی و تباہی غایت درجہ ہلاکت تک پہنچ چکی ہے - جیسے ولایت سمرنا وغیرہ کے مسلمان - پس اس بنا پر بھی مسلمانان ہند کا فرض شرعی ہوگا کہ انکی مدد کیلیے اُٹھ کھڑے ہوں - کیونکہ اگر ایک مقام کے مسلمان دشمن کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے تو دیگر ممالک کے مسلمانوں پر دفاع میں شریک ہونا فرض ہو جاتا ہے -

( ۳ ) جن بلاد اسلامیہ پر غیر مسلم دخل و تصرف کرنا چاہتے ہیں ' یا کرچکے ہیں گو آخری اعلانات ابھی نہیں کیے گئے - مثلاً ایڈریانوپل ' تھریس ' ایشیائے کوچک ' سمرنا ' عراق ' فلسطین ' انکے قرب و جوار میں مسلمانوں کی کوئی ایسی جماعت موجود نہیں جو دشمنوں کے دفاع میں مددگار ہو سکے ' اور اسکی اعانت کی وجہ سے مسلمانان ہند بری الذمہ ہو جائیں - پس اس بنا پر بھی ساری شرعی ذمہ داری مسلمانان ہند کے ذمے عائد ہوتی ہے ' جنکی تعداد دنیا کی تمام اسلامی آبادیوں سے زیادہ ' اور جو بہت سی باتوں میں دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے بہتر حالت رکھتے ہیں -

( ۴ ) عراق کا تمام خطہ دریائے دجلہ تک جزیرہ عرب میں داخل ہے - پس اگر انگریزی قبضہ وہاں قائم رہا ' یا کسی طرح کا بھی انگریزی اقتدار حکم برداری اور نگرانی کے نام سے حاصل کیا گیا ' تو یہ صریح جزیرہ عرب پر غیر مسلم اقتدار کا مسئلہ ہوگا ' اور از روئے شرع مسلمانان ہند کا فرض ہوگا کہ اس اقتدار کے دور کرنے کیلیے حریف کا مقابلہ کریں -

( ۵ ) بیت المقدس اسلام کے مقامات مقدسہ میں داخل ہے - اگر اسپر غیر مسلم اقتدار قائم رکھا جائیگا ' تو تمام دنیا کے مسلمانوں کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کا بھی فرض ہوگا کہ دفاع کیلیے مستعد ہو جائیں -

( ۶ ) غرضکہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک وفادار برٹش شہری کی زندگی بسر کرنا شرعاً ناجائز ہو جائیگا - اور یہ فرائض کی سب سے بڑی کشمکش ہوگی جسمیں کوئی انسانی جماعت مبتلا ہو سکتی ہے - ہندوستان برٹش گورنمنٹ کے ماتحت ہے اور مسلمان اسوقت تک ایک وفادار شہری جماعت کی زندگی بسر کرتے آئے ہیں - لیکن ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ نکلیگا کہ انکے مذہبی فرائض ہندوستان کے قانونی فرائض سے ٹکرا جائینگے - یعنی بمجرد ان حالات کے برٹش گورنمنٹ کی حیثیت از روئے شرع یہ

بلاد اسلامی کے عین دروازہ پر مغربی مدافعت کی ایک آہنی دیوار قائم کر دی ، اور اس طرح حکم جہاد کے دونوں فرض بہ یک رقت تن تنہا انجام دیے ۔ ہجوم بھی ۔ اور دفاع بھی ؟

کیا ہندوستان کی سلطنت مغلیہ نے جس نے اپنی پوری تاریخ میں ایک بار بھی ہندوستان سے قدم باہر نہ نکالا ؟ اور جسکی تلوار پانچ صدیوں کے اندر ایک مرتبہ بھی کسی حریف ملت کے خون سے رنگین نہ ہوئی ؟ عین اکبر اعظم کے زمانے میں ہندوستان کے حاجیوں کو پرتکالیوں اور تچوں کے جرگے ساحل ہند کے سامنے لوٹ رہے تھے اور وہ انکے انسداد سے عاجز تھا !

کیا ایران کے سلاطین نے ، جنکے عقبی حملوں نے ہمیشہ سلاطین عثمانیہ کو مجبور کیا کہ یورپ کا فتح مندانہ اقدام ترک کر کے ایشیاء کی طرف متوجہ ہو جائیں ۔ جسکی وجہ سے یکایک یورپ کو ترکی تلواروں سے مہلت ملگئی اور تمام وسط یورپ فتح ہوتے ہوتے رہ گیا ؟

کیا یمن کے خود مختار قبائل اور عرب آئمہ نے ، جنکو اسلام کے اس سب سے بڑے حریف کا شاید حال بھی معلوم نہ تھا ؟

ہر انسان جو در اور در کو صرف چار ہی کہنا چاہتا ہو ، اسکا اقرار کریگا کہ بجز سلاطین عثمانیہ اور ترکوں کے مسلمانوں کی کوئی حکومت اور قوم نہیں ہے جس نے قرن اخیرہ میں حفظ اسلام و ملت کی یہ خدمت انجام دی ہو ۔ اور جو فرض تمام مسلمانان عالم کے ذمے عائد ہوتا تھا ، اُسکو سب کی طرف سے تن تنہا اُٹھا لیا ہو ؟

حقیقت یہ ہے کہ ترکوں کا یہ وہ عظیم الشان کارنامہ ہے جسکی نظیر قرن اولی کے بعد مسلمانوں کی کسی حکمران قوم کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی ۔ صرف صلاح الدین ایوبی کی دعوت اس سے مستثنیٰ ہے جس نے تمام یورپ کے متحدہ مسیحی جہاد کو شکست دی ۔ تاہم وہ بھی ایک محدود زمانے کا دفاع تھا ۔ مسلسل تین چار صدیوں تک صرف ترکوں ہی کی اسلامی مدافعت قائم رہی ہے ۔ ان پوری چار صدیوں میں تمام روئے زمین کے مسلمان اپنے سب سے بڑے قومی فرض سے غافل رہے ۔ کسی قوم نے ایک زخم بھی اس مقدس راہ میں نہیں کھایا ۔ کسی پادشاہ نے ایک قدم بھی اسکے لیے نہیں اُٹھایا ۔ صرف تن تنہا ترک ہی دنیا بھر کے

## ( موجودہ و آئندہ حالت اور احکام شرعیہ )

بحث کے اس تکرر کو ہم دانستہ حذف کر دیتے ہیں کہ جنگ کے بعد ان وعدوں اور اعلانات کا کیا نتیجہ نکلا ؟ نہ ہم ان پیہم اعلانات کا یہاں ذکر کرینگے جنگا سلسلہ برابر اٹناے جنگ میں جاری رہا ۔ مثلاً وزیر اعظم کی تقریر ۵ - جنوری سنہ ۱۹۱۸ - کیونکہ یہ تمام باتیں دنیا کے سامنے ہیں - اور سورج کی روشنی جن چیزوں کو دکھلا دے انکے لیے بحث و نظر کی روشنی سے مدد لینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی -

ہم کو یہاں صرف ایک بات کا فیصلہ کرنا ہے - اسکے علاوہ اب نہ کوئی بات ہمارے لیے سونچنے سمجھنے کی باقی رہی ہے - نہ گورنمنٹ کیلئے - نہ صرف موجودہ و آئندہ حالت کا سوال ہے -

احکام شرعیہ اور گذر چکے ہیں - پس اگر موجودہ حالت میں تبدیلی نہ ہوئی اور صلح کے نام سے اسلامی خلافت کے خلاف رہی جنگ عمل میں لائی گئی جسکا اظہار ہو رہا ہے ، تو نتائج حسب ذیل ہونگے :

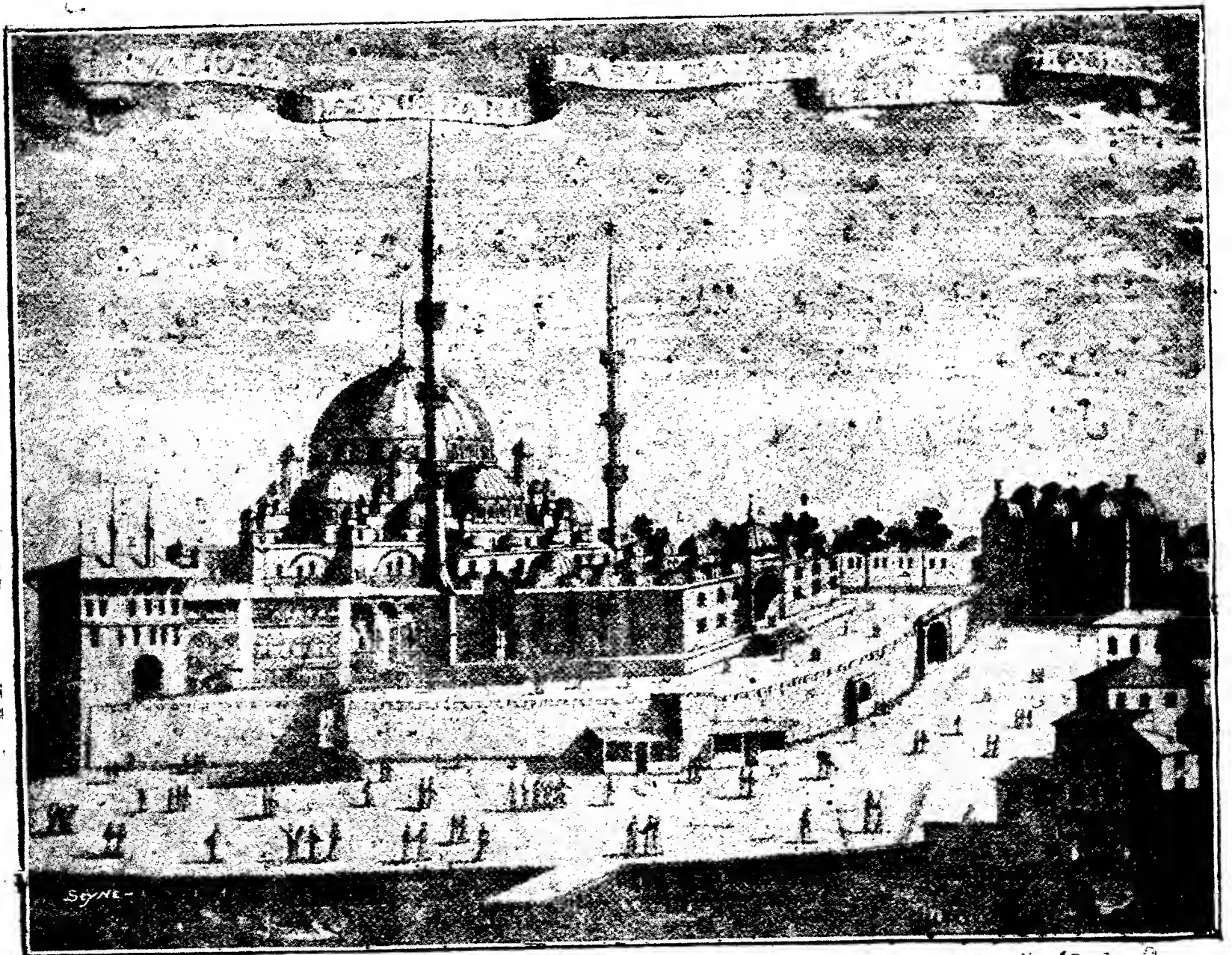
( ۱ ) جس وقت خلیفۃ المسلمین نے جنگ میں شرکت کی ہے تو برٹش گورنمنٹ نے اعلان کیا تھا کہ حملہ انکی جانب سے ہے - انگلستان و حلفاء کی جانب سے نہیں ہے - لیکن اب موجودہ حالت بالکل اسکے برعکس ہے - یعنی خلیفۃ المسلمین کسی غیر مسلم ملک و حکومت پر حملہ آور نہیں ہیں بلکہ غیر مسلم حکومتیں مسلمان آبادیوں اور خلیفۃ اسلام کی حکومت پر قابض ہو رہی ہیں ، اور خلیفۃ المسلمین پر حملہ آور ہیں - پس اگر اس حالت میں تبدیلی نہ ہوئی اور عارضی صلح کے بعد بھی یہی حال رہا ، تو مسلمانوں کیلئے قطعاً صورت دفاع اور نفیر عام کی پیدا ہو جائیگی جب جہاد ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے - حملہ و ہجوم کو ، صورت نہ ہوگی کہ فرض علی الکفایہ ہو - لہذا ہندوستان کے ہر مسلمان یہ شرعی فرض ہوگا کہ خلیفۃ المسلمین ، اور ان تمام اسلامی آبادیہ کی اعانت کیلئے اٹھ کھڑا ہو ، جہاں سے اسلامی حکومت ہٹائی جا رہی ہے -

( ۲ ) یہ حقیقت پہلے سے آشکارا تھی ، مگر چار سال کی جنگ اور اسکے نتائج نے آخری درجہ یقین تک ظاہر کر دی کہ نہ تو خلیفۃ المسلمین کی موجودہ طاقت غیر مسلم حریفوں کے مقابلے کیلئے کافی ہے - نہ موجودہ



سے اپنا خون بہا رہے ہیں ، انہوں نے اس کے لیے کیا کیا ؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ کبھی کبھار چند لاکھ سکے ترک زخمیوں کی مرہم پٹئی کیلئے بھیج دیے جو ایک ترک بیوہ کی مصیبت اور ایک ترک یتیم کے آنسوؤں کی قیمت بھی نہیں ہوسکتے ؟ کیا ایسے لوگوں کو جو اپنی راتیں فارغ البالی کے بستروں پر اور دن آرام و بے فکری کی چھتوں کے نیچے بسر کرتے ہوں ، یہ حق پہنچتا ہے کہ اُن لوگوں پر زبان طعن کھولیں جو چار سو برس سے اپنی لاشیں خاک و خون میں تڑپا رہے ہیں ؟ بہر حال منصب خلافت کا پہلا مقصد قیام دفاع و جہاد ہے ۔ وہ پچھلی چار صدیوں میں بجز ترکوں کے اور کسی اسلامی حکومت نے انجام نہیں دیا ۔ پس اگر اُرر دلائل و شواہد نہ ہوتے ، جب بھی صرف یہی ایک بات سلاطین عثمانیہ کی خلافت و امامت کیلئے کفایت کرتی تھی ۔

اور پھر یہ بھی واضح رہے کہ یہ تمام مباحث اس سوال سے تعلق رکھتا تھا کہ گذشتہ صدیوں میں متعدد اسلامی حکومتوں کے رہتے ہوئے سلاطین عثمانیہ ہی کیوں خلافت عظمیٰ کے حقدار تسلیم کیے گئے ؟ لیکن موجودہ زمانے میں جبکہ تمام اسلامی حکومتیں مت چکی ہیں ، مسلمانان عالم کیلئے بجز سلطان عثمانی کے کسی دوسری خلافت کا وجود ہی نہیں رہا ۔



ایدریا نوپل کی جامع سلیم کا بیرونی منظر

وہ مسلمانوں کو آزادی دیگی کہ نماز پڑھیں جو مذہبی احکام میں شاخ کا حکم رکھتی ہے، لیکن عین اسی رقت خلیفۃ المسلمین کی حکومت کو صرف قسطنطنیہ میں محدود کر دینے اور تمام بچی بچائی ترکی مملکت کا خاتمہ کر دینے کیلئے اپنے جنگی جہازوں کو بھی با سفورس بھیجیگی، اور اس طرح اسلامی خلافت و امامت کا خاتمہ ہو جائیگا جو مسلمانوں کے مذہبی احکام میں شاخ کا نہیں بلکہ بنیاد اور جز کا حکم رکھتی ہے ؟

وہ نماز کے پڑھنے میں مداخلت نہیں کریگی جسکے نہ پڑھنے سے مسلمان گناہگار ہو جاتا ہے، لیکن خلیفۃ المسلمین کو انکی حکومت و مملکت سے محروم کر دیگی جنگی مدد نہ کرنے سے ایک مسلمان گناہگار ہی نہیں بلکہ اسلامی جماعت سے باہر ہو جاتا ہے ؟

وہ مسلمانوں کو حج کے سفر سے نہیں روکتی کیونکہ انکا مذہبی عمل ہے، لیکن وہ خلیفۃ المسلمین کو اپنی بحری و بری فوجی طاقت سے محصور کر کے مجبور کریگی کہ اسلامی مملکتوں کو غیر مسلموں کے حوالہ کر دیں، اور اسوقت مسلمان دفاع کیلئے اٹھیں گے تو کہیں گی کہ یہ بغارت ہے۔ پھر کیا وہ مسلمانوں کا مذہبی عمل نہ ہوگا ؟ اور کیسا مذہبی عمل ؟ ایسا عمل کہ شرعاً ہزاروں حج سے بڑھکر، اور حج اسکے لیے چھوڑ دیا جاسکتا ہے، لیکن حج کی خاطر وہ نہیں چھوڑا جاسکتا۔

مسلمان اُن مسجدوں اور اُنکے اندر کی نمازوں کو لیکر ہندوستان میں کیا کریں گے جنگی اجازت دیدینے پر برٹش گورنمنٹ کی آزادی کو ناز ہے، جبکہ شریعت کے وہ احکام اُنکے سامنے آ جائیں گے جنگی تعمیل ہزار نمازوں سے بڑھکر اور ہزار روزوں سے زیادہ اشد و اہم ہے، اور جنگی نافرمانی کے بعد نہ تو انکی نمازیں ہی اُنکے لیے سود مند رہیں گی۔ نہ اُنکے روزے ہی اُن کو نجات دلا سکیں گے ؟

### ( ترک مراسلات )

اس صورت میں مسلمانوں پر ترک و اختیار، دونوں طرح کے احکام شرعاً عائد ہونگے۔ ” ترک “ سے مقصود یہ ہے کہ بہت سی باتیں جو اسوقت کر رہے ہیں، ترک کر دینی پڑیں گی۔ ” اختیار “ سے مقصود یہ ہے کہ بہت سی باتیں جو اسوقت نہیں کر رہے، کرنی پڑیں گی۔



مسلمانوں سے جنکے دلوں میں کبھی جہاد فی سبیل اللہ کا خطرہ بھی نہیں گذرتا، ترکوں کا ایک گناہگار و معصیت آلود فرد بھی اللہ کے آگے کہیں زیادہ فضیلت و محبوبیت رکھتا ہے۔ ہماری مدۃ العمر کی عبادتیں بھی انکے سینے کے ایک خونچکان زخم اور اس سے بہنے والے ایک قطرہ خون کی عظمت نہیں پاسکتیں۔ حدیث ہے کہ ”حرس لیلة فی سبیل اللہ افضل من الف لیلة یقام لیلها و یصام نہارها“ (۱) جہاد فی سبیل اللہ کی ایک رات ہزار دنوں کے روزوں اور ہزار راتوں کی عبادت سے بھی افضل ہے! حضرت عبد اللہ بن مبارک نے حضرت فضیل بن عیاض کو ایک مرتبہ یہ اشعار لکھ کر بھیجے تھے:

یا عابد الحرمین لو ابصرتنا \* لعلمت انک فی العبادۃ تلعب!  
من کان یخضب خده بدموعه \* فاحسوزنا بدمائنا تتخضب!  
ریح العبیر لکم \* ونحن عبیرنا \* ریح السذابک والغبار الا طیب (۲)

جو مسلمان یورپ کے مسیحی و سیاسی اثر سے مختل ہو کر ترکوں پر اعتراض کیا کرتے ہیں، انکو چاہیے کہ پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ صدیوں سے انکی منافقانہ غفلت و اعراض کا کیا حال رہا ہے؟ علی الخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کو (جو تعداد میں ہر جگہ کے مسلمانوں سے زیادہ ہیں) غور کرنا چاہیے کہ جس اربعین فرض دینی کیلئے ترک چار سو برس

(۱) اخرجہ الامام احمد عن مصعب بن زبیر۔

(۲) حافظ ابن عساکر نے امام موصوف کے ترجمہ میں یہ اشعار نقل کیے ہیں۔ امام موصوف ایک سال درس حدیث دیتے، ایک سال تجارت کرتے، ایک سال جہاد میں شرکت فرماتے۔ حضرت فضیل اُس عہد کے مشہور عباد و زہاد میں سے ہیں۔ حاصل، ان اشعار کا یہ ہے ”اے حرمین کے گوشہ نشین عابد! اگر تو نے ہمارا حال دیکھا ہوتا تو معلوم کر لیتا کہ جس زہد و عبادت میں مشغول رہتا ہے وہ تو ایک طرح کا کھیل ہے۔ جو شخص اپنے رخسار آنسوؤں سے (عبادت میں) ترکرتا ہے، اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری عبادت وہ ہے جس میں رخسار آنسوؤں سے نہیں بلکہ گردنیں خون سے رنگین ہوا کرتی ہیں“! حضرت فضیل نے جب یہ اشعار پڑھے تو انکی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور فرمایا ”صدق ابو عبد الرحمن“ عبد اللہ بن مبارک نے سچ کہا!

ہوجائیگی کہ وہ ”اسلام اور مسلمانوں کی حملہ آور دشمن ہے“ اور اسلیے اُس سلوک کی مستحق ہوا اور رے شرع مسلمانوں کو حملہ آور حریف کے ساتھ کرنا چاہیے ”جب ایسا ہوا“ تو مسلمان مجبور ہونگے کہ در راہوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرلیں - یا برٹش گورنمنٹ کا ساتھ دیں، یا اسلام کا - یہ ناممکن ہو جائیگا کہ دونوں تعلق ایک وقت میں جمع کیے جاسکیں - کیا چہہ کررے سے زائد انسانوں کو اس کشمکش میں مبتلا کردینا کوئی عاقبت اندیشانہ فعل ہو سکتا ہے ؟ فرصت کی آخری گھڑیاں گزر رہی ہیں - اگر عارضی فتح مندی کا گھمڈ مہلت دے، تو گورنمنٹ اس سوال پر غور کرلے -

اگر انگلستان کے رزرا ( نیپولین کے لفظوں میں ) وعدہ اسلیے نہیں کیا کرتے کہ وفا کیا جائے، تو کم از کم اُس ایک وعدہ کو تو اس اخلاقی کلیہ سے مستثنیٰ کر دیں جسکو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کا بنیادی اصول حکومت سمجھا جاتا ہے - یعنی آغاز حکومت سے لیکر آج تک اس وعدہ کا قولاً و فعلاً اعلان کہ کسی جماعت کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کی جائیگی اور ہر جماعت اپنے مذہبی احکام کی بجا آری میں آزاد ہے - اسی وعدہ کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں ہر قوم کی طرح مسلمان بھی روز مرہ اپنے مذہبی فرائض انجام دے رہے ہیں - انکی مسجدیں قائم ہیں - پانچ وقت اذان کی صدائیں بلند ہوتی ہیں - کوئی حاکم مسلمانوں سے یہ نہیں کہتا کہ نماز نہ پڑھو -

لیکن اگر برٹش گورنمنٹ خلیفۃ المسلمین کے خلاف اپنے موجودہ طرز عمل پر قائم رہی، اسکے جہاز اسلامی حکومت کے ٹکرے ٹکرے کردینے کیلئے سمندروں میں دوڑتے رہے، اُسکی فوجیں عراق کی سرزمین پر قابض رہیں جو مقدس جزیرہ عرب میں داخل ہے، اور ساتھ ہی اس کی بھی متوقع رہی کہ ہندوستان کے بد بخت مسلمان اسکے وفادار رہیں، تو اسکے صرف یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو انکے مذہب کے چھوٹے چھوٹے حکموں میں آزادی دینے کیلئے طیار ہے، لیکن جو احکام اسلام کے بنیادی عقائد ہیں اور ان بڑے حکموں میں داخل جن کے ترک کردینے سے مسلمان مسلمان نہیں رہتا، انکے لیے چاہتی ہے کہ مسلمان حق و آزادی کا نام بھی زبان پر نہ لائیں اور برطانیہ کی وفاداری کی خاطر اپنے اسلام سے باغی ہو جائیں !

ہے کیونکہ اُن پر ظلم ہو رہا ہے ، اور اللہ مظلوموں کی مدد پر قادر ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ بلا کسی حق کے اپنی آبادیوں سے نکال دیے گئے ۔ انکا کوئی قصور نہ تھا ۔ صرف یہ کہ اپنے پروردگار کے ماننے والے ہیں ۔ ( ۱ )

لیکن بعض مفسرین نے سورہ بقرہ کی حسب ذیل آیت کو اذن قتال کا پہلا حکم قرار دیا ہے :

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ  
الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ  
وَلَا تَعْتَدُوا - اِنَّ اللَّهَ  
لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ -  
وَاَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ  
ثَقَفْتُمُوهُمْ ، وَاُخْرِجُوهُمْ  
مِنْ حَيْثُ اُخْرِجُوكم -  
وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ -  
( ۲ : ۱۸۷ )

اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو مسلمانوں سے لڑائی لڑ رہے ہیں ۔ مگر زیادتی نہ کرو ۔ اللہ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا ۔ اور ایسا کرو کہ جہاں کہیں بھی وہ جمعے ہوئے ملیں ، قتل کردو ۔ اور جہاں کہیں سے انہوں نے مسلمانوں کو نکالا ہے ، تم بھی نکال باہر کرو ۔ ایسا کرنا اگرچہ خونریزی ہے ، مگر خونریزی کی برائی سے بھی بڑھکر ظلم و فساد کی برائی ہے ۔

امام ابن جریر نے ابو العالیہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنگ کی نسبت یہی پہلی آیت ہے جو نازل ہوئی ” اُنہا اول آیت نزلت فی القتال بالمَدینہ فلما نزلت کان رسول اللہ صلعم یقاتل من قاتلہ ریکف عمن کف عنہ “ حتی نزلت سورۃ برآۃ ” پس اذن قتال کی پہلی آیت یا سورہ حج کی ہے یا بقرہ کی ۔

ان دونوں آیتوں اور انکی ہم مطلب آیات میں قرآن حکیم نے حکم قتال کے اُس حصہ کو صاف صاف مسلمانوں پر فرض کر دیا ہے جسکا مقصد دفاع ( دِیفنس ) ہے ( ۲ ) ۔ یعنی جب کبھی غیر مسلموں کی کوئی جماعت

( ۱ ) روی الحاکم من حدیث الاعمش عن ابن عباس - قال : لما خرج رسول اللہ صلعم من مکہ قال ابو بکر ” اخرجوا نبیہم - انا لله وانا الیہ راجعون - لیہلک “ فانزل اللہ اذن للذین یقاتلون الخ وھی اول آیۃ نزلت فی القتال - اسنادہ علی شرط الصحیحین -

( ۲ ) یعنی حکم جہاد کی مختلف قسموں اور صورتوں میں سے ایک قسم قتال ہے ۔ پھر قتال کی بھی دو قسمیں ہیں ۔ دفاع اور ہجوم ۔ ان آیات میں دفاع کا حکم ہے ۔ ہجوم کا حکم دوسری آیتوں میں ہے اور اسکے مواقع و بواعث اور شرائط دوسرے ہیں ۔

اور اسی سورۃ کے اوائل میں فرمایا : یا ایہا الذین آمنوا ! لا تتخذوا

عذری وعدکم اولیاء ، تلقون الیہم بالمودۃ وقد کفروا بما جاءکم من الحق ؟ الخ  
مسلمانو ! جو غیر مسلم تمہارے اور تمہارے خدا کے دشمن ہیں ، انکو اپنا

درست نہ بناؤ - اور سورۃ مائدہ میں ہے : لا تتخذوا الیہود والنصارى اولیاء ،

بعضہم اولیاء بعض - ر من یقولہم منکم فانہ منکم ( ۵ : ۵۴ ) ان یہود و نصاری  
کو جو مسلمانوں کی دشمنی اور نقصان رسانی میں سرگرم ہوں ،  
اپنا درست نہ بناؤ - اور جو مسلمان بنایگا ، خدا کے حضور اسکا شمار بھی

انہی میں ہوگا - اس سے بھی زیادہ راضع فرمایا : لا یتخذوا المومنین الکافرین

اولیاء من دن المومنین ( ۳ : ۲۸ ) اور لا تتخذوا الکافرین اولیاء من دن  
المومنین ( ۴ : ۱۴۳ ) یعنی جبکہ غیر مسلموں اور مسلمانوں میں باہم  
جنگ ہو ، تو مسلمانوں کو نہیں چاہیے کہ اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر ان کے  
دشمنوں کو اپنا درست بنائیں - ” من دن المومنین “ جہاں جہاں آیا ہے ،  
اس نے راضع کر دیا ہے کہ مقصود ہر قسم کے غیر مسلموں سے ترک موالات  
نہیں ہے ، بلکہ ایک خاص قسم اور ایک خاص حالت - اسی طرح سورۃ  
عمران میں ہے : لا تتخذوا بطانۃ من دنکم لا یالزنکم خیالاً - و در ما عنکم

قد بدت البغضاء من افواہم وما تخفی فی صدرہم اکبر ( ۳ : ۱۱۸ )

( راقعہ حاطب بن ابی بلتعہ )

سورۃ ممتحنہ کے شان نزول کا راقعہ اس بارے میں مسلمانوں کیلئے  
بڑا ہی عبرت انگیز ہے - بخاری و مسلم میں حضرت علی سے مروی ہے کہ  
حاطب بن ابی بلتعہ مہاجر بن صحابہ اور شرکاء بدر میں سے تھے - آنحضرت صلعم  
نے مکہ پر چڑھائی کا قصد کیا تو انہوں نے کسی بری نیت سے نہیں ،  
صرف اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے خیال سے ایک خط لکھ کر مکہ میں  
اطلاع دیدینی چاہی - وحی الہی سے آنحضرت اس پر مطلع ہو گئے اور راستے  
میں سے خط پکڑا منگوا یا - جب حاطب سے پوچھا گیا تو انہوں نے  
معذرت کی اور کہا ” ما فعلت ہذا کفرا ولا ارتداداً “ حضرة عمر نے چاہا کہ  
انہیں قتل کر دیں اور کہا ” انہ منافق - قد خان اللہ ورسولہ “ یہ منافق ہے - اس  
نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کی ! اس پر سورۃ ممتحنہ کا نزول ہوا -

# باب

( فريضة عظيمه دفاع )

## فصل

( حقيقت حاكم دفاع )

اسلام کے شرعي واجبات و فرائض میں ایک نہایت اہم اور اکثر حالتوں میں ایمان و کفر تک کا فیصلہ کر دینے والا فرض ”دفاع“ ہے۔

تشریح اسکی یہ ہے کہ جب کبھی کسی مسلمان حکومت یا کسی مسلمان آبادی پر کوئی غیر مسلم گروہ حملہ کرے، تو یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پر شرعاً فرض ہو جاتا ہے کہ دفاع (Difence - ڈیفنس) کیلئے اُٹھ کھڑے ہوں، اس حکومت اور آبادی کو غیر مسلم قبضہ سے لڑکر بچائیں، اگر فوری قبضہ ہو گیا ہے تو اس سے نجات دلائیں، اور اس کام کیلئے اپنی ساری قوتیں اور ہر طرح کی ممکن کوششیں وقف کر دیں۔ اس بارے میں قرآن و حدیث کے احکام اس کثرت سے موجود ہیں، اور اسلامی فرائض میں یہ اس درجہ مشہور فرض ہے، کہ شاید ہی دنیا میں کوئی مسلمان اس سے نارا قف نکلے۔ یہی باہمی مددگاری و یاروری اور دفاع اعداء کا قانون ہے جس پر اسلام نے شریعت و امت کی حفاظت کی ساری بنیادیں استوار کی ہیں۔ لڑائی لڑنے کی نسبت سب سے پہلی آیت جو نازل ہوئی وہ سورہ حج میں ہے :

اللہ تعالیٰ مومنوں پر سے انکے دشمنوں کو ہٹاتا رہتا ہے۔ وہ ان لوگوں کا ساتھی نہیں جو اُسکی بخشي ہوئی طاقت کے امانت دار نہیں ہیں، اور شکر گزاری کی جگہ کفران نعمت میں سرشار ہیں۔ جن مسلمانوں سے کفر لڑ رہے ہیں، اب ان مسلمانوں کو بھی کافروں سے لڑنے کی اجازت دی جاتی

ان اللہ یدافع عن الذین آمنوا  
ان اللہ لا یحب کل خوان کفور  
أذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا  
وان اللہ علی نصرہم لقدیر  
الذین اخرجوا من دیارہم بغیر  
حق الا ان یقولوا ربنا اللہ۔

( ۲۲ : ۴۲ )



اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز یہ ہے جسکو شریعت نے ”ترک  
مسائل“ سے تعبیر کیا ہے - یعنی جو غیر مسلم مسلمانوں کے  
حریف و دشمن اور حملہ آور فریق کا حکم رکھتے ہوں، اُنسے کوئی تعلق ایسا  
نہ رکھنا جو محبت، خدمت، اور اعانت کا تعلق ہو۔ اگر کوئی مسلمان  
ایسا تعلق رکھیگا، تو اُسکا شمار بھی شریعت کے نزدیک اُنہی غیر مسلموں  
میں ہوگا۔ مسلمانوں میں نہ ہوگا۔

قرآن حکیم نے اس بارے میں ایک اصولی تقسیم کر دی ہے - تمام  
غیر مسلم اقوام و افراد کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے - ایک قسم اُن غیر  
مسلموں کی ہے جو نہ تو مسلمانوں سے لڑتے ہیں - نہ انپر حملہ آور ہیں،  
نہ اُنکی آبادیوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں - دوسری قسم اُن غیر مسلموں  
کی ہے جو یہ ساری باتیں کر رہے ہیں - یعنی لڑتے ہیں، حملہ آور ہیں،  
اسلامی ممالک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام کا حکم یہ ہے کہ پہلی قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں  
کو نیکی و محبت اور ہر طرح کے احسان و خیر خواہی کا سلوک کرنا  
چاہیے - اسلام اس سے ہرگز مانع نہیں - عالمگیر محبت اسکی دعوت  
حق کا اصل اصول ہے - البتہ دوسری قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ وہ  
اجازت نہیں دیتا کہ اس طرح کا کوئی علاقہ بھی مسلمان رکھیں - اگر رکھینگے  
تو اُنکا شمار بھی اللہ اور اسکی شریعت کے دشمنوں میں ہوگا۔  
ایک مسلمان کے سارے گناہوں سے شریعت درگزر کر لے سکتی ہے، لیکن اگر  
وہ اُن غیر مسلموں سے محبت کرتا ہے، یا کسی طرح کا واسطہ رکھتا ہے،  
تو یہ گناہ نہیں ہے - نفاق ہے - اور منافق مومن نہیں ہے۔

قرآن نے یہ تقسیم سورہ ممتحنہ میں کر دی ہے: لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ

لَمْ يَقاتِلُوا بِكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِكُمْ، اِنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتَقْطَعُوْا

الْبَیْمَ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمَقْطُوْعِيْنَ - اِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوْكُمْ

فِي الدِّينِ وَخَرَجُوْكُمْ عَنْ دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلٰی اَخْرَاجِكُمْ، اِنْ تَوَلَّوْهُمْ

وَمِنْ يَتَوَلَّوْهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ - [۴۰ : ۱۰]

و لكم فى القصاص حياة يا تمہارے لیے قصاص کی موت میں امن کی  
اولی الالباب - ( ۲ : ۱۷۹ ) زندگی پوشیدہ ہے !

لہذا حکم دیا کہ جب تک دنیا جنگ اور بواعث جنگ سے باز نہ  
آجائے، جنگ کرتے رہو۔ کبھی اس سے نہ تھکو۔ یہاں تک کہ دنیا میں  
جنگ کا نام و نشان ہی باقی نہ رہے ”تضع الحرب ارزارها“ جنگ اپنے  
ہتیار ڈال دے۔ یعنی جنگ بالکل موقوف ہو جائے۔ فساد و بطلان کی وہ  
قوتیں ہی باقی نہ رہیں جو خدا کی زمین کو ہمیشہ انسانی خون سے  
رنگتی رہتی ہیں۔ قرآن کا دعوا ہے کہ عالمگیر امن کا یہ وقت دنیا پر ضرور  
آئیگا۔ مگر اسی وقت آئیگا جب تمام دنیا اسلام کی دعوت امن و اخوت کے  
آگے جھک جائیگی : هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق  
لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون ( ۹ : ۶۱ )

## فصل

( فضائل دفاع )

اسلامی احکام میں یہ حکم ”دفاع“ جو اہمیت رکھتا ہے، وہ عقائد  
ضروریہ کے بعد کسی حکم، کسی فرض، کسی رکن، کسی عبادت کو حاصل  
نہیں۔ قرآن و حدیث میں بار بار یہ بات بتلائی گئی ہے کہ قومی زندگی  
اسی عمل کے بقاء پر موقوف ہے۔ جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ باقی  
رہیگا اور اس کام کی راہ میں ہر فرد اپنی زندگی اور اپنا مال قربان کر دینے  
کیلیے طیار رہیگا، اسوقت تک دنیا کی کوئی قوم اُنپر غالب نہ آسکیگی۔  
جس دن یہ جذبہ مردہ ہو جائیگا۔ اسی دن سے مسلمانوں کی قومی موت بھی  
شروع ہو جائیگی۔ چنانچہ قرآن نے مثال میں یہودیوں کی تاریخ پیش کی  
ہے۔ جب تک یہودیوں میں اعتقاد و عملاً یہ جذبہ باقی رہا، حکومت  
و عزت انہی کیلیے تھی۔ جب چند گھڑیوں کے عیش و راحت کا عشق  
قومی زندگی و عزت کے دائمی عیش کی طلب پر غالب آگیا، اور اس چیز  
کو چھوڑ بیٹھے، تو ذلت و محکومی کا داغ ہر یہودی کی پیشانی پر لگ گیا،  
اور ہمیشہ کیلیے خوار و ذلیل ہو کر رہ گئے : ضربت علیہم الذلۃ والمسکنة  
و باؤا بغضب من اللہ !

سورہ نساء میں یہ تمام خصلتیں منافقوں کی قرار دی ہیں۔ اُنکا حال یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی رقت میں اسلام و کفر، دونوں سے ساز باز رکھتا چاہتے ہیں۔ یعنی وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی رہیں اور اسلام کے مخالفوں سے بھی رسم و راہ جاری رہے۔ مذبذبین بین ذالک - لا الیٰ ہا ارلہ، لا الیٰ ہا ارلہ ( ۴ : ۱۴۳ ) تو ایسے لوگوں کی نسبت فرمایا: یا ایہا الذین آمنوا لا تتخذوا الکافرن اریاء من دین المومنین - اتریدزن ان تجعلوا للہ علیکم سلطانا مبینا ؟ ان المنافقین فی الذک الاسفل من النار ( ۴ : ۱۴۳ )

اسلام تو ایک مسلمان کیلئے اسکو بھی جائز نہیں رکھتا کہ اگر اسکے ماں باپ، بھائی بہن، مسلمانوں سے لڑ رہے ہوں، تو اُنسے بھی کسی طرح کا واسطہ رکھے: لا تتخذوا اباکم و اخوانکم اریاء ان استعبروا الکفر علی الایمان و من یتولہم منکم فارلئک ہم الظالمون [ ۹ : ۲۳ ] اور جو مسلمان ایسے وقتوں میں معارب غیر مسلموں سے محبت و اعانت کا تعلق رکھیں، خواہ وہ اُنکے ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں، اُنکے مومن ہونے کی صاف صاف نفی کر رہا ہے: لا تجد قوما یومنون باللہ و الیوم الآخر، یوادرن من حاد اللہ و رسولہ و لو کانوا ابائہم ( ۵۸ : ۲۲ ) مہاجرین صحابہ نے اس حکم کی تصویر بنکر دنیا کو دکھلا دیا کہ ایمان کے معنی کیا ہیں ؟

پس اب فیصلہ کرلو کہ اُن لوگوں کا حکم کیا ہونا چاہیے جو ایسے وقتوں میں بھی معارب غیر مسلموں کے دیے ہوئے خطابوں سے پیدار کرینگے، اُن کے دیے ہوئے تمغوں کو ( جن میں سے اکثر اسلام فررشی ہی کے صلے میں ملے ہیں ) اپنے سینوں پر جگہ دینگے، اُنکی بارگاہوں میں جا کر اطاعت و تعبد کا سر جھکا ئینگے، اور آہ، ان سب سے بھی بڑھکر وہ، جو اُنکی راہوں میں غلاموں کی طرح بچھینگے، اُنکے حکموں پر کتوں کی طرح لڑتینگے، اُنکی خدمت و چاکری کے عشق میں اپنے دین و ایمان کے ایک ایک ذرے تک کو نثار کر دینگے ؟ فیا للہ و للمسلمین ! من ہذہ الفائرة التي ہی اعظم فواقہ الدین، و الرزۃ التي ما رزی بمثلہا سبیل المومنین !

لمثل هذا یذرب القلب من کمد

ان کان فی القلب اسلام و ایمان

مسلمانوں کی کسی حکومت یا آبادی پر حملہ کرے، یا اُس پر خود قابض ہو جانا چاہے، تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائیوں کی مدد کیلیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ جس طرح حملہ آوروں نے حملہ کیا ہے، یہ بھی کریں۔ قتل و جنگ کی جو جو چال رہ چلے ہیں، یہ بھی چلیں۔ البتہ یہ جائز نہیں کہ اس بارے میں رحم و عدل کے جو حدود شریعت نے باندھ دیے ہیں (مثلاً ضعیفوں، بوڑھوں، نہتوں، عورتوں، راہبوں، مذہبی عبادتگاہوں وغیرہ سے تعرض نہ کرنا) اُنسے قدم باہر نکالیں۔ پھر اُس حکم کی علت بھی بتلا دی کہ الفتنۃ اشد من القتل۔ بلاشبہ یہ جنگ قتل ہے اور انسانی قتل بہت بڑی برائی ہے، لیکن اس برائی سے بھی بڑھ کر برائی یہ ہے کہ لوگ اپنی آبادیوں اور حکومتوں پر قانع نہیں رہتے۔ دوسروں کے حقوق آزادی و حکومت چھیننا چاہتے ہیں۔ توحید کی جگہ کفر و شرک کے ماتحت مسلمانوں کو لانا چاہتے ہیں، قوموں کا قدرتی حق حریت پامال کر رہے ہیں۔ اگر اسکے دفع کا انتظام نہ کیا جائے، تو پھر دنیا میں کوئی قوم زندہ و باقی نہیں رہ سکتی۔ پس بڑی برائی کے دور کرنے کیلیے چھوٹی برائی اختیار کر لینا چاہیے۔ یہ خود نیچر کا عالمگیر قانون اور کارخانہ حیات کا دائمی عمل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا کبھی جنگ کا حکم نہ دیتا۔

سورہ محمد (ص) میں قرآن نے حکم قتال اور جواز جنگ کی اصلی علت بھی بتلا دی ہے :

حتیٰ تَضَعِ الْعَرْبَ لِرَتِّ رَہو، یہاں تک کہ لڑائی موقوف ارزا رہا۔ (۴۷ : ۶) ہو جائے۔

یعنی اسلام کا اصلی مقصد یہ ہے کہ دنیا میں عالمگیر صلح و امن قائم ہو جائے۔ ساری دنیا ایک قوم، اور تمام نوع انسانی ایک گھرانے کی طرح زندگی بسر کریں۔ لیکن جب تک جنگ کرنے والی ظالم و حریص قوتیں باقی ہیں، یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ پس پہلے مفسد و جابر قوتوں کا مقابلہ کرنا اور اُنکو فنا کر دینا ضروری ہوا۔ مضبوط اور مستقل امن اُسی وقت قائم ہوگا، جب پہلے امن کی خاطر اچھی طرح جنگ کر لی جائے :

حتیٰ اذا اِثْخَنْتُمُوہُمْ یہاں تک لڑو کہ جنگ آزما دشمن چور چور ہو جائیں۔ (۴۷ : ۵)

قاتلوں کا جب تک خون نہ بہایا جائیگا، مقتولوں کا خون بہنا بند نہ ہوگا :

اس واقعہ میں ہمارے لیے بڑی ہی عبرت ہے ۔ حاطب بن ابی بلتعہ مہاجرین و بدر یئین میں سے تھے ۔ انہوں نے صرف اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے خیال سے خط لکھا تھا ۔ لیکن اس پر بھی اللہ کی جانب سے یہ عتاب نازل ہوا ، اور حضرت عمر قتل کر دینے کیلئے آئے کہ یہ منافق ہے ۔ غور کرنا چاہیے کہ جب بارجود علاقہ قرابت ، مخالف و محارب فریق کے ساتھ اتنا تعلق بھی گوارا نہیں کیا گیا ، تو پھر اُن مسلمانوں کا شرعاً کیا حکم ہونا چاہیے جو بارجود برتشی گورنمنٹ کے محارب فریق ہونے کے ، ہر طرح کی محبت و موالات اور اعانت و نصرت کے تعلقات اُسکے ساتھ رکھتے ہیں ۔ اور جنکا اب تک یہ حال ہے کہ اُسکے درباروں کے دیے ہوئے بے سود خطابوں تک کو اپنے دین و ایمان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں ؟ علی الخصوص اُن مدعیان علم و تقدس کا حال قابل تماشا ہے جنکو اُنکی بارگاہوں سے ” شمس العلماء “ کے خطابات ملے ہیں ، اور جو اپنے نئی اسلام کی دینی ریاست کا ارلین حقدار اور مسلمانوں کی مذہبی پیشوائی کا سب سے زیادہ مستحق ظاہر کرتے ہیں ۔ یا سبحان اللہ ! مسلمانوں پر اُنکی قومی بدبختی کا اس سے بڑھکر اور کون سا رقت آ سکتا ہے ؟ جن لوگوں کو اسلام اور اسکی کتاب قطعاً منافق قرار دے رہی ہو ، اور جو اللہ کے نزدیک اسکے بھی حقدار نہیں کہ مسلمانوں کی صف میں جگہ پائیں ، اُنکو مسلمانوں کی دینی ریاست و پیشوائی کا دعویٰ ہے ، وہ مسلمانوں کی بڑی بڑی درسگاہوں کے مالک ہیں جہاں صبح شام انہی کتابوں کا درس دیا جاتا ہے جن میں یہ تمام احکام درج ہیں ، اور پھر اس سے بھی عجیب تر یہ کہ بہت سے مسلمان ہیں جو اُنکی پیشوائی کو جان و دل سے مان رہے ہیں ، اور اُنکے اُگے عقیدت و ارادت کا سر جھکا کر اللہ اور اُسکے رسول سے گردن موڑ رہے ہیں !

مدار روزگار سفلہ پرور را تماشا کن !

|                        |  |
|------------------------|--|
| الذین يتخذون الكافرين  | جو مسلمان ، مسلمانوں کو چہرہ کرانکے    |
| اولياء من دون المؤمنين | مخالف غیر مسلموں کو اپنا درست بنا      |
| ايبتغون عندهم العزة ؟  | رہے ہیں ، تو کیا وہ چاہتے ہیں کہ اُنکی |
| فان العزة لله جميعا !  | بارگاہوں سے عزت حاصل کریں ؟ اگر عزت    |
|                        | ہی کی طلب ہے تو یاد رکھیں کہ اصلی      |

( ۱۳۸ : ۴ )

اور سچی عزت دینے والے وہ نہیں ہیں ۔ ہر طرح کی عزتیں اللہ ہی کیلئے ہیں ، اور ایک مسلمان کو مِل سکتی ہیں تو اسی کی چوکھٹ سے ۔



ہے - یہی اساس شرع ہے - یہی ملاک اسلام ہے - یہی ایمان و نفاق کی اصلی کسوٹی ہے - یہی مومن کو منافق سے الگ کر دینے کیلئے اصلی پہچان ہے - نماز اسی سے ہے - روزہ اسی سے ہے - حج اسی سے ہے - زکوٰۃ کا سب سے پہلا اور افضل مصرف یہی ہے - سب اسکے لیے ملکتوی ہو جاسکتے ہیں - اسکو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جاسکتا - نماز دین کا ستون ہے اور روزہ برائیوں سے بچنے کی دھال ، لیکن یہ دین کی بنیاد ہے اور برائیوں کو معدوم کر دینے والی تلوار - پس اسکی فضیلت کو نہ نماز پہنچ سکتی ہے نہ روزہ - نہ اس سے بڑھکر کوئی دوسرا عمل ہے جو اللہ کی نظروں میں محبوب ہو اور کرنے والے کو اسکی دائمی محبوبیت سے سرفراز کر دے - ہزاروں نمازیں اور ہزاروں روزے بھی اُس ایک قطرہ خون کی فضیلت و تقدیس نہیں پا سکتے جو اس راہ میں بہایا گیا ، اور عمر بھر کی صدقات و خیرات بھی اُس ایک درہم کے اجر کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو اس راہ میں خرچ کیا گیا - حتیٰ کہ یہی عمل اسلام و ایمان کی اصلی پہچان قرار پایا - جس مسلمان کا دل اس کے ولولہ و طلب سے خالی ہوا ، وہ ایمان و اسلام کی روشنی سے محروم ہو گیا - نفاق کی ظلمت اُسپر چھا گئی - صحیح مسلم میں ہے :

مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزِرْ  
لَمْ يَحْدُثْ نَفْسَهُ بِهِ مَاتَ  
عَلَى شَعْبَةِ مَنْ النِّفَاقِ -  
( عن ابي هريره )  
جو مسلمان اس حالت میں دنیا سے گیا  
کہ نہ تو کبھی اللہ کی راہ میں لڑائی لڑی ،  
اور نہ اُسکے دل میں اس بات کی طلب  
رہی ، اُسکی موت ایسی حالت میں  
ہوئی جو نفاق کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے -

قرطبی نے اسکی شرح میں کہا ” فیہ دلیل علی رجوب العزم “ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جہاد کا عزم اور ارادہ ہر مسلمان پر واجب ہے - اسکے عزم اور طلب سے بھی اگر دل خالی ہو گیا تو وہ مومن نہیں ہے ، منافق ہے - اگر ہندوستان کے مسلمان چاہیں تو اس فرمان رسول کو سامنے رکھکر اپنے ایمان و نفاق کا فیصلہ کر لے سکتے ہیں !

ترمذی میں ہے - ایک مرتبہ صحابہ کی ایک جماعت میں اس بات کا چرچا ہوا ” اِیْ اَلْعَمَالِ اَحَبُّ اِلَیْ اللّٰهِ “ ؟ ساری نیکیوں اور عبادتوں میں

اسکے بعد مسلمانوں کیلئے بھی نہایت آسان ہو جائیگا کہ اپنا وقت بے سود  
شور و فغاں میں ضائع نہ کریں، اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام، ان دونوں  
میں سے کوئی ایک بات اپنے لیے پسند کر لیں۔

## فصل

( راہ عمل )

لیکن ہمارے لیے اصلی سوال اب یہ نہیں رہا ہے کہ گورنمنٹ کو کیا  
کرنا تھا؟ صرف یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

اس بارے میں راہ عمل مسلمانوں کیلئے ہمیشہ سے ایک ہی  
رہی ہے، اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے۔ میں نے ہمیشہ  
مسلمانوں کو اُسی کی طرف بلایا ہے، اور جب کبھی میری زبان بلانے کیلئے  
کھلیگی تو صرف اُسی کیلئے کھلیگی۔ یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی  
جماعتی زندگی کی اُس معصیت سے باز آجائیں جس میں ایک عرصہ سے مبتلا  
ہیں، اور جسکی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے انپر بند ہو گئے ہیں۔  
”جماعتی زندگی کی معصیت“ سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک  
”جماعت“ بنکر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔ وہ بالکل اُس گمے کی  
طرح ہیں جسکا اندرہ جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو۔  
وہ بسا اوقات یکجا اکٹھے ہو کر اپنی جماعتی قوت کی نمائش کرنا چاہتے  
ہیں۔ کمیٹیاں بناتے ہیں۔ کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ لیکن یہ تمام اجتماعی  
نمائشیں شریعت کی نظروں میں ”بہیز“ اور ”انبرہ“ کا حکم رکھتی ہیں۔  
”جماعت“ کا حکم نہیں رکھتیں۔ ”بہیز“ اور ”جماعت“ میں فرق ہے۔  
پہلی چیز بازاروں میں نظر آ جاتی ہے جب کوئی تماشہ ہو رہا ہو۔ دوسری  
چیز جمعہ کے دن مسجدوں میں دیکھی جا سکتی ہے جب ہزاروں انسانوں  
کی منظم و مرتب صفیں ایک مقصد، ایک جہت، ایک حالت، اور ایک  
ہی کے پیچھے مجتمع ہوتی ہیں۔

شریعت نے مسلمانوں کیلئے جہاں انفرادی زندگی کے اعمال مقرر  
کر دیے ہیں، وہاں اُنکے لیے ایک اجتماعی نظام بھی قرار دیدیا ہے۔

السم ترالی الملاء من بنی اسرائیل من بعد موسیٰ ؟  
 ان قالوا لنبی لهم " ابعث  
 لنا ملکا نقاتل فی سبیل  
 اللہ " قال " هل عسیتم  
 ان کتب علیکم القتال ان لا  
 تقاتلوا " قالوا " وما لنا  
 ان لا نقاتل فی سبیل اللہ  
 وقد اخرجنا من دیارنا  
 وابنائنا ؟ " فلما کتب علیهم  
 القتال ، تولوا الا قليلا منهم  
 واللہ علیهم بالظالمین -

( ۱۲۲ : ۲ )

کیا بنی اسرائیل کا حال نہیں دیکھتے  
 کہ موسیٰ کے بعد کیا ہوا ؟ پہلے تو خود ہی اپنے  
 عہد کے نبی سے درخواست کی " کسی کو  
 ہم پر پادشاہ بنادو کہ اُسکے ماتحت اللہ کی  
 راہ میں لڑیں " نبی نے کہا " اگرچہ تم ایسا  
 کہتے ہو لیکن امید نہیں کہ وقت پر پورے  
 آؤ۔ اگر تم کو لڑائی کا حکم دیا گیا تو  
 بزدلی دکھلا کے نافرمانی کر جاؤ گے "۔  
 ان لوگوں نے جواب دیا " نہیں ایسا نہیں  
 ہو سکتا - ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ حق کی  
 راہ میں ظالموں سے جنگ نہ کریں ؟ حالانکہ  
 انہوں نے ہم کو ارہماری اولاد کو ہمارے  
 شہروں سے نکال دیا ہے " لیکن دیکھو ، جب  
 لڑائی کا حکم دیا گیا تو بجز چند حق پرستوں کے سب اپنے قول و قرار سے  
 پھر گئے - وقت پر آنا دعا سچا ثابت نہ ہوا -

سنن ابو داؤد میں ہے " اذا ضن الناس بالدينار والدرهم و تبايعوا بالعين  
 واتبعوا اذئاب بقر " و تركوا الجهاد في سبيل الله ، انزل الله بهم بلاء ، فلم  
 يرفعه حتى يرجعوا " یعنی جب کوئی جماعت جہاد فی سبیل اللہ ترک  
 کر دیتی ہے تو اس پر بلائیں نازل ہوتی ہیں جو کبھی دور نہیں ہو سکتیں -  
 الا یہ کہ وہ اس معصیت سے باز آئیں -

چونکہ شریعت و ملت کے قیام کی اصلی بنیاد یہی چیز تھی ، اس لیے  
 ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے اس پر زور دیا گیا ، اور سارے عملوں اور  
 نیکیوں سے جو ایک مسلمان دنیا میں کر سکتا ہے ، اس عمل کا مرتبہ و اجر  
 افضل و اعلیٰ تھرایا - جس عمل میں جس قدر زیادہ ایثار و قربانی ہوگی ،  
 اتنا ہی زیادہ اُسکا اجر و ثواب بھی ہوگا - ظاہر ہے کہ اس عمل سے بڑھ کر اور  
 کس عمل میں مال و جان کا ایثار ہو سکتا ہے ؟

کوئی خاص وقت اور عہد اس کے لیے مخصوص نہیں - ہر حال اور ہر  
 زمانے میں ایک مسلم و مومن زندگی کے ایمان و صداقت کی بنیاد یہی  
 چیز اور اسی کا سچا عشق و ولولہ ہے - یہی سنام دین ہے - یہی عمام ملت

## (گورنمنٹ کیلئے اصلی سوال)

گورنمنٹ صرف اپنے فوائد و اغراض کو سامنے رکھ کر غور کرے کہ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو جو دنیا اور زندگی کی ساری چیزوں سے زیادہ اپنے مذہب کو محبوب رکھتے ہوں، ایک ایسی اٹل اور لا علاج کشمکش میں ڈال دینا بہتر ہوگا جس میں ایک طرف ان کے مذہبی احکام ہوں، دوسری طرف برٹش گورنمنٹ؟ اور دونوں باتیں اس طرح آپس میں لڑ جائیں کہ کسی طرح بھی جمع نہ ہو سکیں؟ اگر انسان کے ہاتھ اشارے کرے طوفانوں اور بجلیوں کو بلا سکتے ہیں، تو یقیناً برٹش گورنمنٹ اس وقت اس آدمی کی طرح سمندر کے کنارے کھڑی ہے جو اپنے ہاتھوں کو ہلا کر طوفانوں کو دعوت دے رہا ہو۔

فی الحقیقت یہ نہ تو کوئی الجھاؤ ہے نہ کوئی مشکل مسئلہ۔ بالکل صاف اور سیدھی سی بات ہے۔ بشرطیکہ حاکمانہ غرور اور طاقت کے نشہ میں چند لمحوں کیلئے عقل و انصاف کی گنجائش نکالی جاسکے۔ مسلمانوں کا مطالبہ شرعی احکام کا مطالبہ ہے۔ اسلام کے احکام کوئی راز نہیں ہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی ممکن نہ ہو۔ چھپی ہوئی کتابوں میں مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب و روز زیر درس و تدریس رہتے ہیں۔ پس گورنمنٹ کو چاہیے کہ صرف اس بات کی جانچ کر لے کہ واقعی اسلام کے شرعی احکام یہی ہیں یا نہیں؟ اگر ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے تو پھر صرف در ہی راہیں گورنمنٹ کے سامنے ہونی چاہئیں۔ یا مسلمانوں کیلئے ان کے مذہب کو چھوڑ دے، اور کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے ان کے مذہب میں مداخلت ہو اور وہ اپنے مذہبی احکام کی بنا پر برٹش گورنمنٹ کے خلاف ہو جانے پر مجبور ہو جائیں۔ یا اعلان کر دے کہ اسکو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی پروا نہیں ہے، نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہ ہو۔ اسکو صرف زیادہ سے زیادہ زمین چاہیے، زیادہ سے زیادہ حکومت چاہیے، مرسل کے تیل کے چشمے چاہئیں، عراق کی زرخیز زمین کی دولت چاہیے، اور اسلامی خلافت کا خاتمہ، تاکہ دنیا میں اسکا مشرقی حریف باقی نہ رہے۔ اگر ایسا کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کے مذہبی احکام باطل ہوتے ہیں تو ہوں۔ اگر انپر طرح طرح کے اشد فرائض عائد ہو جائے ہیں تو ہوا کریں۔ انکو ہر حال میں برٹش گورنمنٹ کا وفادار غلام بنا رکھنا چاہیے، اگرچہ اسکی خاطر اپنے مذہب سے بھی دست بردار ہو جانا پڑے۔

کی ایک صبح یا شام تمام دنیا اور اُسکی نعمتوں سے بہتر ہے اور اُن ساری چیزوں سے افضل ہے جن پر سورج نکلتا اور ڈوبتا ہے !

بخاری میں در حدیثیں ہیں ” ما من عبد یموت له عند الله خیر یمسره ان یرجع الی الدنیا و ان له الدنیا و ما فیها “ الا الشہید - لما یری من فضل الشہادة فانه یمسره ان یرجع الی الدنیا فیقفل مرة أخرى “ اور روایت انس ” ما احد یدخل الجنة یحب ان یرجع الی الدنیا و له ما علی الارض من شیء “ الا الشہید “ یتمنی ان یرجع الی الدنیا فیقفل عشر مرات لما یری من الکرامة “ حاصل دونوں کا یہ ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں آنے کی کسی کو آرزو نہیں ہو سکتی مگر اُس کو جو اللہ کی راہ میں شہید ہوا - جب وہ شہادت کا اجر و ثواب دیکھتا ہے تو تمنا کرتا ہے - کاش پھر دنیا میں جاسکوں اور دس مرتبہ اسی طرح اللہ کی راہ میں مارا جاؤں - اور ہر مرتبہ شہادت کی عزت و کرامت حاصل کروں !

حد ہو گئی کہ جن لوگوں نے جنگ بدر میں جاں نثاریاں کی تھیں ، اگر کبھی ان سے کوئی لغزش ہوئی اور معصیت میں مبتلا ہو گئے ، تو آپ نے سزا دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا ” لعل الله اطلع علی اهل بدر فقال اعملوا ما شئتم “ یہ وہ جاں نثار حق ہیں جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی ہے - عجب نہیں کہ اس ایک عمل کے صلہ میں اللہ نے انکی ساری پچھلی اور آئندہ خطائیں بخشدی ہوں اور کھدیا ہو کہ جو جی میں آئے کرو !

طبرانی نے عمـران بن حصین سے روایت کی ہے کہ جب شام کے رومیوں کی طیاریوں کی خبر پہنچی تو مدینہ میں مسلمانوں کی حالت نہایت نازک اور کمزور تھی - کسی طرح کا ساز و سامان میسر نہ تھا - حضرة عثمان نے یہ حال دیکھا تو اپنا پورا تجارتی قافلہ آنحضرة کی خدمت میں پیش کر دیا جو شام جانے کیلئے طیار ہوا تھا - اسمیں در سو اونت مال و اسباب سے لدے ہوئے تھے ، اور در سو ارقیہ سونا تھا - آنحضرة نے فرمایا ” لا یضر عثمان ما عمل بعدھا “ آج کے دن کے بعد سے عثمان خواہ کچھ ہی کرے لیکن کوئی عمل اسکو نقصان نہیں پہنچا سکتا - ( اخرجہ الترمذی و العاکم ایضاً من حدیث عبد الرحمن بن حباب نحرہ )

سبحان اللہ اس عمل عظیم کی برکت و بخشش ! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عمل دفاع کیلئے اپنا مال و متاع قربان کرنا خدا و رسول کی



یہ وقت فصل کاٹنے کا تھا ، نہ کہ دانہ ڈالنے کا ۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے

جد و جہد کی تمام گذشتہ زندگی گم گشتگی رہے حاصلی میں ضائع کر دی ۔  
حتیٰ کہ سچ مچ وہ وقت آ گیا جسکی تباہیوں کا تخیل پیدا کرے کبھی

ڈرانے والے ڈرایا کرتے تھے : فقد جاء اشراطها ۔ فانی لہم اذجا لثہم ذکراہم ؟  
(۲۱ : ۴۷) اب بھی اگر کام ہے تو یہی کام ہے اور غم ہونا چاہیے تو اسی کا ۔  
سچے کام کے کرنے میں کتنی ہی دیر ہو جائے ، مگر جب کبھی کیا جائے ،  
سچائی ہے ۔ اسکے لیے نہ تو کوئی وقت نا موافق ہے نہ کوئی جگہ مخالف ۔  
اسکے کرنے میں جسقدر دیر کی جائیگی ، مصیبت اور ہلاکی ہے ۔ لیکن  
جب کبھی بھی کر دیا جائے ، سچائی اور نیکی ہے ، اور اسکا ثمرہ زندگی  
اور کامرانی ۔ تمہاری سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ خاص خاص وقتوں  
میں خاص خاص کاموں کا نام سن پاتے ہو ، اور پھر چیخنے چلانے لگتے ہو ،  
اور جس طرح اونگھتا ہوا آدمی ایک مرتبہ چونک اُٹھتا ہے ، یکایک اعتقاد  
اور عمل ، دہروں تمہیں یاد آ جاتے ہیں ۔ حالانکہ نہ تو خاص خاص وقتوں  
ہی میں تمہاری مصیبت وجود میں آتی ہے ۔ نہ کامیابی کی راہ کسی  
خاص کام کے پتہ جانے پر موقوف ہے ۔ تمہاری مصیبت دائمی ، تمہارا ماتم  
ہمیشگی کا ، تمہارا رگ تمہاری ہڈیوں کے اندر سمایا ہوا اور چوبیس  
گھنٹے تمہارے ساتھ ہے ۔ اور ٹھیک اُسی کی طرح تمہاری کامیابی و خوشحالی  
بھی ہر وقت تمہارے سایے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی ہے ۔ تم وقت پر سامنے  
آ جانے والی چیزوں کی فکر نہ کر ، بلکہ اپنا ہمیشہ کا معاملہ ایک مرتبہ  
درست کرلو ۔ جب تک دل و جگر کا علاج نہ ہوگا ، روز نئے نئے رگ لگتے رہینگے ۔  
خلافت کا مسئلہ کل سے سامنے آیا ہے ، مگر تمہاری بربادی کا مسئلہ کل ہی سے  
نہیں شروع ہوا ۔ پس نادانوں ! تمہارا اصلی کام کوئی خاص مسئلہ اور  
کوئی خاص تحریک نہیں ہے ۔ ہمیشہ سے اور ہمیشہ کیلئے صرف یہی ہے  
کہ ” ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمان بننا چاہیے “ اور قوم و فرد ، دونوں  
اعتباروں سے ٹھیک ٹھیک اسلامی زندگی اختیار کر لینی چاہیے “ اس  
ایک کام کے انجام دینے پر سارے کام خود بخود انجام پا جائینگے ۔  
صرف نظر بندوں کے استقبال میں گرد و خاک نہ اُڑاتے رہو ۔ غفلت کے  
بنسوا اپنے ایمان کے سراغ میں نکلو کہ اس نے کیوں تم کو ہمیشہ کیلئے  
چھوڑ دیا ہے ؟

سب سے زیادہ کونسا عمل اللہ کے نزدیک محبوب و مقبول ہے ؟ اس پر سورہ صف نازل ہوئی ( ۱ )

ان الله يحب الذين يقاتلون  
في سبيله صفا كانهم  
بنيدان مرصوص !  
اللہ تعالیٰ تو اُن لوگوں کو محبوب رکھتا  
ہے جو اُسکی راہ میں صف باندھ کر اس  
استقامت اور جماؤ سے لڑتے ہیں، گویا ایک  
دیوار ہے جو تلواروں کے سامنے کھڑی کر دی گئی ہے، اور دیوار بھی کیسی ؟  
ایسی جسکی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سیسہ ڈال کر جوڑ دی گئی ہو !

پھر اسی سورہ میں آگے چل کر فرمایا - یہی وہ عمل ہے جسکے کرنے کے  
بعد تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں - کوئی خطا، کوئی معصیت، کوئی برائی  
باقی نہیں رہتی - ابدی نجات کا دروازہ ہمیشہ کیلئے کھل جاتا ہے :

يا ايها الذين آمنوا ! هل ادلكم على تجارة تنجيكم من عذاب اليم ؟ تؤمنون  
بالله ورسوله ؟ وجاهدون في سبيل الله باموالكم و انفسكم ، ذلكم خير لكم  
ان كنتم تعلمون - يغفر لكم ذنوبكم ، ويدخلكم جنات تجري من تحتها الانهار  
و مساكن طيبة في جنات عدن - ذلك الفوز العظيم !

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے - آنحضرت سے سوال  
کیا گیا - ” ای العمل افضل “ ؟ کونسا عمل سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے ؟  
فرمایا ” ایمان باللہ و رسولہ “ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا - پوچھا  
” ثم ما ذا “ ؟ اس کے بعد ؟ - فرمایا ” الجهاد فی سبیل اللہ “ - اللہ کی  
راہ میں جہاد !

بخاری میں ابوسعید خدری سے ہے ” قيل اي الناس افضل ؟ فقال  
مومن يجاهد في سبيل الله بنفسه و ماله “ آپ سے پوچھا گیا - سب سے زیادہ  
افضل آدمی کون ہے ؟ فرمایا وہ مومن جو اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال  
سے جہاد کرتا ہے -

اور فرمایا ” لغدرة في سبيل الله أو راحة خير من الدنيا و ما فيها “ اور  
” خير مما تطلع عليه الشمس و تغرب “ ( بخاری ) جہاد فی سبیل اللہ

( ۱ ) و اخرجه ايضا امام احمد عن عبد الله بن سلام ، و ابن ابي حاتم  
و ابن حبان ، و الحاكم و قال صحيح على شرط الصحيحين ، و البيهقي في  
شعب الايمان و السنن ، و الطبري في التفسير -

کہتی ہے کہ زندگی اجتماع کا نام ہے ۔ افراد و اشخاص کوئی شے نہیں ۔ جب کوئی قوم اس نظام کو ترک کر دیتی ہے تو گو اس کے افراد فرداً فرداً کتنے ہی شخصی اعمال و طاعات میں سرگرم ہوں ، لیکن یہ سرگرمیاں اس بارے میں کچھ سود مند نہیں ہوسکتیں ، اور قوم جماعتی معصیت میں مبتلا ہو جاتی ہے ۔ قرآن و سنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے ۔ اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے ۔ لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم ( یعنی نظام جماعتی کا نہرنا ) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم تباہ ہو جاتی ہے ۔

شخصی اعمال کی اصلاح و درستگی بھی نظام اجتماعی کے قیام پر موقوف ہے ۔ مسلمانان ہند جماعتی زندگی کی معصیت میں مبتلا ہیں ۔ اور جب جماعتی معصیت سب پر چھا گئی ہے تو افراد کی اصلاح کیونکر ہوسکتی ہے ؟

کتاب و سنت نے جماعتی زندگی کے تین رکن بتلائے ہیں :

تمام لوگ کسی ایک صاحب علم و عمل مسلمان پر جمع ہوجائیں ۔

وہ جو کچھ تعلیم دے ، ایمان و صداقت کے ساتھ قبول کریں ۔

قرآن و سنت کے ماتحت اس کے جو کچھ احکام ہوں ، انکی بلا چون و چرا

تعمیل و اطاعت کریں ۔

سب کی زبانیں گونکی ہوں ۔ صرف اسی کی زبان گویا ہو ۔ سب کے دماغ بیکار ہوجائیں ۔ صرف اسی کا دماغ کارفرما ہو ۔ لوگوں کے پاس نہ زبان ہو نہ دماغ ۔ صرف دل ہو جو قبول کرے ، صرف ہاتھ پاؤں ہوں جو عمل کریں !

اگر ایسا نہیں ہے ، تو ایک بھیڑ ہے ، ایک انبوہ ہے ، جانوروں کا ایک جنگل ہے ، کنکر پتھر کا ایک ڈھیر ہے ، مگر نہ تو ”جماعت“ ہے نہ ”امت“ ۔ نہ ”قوم“ نہ ”اجتماع“ ۔ اینٹیں ہیں مگر دیوار نہیں ۔ کنگر ہیں مگر پہاڑ نہیں ۔ قطرے ہیں مگر دریا نہیں ۔ کڑیاں ہیں جو ٹکرے ٹکرے کر دی جاسکتی ہیں ، مگر زنجیر نہیں ہے جو بڑے بڑے جہازوں کو گرفتار کر لے سکتی ہے ۔

بخاری و مسلم میں ہے - تین مرتبہ آپ سے پوچھا گیا - ” ما يعدل الجہاد فی سبیل اللہ ؟ “ کونسا کام ہے جو جہاد کے برابر درجہ و فضیلت رکھتا ہو ؟ تینوں مرتبہ فرمایا ” لا تستطیعونہ “ تم اسکی طاقت نہیں رکھتے - یعنی کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو جہاد کے برابر درجہ رکھتا ہو اور تم کرسکو - پھر فرمایا ” مثل المجاہد کمثل الصائم القائم القانت بایات اللہ لا یفتقر عن صلاتہ و لا صیامہ حتی یرجع “

اور فرمایا ” من اغبرت قد ماہ فی سبیل اللہ ساعة من نہار ، فہما حرام علی النار “ ( رواہ احمد ) جس کے پاؤں اللہ کی راہ میں ایک گھنٹہ کیلیے بھی گرد آلود ہوے ، دوزخ کی آگ اُن قدموں پر حرام ہے -

امام بخاری نے اسی حدیث کو یوں روایت کیا ہے ” ما اغبرت ( و فی رواۃ المستملی ” اغبرتا “ بالتثنیہ ) قد ما عبد فی سبیل اللہ فتمسہ النار “ ایسا نہیں ہو سکتا کہ جس بندے کے پاؤں جہاد کی راہ میں غبار آلود ہوے ہوں ، اُن کو جہنم کی آگ بھی چھو سکے - حافظ عسقلانی اس کی شرح میں لکھتے ہیں - اس حدیث سے جہاد فی سبیل اللہ کی عظمت و فضیلت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے - جب صرف غبار راہ سے قدموں کا آلودہ ہونا اتنا بڑا اجر رکھتا ہے کہ جہنم کی آگ اُن پر حرام نہوجاتی ہے ، تو جو خوش نصیب جہاد و دفاع میں کمال سعی و تدبیر کرے اور اپنی جان اور مال کو اس کے لیے وقف کر دے ، اس کے اجر و ثواب کا کیا حال ہوگا ؟ اور کون ہے جو اس کا اندازہ لگا سکتا ہے ؟ واللہ یضاعف لمن یشاء -

اور فرمایا ” ما من میت یموت الا ختم عملہ “ الا من مات مرابطا فی سبیل اللہ ، فانہ ینمر لہ عملہ الی یوم القیامۃ و امن من فتنۃ القبر “ ( رواہ اصحاب السنن ) کوئی ایسی موت نہیں جسکے ساتھ اعمال کا سلسلہ بھی ختم نہ ہو جاتا ہو ، الا وہ شخص کہ جہاد کی راہ میں دشمن کے حملے کا انتظار کرتا ہوا دنیا سے گیا - سو اسکا عمل ایسا ہے جو مرنے کے بعد بھی قیامت تک بڑھتا رہیگا -

یعنی عمل جہاد بھی حسنات جاریہ میں سے ہے - حسنات جاریہ بموجب نص حدیث مسلم تین ہیں - ارلان صالح ، علم نافع ، ارقاف و تعمیرات خیرہ - مثلاً مساجد و مدارس وغیرہ جو بعد کو باقی رہیں - اس حدیث اور اسکی ہم معنی احادیث سے معلوم ہوا کہ جہاد کا ہر کام بھی اسی قسم میں داخل

نہیں ہیں ' تو اس سے زیادہ کوئی خطرناک اور مہلک چیز بھی نہیں  
 ہوسکتی - کاش وہ نہ ہوتی - وہ تین کو منزل مقصود پر پہنچاتی ہے ' مگر  
 انجنوں کو ٹکرا کر ہزاروں انسانوں کو ہلاک بھی کر دیتی ہے !

” جذبات “ اسی وقت کام دے سکتے ہیں ' جب انکو مرتب کرنے اور  
 انپر حکم و قضاء کیلئے ” ادراک “ اور ” دماغ “ بھی موجود ہو -  
 وذلک من عمل النبوة ' ولكن لا یعقلها الا العالمون -

بہر حال اسوقت ' اور ہمیشہ سے ' اور ہمیشہ کیلئے ' ” راہ عمل “  
 یہی ہے کہ مسلمان سب سے پہلے اسلام کی جماعتی زندگی اختیار کر لیں -  
 اسی پر مسئلہ خلافت اسلامی کے بھی تمام مہمات و اعمال موقوف ہیں -

( آل انڈیا خلافت کمیٹی اور فراہمی زراعت )

تمام مسلمانوں کو اُن ہمدردان ملت کا شکر گزار ہونا چاہیے جنہوں نے  
 آل انڈیا خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی اور تمام ملک میں اسکی شاخوں  
 کے قیام کا سر سامان کیا - اس کمیٹی کا قیام وقت کا صحیح اور مفید  
 کام ہے بشرطیکہ پوری مستعدی کے ساتھ ایک کثیر طاقتور فنڈ کی فراہمی  
 میں مسلمان اسکا ساتھ دیں - ہر حال میں پہلی اور ناگزیر منزل مال کی  
 پیش آتی ہے - روپیہ کی ایک بڑی مقدار بجائے خود کام اور طاقت ہے -  
 خلافت کمیٹی کو تبلیغ و اشاعت کا وسیلہ اور فنڈ کی فراہمی کا  
 نظام سمجھنا چاہیے ' اور اسکا کام پوری مستعدی اور سرگرمی سے جاری  
 رہنا چاہیے - ہندوستان کا کوئی گوشہ ' کوئی آبادی ' کوئی گاؤں ' خلافت  
 کمیٹی سے خالی نہ رہے - نہ کوئی مسلمان ایسا باقی رہے جو ہندوستان  
 میں بسا ہوا اور خلافت فنڈ کیلئے اس سے چندہ نہ مانگا گیا ہو -

تم نے غور سے سنا یا نہیں ؟ میں نے کیا کہا ؟ میں نے کہا ” چندہ  
 نہ مانگا گیا ہو “ - یہ نہیں کہا کہ ” چندہ دیا ہو “ - یعنی اگر تم ہزار  
 طرح کی فکروں اور نئی نئی تجویزوں اور سوالوں سے بالکل خالی  
 الذہن ہو کر مہینے در مہینے کے اندر صرف یہی دو کام انجام دیدو - ایک  
 زمین کا - دوسرا انسانوں کا - زمین کا یہ کہ کوئی گوشہ خلافت کمیٹی کے رجوع  
 سے خالی نہ رہے - انسانوں کا یہ کہ کسی مسلمان فرد کے کان طلب اعانت  
 کے سوال سے نا آشنا نہ رہجائیں ' تو یاد رکھو کہ بجائے خود یہ ایک بڑا سے  
 بڑا کام ہوگا جو تم ہندوستان میں انجام دے سکتے ہو



نظروں میں ایسا محبوب و محترم کام ہے جسکے بعد کوئی برائی بھی صاحب عمل کو نقصان نہیں پہنچا سکتی - کسی عمل کسی طاعت کسی عبادت کو بھی یہ فضیلت نصیب نہ ہوئی !

ترمذی میں ہے ” من رابط ليلة في سبيل الله “ کانت له كالف ليلة صيامها و قيامها “ جس مسلمان نے ایک رات بھی جہاد کرتے ہوئے دشمن کے انتظار میں کٹی اسکے لیے ایسا اجر ہے گویا ہزار دنوں کا روزہ اور ہزار راتوں کی عبادت !

اور فرمایا ” مقام احدکم في سبيل الله خير من عبادة احد کم فی اہلہ ستین سنة “ (ترمذی) ساٹھ برس تک اپنے گھر میں عبادت کرنے سے بھی یہ افضل ہے کہ جہاد کے میدان میں کھڑے نظر آؤ -

اور فرمایا ” حرس ليلة في سبيل الله “ افضل له من الف ليلة “ یقام لیلہا و یصام نہارہا “ ( رواہ احمد ) جہاد کی ایک رات اس سے افضل ہے کہ ہزار راتیں عبادت میں اور ہزار دن روزہ میں بسر کیے جائیں !

اور فرمایا ” حرمت النار علی عین دمعہ من خشية الله “ و حرمت النار علی عین سہرت فی سبيل الله “ ( ایضاً ) جو آنکھ اللہ کے خوف سے اشکبار ہوئی یا جہاد میں کام کرتے ہوئے جاگی اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے !

ایک شخص نے پوچھا - یا رسول اللہ ! کوئی ایسا عمل بتلا دیجیے کہ مجاہدین کا ثواب حاصل ہو - فرمایا ” هل تستطيع ان تصلی فلا تفتر “ و تصوم فلا تفطر ؟ اسکی طاقت رکھتے ہو کہ برابر نماز پڑھتے رہو اور قضا نہو برابر روزہ رکھتے رہو اور کبھی بیچ میں افطار نہ کرر ؟ عرض کیا ” انا اضعف من ان استطیع ذلک “ یہ تو میری طاقت سے باہر ہے - فرمایا ” فوالذي نفسي بيده ! لو طوقت ذلک “ ما بلغت فضل المجاہدين في سبيل الله - اما علمت ان فرس المجاہد لیستن في طوله فيكتب له بذلك الحسنات ؟ “ خدا کی قسم ! اگر تم ایسا کرنے کی طاقت بھی رکھتے اور کر دکھاتے جب بھی اُن لوگوں کی فضیلت کہاں پاسکتے تھے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں ؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مجاہد کا گھوڑا لگام میں اچھلتا ہے تو اسکے لیے بھی اسکے نامہ اعمال میں نیکیاں درج ہوتی رہتی ہیں ؟ ( رواہ احمد ) و ایضاً رواہ البخاری باختلاف یسیر )

درازمی شب ریسناری من این همه هست  
ز بخت من خبر آرید تا کجا خفتست

اسی مسئلہ خلافت کو دیکھو! شرعی اور سیاسی دونوں پہلوؤں سے کس قدر اہم اور نازک معاملہ ہے؟ اگر آج مسلمانوں میں انکے ائمہ و مشاہیر موجود ہوتے، تو انہیں سے بھی ہر شخص زبان نہ کھولتا، کسی ایک صاحب نظر و عمل کے احکام پر سب کار بند ہو جاتے۔ لیکن اسکے مقابلہ میں آج تمہارا کیا حال ہو رہا ہے؟ کمیٹیوں اور تجویزوں کی عادت برسوں سے پڑی ہوئی ہے۔ اسی قینچی سے اس پہاڑ کو بھی کترنا چاہتے ہو۔ ہر زبان تجویزیں پیش کر رہی ہے۔ ہر قلم امام و مجتہد کی طرح احکام نافذ کر رہا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے۔ کوئی دھنہ بلاتا ہے۔ کوئی بائیں۔ کیا اس طوائف الملوکی اور ذہنی انارکی کے ساتھ جو عالم فکر و نظر کا ایک پورا پورا غدر ہے، یہ مہم سر ہو سکتی ہے؟

شرعی پہلو سے مسئلہ کا یہ حال، کہ ایک صاحب نظر و اجتہاد دماغ کی ضرورت ہے جس کا قلب کتاب و سنۃ کے معارف و غوامض سے معمور ہو۔ وہ اصول شرعیہ کو مسلمانان ہند کی موجودہ حالت پر، انکے توطن ہند کی حدیث العہد نوعیت پر، ایک ایک لمحہ کے اندر متغیر ہو جانے والے حوادث جنگ و صلح پر، تھیک تھیک منطبق کرے، اور پھر تمام مصالح و مقاصد شرعیہ و ملیہ کے تحفظ و توازن کے بعد فتویٰ شرع صادر کرتا رہے۔ نہ ہر عالم اسکا اہل ہے۔ نہ ہر مدرسہ نشین اس کا اسرار شناس۔

سیاسی پہلو سے دیکھا جائے تو جو کام فوجوں اور حکومتوں کی طاقت سے انجام پاسکتا ہے، اسکو تم صرف اپنی جماعتی قوت کے استعمال سے حاصل کرنا چاہتے ہو۔ پھر کس قدر نامرادی ہے کہ وہ قوت بھی ناپید؟

بلاشبہ لوگوں میں احساس اور طلب کی کمی نہیں۔ نہ جوش و سرگرمی کی کمی ہے، اور یہ بڑی ہی قیمتی چیز ہے۔ لیکن اگر صحیح راہ عمل اختیار نہ کی گئی تو یہی بات سب سے زیادہ مضر بھی ہو جاسکتی ہے۔ جذبات کی مثال اسٹیم کی سی ہے۔ بغیر اسٹیم کے کچھ نہیں ہو سکتا، لیکن وہ بھی بغیر مشین اور سائق (ڈرائیور) کے کچھ نہیں کر سکتی۔ مشین اسکی طاقت کو ترتیب دیتا، اور ڈرائیور اس سے کام لیتا ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں

خدمت انجام دیں، تو اگرچہ وہ مجاہدین کا اجر و ثواب نہیں پا سکتے، لیکن اُن کے لیے بھی اجر ہے اور ساری عبادتوں اور طاعتوں سے بڑھکر اجر ہے۔

ابن ماجہ میں ہے ”من ارسل بنفقة فی سبیل اللہ و اقام فی بیتہ، فلہ بکل درہم سبع مائۃ درہم“ و من غزا بنفسہ فی سبیل اللہ و أنفق فی وجہہ ذلک، فلہ بکل درہم سبع مائۃ الف درہم۔ ثم تلاہ—ذہ الایہ۔ و اللہ یضاعف لمن یشاء“ یعنی جو مسلمان ایسے رقتوں میں گھر سے نہ نکلا، صرف اپنے روپیہ سے جہاد میں مدد دی، تو اسکو ہر ایک روپیہ کے بدلے سات سو روپیوں کا اجر ملیگا۔ یعنی اس اتفاق میں سات سو درجہ زیادہ اجر ہے۔ اور جس نے روپیہ بھی لگایا اور خود بھی شریک کار ہوا، تو اسکے لیے سات ہزار درجہ زیادہ اجر ہے۔ پھر اپنے یہ آیت پڑھی ”اللہ جس کسی کا اجر و ثواب چاہتا ہے دوگنا کر دیتا ہے“

اور امام بخاری نے باب باندھا ہے ”فضل من جہز غازیاً“ اسمیں زید بن خالد کی حدیث لائے ہیں ”من جہز غازیاً فی سبیل اللہ فقد غزا و من خلف غازیاً فی سبیل اللہ بخیر فقد غزا“ یعنی جس شخص نے مجاہد و غازی کے سامان کا انتظام کر دیا تو گویا اُس نے مخد جہاد کیا۔ اور جس نے اُسکے پیچھے اُسکے کاموں کی دیکھ بھال کی تو اسکے لیے بھی ایسا ہی اجر ہے!

اسلام نے حقوق العباد پر جسقدر زور دیا ہے، معلوم ہے۔ علی الخصوص والدین اور اقرباء کے حقوق کہ ساری نیکیوں اور ہر طرح کی عبادتوں سے مقدم ٹھہرائے گئے۔ لیکن صرف یہی وہ عمل عظیم ہے جسکے لیے یہ حقوق بھی روک نہیں ہو سکتے۔ اہمیت اور شریعت کی حفاظت ہی پر تمام افراد کی حفاظت موقوف ہے۔ پس اگر امت دشمنوں کے نرغہ میں ہے، تو نیکی کا سب سے بڑا کام جو زمین پر ہو سکتا ہے مسلمانوں کے سامنے آ گیا۔ اب اس بڑے کام کے لیے سارے چھوٹے کام چھوڑ دینے چاہئیں۔ ماں، باپ، بھائی، بہن، بیوی، بچے، رشتے ناتے، اپنی اپنی جگہ سب حق ہیں۔ سب کا حق ادا کرنا چاہیے۔ لیکن خدا اور اسکی سچائی کا حق سب سے بڑا حق ہے۔ اُسکے رشتہ کے سامنے سارے رشتے ہیچ ہیں۔ پس اگر اُسکے کام کا وقت آ گیا تو سب کو اُسکی خاطر چھوڑ دینا پڑیگا:

( اتبعون ' اهدکم سبیل الرشاد )

عزیزان ملت ! اس طول طویل صحبت میں جسقدر باتیں میں نے تم سے کہی ہیں، ان میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو میری زبان پر نئی ہو۔ بلکہ یہ تمام وہی باتیں ہیں جو پچھلے دس سالوں سے برابر کہتا رہا ہوں، اور اگر الہلال و البلاغ کی پیہم صدائیں تمہارے حافظہ میں فراموش نہیں ہوگئی ہیں، تو تم اسکی تصدیق کرسکتے ہو۔ تمہارے رہبروں اور پیشواؤں کی رائیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں، لیکن میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا، اور صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر بلا رہا اور لوت لوت کر پکار رہا ہے۔ ولکن لا

تعبون الناصحین ( ۷ : ۲۸ ) مگر افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ تم نمائش کے پجاری، شور و ہنگامہ کے بندے، اور وقتی جذبات و انفجار ہیجان کی مخلوق ہو۔ تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر۔ نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو۔ تم جسقدر تیز درز کر آتے ہو، اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی کر جاتے ہو۔ تمہاری اطاعت جسقدر سہل ہے اور تمہاری ارادت جتنی سستی، اگٹاھی تمہاری انحراف آسان ہے، اور اُسی نسبت سے تمہاری مخالفت بھی آسان ہے۔ پس نہ تو تمہاری تحسین کی کوئی قیمت، نہ تمہاری توحین کا کوئی رزن۔ نہ تمہارے پاس دماغ ہے نہ دل۔ و سارس ہیں جنکو تم افکار سمجھتے ہو۔ خطرات ہیں جنکو تم عزائم کہتے ہو۔ خدا را بتلاؤ! میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آج جن باتوں کیلئے تم رو رہے ہو، یہ وہی باتیں ہیں جو ایک زمانے میں میری زبان سے فریاد کا اضطراب اور طلب کی چیخ بنکر نکلتی تھیں، مگر تمہارے سینے کے اندر پتھر کا ایک ٹکرہ ہے، اس سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آ جاتی تھیں، اور تم یقیناً انکار و اعراض میں غرق تھے؟

تم نے ہمیشہ اعراض کیا۔ تم نے اعراض ہی نہیں کیا، بلکہ

جعلوا اصابعهم فی اذانہم ' و استغشوا ثیابہم ' و اصروا ' و استکبروا استکبارا [ ۷ : ۷۱ ] کی ساری سنتیں غفلت و انکار کی تازہ کردیں۔ میں نے تم میں سے ہر گروہ کو ٹٹولا۔ میں نے دلوں اور زہروں کا ایک ایک گوشہ



ہے۔ علت اسکی بالکل واضح ہے۔ عمل جہاد کی بنیاد ہی یہ ہے کہ اپنے بعد کے زمانے اور آنے والی نسلوں کی حفاظت و سعادت کیلئے اپنا وجود قربان کر دیا جائے۔ پس کوئی عمل نہیں جو اس سے زیادہ سچی اور بے لاگ انسانی خدمت اور نوع پرستی کے جذبات رکھتا ہو۔ اور اسی لیے ضروری ہوا کہ اسکا اجر بھی وقتی نہ ہو، دائمی ہو۔ عمل کا اجر تو عمل کے نتائج پر موقوف ہے۔ جب نتائج بعد کے زمانوں اور نسلوں کو ملینگے، تو صاحب عمل کا اجر بھی فوراً کیوں منقطع ہو جائے؟

اس حدیث میں ”مرابطاً فی سبیل اللہ“ کا لفظ آیا ہے۔ اور دوسری حدیثوں میں بھی ”رباط“ کا لفظ وارد ہے۔ ”رباط“ سے مقصود یہ ہے کہ کسی مقام میں ٹھہر کر دشمن کے حملہ کا انتظار کرنا۔ تاکہ جب دشمن آجائے تو اللہ کی راہ میں مقابلہ کیا جائے۔ نہایہ میں ہے ”ہو الاقامة فی مکان یتوقع هجوم العدو فیہ لقصد دفعه لله“ پس ”مرابطاً فی سبیل اللہ“ کا مطلب یہ ہوا کہ اگر لڑکر شہید ہونے کا موقعہ نہیں ملا، اور حملہ کے انتظار ہی میں موت آگئی، جب بھی اسکا اجر مرنے کے بعد برابر بڑھتا رہیگا۔ اور وہ ہزار دنوں کے روزے و نماز سے بھی افضل ہے! اسی بنا پر امام بخاری و امام نواری وغیرہما نے فضل الرباط فی سبیل اللہ کا باب باندھا ہے۔

قرآن بھی ہر جگہ اور بار بار یہی کہتا ہے :

|                               |  |
|-------------------------------|--|
| الذین آمنوا و ہاجرنا و جاهدنا | جو لوگ ایمان لائے، حق کی راہ میں       |
| فی سبیل اللہ باموالہم         | اپنا گھر بار چھوڑا، اپنی جان و مال سے  |
| وانفسہم، اعظم درجۃ عند اللہ   | جہاد کیا، سو اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ |
| وارلاک ہم الفائزون۔           | اور اونچا درجہ انہی کا ہے۔ یہی لوگ     |
| یبشر ہم ربہم برحمة منہ۔       | ہیں کہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہونگے۔ |
| ورضوان و جذات لهم فیہا نعیم   | اللہ کی طرف سے انکے لیے بشارت ہے۔      |
| مقیم۔ خالـدین فیہا ابدًا۔     | اسکی رحمت، اسکی محبت، بہشتی            |
| ان اللہ عنـدہ اجر عظیم!       | زندگی کی نعمتیں، اور انکی دائمی اور    |
| ( ۲۳ : ۹ )                    | ہمیشگی، سب کچھ انہی کیلئے ہے۔          |

جو لوگ خود اپنی ذات سے جہاد و دفاع میں حصہ نہ لے سکیں مگر مجاہدین کو اپنے مال و متاع سے مدد پہنچائیں، یا اور کسی طرح کی



جو لوگ ایثار و قربانی کی بڑی بڑی مہموں کا دعوا کیا کرتے ہیں ، انکو سب سے پہلے مالی قربانی کی ابتدائی اور سہل ترین منزل سے گزر جانا چاہیے ۔ اگر وہ روپیہ بھی نہیں دے سکتے اور اسکی فراہمی کی زحمت بھی انسے جھیلی نہیں جا سکتی ، تو پھر خراہ کتنے ہی بڑی بڑی اور پرچش آمادگیوں کا اظہار کریں ، نہ عقل انکی تصدیق کریگی ، نہ شرع قبول کریگی ۔

لیکن خلافت کمیٹی کا کام مسلمانوں کو نظام جماعتی و شرعی کے قیام سے مستغنی نہیں کر دے سکتا ۔ خلافت کمیٹی روپیہ جمع کریگی ۔ ایچی ٹیشن جاری رکھیگی ۔ تبلیغ و اشاعت کریگی ۔ لیکن نہ تورہ قوم کو سنبھال سکتی ہے ، نہ کمیٹیوں سے ” جماعت “ پیدا ہو سکتی ہے ، نہ شرعی نظام کی قائم مقامی ہو سکتی ہے ۔ وہ خود احکام شرعیہ کے علم کیلئے ، اپنے قیام و تکمیل کیلئے ، دفع تفرقہ و انتشار کیلئے ، اور روح اجتماع و قوام کے نفوذ کیلئے ایک بالا تر قوت حاکمہ و نافذہ کی محتاج ہے ۔ اور اگر وہ نہیں ہے تو پھر اسکی ہستی بھی قائم نہیں رہ سکتی ۔

نظام شرعی یہ نہیں ہے کہ ہر شخص فرداً فرداً سونچتا رہے کہ مسئلہ خلافت کیلئے کیا کرنا چاہیے ؟ اور اخباروں میں آرٹیکل لکے جائیں کہ عملی راہ کیا ہونی چاہیے ؟ اور نہ ہر شخص یا چند آدمیوں کی گڑھی ہوئی کمیٹی کو یہ حق ہے کہ لوگوں کو کسی راہ کی طرف دعوت دینا شروع کر دے ۔ یہ کام صرف ایک صاحب نظر و اجتہاد کا ہے جسکو قوم نے بالاتفاق تسلیم کر لیا ہو ۔ وہ وقت اور حالت پر اصول شریعت کو منطبق کریگا ۔ ایک ایک جزئیہ حوادث و واقعات پر پوری کار دانی و نکتہ شناسی کے ساتھ نظر ڈالیگا ، امت و شرع کے اصولی مصالح و فوائد اسکے سامنے ہونگے ۔ کسی ایک گوشے ہی میں ایسا مستغرق نہ ہو جائیگا کہ باقی تمام گوشوں سے بے پروا ہو جائے :

حفظت شیئاً و غابت عنک اشیاء !

سب سے بڑھکر یہ کہ اعمال مہمۂ امت کی راہ میں منہاج نبوت پر اسکا قدم استوار ہوگا ، اور ان ساری باتوں کے علم و بصیرت کے بعد ہر وقت ہر تغیر ہر حالت کے لیے احکام شرعیہ کا استنباط کریگا ۔

# فصل

( عہد نبوت کا ایک واقعہ )

یہ قرآن و سنت کے احکام ہیں - اب دیکھیں ' صاحب شریعت کا اس بارے میں میں طرز عمل کیا رہا ہے ؟

ہجرت کے نوویں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ رومیوں کی فوج مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے اکٹھی ہو رہی ہے - یہ سنکر آپؐ بھی طیاری کا حکم دیدیا ' اور تیس ہزار مجاہدین کے ساتھ مدینہ سے کوچ کر دیا - چونکہ یہ فوج بڑی ہی تنگدستی اور بے سر و سامانی کے حال میں نکلی تھی - اٹھارہ آدمیوں کے حصے میں صرف ایک سواری آئی تھی - جنگل کے پتے کھا کر لوگوں نے گزارہ کیا تھا ' اس لیے اس فوج کا نام " جیش العسرة " مشہور ہوا - الذین اتبعوه فی ساعة العسرة ( ۹۹ : ۱۱۹ )

آج تم خدا اور اس کے ایمان کی جگہ لوہے اور گندھک کے سامان و اسلحہ کی پرستش کر رہے ہو - لیکن ایک وقت وہ بھی تھا ' جب بے سر و سامان مسلمانوں کی یہ بھیڑ نکلی تھی ' تا کہ کرۂ ارضیٰ کی سب سے بڑی متمدن قوم یعنی رومیوں سے مقابلہ کرے !

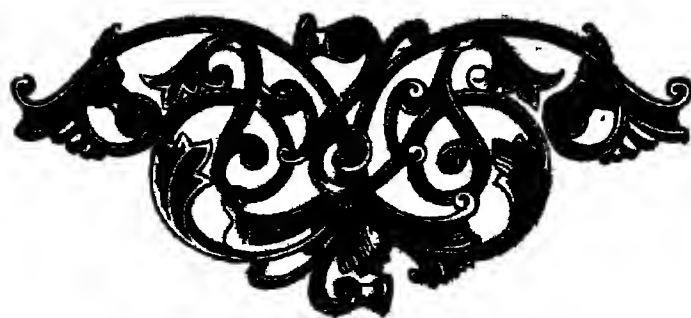
حضرت ابوبکر ( رض ) نے اسی دفاع کیلئے اپنا تمام مال و متاع پیش کر دیا تھا - جب اُن سے پوچھا گیا " ما ابقیت لاهلک " اپنے بیوی بچوں کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو ؟ تو اس پیکر ایمان و مجسمۂ عشق حق نے جواب دیا تھا " ابقیت لہم اللہ و رسولہ " ! اللہ اور اس کے رسول کو !

آنکس کہ تو بخواست ' جانرا چہ کند ؟  
فرزند و عیال و خانمان را چہ کند ؟  
دیوانہ کنی ہر در جہانش بخشی  
دیوانہ تو ہر در جہان را چہ کند ؟

تبوک نامی مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا مسلمانوں کی دلیرانہ طیاروں کا حال سنکر رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور فوجیں منتشر کر دی گئیں - آنحضرت نے ایک ماہ قیام فرمایا اور پھر مدینہ واپس آ گئے -

و مظلونات نہ تھے۔ و ان الظن لا يغني من الحق شيئا ( ۵۴ : ۳ ) اس وقت تم میں سے اکثروں نے اعراض کیا، بہتوں نے استہزاء کیا، کتنوں ہی نے کہہ دیا کہ یہ ایک طرح کی مذہبی بذات اور ما فوق الفطرۃ دعویٰ کا اعلان ہے: یرید ان یتفضل علینا۔ بعضوں نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ یہ صرف فصاحت و بلاغت کی ساحری اور ادیبانہ افسرنگری ہے: اکتبہا فہی تملي علیہ بکرة و اصیلا ( ۲۵ : ۷ ) لیکن دیکھو! بالآخر رفتہ رفتہ سب نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں۔ سب اُسی راہ پر چل پڑے۔ بہتوں نے دانستہ، اور بہتوں نے نادانستہ، مگر راہ سب نے وہی اختیار کی۔ آج تم سب اُسی ”ما فوق الفطرۃ دعویٰ“ اور ”ساحرانہ فصاحت طرازیوں“ کو اپنا اصل الاصل بنائے ہوئے ہو، اور ”قیام شریعت“ اور ”تقدیم و اتباع مذہب“ کے ناموں سے اسے موسوم کرتے ہو۔

پس جبکہ یہ تجربہ و مشاہدہ تمہارے سامنے ہے، تو آج میں اعلان کرتا ہوں کہ دوسرے تجربہ کا وقت آگیا۔ راہ عمل کیلیے تمہارا رخ وہ ہے جسکی طرف درزر ہے۔ اور میزبی راہ وہ ہے جسکی طرف پچھلے صفحوں میں بلا چکا ہوں۔ تم بارش کے وجود سے انکار تو نہیں کیا کرتے، مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں، لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگہ لینے کا خوگر ہوں، اور صرف بادلوں ہی کو دیکھہ لینا میرے علم کیلیے کافی ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ کافی ہے تو اس سے عبرت پکڑو، اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو۔ فسند کردن ما اقول لکم، و افروض امری الی اللہ۔ ان اللہ بصیر بالعباد ( ۴۰ : ۴۷ )



قل ان کان اباؤکم ، و انباؤکم ،  
 و اخوانکم ، و ازواجکم ،  
 و عشیرتکم ، و اموال  
 اقتـرفتمـوها ، و تجارة  
 تخشون کسادھا ،  
 و مساکن ترضونھا ،  
 احب الیکم من اللہ  
 و رسولہ و جہاد فی  
 سبیلہ فتربصوا حتی  
 یأتی اللہ بامرہ و اللہ  
 لا یہدی القوم الفاسقین -  
 ( ۲۵ : ۹ )

مسلمانوں سے کہہ دو کہ تمہارے والدین ،  
 تمہاری اولاد ، تمہارے بھائی ، تمہاری  
 بیویاں ، تمہارا خاندان اور اسکے تمام رشتے ،  
 یہ مال و متاع جو تم نے کمایا ہے ، یہ  
 کاروبار و تجارت جسکے مندا پتر جانے سے تم  
 ڈرتے ہو ، یہ تمہارے رہنے کے محل جن میں  
 تمہارا دل اٹکا ہوا ہے ، اگر تمہیں اللہ اور  
 اسکے رسول اور اسکی راہ میں جہاد کرنے  
 سے زیادہ پیارے ہیں ، اور تمہارے پاؤں  
 ان زنجیروں میں ایسے بندھ گئے ہیں کہ اللہ  
 کی پکار بھی انہیں نہیں ہلا سکتی ، تو  
 جان لو کہ اللہ کا کام بھی تمہارا محتاج

نہیں - نتائج کا انتظار کرو - یہاں تک کہ اللہ کو جو کچھ کرنا منظور ہے  
 کر دکھائے - اللہ کا قانون ہے کہ وہ نافرمانوں پر کامیابی کی راہ نہیں کھولتا !  
 اگرچہ عمل کے اعتبار سے اس فرض کی تعمیل اُس وقت لازم سے الزم  
 ہو جاتی ہے جب حملۂ اعداء کی وجہ سے خاص طور پر ضرورت پیش آجائے ،  
 لیکن عزم و استعداد کے لحاظ سے یہ حکم کسی خاص وقت میں محدود نہیں -  
 ہمیشہ اور ہر حال میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ دفاع اعداء کیلئے طیار رہیں  
 اور طیار رہتے رہیں - اوپر حدیث گزر چکی ہے کہ جو دل اس کے عزم و  
 طلب سے خالی ہوا ، اُس پر ایمان کی جگہ نفاق کا قبضہ ہو گیا :

واعذوا لہم ما استطعتم من قوۃ  
 و من رباط الخیل ترہبون بہ  
 عدو اللہ و عدوکم و آخرین من  
 دینہم لا تعلمونہم ( ۸ : ۶۰ )  
 جسقدر بھی تم سے ممکن ہو ، دشمنوں کے  
 مقابلے کیلئے اپنی قوت اور ساز و سامان  
 سے طیار رہو - تاکہ تمہاری مستعدی  
 دیکھ کر اللہ اور اُسکی اُمت کے دشمنوں پر  
 خوف اور رعب چھا جائے - تم پر حملہ کرنے کی کو جرات ہی نہ ہو -



جہاں مارا - جب کبھی کوئی بہتر دیکھی ' فریاد کی - جب کبھی انسانوں کو دیکھا اپنی طرف بلایا - لیکن فلم یزد ہم دعا کی الافرازا [ ۷۱ : ۶ ] بہت کم روحیں ایسی نکلیں جنکو حقیقت کا فہم ہو ' اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں - یہاں تک کہ میں تمہاری آباہیوں سے الگ ہو کر رانچی کے گوشہ قید و بند میں چلا گیا ' اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ رہاں بھی میری صبحیں اور میری شامیں کن فکروں اور کاموں میں بسر ہوتی رہیں - اب میں پھر تم میں واپس آ گیا ہوں - لیکن تمہاری بہتروں اور غلوں میں سچی جستجو کا چہرہ اُسی طرح مفقود ہے ' جیسا کہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے - اب تک حقیقت شناسی کی کوئی گیرائی تم میں نظر نہیں آتی - تم مجھے بلاتے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے ریلوے اسٹیشنوں پر اتارو ' اور ایسے پرجوش انسانوں کے نعرے سناؤ جنکے ہاتھوں میں فتح مند فوجوں کی طرح جھنڈیاں ہوں ' اور پھر اتنے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے کر دو کہ اُنکے ہجوم میں در چار آدمیوں کا خون ہو جائے ' مگر آہ ! میں تمہاری ان بہتروں کو لیکر کیا کروں جب تمہارے دلوں میں سناتا چھایا ہوا ہے ' اور تمہارے اس جوش استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو جب تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہیں - افسوس ! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو - تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو - میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں :

من بہر جمعیتے نالان شدم \* جفت خوشحالان ر بد حالان شدم  
هر کسے از ظن خرد شد یار من \* رز درون من نہ جست اسرار من  
سر من از نالۂ من در نیست \* لیکت کس را گوش آن منظور نیست

میری رایوں میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی نہ میرے سفر میں کبھی یمن و یسار کا تذبذب پیش آیا ہے - تبدیلیاں فکروں میں ہوسکتی ہیں ' قیاسوں میں ہوسکتی ہیں ' پولیٹکل حکمت عملیوں میں ہوسکتی ہیں ' انسانی تقلید اسکا سرچشمہ ہے ' اور انسانوں اور قوموں کا اتباع اسکا منبع ' لیکن اُن عقائد میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی جو وحی و تنزیل کی اٹل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہوں - الحمد للہ کہ میں جو کچھ کہتا اور کرتا رہا ' وہ میرے عقائد و معلومات تھے ' تمہارے بزرگوں کی طرح ارادہ



رکھا ہے ، اسکی گیرائیوں اور دلربائیوں کا حال تمہیں کیا معلوم ؟ اُسکی بے التفاتی بھی دوسروں کی محبت و عزت سے ہزار درجہ زیادہ عزیز و محبوب ہے :  
اے جفا ہاے تو خوشتر ز وفاے دگراں !

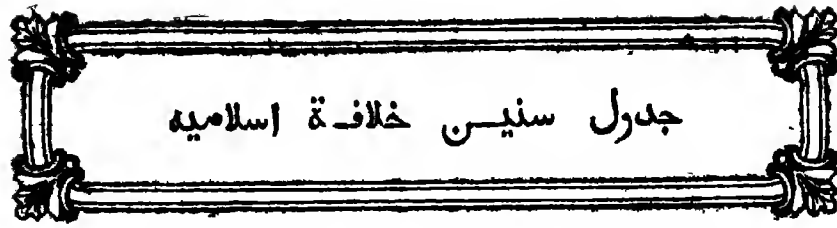
ان مومنین صادقین کی یہ آزمائش پورے پچاس دن تک جاری رہی ۔  
بالآخر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی اور سورہ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی :  
و علی الثلثة الذین خلفوا حتی ضاقت علیہم الارض بما رحبت و ضاقت علیہم انفسہم و ظنوا ان لا ملجاء من اللہ الا الیہ ثم تاب علیہم لیتوبوا - ان اللہ هو التواب الرحیم ! ( ۱۲۰ : ۹ )  
اور وہ تین آدمی جنکا معاملہ فیصلہ الہی کیلئے ملتوی کر دیا گیا تھا ، سوجب انکا یہ حال ہوا کہ تمام مسلمانوں نے اُنکو چھوڑ دیا ، زمین باوجود اپنی وسعت کے انپر تنگ ہو گئی ، اپنی زندگی سے بیزار ہو گئے اور اُنہوں نے دیکھ لیا کہ اللہ سے پناہ نہیں ہے مگر صرف اسی کی طرف ، تو پھر اللہ نے انکی توبہ قبول کر لی ۔ یقیناً اللہ ہی ہے جو توبہ قبول کرتا اور خطا کاروں کیلئے مہربانی رکھتا ہے !

حضرت کعب کو جب قبولیت توبہ کی بشارت ملی تو بے اختیار سجدہ میں گر پڑے اور اپنا سارا مال و متاع شکرانۂ قبولیت میں لٹا دینا چاہا ۔  
اس واقعہ میں متعدد باتیں قابل غور ہیں :

( ۱ ) رومیوں نے حملے کی طیاریاں کیں تو اسلام و اُمت کی حفاظت کیلئے دفاع کرنا ہر مسلمان پر فرض ہو گیا ۔ موسم سخت گرمی کا تھا ۔ سفر دور دراز کا ۔ بے سروسامانی حد درجہ کی ۔ مقابلہ اس حکومت سے جو نصف دنیا پر حکمران تھی ۔ حجاز میں فصل پک چکی تھی اور کٹائی کا اصلی وقت تھا ۔ یہی فصل ملک کیلئے سال بھر کی خوراک تھی ۔ اگر مشکلوں اور مجبوریوں کے عذر سنے جاسکتے ہیں تو ان حالات سے بڑھکر اور کون سے حالات عذر داری کے لیے مناسب ہوسکتے ہیں ؟ مگر دفاع کا فرض ایسا سخت اور اٹل ہے کہ نہ کوئی عذر سنا گیا ، نہ کوئی مشکل رکارت ہوسکی ۔ حکم ہوا کہ سب کچھ چھوڑ دو ۔ ساری مصیبتیں جھیل لو ۔ مگر دشمنوں کو روکنے کے لیے نکل کھڑے ہو ۔ سورہ توبہ میں اس کا براہی عبرت انگیز تذکرہ ہے ۔ یہ مرقعہ تفصیل کا نہیں ۔ قالوا لا تنفروا فی الحر -

قل نار جہنم اشد حرا لو کانوا یفقهون ( ۸۳ : ۹ )

## ضميمة



| عدد            | خلفاء                       | سنة هجري | سنة مسيحي |
|----------------|-----------------------------|----------|-----------|
| ١              | ابوبكر الصديق ( رض )        | ١١       | ٦٣٢       |
| ٢              | عمر بن الخطاب ( رض )        | ١٣       | ٦٣٤       |
| ٣              | عثمان بن عفان ( رض )        | ٢٣       | ٦٤٤       |
| ٤              | علي بن ابي طالب ( رض )      | ٣٥       | ٦٥٢       |
| سلسلة بنو امية |                             |          |           |
| ٥              | معاوية بن ابي سفيان         | ٤١       | ٦٦١       |
| ٦              | يزيد بن معاوية              | ٦٠       | ٦٨٠       |
| ٧              | معاوية بن يزيد              | ٦٥       | ٦٨٣       |
| ٨              | مروان بن الحكم              | ٦٥       | ٦٨٣       |
| ٩              | عبد الملك بن مرزان          | ٦٥       | ٦٨٤       |
| ١٠             | الوليد بن عبد الملك         | ٨٦       | ٧٠٥       |
| ١١             | سليمان بن عبد الملك         | ٩٦       | ٧١٤       |
| ١٢             | عمر بن عبد العزيز           | ٩٩       | ٧١٧       |
| ١٣             | يزيد بن عبد الملك           | ١٠١      | ٧١٩       |
| ١٤             | هشام بن عبد الملك           | ١٠٥      | ٧٢٣       |
| ١٥             | الوليد بن يزيد بن عبد الملك | ١٢٥      | ٧٤٢       |
| ١٦             | يزيد بن الوليد              | ١٢٦      | ٧٤٣       |
| ١٧             | ابراهيم بن الوليد           | ١٢٦      | ٧٤٣       |
| ١٨             | مروان بن محمد بن مرزان      | ١٢٧      | ٧٤٤       |
| سلسلة عباسية   |                             |          |           |
| ١٩             | ابو العباس سفاك             | ١٣٢      | ٧٤٩       |
| ٢٠             | ابو جعفر منصور              | ١٣٧      | ٧٥٤       |
| ٢١             | المهدي بن منصور             | ١٥٨      | ٧٧٤       |

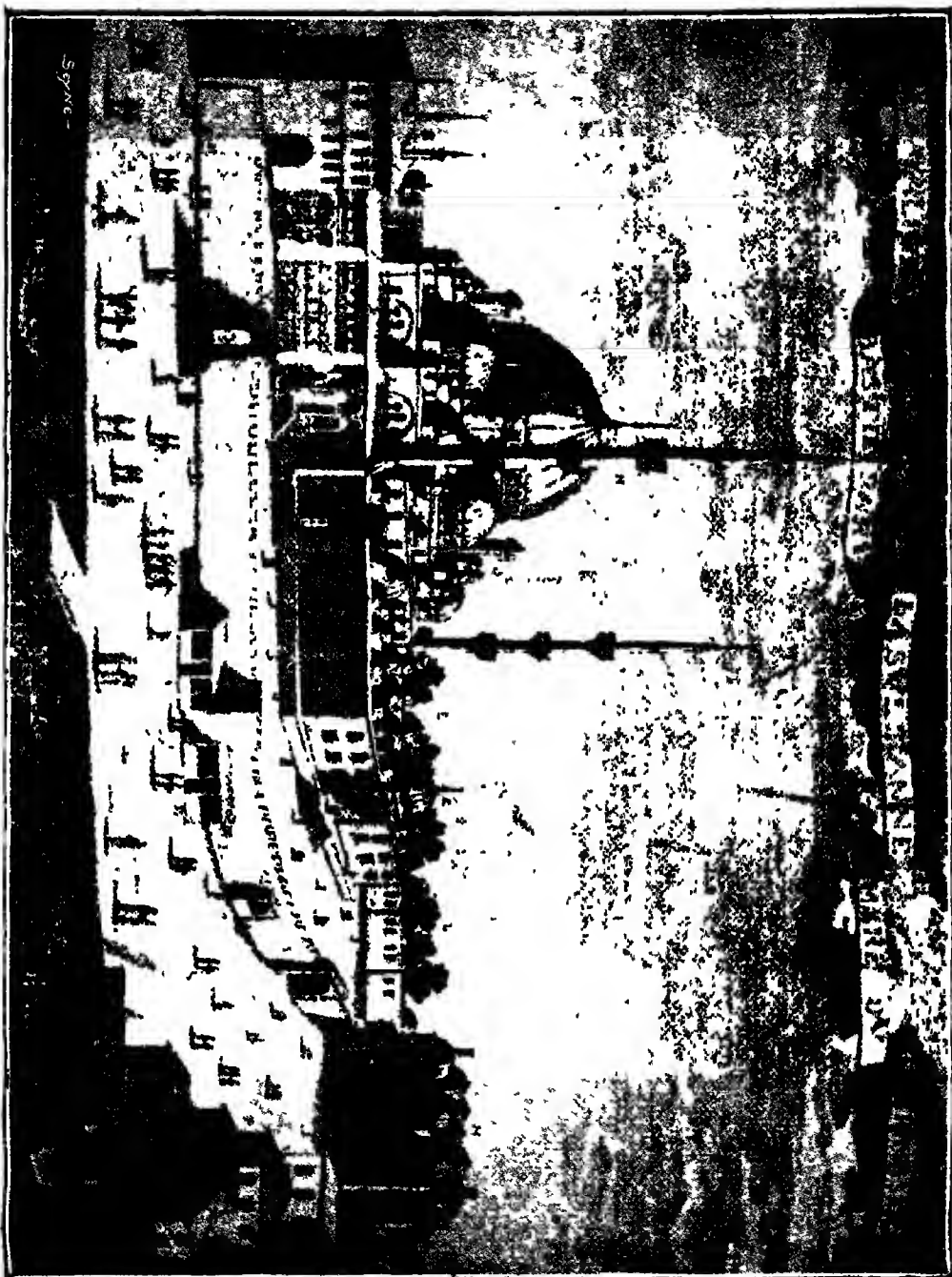
اس دفاع میں بجز منافقین کے تمام مسلمان شریک ہوئے تھے - صرف تین شخص نہ جاسکے - کعب بن مالک - ہلال بن امیہ - مرارہ بن ربیع - کعب بن مالک سابقین انصار میں سے ہیں ، اور ان ۷۳ سابقین مخلصین میں سے جو عقبہ کی بیعت میں حاضر ہوئے تھے - انکے ایمان و اخلاص میں کیا شبہ ہو سکتا ہے ؟ انکا شریک نہ ہونا کسی بری نیت سے نہ تھا - سستی اور کاہلی سے آج کل کرتے رہے اور فوج کے ساتھ ملنے کا موقعہ نکل گیا -

با ایں ہمہ یہ معاملہ اللہ اور اس کے رسول کی نظروں میں اس درجہ اہم ہے کہ اتنی سستی اور کاہلی بھی ایک سخت جرم قرار پائی - معذرت کرنے کیلئے حاضر ہوئے تو توبہ قبول نہ ہوئی - حکم ہوا کہ گھر میں بیٹھو اور فیصلہ رحی کا انتظار کرو - مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تمام تعلقات ان سے ترک کر دیں - نہ کوئی بات چیت کرے - نہ ملے جلے - نہ آدر کسی طرح کا واسطہ رکھے - پھر انکی بی بیوں کو حکم ملا کہ وہ بھی الگ ہو جائیں اور کوئی واسطہ نہ رکھیں - امام بخاری نے ایک طویل روایت خود حضرت کعب بن مالک کی زبانی نقل کی ہے اور اس واقعہ کیلئے خاص باب باندھا ہے - کعب کہتے ہیں - ہمارا یہ حال ہو گیا تھا کہ سارا مدینہ انسانوں سے بھرا تھا ، مگر ہمارے لیے نہ ایک آنکھ دیکھنے والی تھی نہ ایک زبان بات کرنے والی - خود عزیز و اقارب نے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا - حسرت سے ایک ایک کا منہ تکتے اور دیوانوں کی طرح پھرتے تھے - ایک دن اپنے چچیرے بھائی ابو قتادہ کے یہاں گیا - مجمع دیکھتے ہی منہ دوسرے طرف پھرا لیا - سلام کیا تو جواب نہ ملا -

اللہ اللہ ! کیا مسلمان تھے کہ انکا رشتہ تھا تو اللہ اور اس کے رسول کا رشتہ - زندگی تھی تو صرف اسی کے حکم پر ! الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کی مجسم تصویر تھے !

غسان کے عیسائی پادشاہ نے یہ حال سنا تو خوش ہوا کہ مسلمانوں میں پھرت ڈالنے کا اچھا موقعہ نکل آیا ہے - کعب کے نام اس مضمون کا خط لکھ کر بھیجا کہ تمہارے آقا نے تمہاری ساری عمر کی خدمتوں کا جو معارضہ دیا ہے وہ دیکھ چکے ہو - اب میرے پاس چلے آؤ - دیکھو یہاں تمہاری کیسی عزت ہوتی ہے ؟ کعب بن مالک کو خط ملا تو ایلاچی کے سامنے آگ میں جھونک دیا اور کہا جواب میں کہدینا - ہم نے جس آقا کی چوکھٹ پر سر

# ایڈریا نوبل کی جامع سلیم کا پیرزنی منظر



نام نہاد مجلس صلح فیصلہ کرنا چاہتی ہے کہ ولایت ایدریا نوبل کو  
قسطاطیہ سے الگ کر دیا جائے



مغفرت کھلا پاؤ گے - لیکن دیکھو امت کی حفاظت و مدافعت سے غفلت کرنا اللہ کی نظروں میں کیسا سخت جرم ہے کہ یکایک توبہ بھی قبول نہوئی - تینوں صحابی آپکی واپسی کے بعد پہلی ہی صحبت میں عفو و تقصیر کیلئے حاضر ہو گئے تھے ' مگر حکم ملا کہ ابھی نہیں - انتظار کرو - پچاس دن سزاؤ عقوبت کے گزر چکے تب کہیں جا کر توبہ قبول ہوئی !

( ۴ ) جب اُن پاک انسانوں کا یہ حال ہوا کہ ایمان اُنکا ایمان تھا ' اور نیکیاں اُنکی نیکیاں - اُن کے بستر خواب کے اجر و ثواب کا بھی ہماری بڑی بڑی عبادتیں مقابلہ نہیں کرسکتیں ' تو خدا را بتلاؤ ' ہم بدبختوں اور سیہ کاروں کا کیا حشر ہوگا کہ نہ ایمان کی دولت ساتھ ہے نہ طاعت و حسنات کی پونجی دامن مین - زندگی یکسر برباد غفلت و معصیت ' اور عمریں یکقلم تاراج نفس پرستی و نافرمانی - وہاں عزم و ایمان کے ساتھ سہو و نسیان تھا مگر عذر قبول نہ ہوا - یہاں اعراض و نفاق کے ساتھ صریح نافرمانی و انکار ہے اور پھر نہ ندامت ہے نہ توبہ و انابت ! اُنکے ساتھ سب کچھ تھا اور کام نہ آیا - ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے - پھر کیا ہے جس نے آنے والے دن کی طرف سے بے فکر کر دیا ہے اور ہمارے غافل دلوں پر بیخوفی کی موت چھا گئی ہے ؟ بتلاؤ زمین و آسمان میں کون ہے جو اُس دن ہمیں بچا سکیگا جب خدا کے غضب کا بے پناہ ہاتھ ہماری طرف بڑھیکا ؟

یقول الانسان یومئذ این المفر ؟

## فصل

( ایک عام غلط فہمی )

البتہ یاد رہے کہ ” جہاد “ کی حقیقت کی نسبت سخت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں - بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ جہاد کے معنی صرف لڑنے کے ہیں - مخالفین اسلام بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے - حالانکہ ایسا سمجھنا اس عظیم الشان مقدس حکم کی عملی وسعت کو بالکل محدود کر دینا ہے -

” جہاد “ کے معنی کمال درجہ کوشش کرنے کے ہیں - قرآن و سنت کی اصطلاح میں اس کمال درجہ سعی کو جو ذاتی اغراض کی جگہ حق پرستی



|      |     |                            |    |
|------|-----|----------------------------|----|
| ١٢٢٣ | ٦٢٣ | المستنصر بالله بن الظاهر   | ٥٢ |
| ١٢٢٣ | ٦٤٠ | المستعصم بالله بن المستنصر | ٥٣ |
|      |     | عباسية مصر                 |    |
| ١٢٥٨ | ٦٥٩ | المستنصر بالله             | ٥٤ |
| ١٢٦٢ | ٦٦١ | الحاكم بأمر الله           | ٥٥ |
| ١٣٠١ | ٧٠١ | المستكفي بالله             | ٥٦ |
| ١٢٣٩ | ٧٤٠ | الرائق بالله               | ٥٧ |
| ١٢٣١ | ٧٤٢ | الحاكم بأمر الله           | ٥٨ |
| ١٣٥٢ | ٧٥٣ | المعتضد بالله              | ٥٩ |
| ١٣٦١ | ٧٦٣ | المتوكل على الله           | ٦٠ |
| ١٣٨٣ | ٧٨٥ | الرائق بالله               | ٦١ |
| ١٤٠١ | ٨٠٨ | المستعين بالله             | ٦٢ |
| ١٤١٢ | ٨١٥ | المعتضد بالله              | ٦٣ |
| ١٤٢١ | ٨٢٠ | المستكفي بالله             | ٦٤ |
| ١٤٥٠ | ٨٥٢ | القائم بأمر الله           | ٦٥ |
| ١٤٥٣ | ٨٥٩ | المستنجد بالله             | ٦٦ |
| ١٤٧٩ | ٨٨٢ | المتوكل على الله           | ٦٧ |
| ١٤٩٧ | ٩٠٣ | المستمسك بالله             | ٦٨ |
| ١٥٠٦ | ٩١٢ | المتوكل على الله           | ٦٩ |

سلسلة عثمانية

|      |      |              |    |
|------|------|--------------|----|
| ١٥١٧ | ٩٢٣  | سليم خان اول | ٧٠ |
| ١٥٢٠ | ٩٢٦  | سليمان اول   | ٧١ |
| ١٥٦٦ | ٩٧٣  | سليم ثاني    | ٧٢ |
| ١٥٧٣ | ٩٥٢  | مراد ثالث    | ٧٣ |
| ١٥٩٦ | ١٠٠٢ | محمد ثالث    | ٧٤ |
| ١٦٠٢ | ١٠١٢ | احمد اول     | ٧٥ |
| ١٦١٨ | ١٠٢٧ | مصطفى اول    | ٧٦ |
| ١٦١٨ | ١٠٢٧ | عثمان ثاني   | ٧٧ |

( ۲ ) یہ تینوں مسلمان جو شرکت دفاع سے رہ گئے ، مخلصین مومنین میں سے تھے ۔ انکی زندگیاں اسلام کی بے شمار خدمتوں اور جان نثاریوں میں بسر ہوئی تھیں ۔ عبادتوں اور نیکیوں کا کیا پوچھنا کہ شب و روز اللہ کے رسول کے سایۂ تربیت میں رہتے تھے ، انہی کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے ، انہی کے ساتھ روزے رکھتے تھے ۔ صحابہ کے ایک ادنیٰ فرد کی عبادت کا مقابلہ ہم اپنی پوری نسلوں اور قوموں کی عبادت گزاریاں پیش کرے بھی نہیں کرسکتے ۔ حضرت کعب بن مالک سابقہ من الازلون میں سے ہیں ۔ جب اسلام کا کوئی ساتھی نہ تھا تو مدینہ کے انصار نے ساتھ دیا ۔ عقبہ کی بیعت ثانیہ میں ۷۳ جان نثاروں نے بیعت کی تھی ۔ یہ انہی عشاق اسلام میں سے ہیں ۔ خود کہتے ہیں کہ کسی اسلامی خدمت میں دوسروں سے پیچھے نہ رہا ۔ ہر جنگ میں شرکت کی ۔ ہر موقعہ پر جان و مال نثار کیا ۔ اس دفاع کی شرکت سے بھی جو رہ گئے ، تو دل کی کمزوری اور نیت کے فساد کی وجہ سے نہیں ۔ چلنے کا پورا سامان کر لیا تھا ۔ صرف یہ قصور ہوا کہ سستی اور کاہلی کی ۔ پوری طرح مستعدی سے کام نہ لیا ۔ تاہم دیکھو ، یہ سستی اور کاہلی بھی خدا کے حضور کیسے بڑا جرم قرار پائی کہ نہ تو کوئی پچھلی خدمت آئے آسکی ، نہ مدۃ العمر کی نیکیوں اور عبادتوں ہی نے کچھ کام دیا ۔ نہ کوئی بزرگی اور بڑائی اس معاملہ میں شفیع ہو سکی ۔ نہ ایک ایسے پکے اور پرکھے ہوئے مخلص مسلمان کیلئے عذر و معذرت کی گنجائش نکل سکی ۔ سخت سے سخت سزا جو دی جاسکتی تھی ، دی گئی ۔ مسلمانوں سے اسلامی برادری کا رشتہ توڑ دیا گیا ۔ پچاس دنوں کیلئے جماعت سے باہر کر دیے گئے ۔ یہ سارا زمانہ گریۂ زاری اور عبادت و استغفار میں بسر ہوا ۔ تب کہیں جا کر توبہ قبول کی گئی ۔

( ۳ ) اسلام کے احکام کا قبولیت توبہ کے بارے میں جو حال ہے ، معلوم ہے ۔ خدا کا دروازہ رحمت کسی آنے والے کا اتنا انتظار نہیں کرتا ، جسقدر اس مضطرب روح کا ، جو توبہ کیلئے اُسکی طرف بڑھے ۔ ” لو اخطاتم حتی تملاء خطایکم ما بین السماء و الارض “ ثم استغفرتم ” اللہ یغفر لکم “ ( رواہ مسلم عن ابی ہریرہ ) اگر تم نے اتنے گناہ کیے ہوں کہ زمین و آسمان کا فاصلہ ان سے بھر دیا جاسکے ، پھر بھی توبہ کا آنسو بہاتے ہوئے آؤ تو دروازہ

|      |     |                               |    |
|------|-----|-------------------------------|----|
| ٧٨٥  | ١٩٩ | الهادي بن المهدي              | ٢٢ |
| ٧٨٩  | ١٧٠ | هارون الرشيد بن المهدي        | ٢٣ |
| ٨٠٨  | ١٩٣ | محمد الأمين بن هارون          | ٢٤ |
| ٨١٣  | ١٩٨ | المأمون بن هارون              | ٢٥ |
| ٨٣٣  | ٢١٨ | المعتصم بن هارون              | ٢٦ |
| ٨٤٢  | ٢٢٧ | الواثق بن المعتصم             | ٢٧ |
| ٨٤٧  | ٢٣٢ | المتوكل على الله بن المعتصم   | ٢٨ |
| ٨٩١  | ٢٤٧ | المستنصر بالله بن المتوكل     | ٢٩ |
| ٨٩٢  | ٢٤٨ | المستعين بالله بن المعتصم     | ٣٠ |
| ٨٩٩  | ٢٥٢ | المعتز بالله بن المتوكل       | ٣١ |
| ٨٩٩  | ٢٥٥ | المهتدي بالله بن الواثق       | ٣٢ |
| ٨٧٠  | ٢٥٦ | المعتمد بالله بن المتوكل      | ٣٣ |
| ٨٩٢  | ٢٧٩ | المعتضد بالله بن الموفق       | ٣٤ |
| ٩٠٨  | ٢٩٥ | المقتدر بالله بن الموفق       | ٣٥ |
| ٩٣٣  | ٣٢٢ | الراضي بالله بن المقتدر       | ٣٦ |
| ٩٤٠  | ٣٢٩ | المقتفي بالله بن المقتدر      | ٣٧ |
| ٩٤٤  | ٣٣٣ | المستكفي بالله بن المقتفي     | ٣٨ |
| ٩٤٩  | ٣٣٣ | المطيع بالله بن المقتدر       | ٣٩ |
| ٩٧٣  | ٣٩٣ | الطائع لله بن المطيع          | ٤٠ |
| ٩٩١  | ٣٨١ | القادر بالله بن المقتدر       | ٤١ |
| ١٠٣١ | ٤٣٢ | القائم بامر الله بن القادر    | ٤٢ |
| ١٠٧٥ | ٤٩٧ | المقتدي بالله بن القائم       | ٤٣ |
| ١٠٩٤ | ٤٨٧ | المستظهر بالله بن المقتدي     | ٤٤ |
| ١١١٨ | ٥١٢ | المسترشد بالله بن المستظهر    | ٤٥ |
| ١١٣٥ | ٥٢٩ | الراشد بن المسترشد            | ٤٦ |
| ١١٣٦ | ٥٣٠ | المقتفي بن المستظهر           | ٤٧ |
| ١١٩٠ | ٥٥٥ | المستنجد بالله بن المقتفي     | ٤٨ |
| ١١٧٠ | ٥٩٩ | المستضي بنور الله بن المستنجد | ٤٩ |
| ١٢٨٠ | ٥٧٥ | الناصر لدين الله بن المستضي   | ٥٠ |
| ١٢٢٥ | ٢٩٢ | الظاهر بالله بن الناصر        | ٥١ |

ہی نہ تھی، اور نہ اُن سے کبھی جنگ کی گئی - سریہ جہاد بھی تبلیغ حق و اتمام حجة و مقاومة فساد کا جہاد تھا جو قلب و زبان سے تعلق رکھتا ہے - بخاری و ابن ماجہ میں ہے - حضرت عائشہ نے پوچھا ”علی النساء جہاد؟“ کیا عورتوں کیلئے بھی جہاد ہے؟ فرمایا ”نعم جہاد“ لا قتال فیہ - الحج و العمرة“ ہاں، جہاد ہے مگر اسمیں لڑنا نہیں ہے - حج اور عمرہ - اس حدیث میں اُس سعی اور ترک وطن کی محنت کو جو حج و عمرہ میں پیش آتی ہے، عورتوں کیلئے جہاد فرمایا، اور کہا ایسا جہاد جسمیں لڑائی نہیں - اس سے معلوم ہوا کہ لڑائی کے الگ کر دینے کے بعد بھی حقیقت ”جہاد“ باقی رہتی ہے -

اگر امت کیلئے دفاع و جنگ کا وقت آ گیا، یا کسی جماعت مفسدین ارض پر امام نے حملہ کیا، تو ایسے وقتوں میں بھی صرف نفس جنگ ہی نہیں بلکہ سعی و کوشش کی ساری باتیں شریعت کے نزدیک جہاد ہیں - جسکی طاقت میں جنگ کرنا نہیں ہے اور اُس نے مال دیا تو رہ بھی مجاہد ہے - جس نے زبان سے دعوت و تبلیغ کی رہ بھی مجاہد ہے - جس نے اس راہ میں اور کسی طرح کی تکلیف و محنت اُٹھائی، رہ بھی مجاہد ہے - البتہ ایسے وقتوں میں اگر کوئی مسلمان لڑائی کی طاقت رکھتا ہے اور اس سے پہلو تہی کرے، تو اُسکا کوئی عذر نہیں سنا جائیگا - اسکا شمار مومنوں کی جگہ منافقوں میں ہوگا - جو مال دیسکتا ہے اور نہ دیا، تو رہ بھی ایمان و اخلاص کی زندگی سے نکل گیا - زمین پر گو مسلمان کہلائے پر اللہ کے حضور منافق کہلائیگا - جس شخص کی زبان اعلان حق اور دعوت الی الجہاد میں کھل سکتی ہے مگر نہ کھلی، اُس نے بھی ایمان چھوڑ کر نفاق کی راہ اختیار کر لی - گو شیطان حیل اور نفس خادع اسکو ہزاروں فریب دیتا رہے - ترمذی اور ابو داؤد میں ہے - ”افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر“ سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والا جہاد وہ کلمۃ حق ہے جو شاہان جور و ظلم کے سامنے بے باکانہ کہا جائے -

اور پھر ان سب سے بالاتر مرتبہ اُن مجاہدین کاملین اور اصحاب عزيمة عمل کا ہے، جنکی زندگی سرتا سر جہاد فی سبیل اللہ، اور جنکا وجود یکسر خدمت حق، و شیفگی صدق، و عشق دعوت ہے - جو اس عمل مقدس کیلئے کسی خاص صدائے نفیر اور اعلان وقت کے منتظر نہیں رہتے - بلکہ ہر صبح جو اُنپر آتی ہے، جہاد فی سبیل اللہ کی صبح ہوتی ہے، اور ہر شام

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ، هُوَ  
أَجْتَنِبَكُمْ، وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ  
مِنْ حَرَجٍ، يَأْتِيكُمْ بَرٌّ مِنْهُ  
سَمَّكُمْ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ فِي هَذَا  
لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ، وَ  
تَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ، فَأَقِيمُوا  
الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ، وَاعْتَصِمُوا  
بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَ  
نِعْمَ النَّصِيرُ (٢٢٨ : ٢٢٩)



اور سچائی کی راہ میں کی جائے، ”جہاد“ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ سعی زبان سے بھی ہے، مال سے بھی ہے، انفاق وقت و عمر سے بھی ہے، محنت و تکالیف برداشت کرنے سے بھی ہے، اور دشمنوں کے مقابلے میں لڑنے اور اپنا خون بہانے سے بھی ہے۔ جس سعی کی ضرورت ہو، اور جو سعی جس کے امکان میں ہو، اُس پر فرض ہے، اور جہاد فی سبیل اللہ میں لغۃ و شرع، دونوں اعتبار سے داخل۔ یہ بات نہیں ہے کہ ”جہاد“ سے مقصود مجرد لڑائی ہی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو جہاد کا اطلاق اعمال قلبی و لسانی پر نہ ہوتا۔ حالانکہ کتاب و سنت ایسے اطلاقات سے لبریز ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا قول صاحب اقتناع نے نقل کیا ہے جو حقیقت جہاد کے بارے میں قول فیصل و جامع ہے ”الامر بالجہاد مذہ ما یکون بالقلب، کالعزم علیہ، و مذہ ما یکون باللسان کالدعوة الی الاسلام والحجة و البیان، و الراي و التدبیر فی ما فیہ نفع المسلمین، و بالبدن، ای القتال بنفسه۔ فیجب الجہاد بغایۃ ما یمکنہ من ہذہ الامور“ (جلد ۱ - ۱ - ۶۵۳)

دشمنوں کی فوج سے خاص وقت ہی میں مقابلہ ہو سکتا ہے، لیکن ایک مومن انسان اپنی ساری زندگی اور زندگی کی ہر صبح و شام جہاد حق میں بسر کرتا ہے۔ مشہور حدیث ہے ”المجاہد من جاهد نفسه فی ذات اللہ، و المهاجر من هجر ما نہی اللہ عنہ“

سورۃ فرقان میں ہے فلا تطع الکافرین و جاهد ہم بہ جہاداً کبیراً (۵۵: ۲۵) یعنی کفار کے مقابلہ میں بڑے سے بڑا جہاد کر۔ سورۃ فرقان بالاتفاق مکی ہے، اور معلوم ہے کہ جہاد بالسیف یعنی لڑائی کا حکم ہجرت مدینہ کے بعد ہوا۔ پس غور کرنا چاہیے کہ مکی زندگی میں کونسا جہاد تھا جس کا اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے؟ جہاد بالسیف تو ہو نہیں سکتا۔ یقیناً وہ حق کی استقامت اور اسکی راہ میں تمام مصیبتیں اور شدتیں جھیل لینے کا جہاد تھا۔ مکی زندگی میں جس طرح یہ جہاد جاری رہا، سب کو معلوم ہے۔ حق کی راہ میں دنیا کی کسی جماعت نے ایسی تکالیفیں اور مصیبتیں نہ اُٹھائی ہونگی، جیسی اللہ کے رسول اور اُسکے ساتھیوں نے مکی زندگی میں برداشت کیں۔ اسی پر جہاد کبیر کا اطلاق ہوا۔

اسی طرح منافقوں کے ساتھ بھی جہاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ جاهد الکفار و المنافقین و اغلظ علیہم (۹: ۶۶) حالانکہ منافق تو خود اسلام کے ماتحت مقہورانہ و محکومانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُنسے جنگ و قتال کی ضرورت

|  |      |                 |    |
|--|------|-----------------|----|
| ۱۶۲۰   | ۱۰۴۹ | مراد رابع       | ۷۱ |
| ۱۶۷۴   | ۱۰۵۳ | ابراہیم اول     | ۸۰ |
| ۱۶۸۷   | ۱۰۹۹ | محمد رابع       | ۸۱ |
| ۱۶۹۱   | ۱۱۰۲ | سلیمان ثانی     | ۸۲ |
| ۱۶۹۵   | ۱۱۰۶ | احمد ثانی       | ۸۳ |
| ۱۷۰۳   | ۱۱۱۵ | مصطفیٰ ثانی     | ۸۴ |
| ۱۷۳۰   | ۱۱۴۲ | احمد ثالث       | ۸۵ |
| ۱۷۵۴   | ۱۱۲۸ | محمود اول       | ۸۶ |
| ۱۷۵۷   | ۱۱۷۱ | عثمان ثالث      | ۸۷ |
| ۱۷۷۳   | ۱۱۸۷ | مصطفیٰ ثالث     | ۸۸ |
| ۱۷۸۹   | ۱۲۰۳ | عبد المجید اول  | ۸۹ |
| ۱۸۰۷   | ۱۲۲۲ | سلیم ثالث       | ۹۰ |
| ۱۸۰۸   | ۱۲۲۳ | مصطفیٰ رابع     | ۹۱ |
| ۱۸۳۹   | ۱۲۵۵ | محمود ثانی      | ۹۲ |
| ۱۸۶۱   | ۱۲۷۷ | عبد المجید      | ۹۳ |
| ۱۸۷۶   | ۱۲۹۳ | عبد العزیز      | ۹۴ |
| ۱۸۷۶   | ۱۲۹۳ | مراد خامس       | ۹۵ |
|  |      | عبد الحمید ثانی | ۹۶ |
|  |      | محمد خامس       | ۹۷ |
| امیر المومنین السلطان محمد خاں سادس - خلد اللہ ملکہ رشوکتہ - |      |                 |    |

## تصحیح

صفحہ ۶۹ - سطر ۲۷ - میں ہے کہ حافظ عسقلانی اور قاضی عینی نے  
 اٹھویں صدی میں بخاری کی شرحیں لکھیں - اسکو یوں پڑھنا چاہیے :  
 " اٹھویں صدی یا نوویں صدی کے اراٹل میں "  
 صفحہ ۸۰ - سطر ۲۰ - میں ہے " ہندوستان میں شہنشاہ اکبر کا زمانہ  
 تھا " یہ صحیح نہیں ہے - یوں پڑھنا چاہیے " بابر کی قسمت آزمائیوں  
 کا زمانہ تھا "  
 صفحہ ۵۳ سطر ۵ کے آخری لفظ " تمہاری " کے بجائے " تمہارا " پڑھیے -  
 رسالہ بالکل قلم برداشتہ لکھا گیا ہے - تحریر و طباعت دونوں کا سلسلہ  
 ساتھ ساتھ جاری رہا - نظر ثانی و مراجعت کتب کا بالکل موقعہ نہ تھا -  
 اس لیے اکبر کے زمانہ کی تعیین میں غلطی ہو گئی -

# فصل

( احکام قطعیت دفاع )

غرضکہ ” دفاع “ اسلام کے اُن بنیادی حکموں میں سے ہے، جنکو ایک مسلمان مسلمان رہکر کبھی ترک نہیں کرسکتا۔ اگر ایک مسلمان کے دل میں رائی برابر بھی ایمان کی محبت باقی رہگئی ہے، تو اُسکی طاقت سے باہر ہے کہ اللہ کی یہ صداے حق سنے، اور ازسرتا پا کانپ نہ اُٹھے :

یا ایہا الذین آمنوا ! ما لکم اذا قیل لکم انفرورا فی سبیل اللہ ؟ انا قلتم الی الارض ؟ ارضیتم بالحیاة الدنیا من الآخرة ؟ فما متاع الحیاة الدنیا فی الآخرة الا قلیل - ( ۹ : ۳۹ )

مسلمانوں ! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے ” اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہو “ تو تمہارے قدموں میں حرکت نہیں ہوتی اور زمین پر تھیر ہوئے جاتے ہو ؟ کیا تم نے آخرت چھوڑ کر صرف دنیا ہی کی زندگی پر قناعت کر لی ؟ اگر یہی بات ہے تو یاد رکھو، جس زندگی پر ریجے بیٹھے ہو، وہ آخرت کے مقابلہ میں بالکل ہی ہیچ ہے !

اسکے بعد فرمایا :

الا تنفروا ؟ یعذبکم عذاباً الیما ویستبدل قومًا غیرکم ولا تضررة شیئاً - واللہ علی کل شیء قذیر ! ( ۹ : ۳۰ )

یاں رکھو ! اگر تم نے حکم الہی سے سرتابی کی، اور وقت کے آنے پر بھی راہ حق میں کمر بستہ نہوے، تو اللہ نہایت ہی سخت عذاب میں ڈالکر اسکی سزا دیگا، اور تمہارے بدلے کسی دوسری قوم کو خدمت اسلام کیلئے کھڑا کر دیگا۔ تم چھانت دیے جاؤ گے۔ کلمۂ حق تمہارا محتاج نہیں ہے۔ تم ہی اپنی زندگی و نجات کیلئے اُسکے محتاج ہو !

اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت، اُنکی حکومتوں کے مٹانے، اور اُنکی آبادیوں اور شہروں کو آپس میں بانٹ لینے کیلئے کفار ایک دوسرے کے ساتھی اور حامی ہیں :

والذین کفروا بعضهم اولیاء بعض - جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی تو وہ ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار ہیں۔

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ

رسالہ

# مسئلہ خلافت و خیرۃ عرب

اش

ابوالکلام

جو پہلے خطبہ صدارت کی صورت میں پرائیویٹ خلافت کمیٹی بنگال کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔ اب مصنف کی نظر ثانی، مطالب کی تقسیم و تبویب، مجمل بیانات کی مزید تفصیل، متعدد اہم فصول و مباحث کو اضافہ اور بعض ضروری ضمیموں کی تدریج کے بعد مکمل شائع کیا جاتا ہے۔

تم مسلمان ہو ایک زمانے میں اللہ اور اس کے دین برحق کے لئے سب کچھ کر سکتے تھے کیا اب اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اس کے احکام اس کے غافل بندوں تک پہنچا دو؟ تم کو آام نہیں لینا چاہئے جب تک کم از کم دس مسلمانوں تک وہ تمام احکام نہ پہنچا دو جو اس رسالہ میں درج ہیں، اور چاہئے کہ ان میں سے ہر ایک کو وصیت کرو کہ اسی طرح دس آدمیوں تک پہنچا دے۔ فلیبلغ الشاهد الغائب، فان الشاهد عسی أن یبلغ من هو اوعی له منه۔

البلاغ پریس کلکتہ



کی تاریکی جو اُنپر پھیلتی ہے ، وہ اسی راہ کی شام ہوتی ہے ۔ اُنکی زندگی پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جو جہاد کے مرتبہ علیا و فضیلة عظمیٰ کے اجر و ثواب سے خالی ہو ۔

کائنات ہستی کے ہر عمل کی طرح یہ عمل بھی تین عنصروں سے مرکب ہے ۔ دل ، زبان ، اعضا و جوارح ۔ سو اُنکا دل ہمیشہ عشق حق اور عزم مقصد کی آتش شوق میں پھنکتا رہتا ہے ۔ اُنکی زبان ہمیشہ اعلان حق ، ردِ عیوۃ الی اللہ میں سرگرم رہتی ہے ۔ اُنکے ہاتھ اور اُنکے تمام جوارح کبھی اس راہ کی سعی و محنت سے نہیں تھکتے ۔ اسکے بعد جہاد کا کونسا کام رہ گیا جو انہوں نے نہیں کیا ؟ اور اس راہ کا کونسا مرتبہ رہ گیا جو انہوں نے نہیں پایا ؟ و ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء و اللہ ذوالفضل العظیم !

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں ؟

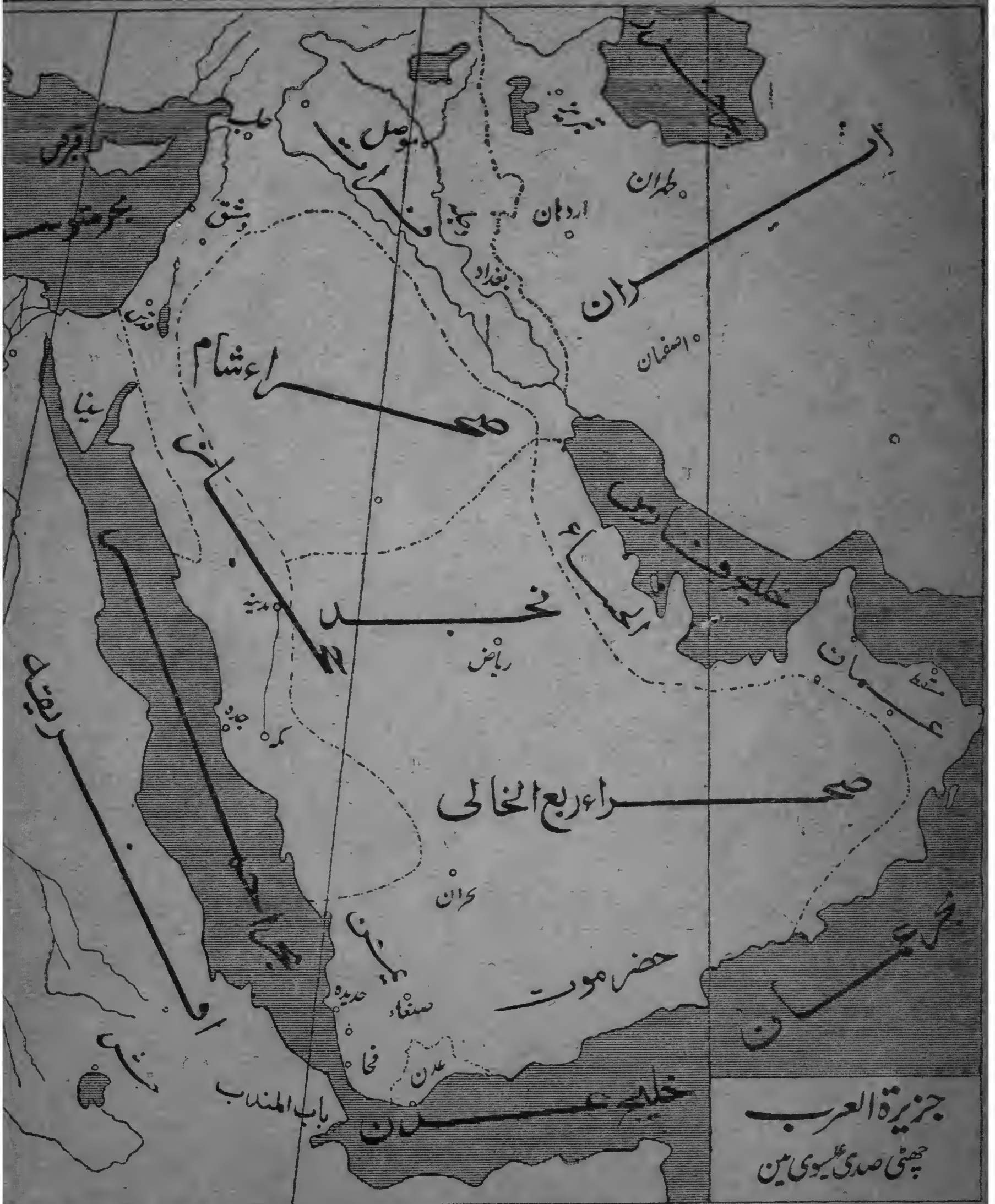
جہاد کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کر ! انسانی اعمال کی کونسی بڑائی اور عظمت ہے جو اس کے دائرہ سے باہر رہ گئی ؟ اور نوع انسانی کی ہدایت و سعادت کا کونسا عمل حق ہے جو اس کے بغیر انجام پا سکتا ہے ؟ پس یہی وجہ ہے کہ شریعت نے اسکی اہمیت و فضیلت پر اسقدر زور دیا کہ ساری نیکیاں ساری عبادتیں اس سے پیچھے رہ گئیں ۔ سب کا حکم شاخوں کا ہوا ۔ جڑ یہی عمل قرار پایا ۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل فضیلت ہو سکتی ہے کہ خود اللہ کے رسول نے فرمایا : ” والذی نفسی بیدہ “ لودت انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا “ ثم اقتل ثم احیا “ ( رواہ البخاری ) خدا کی قسم ! اگر ممکن ہوتا تو میں یہ چاہتا کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں ، پھر زندہ ہوں ۔ پھر قتل کیا جاؤں ، پھر زندہ ہوں ۔ پھر قتل کیا جاؤں ، پھر زندہ ہوں ۔ تاکہ اُسکی راہ میں جان دینے کی لذت و سعادت ایک ہی مرتبہ میں ختم نہ ہو جائے !

تمنت سلیمہ ان نموت بعہا

راہوں شی عندنا ما تمت !



# اخرجوا اليهود والنصارى من جزيرة العرب (الحديث)



جزيرة العرب  
چھٹی صدی عیسوی میں

مقابلہ جاری رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائیگا تو دشمن مسلمانوں کو چین سے بیٹھنے نہ دینگے اور اسلام کی اشاعت اور اسکے مشن کی تبلیغ و تکمیل میں ہمیشہ مانع ہونگے۔

فقہاء کی اصطلاح میں فرائض شرعیہ کی دز قسمیں ہیں۔ ”کفایہ“ اور ”عین“۔ یہ وہی اعمال انسانی کی قدرتی تقسیم ہے جسکو ”جماعتی فرائض“ اور ”شخصی فرائض“ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ”فرض کفایہ“ سے مقصود وہ احکام ہیں جو بہ حیثیت جماعت و اجتماع قوم پر فرض ہیں۔ نہ کہ بہ حیثیت فرد و انفراد۔ یعنی ایسے فرائض جو مسلمان جماعتوں اور آبادیوں کے ذمے عائد کر دیے گئے ہیں کہ انکا انتظام کر دیں۔ پس انتظام ہو جانا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر فرد بہ ذات خاص اُس میں حصہ بھی لے۔ اگر ایک گروہ نے ایک وقت میں انجام دیدیا تو باقی مسلمانوں پر سے اُسوقت ساقط ہو گیا۔ جیسے تجہیز و تکفین اموات اور نماز جنازہ۔ البتہ ایک مسلمان کیلئے عزیمة اسی میں ہوگی کہ اداء فرض کفایہ میں بھی شخصاً حصہ لے۔

فرض کفایہ میں شریعت کا خطاب اشخاص سے نہیں ہے بلکہ جماعت سے ہے پس ہر مسلمان جماعت اور آبادی کو اُسکا انتظام کر دینا چاہیے۔ جب انتظام ہو گیا تو اس آبادی کے بقیہ افراد پر اسکا وجوب باقی نہ رہیگا۔ دوسری قسم ”اعیان“ کی ہے۔ یعنی وہ فرائض جنکی فرضیت جماعت پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے۔ اور ایک کے کرنے سے دوسرا بری الذمہ نہیں ہو جاسکتا۔ جیسے پانچ وقت کی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔

شراً قتال کی پہلی صورت (یعنی ہجوم و مقابلہ کا دائمی سلسلہ) فرض کفایہ ہے بحکم ”وما کان المؤمنون لیذفروا کافۃ“۔ ضروری نہیں کہ بہ یک وقت ہر مسلمان اسمیں حصہ لے۔ ہر عہد اور ہر ملک میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو یہ فرض انجام دیتی رہے۔ اگر ایک جماعت انجام دے رہی ہے تو کافی ہے۔ جو مسلمان شریک ہوگا، اُسکے لیے بڑا اجر ہے۔ جو شریک نہ ہوگا، اُسکے لیے کوئی گناہ نہیں۔ صاحب ہدایہ (جسکا انگریزی ترجمہ بھی ہوچکا ہے اور ہندوستانی عدالتوں میں محمدن لا کی بنیادی کتاب ہے) لکھتے ہیں :



|                                   |                             |
|-----------------------------------|-----------------------------|
| فصل - اقسام ثلاثہ قتل مسلم        | ۸۱                          |
| ر حمل سلاح                        | ۸۶                          |
| فصل - واقعہ امام حسین علیہ السلام | ۸۹                          |
| فصل - شرط قرشیہ                   | باب                         |
| ( الامة من قریش )                 |                             |
| فصل - تحقیق امارۃ قریش و شرط      | ۹۱                          |
| قرشیہ                             | ۱۰۵                         |
| فصل - دعوت اجماع                  | باب - خلافت آل عثمان        |
| فصل - چند لمحات تاریخیہ           | ۱۱۵                         |
| فصل - خلافت و امامت سلاطین        | عثمانیہ                     |
| ۱۱۸                               | فصل - مسلمانان ہند اور      |
| ۱۲۴                               | خلافت سلاطین عثمانیہ        |
| فصل - قرون متوسطہ و اخیرہ         | ۱۳۰                         |
| میں مرکزی حکمرانی                 | فصل - ترکان عثمانی اور      |
| ۱۳۱                               | عالم اسلامی                 |
| باب                               | ( فریضہ عظیمہ دفاع )        |
| ۱۳۸                               | فصل - حقیقت حکم دفاع        |
| ۱۴۱                               | فصل - فضائل دفاع            |
| ۱۵۰                               | فصل - عہد نبوت کا ایک واقعہ |
| ۱۵۵                               | فصل - ایک عام غلط فہمی      |
| ۱۵۹                               | فصل - احکام قطعہ دفاع       |
| ۱۶۷                               | فصل - ترتیب وجوب دفاع       |

|                 |                                  |
|-----------------|----------------------------------|
| خطبہ افتتاحیہ   | باب                              |
| ( مسئلہ خلافت ) |                                  |
| ۱               | فصل - حقیقت خلافت -              |
| ۵               | فصل - خلافت خاصہ و خلافت ملوکي   |
| ۸               | فصل - عہد اجتماع و ائتلاف و      |
|                 | دور اشتات و انتشار               |
| ۱۴              | فصل - جمع و تفرقہ قری و مناصب    |
| ۱۹              | فصل - اطاعت خلیفہ و التزام جماعت |
|                 | مطلب - تحقیق معنی ” اولوالامر “  |
| ۲۹              | فصل - شرح حدیث حارث اشعری        |
| ۳۹              | فصل - جماعت و التزام جماعت       |
| ۴۲              | فصل - شرائط امامت و خلافت        |
| ۵۰              | فصل - نصوص سنہ و اجماع امت       |
|                 | فصل - اذا بویع الخلیفتین فاقتلوا |
| ۵۷              | اخرهما                           |
|                 | فصل - اجماع امت و جمهور فقہاء    |
| ۵۸              | و اعلام                          |
|                 | فصل - سنی اور شیعہ دونوں         |
| ۶۳              | متفق ہیں                         |
|                 | فصل - بعض کتب مشہورہ عقائد       |
| ۶۵              | و فقہ                            |
|                 | باب                              |
|                 | ( حکم حمل سلاح علی المسلم )      |
|                 | فصل - من حمل علینا السلاح        |
| ۶۸              | فلیس منا                         |



مسلمانوں کی مخالفت میں خزانوں کے خزانے خرچ کر دالتے ہیں :

والذین کفرا ینفقون اموالہم جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی، تورہ حق لیصدرا عن سبیل اللہ - کی مخالفت میں اپنا مال خرچ کر رہے ہیں۔

پس مسلمانوں کی بھی سب سے بڑی اسلامی و ایمانی خصلت یہ قرار پائی کہ :

والمومنون والمومنات بعضهم مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں باہم اولیاء بعض - ( ۷۲ : ۹ ) ایک دوسرے کی رفیق اور مددگار ہیں !

اور اسی بنا پر مسلمانوں کا فرض تھا کہ اگر دنیا کے کسی ایک اسلامی حصہ پر غیر مسلم حملہ کریں اور وہاں کے مسلمان اُنکے مقابلہ کی کافی قوت نہ رکھتے ہوں، یا بالکل مغلوب و مقہور ہو گئے ہوں، تو تمام دوسرے حصص عالم کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ انکی یارپی و اعانت کیلئے اُسی طرح اُتھہ کھڑے ہوں - جس طرح خود اپنی آبادیوں کی حفاظت کیلئے اُتھتے - اور اپنی جان و مال سے اُسی طرح مدد دیں، جس طرح خود اپنے گھر بار کی حفاظت کیلئے مدد دیتے -

یہ نہ کوئی نیا مذہبی اجتہاد ہے، نہ کوئی پولیٹیکل فتویٰ - تمام دنیا کے مسلمان فقہ و قوانین شریعت کی جو کتابیں صدیوں سے پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں، اور جو چھپی ہوئی بازاروں میں ہر جگہ ملتی ہیں، اور جن پر خود ہندوستانی عدالتوں میں عمل کیا جا رہا ہے، اُن سب میں یہ احکام موجود ہیں - اسلامی دینیات کا کوئی طالب علم ایسا نہیں ملیگا جو ان حکموں سے بے خبر ہو - اور پھر ان سب کے اوپر مسلمانوں کی کتاب اللہ ہے جو اپنے ہر پارہ اور ہر سورۃ کے اندر اس حکم کا اعلان اور اس قانون کی پکار تیرہ صدیوں سے بلند کر رہی ہے - نوع انسانی کی کامل بیس نسلیں گزر چکیں، اور یہ احکام اپنی یکساں، غیر مبدل، اُتل، اور لا انتہا طاقت کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں !

”جہاد“ کی بہت سے قسموں میں سے ایک قسم ”قتال“ یعنی لڑائی ہے - اور اُسکی بھی دو صورتیں ہیں - ”ہجوم“ اور ”دفاع“ - یعنی افسو ( Offensive ) اور دیفنسو ( Defensive ) دراصل ہجوم کی بنیاد بھی دفاع ہی ہے - یعنی جب تک دنیا میں عالم گیر صلح و امن اور عام اخوت قائم نہ ہو جائے، ضروری ہوا کہ حریف و مفسد قوتوں سے ہمیشہ

مسلمان اسکو انجام دیتے رہیں بلکہ ہر ملک کے مسلمانوں میں سے اتنے مسلمانوں کو انجام دینا چاہیے جو حصول مقصد جہاد کیلئے کافی ہو۔ پس ایک ملک میں سلسلہ جہاد کے بقاء سے دوسرے ملک کے مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے آپر بدستور اسکا رجوب باقی رہیگا اور بصورت ترک وہاں کے تمام مسلمان گنہ گار ہونگے۔ گذشتہ پانچ صدیوں سے مسلمانان عالم نے اس فرض شرعی کو فراموش کر دیا ہے۔ اور صرف کسی ایک حصے کے مسلمانوں ہی کے ذمہ اس کو چھوڑ کر خود فارغ البال ہو کر بیٹھ رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اعداء حق کو صدیوں کی صدیاں عروج و ظہور کیلئے مل گئیں، اور مسلمانوں کیلئے تمام کرۂ ارضی میں کوئی ایک گوشہ بھی امن و سکون کا باقی نہیں رہا

و ما کان اللہ لیظلمہم و لکن کانوا انفسہم یظلمون !

اور فتح الباری میں ہے ”ہو فرض کفایۃ علی المشہور“ الا ان تدعو الحاجة الیہ“ اس کے بعد کہا ”و ان جنس جہاد الکفار متعین علی کل مسلم“ اما بیدہ، و اما بلسانہ، و اما بما لہ، و اما بقلبہ“ [جلد ۶ : ۲۸] یعنی جہاد کی یہ قسم فرض کفایہ ہے۔ باقی رہا نفس جہاد، تورہ ہر مسلمان پر فرض عین ہے، کسی کیلئے ہاتھ سے، کسی کیلئے مال سے، کسی کیلئے دل سے۔ یعنی جس وقت ایک گرہ ہاتھ اور تلوار سے مشغول جہاد ہوگا تو بقیہ مسلمانوں پر دل اور زبان سے انکے لیے سعی و اعانت فرض ہوگی۔ اور مال و دولت والوں کا فرض ہوگا کہ مال سے مدد کریں۔

اسی طرح اقناع میں ہے ”ہو فرض کفایۃ اذا قام بہ من بکفی سقط وجوبہ عن غیرہم“ ابن ادریس اُسکی شرح میں لکھتے ہیں ”و معنی الکفایۃ فی الجہاد ان ینہض الیہ قوم یکفون فی جہادہم“ اما ان یکونوا جند الہم دراہین او یکونوا اعدوا انفسہم لہ تبرعاً و تکران فی الثغور من یدفع العذر عنہا و یبعث فی کل سفۃ جیشا یغیرون علی العذر فی بلادہم“ (جلد ۱ - ۶۵۱)

یہ صورت تو اُس قتال کی ہے جسکی صورت حملہ و ہجوم کی ہوگی، دوسری قسم ”دفاع“ ہے۔ یعنی جب کوئی غیر مسلم جماعت مسلمانوں کی آبادیوں اور حکومتوں پر حملہ کا قصد کرے، تو اُس حملہ و تسلط کو ہر طرح مقابلہ کر کے روکنا، اور اسلامی ملکوں اور آبادیوں کو غیر مسلموں کی حکومت اور ہر طرح کے قبضہ و اثر سے محفوظ رکھنا۔



جہاد فرض کفایہ ہے - جب مسلمانوں کی کوئی ایک جماعت اس کے لیے کھڑی ہوگئی، تو باقی مسلمانوں کیلئے واجب نہ رہا - لیکن اگر کوئی گھرہ بھی اس کے لیے نہ اُٹھا، تو پھر تمام مسلمان جہاد ترک کر دینے کی وجہ سے گناہگار ہونگے - کیونکہ فرض پوری قوم پر ہے -

لیکن جماعت سے کیا مقصود ہے ؟ تمام دنیا کے مسلمانوں کی مجموعی جماعت یا ہر ہر ملک اور اقلیم کی جماعت ؟ اس کی تشریح سعدی چلی حاشیۂ عنایۃ میں کرتے ہیں :

ہدایہ کی عبارت کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ اگر ایک ملک کے مسلمانوں نے یہ فرض ادا کر دیا تو دوسرے ملک کے مسلمانوں پر سے بھی ساقط ہو گیا - مثلاً اگر روم کے ترکوں نے جہاد قائم رکھا تو ہندوستان کے مسلمانوں پر سے ساقط ہو گیا - کیونکہ مقصود قیام جہاد سے یہ ہے کہ مسلمانوں پر سے دشمنوں کے حملوں اور شر کو دور کیا جائے - ظاہر ہے کہ مسلمانان روم کے جہاد کرنے سے مسلمانان ہند محفوظ نہیں ہو جاسکتے - وہ تو جد بھی ہونگے جب خود اپنے ملک میں اس کا انتظام کریں - پس مطلب یہ ہے کہ ہر ملک کے مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے - اگر اس ملک کے تمام مسلمانوں میں سے ایک جماعت یہ فرض انجام دیتی رہی، تو رہانکے بقیہ مسلمانوں پر سے ساقط ہو جائیگا - لیکن دوسرے ملکوں کے مسلمانوں پر فرضیت باقی رہیگی - قرآن میں ہے :

قاتلوا الذین یلونکم من الکفار - اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان مسلمانوں پر جو دشمنوں سے قریب ہوں، قتال واجب ہے - انتہی -

الجہاد فرض علی الکفایہ - اذا قام فریق من الناس ، سقط عن الباقین \* \* فان لم یقم به أحد ، اثم جمیع الناس بترکہ - لان الوجوب علی الكل ( کتاب السیر )

اقول لا ینبغی ان یفہم منہ ان الوجوب علی جمیع اهل الارض كافة حتی یسقط عن اهل الهند بقیام اهل الررم ، ان لا یندفع بقیامهم الشر عن الهندود المسلمین - ر ان قولہ تعالی قاتلوا الذین یلونکم من الکفار یدل علی ان الوجوب علی اهل کل قطر یقربون الکفار - ( مجموعۃ فتح القدیر - ۴ : ۲۸۰ )

اس سے واضح ہو گیا کہ اس فرض میں خطاب تمام مسلمانان عالم سے نہیں ہے بلکہ ہر جماعت اور ملک کے مسلمانوں سے ہے - اور علی الکفایہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں سے کچھ

حملہ و ہجوم کے دائمی جہاد میں ( جب قتال فرض کفایہ ہے ہوتا ) بعض جماعتیں مستثنیٰ ہیں - مثلاً عورتیں اور نوکر - عورتوں کے لیے شوہر کی خدمت اور نوکر کیلئے آقا کی خدمت مقدم ہے - لیکن اگر دفاع کی صورت پیش آگئی ہو تو اسکی فرضیۃ ایسی ہمہ گیر اور بالاتر ہے کہ بچوں اور معذروں کے سوا کوئی گروہ 'کوئی فرد' مستثنیٰ نہیں ہوسکتا - بیوی بلا شوہر کی اجازت کے نکل کھڑی ہو - غلام بلا آقا کی اذن کے مشغول جہاد ہو جائے - ہدایہ میں ہے :

فان هجم العدو على بلد  
رجب على جميع الناس  
الدفع، تخرج المرأة بغير اذن  
زوجها و العبد بغير اذن  
المولى - لانه صار فرض  
عين، و ملك اليمين ورق  
النكاح لا يظهر في حق  
فروض الاعيان كما في الصلوة  
و الصوم - بخلاف ما قبل  
النفير، لان بغيرهما مقنعا  
فلا ضرورة الى ابطال حق  
المولى و الزوج -  
( کتاب السیر )

لیکن اگر دشمنوں نے کسی شہر پر حملہ کیا ' تو پھر تمام لوگوں پر دفاع فرض ہوگیا - بیوی بلا شوہر کی اجازت کے اور غلام بلا آقا کی اذن کے دفاع میں حصہ لے - اسلیے کہ اب جہاد فرض عین ہوگیا ' اور جو فرائض ایسے ہیں ' انپر مالکیت اور زوجیۃ کے حقوق موثر نہیں ہوسکتے - جیسے نماز اور روزہ - اگر نماز کا رقت آگیا ہے تو عورت پر نماز فرض ہوگئی - شوہر کی اذن پر موقوف نہیں - البتہ نفیر سے پہلے یہ صورت نہ تھی - اسوقت عورتوں اور غلاموں کی شرکت کے بغیر بھی یہ فرض ادا ہوسکتا تھا - پس ضرورت نہ تھی کہ شوہر اور آقا کے حقوق باطل کیے جائیں -

ہم نے ہدایہ اور متداول کتب فقہ کی عبارتیں سب سے پہلے اسلیے نقل کیں کہ ان کتابوں کے نام سے ہندوستان کی سرکاری عدالتیں بھی آشنا ہیں - اور انگریزی میں محمدن لا پرجسقدر کتابیں لکھی گئی ہیں ' سب میں ان کا حوالہ موجود ہے - پس بآسانی دیکھ لیا جاسکتا ہے کہ فی الحقیقت اسلام کے احکام شرعی یہی ہیں یا نہیں ؟ ورنہ تمام کتب تفسیر و حدیث میں بھی یہ احکام موجود ہیں - امام بخاری نے باب باندھا ہے " رجب النفیر " یعنی جب حفظ ملت کی ضرورت پیش آجائے تو قتال کیلئے سب کا اٹھ کھڑا ہونا واجب ہے - پھر آیت " انفرأ خفافاً و ثقلاً " اور " مالکم اذا قيل لكم انفرأ " الخ سے رجب پر استدلال کیا ہے - اسکے بعد حضرت ابن عباس کی روایت درج کی ہے " لا هجرة بعد الفتح

یہ فرض کفایہ نہیں ہے ، بلکہ بالاتفاق مثل نماز روزہ کے ہر مسلمان پر فرض عین ہے ۔ ایک گروہ کے دفاع کرنے سے باقی مسلمان بری الذمہ نہیں ہو جاسکتے ۔ جس طرح ایک گروہ کے نماز پڑھ لینے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ نماز ساقط نہیں ہو جاتی ۔ اسی ہدایہ میں ہے ۔

”الا ان يكون النفير عاماً فحينئذ يصير من فروض الاعيان“

نفیر ”نفر“ سے ہے ۔ ”نفر“ کے معنی ہیں تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ درّ جانا ۔ پس قوم کے ایسے ہلارے اور اجتماع پر جو لڑائی کیلئے ہو ”نفیر“ کا اطلاق ہوا ۔ قرآن میں ہے ۔ انفررا خفافاً وثقالاً ۔ اور الا تنفروا ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حفظ و دفاع کی ضرورت سے عام اجتماع و قیام کا وقت آ گیا ، تو پھر جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے ۔

ابن ہمام اسکی شرح میں لکھتے ہیں :

هذا اذا لم يكن النفير عاماً ، فرض کفایہ کی صورت اسوقت تک ہے فاذا كان النفير عاماً بان کہ نفیر کی حالت نہو ۔ لیکن اگر ہجروا علی بلدة من بلاد مسلمانوں کے شہروں میں سے کسی شہر المسلمین ، فیصير من فروض پر غیر مسلموں نے حملہ کر دیا ، تو اسوقت الاعیان سواء كان المستنفر عدلاً او فاسقاً ۔ جنگ کرنا ہر مسلمان فرد پر فرض عین ہو جائیگا ۔ خواہ جنگ کے لیے دعوت دینے والا عادل ہو یا فاسق ۔

( فتح القدیر - ۴ : ۲۸۰ )

اور عذایہ میں ہے :

ثم الجهاد يصير فرض عین اور اگر نفیر عام کی حالت ہو ، تو پھر عند النفير العام علی من جہاد کرنا ان مسلمانوں پر فرض عین یقرب من العدو وهو ہو جائیگا جو دشمن سے قریب ہوں اور یقدر: علیہ ۔ ( مجموعہ اس پر قابو رکھتے ہوں ۔

فتح القدیر - ۴ : ۲۸۱ )

اسی طرح سراجیہ ، در المختار ، شامی وغیرہ تمام کتب فقہ میں ہے ۔ ”اذا جاء النفير انما يصير فرض عین علی من یقرب من العدو“ اور ”الجهاد فرض کفایة اذا لم يكن النفير عاماً“ فاذا اقام به البعض ، یسقط عن الباقيین ۔ فاذا صار النفير عاماً ، فحينئذ يصير من فروض الاعیان“ الخ ۔

کی بدنظمی و بدحالی ہے ۔ انکا فرض ہوگا کہ داعی و امیر کا انتظام کریں یہی حال تمام فرائض کا ہے ۔ نماز کا جب رقت آجائے تو خواہ مؤذن کی مددے ” حی علی الصلاة “ سناؤں دے یا نہ دے ، رقت کا آجانا وجوب کیلئے کافی ہوتا ہے ۔

## فصل

( ترتیب وجوب دفاع )

جب دفاع کا فرض عین ہونا راضع ہو گیا ، تو اب معلوم ہونا چاہیے کہ اس فرض کی انجام دہی کیلئے شریعت نے ایک خاص ترتیب اختیار کی ہے ۔ عقل و حکمت کی بنا پر رہی اس معاملہ کی قدرتی اور صحیح ترتیب ہوسکتی تھی ۔ صورت اُسکی یہ ہے کہ جب غیر مسلموں نے کسی اسلامی حکومت اور آبادی کا قصد کیا ، تو اُس شہر کے تمام مسلمانوں پر بہ مجرد قصد اعداء ، دفاع فرض عین ہو گیا ۔ باقی رہے دیگر ممالک کے مسلمان ، تو اگر زیر جنگ مقامات کے مسلمان دشمن کے مقابلہ کے ایسے کافی قوت نہیں رکھتے ۔ دشمن بہت زیادہ قوی ہے ۔ یا رکھتے ہیں اور غفلت و تساہل کرنے لگے ہیں ، تو اُس حالت میں یکے بعد دیگرے تمام دنیا کے مسلمانوں پر بھی دفاع فرض عین ہو جائیگا ۔ بالکل اسی طرح جیسے نماز اور روزہ ۔

مگر صورت اُس کی یوں ہوگی کہ پہلے اُن مقامات سے قریب تر مقام کے مسلمانوں پر واجب ہوگا ۔ پھر اُن سے قریب تر پر ۔ پھر اُن سے قریب تر پر ۔ حتیٰ کہ مغرب و مشرق جنوب و شمال ، تمام اکناف عالم کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے فرضیت عائد ہو جائیگی ۔

اُسوقت سارے فرائض ، سارے وظائف ، سارے کام ، ملتوی کر دینے چاہیئیں ۔ بمجرد اطلاع ہر مسلمان کو اپنی تمام قوتوں اور تمام سامانوں کے ساتھ وقف دفاع ملت و جہاد فی سبیل اللہ ہو جانا چاہیے ۔ اور قیام دفاع کے لیے شرعاً جن جن رسائل و انتظامات کی ضرورت ہے ، سب کو مل جلکر انکا انصرام کرنا چاہیے ۔ اگر کسی آبادی میں مسلمانوں کا کوئی امام و پیشوا نہیں ہے جو نظم و قیام اپنے ہاتھ میں لے تو سب کا فرض ہوگا کہ پہلے امام



و لکن جہاد و نیتہ و اذا استنفرتم فاستنفرورا ” یعنی وہ جو اراٹل اسلام میں ایک خاص طرح کی ہجرت فرض ہوئی تھی ، تو فتح مکہ کے بعد اسکی ضرورت نہیں رہی ۔ البتہ جہاد اور عزم جہاد قیامت تک باقی ہے ۔  
تو جب جمع ہونے کیلئے پکارے جاؤ ، جمع ہو جاؤ اور جہاد کرو ۔

فتح الباری میں ہے ” الا ان تدعوا الحاجة اليه كان يدهم العدو ويتعين على من عينه الامام “ ( جلد ۶ : ۲۸ )

اور موطا امام مالک میں ہے ” اذا كان الكفار مستقرين ببلاد هم فالجهاد فرض كفاية “ ان اقام به بعضهم سقط الحرج عن الباقيين ” و اذا قصدوا بلادنا و استنفر الامام المسلمين ” و جب علی الاعیان ” یعنی اگر کفار اپنے اپنے ملکوں میں ہیں ۔ مسلمانوں پر حملہ آور نہیں ہوئے ہیں ۔ تو اس حالت میں جہاد فرض کفایہ ہے ۔ لیکن جب وہ ہمارے ملکوں کا قصد کریں اور امیر اسلام نفیر کا اعلان کرے تو پھر فرض عین ہو جائیگا ۔

چونکہ جابجا ” نفیر “ کا لفظ آیا ہے ، اسلئے یہ بات بھی صاف ہو جانی چاہیے کہ نفیر عام سے مقصود کیا ہے ؟ یہ مقصود ہے کہ دفاع کی ضرورت پیش آ جائے اور ہر شخص کو اسکا علم ہو جائے ۔ یا یہ مقصود ہے کہ جب تک کوئی بلانے والا مسلمانوں کو نہ بلائیگا ، نفیر عام کی حالت پیدا نہ ہوگی ؟ اسکا جواب شاہ ولی اللہ نے موطا کی شرح میں دیدیا ہے :

” نزدیک استنفر جہاد فرض علی الاعیان می شود ۔ استنفر را چوں منقم کنیم حاصل شود حالتی کہ مقتضای استنفر شدہ است از قصد کفار بلاد مارا ، و قیام حرب در میان جیوش مسلمین و کفرین ، و عدم کفایہ ازاں مسلمانان ، و انچه بداں ماند “ ( مسوی جلد ۲ - ۱۲۹ )

شاہ صاحب کے بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نفیر کی صورت کیا ہے ؟ تو یہ ضرور نہیں کہ کوئی خاص شخص مسلمانوں کو یہ کہہ کر پکارے کہ آؤ جہاد کرو ۔ مقصود یہ ہے کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے جو مقتضای نفیر ہے ۔ پس جب غیر مسلموں نے اسلامی ملکوں کا قصد کیا اور مسلمانوں اور کافروں میں لڑائی شروع ہوگئی تو جہاد فرض ہوگیا ، اور جب دشمنوں کی طاقت ان ممالک کے مسلمانوں سے زیادہ قوی ہوئی اور انکے شکست کا خوف ہوا ، تو یکے بعد دیگرے تمام مسلمانان عالم پر فرض ہوگیا ۔ خواہ کوئی پکارے یا نہ پکارے ۔ پکارنے والا نہیں ہے تو یہ مسلمانوں



ہر ح یہ فرض عائد ہوگا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے اسکا وجوب منتقل ہوتا جائیگا۔ حتیٰ کہ تمام مسلمانوں پر مشرق میں ہوں یا مغرب میں، دفاع کے لیے اُٹھ کر ہونا فرض ہو جائیگا۔ انتہی۔

ایسا ہی تمام کتب معتمدہ فقہ و حدیث میں ہے۔ عبارتوں کے نقل و ترجمہ میں طول ہوگا۔ رد المحتار وغیرہ شروح میں ذخیرہ سے نقل کیا ہے: ”فاما من ورائهم ببعد من العذر“ فہو فرض کفایۃ علیہم حتیٰ یسعمہم ترکہ، اذا لم یحتیج الیہم بان عجز من کان یقرب من العذر عن المقارمۃ، ار لم یعجزوا عنها لکنہم تکاسلوا، فانه یفترض علی من یلیہ فرض كالصلوة والصوم لا یسعمہم ترکہ، و ثم و ثم، الی ان یفترض علی جمیع اهل الاسلام شرقاً و غرباً“

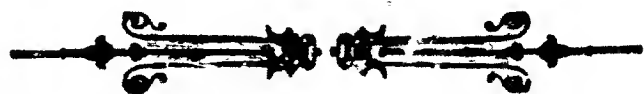
اور عنایہ شرح ہدایہ میں ہے ”ثم الجہاد یصیر فرض عین عند النفیۃ العام علی من یقرب من العذر و ہو یقدر علیہ“ و اما من ورائهم فلا یكون فرضاً علیہم الا اذا احتیج الیہم، اما لعجز القریب و اما للتکاسل، فحینئذ یفرض علی من یلیہم“ الخ۔

اور شرح موطا میں ہے ”فان لم تقع الکفایۃ بمن نزل بہم“ یجب علی من بعد منهم من المسلمین عونہم“ (جلد ۲ - ۱۲۹)

البتہ یاد رہے کہ یہ دفاع کی عام صورت ہے۔ لیکن دو حالتیں شرعاً ایسی بھی ہیں جن میں وجوب دفاع کیلئے یکے بعد دیگرے اس ترتیب اور الاقرب فالاقرب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بیک وقت اور بیک دفعہ ہی تمام مسلمانان عالم پر دفاع فرض ہو جاتا ہے۔

پہلی حالت یہ ہے کہ خلیفۂ رقت تمام مسلمانان عالم سے طالب اعانت ہو یا اُسکی بے بسی و بیچارگی کی حالت ایسی ہو جائے کہ بلا تمام مسلمانان عالم کی مجموعی اعانت کے مخلصی و فتح ممکن نہ ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اسلام کے عین مرکزی مقام یعنی جزیرۂ عرب پر غیر مسلم حملہ آور ہوں جنکو ہمیشہ غیر مسلم اثر سے محفوظ رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں بسا ہو۔ تفصیل اسکی آگے آتی ہے۔



ر امیر کا انتظام کریں - پھر جن جن وسائل کی ضرورت ہو اُن کے حصول کے لیے ہر ممکن تدبیر و سعی کام میں لائیں - اگر ایسا نہ کیا گیا تو سب اللہ کے حضور جوابدہ ہونگے - سب مبتلائے معصیت و فسق ہونگے - ایسی معصیت ' ایسا فسق ' ایسا عدوان ' ایسا نفاق ' جس کے بعد صرف کفر ہی کا درجہ ہے -

اگر قیامت کا آنا حق ہے ' اور یہ جھوٹ نہیں کہ خدا کا وجود ہے ' تو مسلمانان عالم کے پاس اُسوقت کیا جواب ہوگا ' جب قیامت کے دن پوچھا جائیگا کہ تم کترور کی تعداد میں زندہ و سلامت موجود تھے - تمہارے جسموں سے روح کھینچ نہیں لی گئی تھی - تمہاری قوتوں کو سلب نہیں کر لیا گیا تھا - تمہارے کان بہرے نہ تھے نہ ہاتھ کتے ہوئے اور پانوں لنگرے - پھر تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تمہارے سامنے تمہارے بھائیوں کی گردنوں پر دشمنوں کی تلواریں چل گئیں - وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر ہو گئے - اسلام کی آبادیاں غیروں کے قبضہ و تسلط سے پامال ہو گئیں - پر نہ تو تمہارے دلوں میں جنبش ہوئی ' نہ تمہارے قدموں میں حرکت ہوئی ' نہ تمہاری آنکھوں نے محبت و ماتم کا ایک آنسو بخشا ' اور نہ تمہارے خزانوں پر سے بخل و زر پرستی کے قفل توتے ؟ تم نے چین اور آرام کے بستروں پر لیت لیت کر بربادی ملت اور پامالی اسلام کا یہ خونین تماشہ دیکھا ' اور اُس بے درد تماشا کی طرح بے حس و حرکت تکتے رہے جو سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر دہکتے ہوئے جہازوں اور بہتی ہوئی لاشوں کا نظارہ کر رہا ہو ! ارضیتم بالحیاة الدنیا من الآخرة ؟ فما حیاة الدنیا الا قلیل !

فتح القدیر میں ہے :

اگر غیر مسلموں نے حملہ کیا تو پھر اُس شہر کے تمام باشندوں پر دفاع کے لیے اُٹھ کھڑا ہونا فرض عین ہو جائیگا - اور اگر دشمن زیادہ طاقتور ہیں اور مقابلہ کیلئے وہاں کے مسلمان کافی نہیں ' تو جو مسلمان اُن سے قریب ہونگے ' ان پر بھی فرض عین ہو جائیگا - اور اگر وہ بھی کافی نہیں ' یا انہوں نے سستی کی ' یا دانستہ انکار کیا ' تو پھر اُن تمام لوگوں پر جو اُن سے قریب

فیجب علی جمیع اهل تلك البلدة النفر ' و کذا من یقرب منهم ان لم یکن باهلها کفاية ' و کذا من یقرب ممن یقرب ان لم یکن بمن یقرب کفاية ' او تکسلوا ' او عصوا ' و هکذا الی ان یجب علی جمیع اهل الاسلام شرقاً و غرباً - ( جلد ۴ - صفحہ ۸۲۰ )

”مرکز ارضی“ سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی دعوت ایک عالمگیر اور دنیا کی بین الملی دعوت تھی۔ وہ کسی خاص ملک اور قوم میں محدود نہ تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کے اجزاء تمام کرۂ ارضی میں بکھر جانے اور پھیل جانے والے تھے۔ پس ان بکھرے ہوئے اجزاء کو ایک دائمی متحدہ قومیت کی ترکیب میں قائم رکھنے کیلئے ضروری تھا کہ کوئی ایک مقام ایسا مخصوص کر دیا جاتا، جو ان تمام متفرق و منتشر اجزاء کیلئے اتحاد و انضمام کا مرکزی نقطہ ہوتا۔ سارے بکھرے ہوئے اجزاء وہاں پہنچ کر سمت جاتے۔ تمام پھیلی ہوئی شاخیں وہاں اکٹھی ہو کر جڑ جاتیں۔ ہر شاخ کو اُس جڑ سے زندگی ملتی، ہر نہر اُس سرچشمہ سے سیراب ہوتی۔ ہر ستارہ اُس سورج سے روشنی اور گرمی لیتا۔ ہر درخت اُس سے قرب پاتی۔ ہر فصل کو اُس سے مواصلت ملتی۔ ہر انتشار کو اُس سے اتحاد و یگانگی حاصل ہوتی۔

وہی مقام تمام امت کی تعلیم و ہدایت کیلئے ایک وسطی درسگاہ کا کام دیتا۔ وہی تمام کرۂ ارضی کی پھیلی ہوئی کثرت کیلئے نقطۂ وحدت ہوتا۔ ساری دنیا تہذیبی پڑ جاتی، پر اُسکا تنور کبھی نہ بجھتا۔ ساری دنیا تاریک ہو جاتی، مگر اُسکی روشنی کبھی گل نہ ہوتی۔ اگر تمام دنیا ارلاں آدم کے باہمی جنگ و جدال اور فتنہ و فساد سے خون ریزی کی درزخ بن جاتی، پھر بھی ایک گوشۂ قدس ایسا رہتا جو ہمیشہ امن و رحمت کا بہشت ہوتا، اور انسانی فتنہ و فساد کی پرچھائیں بھی وہاں نہ پڑ سکتی۔

اُسکا ایک ایک چپہ مقدس ہوتا، اُسکا ایک ایک کونہ خدا کے نام پر محترم ہو جاتا، اُسکا ایک ایک ذرہ اس کے جلال و قدسیت کا جلوہ گاہ ہوتا۔ خونریز اور سرکش انسان ہر مقام کو اپنے ظلم و فساد کی نجاست سے آلودہ کر سکتا، پر اُسکی فضاء مقدس ہمیشہ پاک و محفوظ رہتی، اور جب زمین کے ہر گوشے میں انسانی سرکشی اپنی مجرمانہ خداوندی کا اعلان کرتی تو وہاں خدا کی سچی پادشاہت کا تخت عظمت و اجلال بچھ جاتا، اور اسکا ظل عاطفت تمام بندگان حق کو اپنی طرف کھینچ بلاتا۔ دنیا پر کفر و شرک کے جماؤ اور اُتھان کا کیسا ہی سخت اور برا وقت آجاتا، مگر سچی توحید اور بے میل خدا پرستی کا وہ ایک ایسا گہر ہوتا، جہاں خدا اور اُسکی صداقت کے سوا نہ کسی خیال کی پہنچ ہوتی، نہ کسی صدا کی گونج اُتھ سکتی۔



# باب

جزیرہ عرب و بلاد مقدسہ

## فصل

( مرکز ارضی )

کوئی قوم زندہ نہیں رہسکتی، جب تک اسکا کوئی ارضی مرکز نہ ہو۔  
کوئی تعلیم باقی نہیں رہسکتی، جب تک اسکی ایک قائم و جاری درسگاہ  
نہ ہو۔ کوئی دریا جاری نہیں رہسکتا، جب تک ایک محفوظ سرچشمہ  
سے اسکا لگاؤ نہ ہو۔

نظام شمسی کا ہر ستارہ روشنی اور حرارت صرف اپنے مرکز شمسی ہی  
سے حاصل کرتا ہے۔ اسی کی بالاتر جاذبیت ہے جس نے یہ پورا معلق کارخانہ

سنبھال رکھا ہے ! اللہ الذی رفع السموات بغیر عمد ترونها، تم استہوی  
علي العرش، و سجدوا الشمس و القمر، کل یجری لاجل مسمى ! (۲: ۱۳)

یہی قانون الہی ہے جس پر اسکی شریعت کے تمام جماعتی احکام مبنی  
ہیں۔ پس جس طرح اسلام نے امت کے بقا اور حق و ہدایت کے قیام  
کیلئے ہر طرح کے مرکز قرار دیے، ضرور تھا کہ ایک ارضی مرکز بھی قیامت  
تک کیلئے قرار دیدیا جاتا۔

اُن بے شمار مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر جنکی تشریح کا یہ موقعہ  
نہیں، اسلام نے اس غرض سے سرزمین حجاز کو منتخب کیا۔ یہی ناف  
زمین دنیا کی آخری اور دائمی ہدایت و سعادت کیلئے مرکزی سرچشمہ  
اور روحانی درسگاہ قرار پائی۔ اور چونکہ سرزمین حجاز جزیرہ عرب میں  
واقع تھی، وہی اسلام کا اولین موطن، وہی اسکا سب سے پہلا سرچشمہ  
تھا، اسلئے ضرور تھا کہ اسلامی مرکز کے قریبی گرد و پیش کا بھی حکم  
ہوتا جو اصل مرکز کا۔ لہذا یہ تمام سرزمین بھی کہ حجاز کی ”رادی  
غیر ذی زرع“ کو گھیرے ہوئے ہے، اسی حکم میں داخل ہوگئی۔

ذلک تقدیر العزیز العلیم !

و اذ جعلنا البيت مثابة للناس و امنا (۱۲۵:۲)  
اور جب ایسا ہوا کہ ہم نے خانہ کعبہ کو انسانوں کیلئے اجتماع کا مرکز اور امن کا گھر بنایا۔

من دخلہ کان امنا (۹۷:۳)  
جو اسکے حدود کے اندر پہنچ گیا، اسکے لیے کسی طرح کا خوف اور ڈر نہیں۔

اور یہی علت تھی تحریک قبلہ کی۔ نہ وہ جو لوگوں نے سمجھی :  
و حیث ما کنتم فولوا و جوہکم شطرہ (۱۵۰:۲)  
اور تم کہیں بھی ہوں، رخ اُنکا اسی طرف رہے۔ لیکن چاہیے کہ اپنا رخ اسی کی جانب رکھو!

کیونکہ جب یہی مقام ارضی مرکز قرار پایا، تو تمام افراد قوم کیلئے لازمی ہوا کہ جہاں کہیں بھی ہوں، رخ اُنکا اسی طرف رہے۔ اور دن میں پانچ مرتبہ اپنے قومی مرکز کے طرف متوجہ ہوتے رہیں۔ اور یاد رہے کہ من جملہ بے شمار مصالح و حکم کے، ایک بڑی مصلحت فریضہ حج میں یہ بھی ہے کہ ساری امت، تمام کرۂ ارضی، اور تمام اقوام عالم کو، اس نقطۂ مرکز سے دائمی پیوستگی بخشدی :

و اذن فی الناس بالعجم یا ترک رجالا و علی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق (۲۸:۲۲)  
اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ پھر ایسا ہوگا کہ ساری دنیا کو یہ گوشۂ برکت کھینچ بلائیگا۔ لوگوں کے پیادے اور سوار قافلے در در دُور سے یہاں پہنچیں گے!

## فصل

( احکام شرعیہ )

اس مرکز کے قیام و بقا کیلئے سب سے پہلی بات یہ تھی کہ دائمی طور پر اسکو صرف اسلام کیلئے مخصوص کر دیا جائے۔ جب تک یہ خصوصیت قائم نہ کی جاتی، امت کیلئے اس مرکزیت کے مطلوبہ مقاصد و مصالح حاصل نہ ہوتے۔

چنانچہ اسی بنا پر مسلمانوں کو حکم دیا گیا : انما المشركون نجس، فلا یقربو المسجد الحرام بعد عامہم ہذا۔ مسجد حرام کے حدود صرف توحید کی پاکی کیلئے مخصوص ہیں۔ اب آئندہ کوئی غیر مسلم اسکے



وہ انسان کی پھیلی ہوئی نسل کیلئے ایک مشترک اور عالمگیر گھر ہوتا۔ کت کت کر قومیں وہاں جڑتیں، اور بکھر بکھرے نسلیں وہاں سمٹتیں۔ پرند جس طرح اپنے اشیانوں کی طرف آرتے ہیں، اور پروانوں کو تم نے دیکھا کہ روشنی کی طرف درازے۔ تھیک اسی طرح انسانوں کے گروہ اور قوموں کے قافلے اُسکی طرف دوڑتے، اور زمین کی خشکی و تری کی وہ ساری راہیں جو اُس تک پہنچ سکتیں، ہمیشہ مسافروں اور قافلوں سے بھری رھتیں۔

دنیا بھر کے زخمی دل وہاں پہنچتے اور شفا اور تندرستی کا مرہم پاتے۔ بے قرار و مضطرب روحوں کیلئے اُسکے آغوش گرم میں آرام و سکون کی تہذک ہوتی۔ گناہ کی کثافتوں سے آلودہ جسم وہاں لائے جاتے، اور محرومی و نامرادی کی مایوسیوں سے گھاٹل دل چپختے اور تڑپتے ہوئے اُس کی جانب دوڑتے، تو اُسکی پاک ہوا امید و مراد کی عطر بیزی سے مشکبار ہو جاتی، اُسکے پہاڑوں کی چوٹیاں خدا کی محبت و بخشش کے بادلوں میں چھپ جاتیں، اور اُس کی مقدس فضاء میں رحمت کے فرشتے غول در غول اُتر کر اپنی معصوم مسکراہٹ اور اپنے پاک نغموں کے ساتھ مغفرت و قبولیت کی بشارتیں بانٹتے۔

شاخوں کی شادابی جڑ پر موقوف ہے۔ درختوں کی جڑ اگر سلامت ہے تو شاخوں اور پتوں کے مرجھا جانے سے باغ اجڑ نہیں جا سکتا۔ دس تہذیبیں کات دی جائیں گی، تو بیس نئی نکل آئیں گی۔ اسی طرح قوم کا مرکز ارضی اگر محفوظ ہے، تو اُسکے بکھرے ہوئے تکرروں کی بربادی سے قوم نہیں مت جاسکتی۔ سارے تکررے مت جائیں، مگر مرکز باقی ہے تو پھر نئی نئی شاخیں پھوٹیں گی اور نئی نئی زندگیاں ابھریں گی۔ پس جس طرح مسلمانوں کے اجتماعی دائرہ کیلئے خلیفہ و اموم کے وجود کو مرکز ٹھہرایا گیا، اُسی طرح اُنکی ارضی وسعت و انتشار کیلئے عبادت گاہ ابراہیمی کا کعبہ اللہ، اُسکی سر زمین حجاز، اور اُسکا ملک جزیرہ عرب، دائمی مرکز قرار پایا۔ یہی معنی ان آیات کریمہ کے ہیں کہ :

جعل اللہ الکعبۃ اللہ نے کعبہ کو کہ اسکا محترم گھر ہے، انسانوں  
البيت الحرام قیاماً کے بقا و اقیام کا باعث ٹھہرایا۔

الا بعضهم لحقوا برسول الله فامنهم و اسلموا ' و اجلى يهود المدينة كلهم بني قينقاع و هم قوم عبد الله بن سلام و يهود بني حارثة ' و كل يهودي كان بالمدينة "

بخاري و مسلم میں اس آخری اخراج کا واقعہ برایت حضرت ابو ہریرہ مرزی ہے ۔ آپ صحابہ کو ساتھ لیکر یہودیوں کی تعلیم گاہ میں تشریف لیگئے اور فرمایا " یا معشر الیہود ! اسلموا تسلموا " اسلام قبول کرو ۔ نجات پاؤ گے ۔ پھر فرمایا " اعلموا ان الارض لله و رسوله و انی ارید ان اجلیکم من هذه الارض ' فمن وجد منکم بماله شیئاً فلیبعه ' و الا ' فاعلموا ان الارض لله و رسوله " میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ تم کو اس ملک سے خارج کر دوں ۔ پس اپنا مال و متاع فروخت کرنا چاہو تو کرو ۔ ورنہ جان رکھو کہ اس ملک کی حکومت صرف اللہ اور اس کے رسول ہی کیلئے ہے ۔

جب آپ دنیا سے تشریف لیگئے تو در مقام ایسے رہ گئے تھے جہاں سے یہود و نصارا کا اخراج نہ ہو سکا تھا ۔ خیبر اور نجدان ۔ پس آپے وصیت فرمائی کہ آئندہ جزیرہ عرب صرف اسلام کیلئے مخصوص کر دیا جائے ۔ جو غیر مسلم اس ملک میں باقی رہ گئے ہیں ' خارج کر دیے جائیں ۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے " اخراج الیہود من جزیرة العرب " اسمیں پہلی برایت یہود مدینہ کے اخراج کی لائے ہیں جو اوپر گزر چکی ۔ دوسری برایت حضرت ابن عباس کی ہے ۔ آنحضرت صلعم نے مرض الموت میں تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی ۔ ایک یہ تھی " اخرجوا المشرکین من جزیرة العرب " حافظ ابن حجر لکھتے ہیں " اقتصر علی ذکر الیہود لانہم یوحـدـون اللہ تعالیٰ الا القلیل ومع ذلك امر باخراجہم ' فیکون اخراج غیرہم من الکفار بطریق اولی " ( فتح الباری - ۶ : ۱۹۴ ) یعنی امام بخاری نے عنوان باب میں صرف یہود کا ذکر کیا ۔ اسمیں استدلال یہ ہے کہ تمام غیر مسلم اقوام میں یہودی سب سے زیادہ توحید کے قائل ہیں ۔ انکو خارج کیا گیا تو دیگر مذاہب کے اخراج کا وجوب بدرجہ اولی ثابت ہو گیا ۔ پس حاجت تصریح نہیں ۔

حضرت عمر کی برایت میں " یہود و نصاری " کا لفظ ہے " لاخرجن الیہود و النصاری من جزیرة العرب حتی لا ادع الا مسلما " رواہ مسلم و احمد و الترمذی و صححہ ۔ ابو عبیدہ بن جراح سے امام احمد نے برایت کیا ہے : " اخر ما تکلم به رسول الله صلعم اخرجوا یہود اهل الحجاز و اهل نجدان من جزیرة العرب " حضرت عائشہ کی برایت میں اسکی علت بھی واضح کر دی

قریب بھی نہ آنے پائے - یعنی نہ صرف یہ کہ وہاں غیر مسلم نہ رہیں ، بلکہ کسی حال میں داخل بھی نہ ہوں - جمہور اہل اسلام نے اتفاق کیا کہ مسجد حرام سے مقصود صرف احاطۃ کعبہ ہی نہیں ہے ، بلکہ تمام سرزمین حرم ہے - اور دلائل و مباحث اسکے اپنے مقام پر درج ہیں -

اور اسی طرح احادیث صحیحہ و کثیرہ سے جو حضرت علی ، سعد بن وقاص ، انس ، جابر ، ابو ہریرہ ، عبد اللہ بن زید ، رافع بن خدیج ، سہل بن حنیف ، وغیرہم اجلۃ صحابہ سے مروی ہیں ، ثابت ہو چکا ہے کہ مدینہ کی زمین بھی مثل مکہ کے حرم ہے ، اور غیر و ثور اسکے حدود ہیں - ” المدینۃ حرام ما بین غیر الی ثور “ اخرجہ الشیخان - اور روایت سعد کہ ” انی احرم ما بین لابتی المدینہ ان یقطع اعضاھا اریقتل صیدھا “ رواہ مسلم - اور روایت انس متفق علیہ کہ ” اللهم ان ابراهیم حرم مکہ ، و انی احرم ما بین لابتیھا “ (۱) خدایا ! ابراہیم نے مکہ کو حرم ٹھہرایا اور میں مدینہ کو ٹھہراتا ہوں !

یہ احکام تو خاص اس مرکز کی نسبت تھے - باقی رہا اسکا گرد و پیش ، یعنی جزیرہ عرب ، تو گو اسکے لیے اسقدر اہتمام کی ضرورت نہ تھی ، تاہم اسکا خالص اسلامی ملک ہونا ضروری تھا - تاکہ اسلامی مرکز کا گرد و پیش اور اسکا مولد و منشاء ہمیشہ غیروں کے اثر سے محفوظ رہے -

اسلام کا جب ظہور ہوا تو علاقہ مشرکین عرب کے یہود و نصارا کی بھی ایک بڑی جماعت جزیرہ عرب میں آباد تھی - مدینہ میں یہودیوں کے متعدد قبیلے تھے - خیبر میں انہی کی ریاست تھی - یمن میں نجران عیسائیوں کا بڑا مرکز تھا -

مدینہ کی سرزمین خود آپ کی زندگی ہی میں یہودیوں سے خالی ہو گئی - آخری جماعت جو مدینہ سے خارج کی گئی ، بنو قینقاع اور بنو حارثہ کا گروہ تھا - امام مسلم نے ابن عمر کا قول نقل کیا ہے ” ان یہود بنی النضیر حاربوا رسول اللہ صلعم فاجلی بنی النضیر و اقر قریظہ و من علیہم ، حتی حارب قریظہ ، فقتل رجالہم و قسم اولادہم و نسائہم بین المسلمین

( ۱ ) زیادہ مفصل بحث رسالہ ” جامع الشواہد “ میں لکھ چکا ہوں -

اس رسالہ کا اصل موضوع مسئلۃ خلافت ہے - یہ ٹکڑہ ضمنا آگیا ہے - پس اشارات پر اکتفا کیا گیا -



اُن کی نسبت یا تو بطریق پیشین گولی کے خبر دیدی جاتی ہے - یا اپنے جانشینوں کو وصیت کر دی جاتی ہے -

یہ معاملہ اسی دوسری قسم میں داخل تھا - پس ضرور نہ تھا کہ اس کا پورا پورا نفاذ خود آنحضرت صلعہ کی حیات طیبہ ہی میں ہو جاتا - آپ نے یہود مدینہ کے اخراج سے عملاً نفاذ شروع کر دیا - یہود خیبر سے ابتدا ہی میں شرط کر لی تھی کہ جب ضرورت ہوگی اس سرزمین سے خارج کر دیے جاؤ گے - پھر تکمیل کیلئے اپنے جانشینوں کو وصیت فرمادی - چنانچہ حضرت عمر (رض) کے زمانے میں تکمیل کا وقت آ گیا - اور یہود خیبر نے طرح طرح کی شرارتیں اور نا فرمانیاں کر کے خود ہی اس کا موقعہ بہم پہنچا دیا - پس حضرت عمر نے اس وصیت کی تحقیق کی اور جب پوری طرح تصدیق ہو گئی تو تمام صحابہ کو جمع کر کے اعلان کر دیا - سب نے اتفاق کیا اور یہود خیبر ر فدک خارج کر دیے گئے - اسی طرح نجران سے بھی عیسائیوں کا اخراج عمل میں آیا - امام زہری نے ابن عتبہ سے اور امام مالک نے ابن شہاب سے روایت کیا ہے ” ما زال عمر حتی وجد الثبت عن رسول اللہ انہ قال لا یجتمع بجزیرۃ العرب دینان “ فقال من کان لہ من اهل الکتابین عہد فلیات بہ ” انفذ لہ “ والا فانی مجلیکم ” فاجلاہم “ ( اخرجہ ابن ابی شیبہ )

امام بخاری نے یہود خیبر کے اخراج کا واقعہ کتاب الشروط کے باب ” اذا اشترط فی المزارعة اذا شئت اخرجتک “ میں درج کیا ہے اور ترجمہ باب میں استدلال ہے کہ یہود خیبر کا تقرر پہلے ہی سے عارضی و مشروط تھا - بالاستقلال نہ تھا - حافظ عسقلانی لکھتے ہیں - حضرت عمر کے اجلاء کردہ اہل کتاب کی تعداد چالیس ہزار منقول ہے -

پس صاحب شریعت کے قول و عمل اُن کے آخرین لمحات حیات کی وصیت حضرت عمر کے فحوص و تصدیق تمام صحابہ کے اجماع و اتفاق سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلام نے ہمیشہ کیلئے جزیرۃ عرب کو صرف اسلامی آبادی ہی کے لیے مخصوص کر دیا ہے - الا یہ کہ کسی مصلحت سے خلیفہ وقت عارضی طور پر کسی گروہ کو داخل ہونے کی اجازت دیدے - اور ظاہر ہے کہ جب وہاں غیر مسلموں کا قیام اور در دینوں کا اجتماع شریعت کو منظور نہیں تو غیر مسلم کی حکومت یا حاکمانہ نگرانی و بالا دستی کو جائز رکھنا کب مسلمانوں کیلئے جائز ہو سکتا ہے ؟

ہے ”آخر ما عهد رسول اللہ صلعم ان قال لا یترک بجزیرۃ العرب دنیاں“  
 رواہ احمد - یعنی سب سے آخری وصیت رسول اللہ کی یہ تھی کہ جزیرۃ  
 عرب میں در دین جمع نہ ہوں - صرف اسلام ہی کیلئے مخصوص ہو جائے -  
 امام مالک نے موطا میں عمر بن عبد العزیز اور ابن شہاب کے مراسیل نقل  
 کیے ہیں اور مصمودی و غیرہم نے باب باندھا ہے ”اخراج الیہود و النصارى  
 من جزیرۃ العرب“ عمر ابن عبد العزیز کی روایت میں ہے : ”کان من آخر  
 ما تکلم بہ رسول اللہ صلعم انه قال قاتل اللہ الیہود و النصارى“ اتخذوا قبور  
 انبیائہم مساجد - لا یبقیان دنیاں بارض العرب“ اور ابن شہاب کا لفظ ہے  
 ”لا یجتمع دنیاں فی جزیرۃ العرب“

حضرت عمر ابن عبد العزیز نے آخر تکلم ”قاتل اللہ الیہود و النصارى“  
 جو نقل کیا ہے ، تو حضرت عائشہ سے صحیحین وغیرہا میں بطریق رفع بھی  
 ثابت ہے -

حافظ نواری نے گو امام بخاری کا اتباع کیا اور ”اجلاء الیہود“  
 کا باب استدلالاً کافی سمجھا ، لیکن حافظ منذری نے تلخیص مسلم میں  
 ”اخراج الیہود و النصارى من جزیرۃ العرب“ کا الگ باب باندھ کر جزیرۃ عرب  
 والی روایتیں روایات اجلاء یہود سے الگ کر دی ہیں - یہ وصیۃ نبوی علامہ  
 طرق بالا کے مسند امام احمد ، مسند حمیدی ، سنن بیہقی وغیرہ میں  
 بھی مختلف طریقوں سے مروی ہے ، اور سب کا مضمون متحد اور باہم دگر  
 اجمال و تبیین اور اعتضاد و تقویت کا حکم رکھتا ہے -

احکام شرعیہ در قسم کے ہیں - ایک قسم اُن احکام کی ہے جنکا تعلق  
 افراد کی اصلاح و تزکیہ سے ہوتا ہے - جیسے تمام اراکمر و نواہی اور فرائض  
 و واجبات - دوسرے وہ ہیں جنکا تعلق افراد سے نہیں بلکہ امت کے قومی اور  
 اجتماعی فرائض اور ملکی سیاسیات سے ہوتا ہے - جیسے فتح ممالک اور  
 قوانین سیاسیہ و ملکیہ -

سنۃ الہی یوں واقع ہوئی ہے کہ پہلی قسم کے احکام خود شارع کی  
 زندگی ہی میں تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں ، اور وہ دنیا نہیں چھوڑتا مگر  
 اُنکی تکمیل کا اعلان کر کے - لیکن دوسری قسم کے لیے ایسا ہونا ضروری  
 نہیں - بسا احکام ایسے ہوتے ہیں جنکے نفاذ و وقوع کے لیے ایک خاص وقت  
 مطلوب ہوتا ہے اور وہ شارع کے بعد بتدریج تکمیل و تنفیذ پاتے ہیں - پس



حاصل سب کا یہی ہے کہ جزیرہ عرب وہ سرزمین ہے جسکے تین جانب سمندر ہیں اور شمالی جانب دریائے دجلہ و فرات -

سب سے زیادہ مفصل جغرافیہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں دیا ہے - اس سے زیادہ جامع و معتبر کتاب عربی میں جغرافیہ و تقویم بلدان کی کوئی نہیں :

”انما سمیت بلاد العرب جزيرة لاحتاطة الانهار والبحار“ و ذلک ان الفرات اقبل من بلاد الروم ” فظهر بناحية قنسرین ” ثم انحط على أطراف الجزيرة و سواد العراق ” حتی وقع في البحر في ناحية البصرة و الابلہ ” و امتد الى عبادان ” و اخذ البحر في ذلک الموضع مغرباً منعطفاً ببلاد العرب ” الخ -

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ عرب اسلامی جزیرہ مشہور ہوا کہ سمندروں اور دریاؤں سے گھرا ہوا ہے - صورت اسکی یوں ہے کہ دریائے فرات بلاد روم سے شروع ہوا ” اور قنسرین کے نواح میں عرب کی سرحد پر ظاہر ہوا - پھر عراق میں ہوتا ہوا بصرہ کے پاس سمندر میں جا ملا - وہاں سے پھر سمندر نے عرب کو گھیرا ” اور قطیف و ہجر کے کناروں سے ہوتا ہوا عمان اور شہر سے گزر گیا - پھر حضرموت اور عدن ہوتا ہوا یمن کی جانب یمن کے ساحلوں سے جا ٹکرایا - حتیٰ کہ جدہ نمودار ہوا جو مکہ و حجاز کا ساحل ہے - پھر ساحل طور و خلیج ایلہ پر جا کر سمندر کی شاخ ختم ہو گئی - پھر سرزمین مصر شروع ہوتی ہے اور قلزم نمودار ہوتا ہے ” اور اسکا سلسلہ بلاد فلسطین سے سواحل عسقلان ہوتا ہوا سرزمین صور و ساحل اردن تک بیدرت پر پہنچتا ہے ” اور آخر میں پھر قنسرین تک منتهی ہو کر وہ جگہ آجاتی ہے جہاں سے فرات نے عرب کا احاطہ شروع کیا تھا - پس اس طرح چاروں طرف پانی کا سلسلہ قائم ہے - بحر احمر اور قلزم کی درمیانی خشکی بھی پانی سے خالی نہیں - کیونکہ سردان سے دریائے نیل وہاں آ پہنچا ہے اور قلزم میں گرا ہے - یہی جزیرہ ہے جس سے عربا کی سرزمین عبارت ہے ” اور یہی عرب اقوام کا مولد و منشأ ہے - انتہی ملخصاً - ( جلد ۳ - ۱۰۰ )

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ جزیرہ عرب کے حدود کیا ہیں ؟ عرب کا نقشہ اپنے سامنے رکھو اور اس پر مندرجہ بالا تخطیط منطبق کر کے دیکھو - اوپر شمال ہے - دھنہ مشرق - بائیں مغرب - شمال میں دریائے فرات مغرب سے خم کھاتا ہوا نمودار ہوتا ہے اور صحرائے شام کے کنارے سے گزرتا

# فصل

( جزیرہ عرب کی تحدید )

باقی رہا یہ مسئلہ کہ جزیرہ عرب سے مقصود کیا ہے ؟ تو یہ بالکل صاف و راضح ہے ۔ اس کے لیے کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں ۔ نص حدیث میں ” جزیرہ عرب “ کا لفظ وارد ہے ، اور عقلاً و اصولاً معلوم ہے کہ جب تک کوئی سبب قری موجود نہ ہو ، کسی لفظ کے منظور اور عام و متعارف مدلول سے انحراف جائز نہ ہوگا ۔ اور نہ بلا مخصص کے قیاساً تخصیص جائز ۔ شارع نے ” جزیرہ “ کا لفظ کہا ، اور دنیا میں اُس وقت سے لیکر اب تک جزیرہ عرب کا اطلاق ایک خاص ملک پر ہر انسان کر رہا اور جان رہا ہے ۔ پس جو مطلب اسکا سمجھا جاتا تھا اور سمجھا جاتا ہے ، وہی سمجھا جایگا ۔

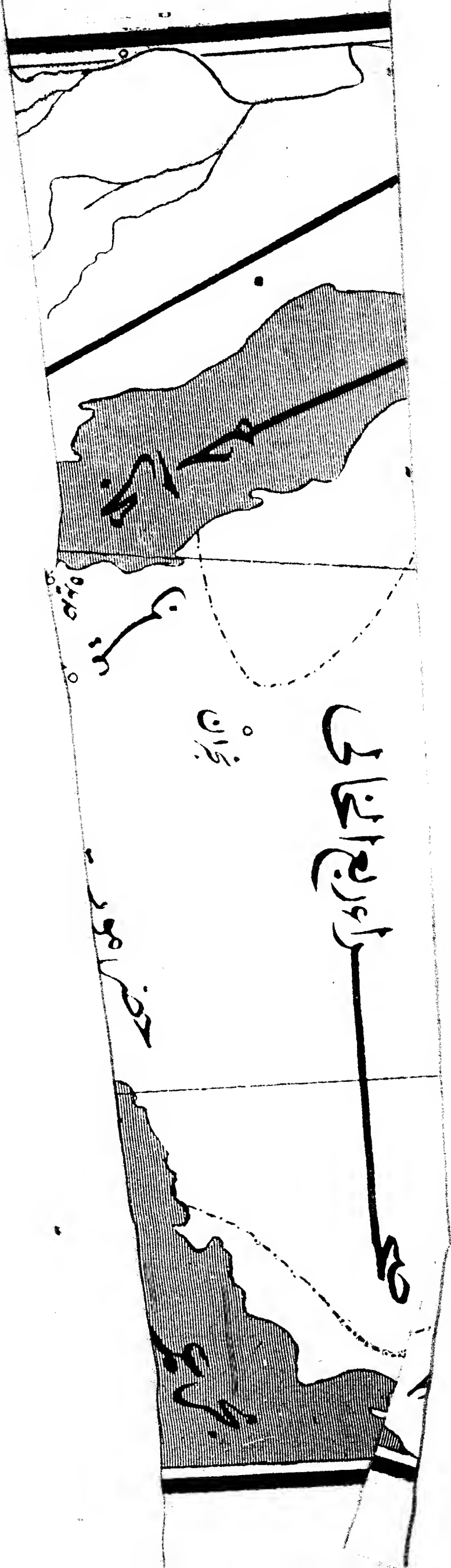
تمام مورخین اور جغرافیہ نگاران قدیم و جدید متفق ہیں کہ عرب کو ” جزیرہ “ اس لیے کہا گیا کہ تین طرف سمندر اور ایک جانب دریا کے پانی سے محصور ہے ۔ یعنی تین طرف بحر ہند ، خلیج فارس ، بحر احمر و قلمز واقع ہیں ۔ ایک جانب دریائے دجلہ و فرات ۔

فتح الباری و غیرہ میں ہے ” قال الخلیل سمیت جزیرۃ العرب لان بحر فارس و بحر الحبشہ و الفرات و الدجلہ احاطت بها “ ( ۱۱۸ : ۶ ) اور اصمعی کا قول ہے : ” لاحاطۃ البحار بها “ یعنی بحر الہند و القلمز و بحر فارس و بحر الحبشہ و دجلہ “ ( ایضاً )

نہایہ میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے ” سمیت جزیرۃ لان بحر الفارس و بحر السودان احاطا بجانبيها “ و احاط بالجناب الشمالي دجلہ و الفرات “ ۔

یہی قول ارباب لغۃ کا بھی ہے ۔ قاموس میں ہے ” جزیرۃ العرب ما احاط به بحر الہند و الشام ثم دجلہ و الفرات “ پروفیسر پطرس بستانی نے بھی ( جو زمانہ حال میں شام کا ایک مشہور مسیحی مصنف گزرا ہے اور جس نے عربی میں انسائیکلو پیڈیا لکھنی شروع کی تھی ) محیط المحيط میں یہی تعریف کی ہے ۔

جو بقیہ یورپین ترکی میں اسلام کی آخری متاع عزت تھی اور یونان کے سپرد کر دی گئی !





ہوا دجلہ میں مل جاتا ہے - پھر دونوں ملکر خلیج فارس میں گرتے ہیں - فرات کے پیچھے دجلہ کا خط ہے - اسی پر بغداد واقع ہے - خلیج فارس کے مشرق میں ایران ہے اور مغربی ساحل میں قطیف و حساء - پھر یہ خلیج تنگ نائے هرمز سے نکل کر مسقط و عمان کے کناروں سے گزرتا ہے اور اسکے بعد ہی بحر عمان نمودار ہو جاتا ہے - اسکے بعد حضرموت کا ساحل دیکھو گے - بحر عدن آگیا اور باب المندب سے جونہی آگے بڑھے بحر احمر شروع ہو گیا - چونکہ اسکا مغربی ساحل افریقہ و حبش سے متصل ہے اسلیے قدیم جغرافیہ میں اسکو بحر حبش بھی کہتے تھے - بحر احمر کے کنارے پہلے یمن ملیکا - پھر جدہ - اسکے بعد ساحل حجاز - حتیٰ کہ سمندر کی شاخ پتلی ہو کر طور سینا تک منتهی ہو گئی اور اسکے ساتھ ہی خلیج عقبہ کی شاخ نمودار ہوئی - اب مصر کی سر زمین شروع ہو گئی - نہر سوئیس کے بننے سے پہلے یہ خشکی کا ایک ٹکڑہ تھا جس نے بحر احمر کو بحر متوسط سے جدا کر دیا تھا - اسلیے صاحب معجم نے یہاں دریاے نیل کا ذکر کیا جسکو اسی درمیانی تختہ خشک کے بائیں جانب دیکھہ رہے ہو - وہ قاہرہ سے ہوتا ہوا اسکندریہ کے پاس سمندر میں گرتا ہے - پس اگرچہ اُس زمانے میں یہ ٹکڑہ خشک تھا مگر سمندر کی جگہ دریاے نیل کا خط آبی موجود تھا -

اس کے بعد بحر متوسط ہے جس کے ابتدائی حصہ کو قدیم جغرافیہ نویس بحر مصر و شام سے موسوم کرتے تھے - اسی پر بیروت واقع ہے اور ساحل سے اندر کی جانب دیکھو گے تو پھر وہی مقام سامنے ہوگا جہاں سے دریاے فرات نمودار ہو کر خلیج فارس کی جانب بڑھا تھا -

پس یہ ایک مثلث نما ٹکڑہ ہے جو اس تمام بحری احاطہ کے اندر واقع ہے - صرف خشکی کا ایک حصہ شمال میں فرات کے بائیں جانب نظر آتا ہے - یعنی سرحد شام - یہی مثلث ٹکڑہ جزیرہ عرب ہے - قدیم و جدید جغرافیہ نگار دونوں اس پر متفق ہیں -

اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے ”جزیرہ“ اور ”جزیرہ نما“ ہونے میں سب سے زیادہ اہم وجود دریاے دجلہ و فرات کا ہے - کیونکہ اگر یہ عرب کے حدود سے کوئی متصل تعلق نہیں رکھتے تو پھر اس کی ایسی صورت ہی باقی نہیں رہتی جس پر جزیرہ کا اطلاق ہو سکے - یعنی شمال کی جانب بالکل خشک رہ جاتی ہے - یہی وجہ ہے کہ جس کسی نے عرب کی تعریف کی

احاطہ بحر و فہر کا لفظ کہہ کر واضح کر دیا کہ جانب شمال دجلہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جنہوں نے مقامات کے نام لیکر حدود متعین کیے، انہوں نے بھی صاف کہہ دیا کہ شمالی حد دجلہ ہے۔ نہایہ، معجم البلدان، اور فتح الباری میں اصمعی کا قول منقول ہے ”من اقصى عدن الى ريف العراق طولاً“ و من جسدہ و ساحل البحر الى اطراف الشام عرضاً ”کرمانی نے کہا ”ہی ما بین عدن الى ريف العراق طولاً“ و من جسدہ الى الشام عرضاً ” یہی قاموس میں ہے۔ ایسا ہی ابن کلبی سے مرزی ہے۔ رفاعہ بک طہطہاری نے قدیم و جدید کتب سے اخذ کر کے عربی میں ”تعريفات الذافعه لمريد الجغرافيه“ لکھی۔ اسمیں بھی یہی حدود ہیں۔ پس صاحب معجم کی تفصیل اور تمام اقوال سے ثابت ہو گیا کہ عرب طول میں عدن سے لیکر عراق کی قرائی تک، از عرض میں ساحل بحر احمر سے خلیج فارس تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی حد شمال میں دھنی جانب دجلہ ہے، اور اگر عرض کا خط کھینچیں تو بائیں جانب شام۔ آجکل کے جغرافیوں میں بھی عرب کے یہی حدود بتلائے جاتے ہیں۔ پچھم میں بحر احمر، جنوب میں بحر ہند، یورپ میں خلیج فارس، اور دکھن میں ملک شام۔

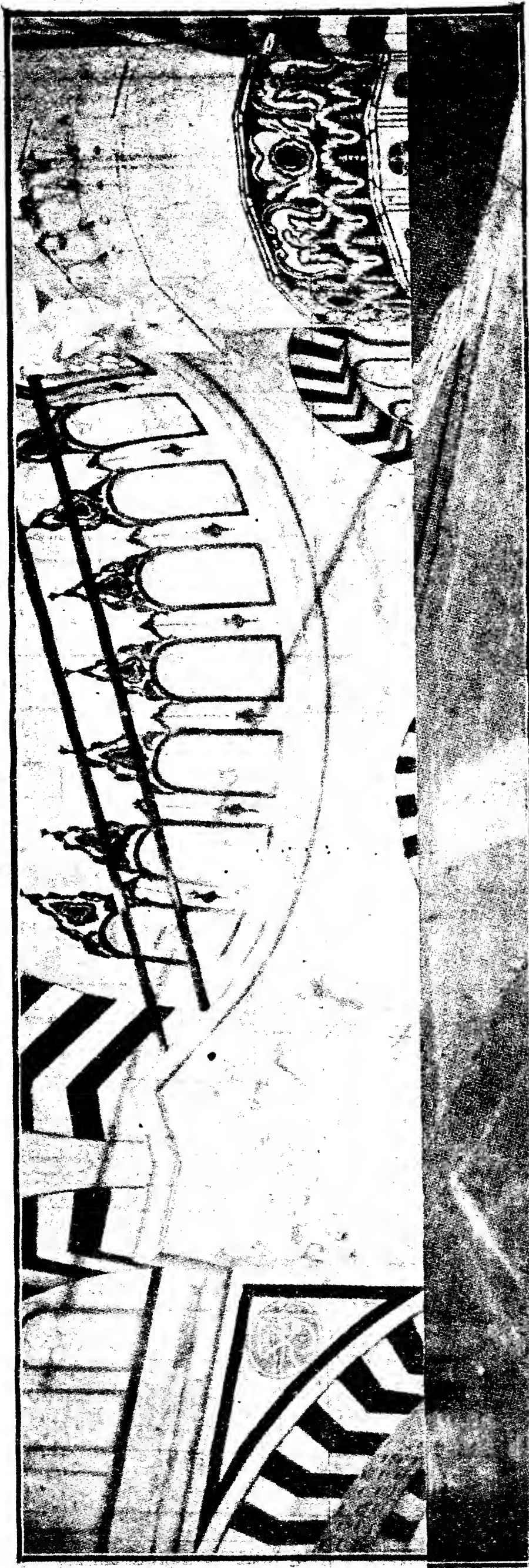
اسی معجم البلدان میں عراق کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ”ای انہا اسفل ارض العرب“ (جلد ۶: ۱۳۳) یعنی عراق اسلیے نام ہوا کہ زمین عرب کا سب سے زیادہ نچلا حصہ ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ عراق عرب میں داخل ہے۔ البتہ عراق کا وہ حصہ جو دجلہ کے پار واقع ہے، اس میں داخل نہ ہوگا۔

ہم یہاں عرب کا ایک نقشہ تفسیر البیان کے مسودہ سے لیکر درج کرتے ہیں۔ اس نقشہ میں ظہور اسلام کے وقت جزیرہ عرب کی حالت دکھلائی ہے۔ یہ نقشہ دراصل یورپ کے بعض مشہور مستشرقین (ارنٹیلست) نے قدیم نقشوں اور تعریفات سے مدد لیکر طیار کیا تھا جسکو سنہ ۱۸۵۰ء میں پروفیسر فردینند ویسٹن فیلڈ (Ferdinand Wustenfeld) نے لیڈن یونیورسٹی سے شائع کیا۔ جزیرہ عرب کے تمام قدیم نقشوں میں سب سے زیادہ صحیح اور مستند نقشہ یہی ہے۔ نقطوں کے خطوط سے تجارتی قافلوں کی وہ سڑکیں دکھلائی ہیں جو چھٹی صدی عیسوی میں عرب کے اندرونی مقامات سے سواحل تک جاتی تھیں۔



حتى المذابح تربي وهي جامدة

حتى المذابح تربي وهي عيدان !



مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ اس وراثت کی بشارت دی تھی -  
 ولقد كتبنا في الزبور من بعد الذكر ان الارض يرثها عبادي الصالحون -  
 ان في هذا لبلاغاً لقوم عابدين - وما ارسلناك الا رحمة للعالمين (۱۰۵:۲۱)  
 حضرت ابن عباس وغیرہ سے مراد یہ ہے کہ اس آیت میں ”الارض“ سے  
 مقصود بیت المقدس اور فلسطین ہے - اس میں خبر دی گئی تھی کہ اب  
 وہاں کی پادشاہت مسلمانوں کے حصے میں آئیگی - اسی لیے کہا: ان في  
 هذا لبلاغاً الخ -

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اس سر زمین کی خدمت و وراثت  
 کو اللہ کی طرف سے ایک مخصوص عطیہ و امانت سمجھا اور اس کی  
 حفاظت کو حرمین کی طرح ساری دنیا کی حکومت و فرماں روائی سے  
 بھی زیادہ عزیز و محبوب سمجھتے رہے - یہی اعتقاد دینی تھا جس نے مسیحی  
 جہاں کی ان آٹھ لڑائیوں کو کامیاب کرنے نہ دیا جن میں تمام یورپ کی  
 طاقت اکٹھی ہو گئی تھی ، حالانکہ وہ وقت مسلمانوں کی پولیٹیکل طاقت  
 کے عروج کا نہ تھا - تنزل و انحطاط کا تھا ، اور تمام عالم اسلامی مختلف  
 حکومتوں میں متفرق ہو چکا تھا - اس وقت سے لیکر آج تک وہاں کی حکومت  
 خلیفہ اسلام کے ماتحت رہی ہے ، اور ہمیشہ خود یورپ نے مسیحی دنیا  
 کے امن و سکون کیلئے اسی بات کو بہتر سمجھا ہے - پس اگر آج پھر ازمۂ  
 مظالمہ (مدل ایجز) کی تاریخ دہرائی جائیگی ، اور اسلام کی جگہ اُسے  
 مسیحیت یا یہودیت کے زیر اثر لانے کی کوشش کی جائیگی ، تو مسلمانان  
 عالم کیلئے ناممکن ہوگا کہ خاموش رہ سکیں - انکا فرض ہوگا کہ جب گذشتہ  
 کروسید کا ایک حصہ دہرایا گیا ہے ، تو دوسرا حصہ بھی ظہور میں آجائے - وہ  
 مسلمانوں کی دینی زیارت گاہ ہے - انکا مقدس اولین قبلہ ہے - اس کی  
 مذہبی وابستگی انکے ایمان و مذہب کا جزء ہے - اگر وہاں یہودیوں کا اقتدار  
 بڑھایا جاتا ہے ، یا کسی مسیحی حکومت کو نگرانی و بالا دستی کے نام سے  
 قائم کیا جاتا ہے ، تو یہ صرف مسلمانوں کی آبادیوں ہی کو نہیں  
 بلکہ انکی شریعت کو چیلنج دینا ہے ، اور مسلمانوں کو مجبور کر دینا  
 ہے کہ یا تو اسلام کی جانب سے اس چیلنج کو قبول کر لیں ، یا اس کی  
 اطاعت و حمایت سے دست بردار ہو جائیں -

# فصل

( مسجد اقصیٰ و ارض مقدس )

مقامات مقدسہ اسلامیہ کے سلسلہ میں بیت المقدس اور اسکی سرزمین کا مسئلہ بھی مسلمانوں کے لیے اس سے کم اہمیت نہیں رکھتا جس قدر حرم مکہ اور حرم مدینہ کا۔

اسلام نے صرف تین مقامات کے لیے بہ نیت طاعت و ثواب سفر کرنے کی اجازت دی ہے۔ ان میں جس طرح مکہ و مدینہ کا نام ہے، اسی طرح بیت المقدس کا بھی۔ بخاری و مسلم کی مشہور روایت میں ہے: ” لا تشد الرحال الا الى ثلاثة مساجد: المسجد الحرام، و مسجدی هذا، و المسجد الاقصیٰ “ یعنی بہ نیت زیارت و طاعت سفر کا قصد و اہتمام کرنا نہیں ہے مگر ان تین جگہوں کے لیے۔ مسجد حرام، مسجد مدینہ، اور مسجد اقصیٰ۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام دنیا میں مسلمانوں کے لیے شرعاً یہی تین مقام سب سے زیادہ مقدس و محترم ہیں، اور انہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ انکی زیارت کیلئے نیت کر کے اپنے وطنوں سے نکلتے ہیں، سفر کی تکلیفیں اور صعوبتیں برداشت کرتے ہیں، اور یقین کرتے ہیں کہ اس کے معارضہ میں انکے لیے بڑا ہی اجر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور ائمہ اسلام نے اتفاق کیا کہ اگر مسجد اقصیٰ کی زیارت کی نذر مانی ہو، تو اسکا ادا کرنا اسی طرح واجب ہوگا، جس طرح زیارت مسجد نبوی اور حج و عمرہ کا ادا کرنا۔ حالانکہ ان تین جگہوں کے علاوہ اگر کسی دوسری زیارت گاہ کے سفر کیلئے نذر مانی ہو، تو اسکا ادا کرنا باتفاق ائمہ واجب نہ ہوگا۔ اسی بات سے اندازہ کر لیا جائے کہ بیت المقدس کی سرزمین مسلمانوں کے مذہبی احکام و اعتقاد میں کیسا اہم درجہ رکھتی ہے؟

یہی وہ مقدس سرزمین ہے جسکا اللہ نے یہودیوں سے وعدہ کیا تھا، اور بالآخر وعدہ پورا ہو کر رہا۔ لیکن وہ اسکے اہل ثابت نہ ہوئے، اور دنیا کی حکومت و عزت کے ساتھ یہاں کی پادشاہت بھی ان سے چھین لی گئی۔ پھر مسیحی دور شروع ہوا۔ اسکے بعد مسلمان وارث ہوئے۔ قرآن حکیم نے



اسلام کی جگہ جاہلیۃ مول لی - جس نے انکے مقابلے میں لڑائی کی ،  
یا انکے دشمنوں کا ساتھ دیا ، اُس نے خدا اور اُسکے رسول سے لڑائی کی -

(۵) صرف خلیفۃ اسلام ہی کے لیے یہ حکم مخصوص نہیں ہے - جب  
کبھی مسلمہ انوں اور غیر مسلمانوں میں لڑائی ہو ، تو کسی مسلمان کیلئے  
شرعاً جائز نہیں کہ غیر مسلمان فوج کا ساتھی ہو کر مسلمانوں سے لڑے -  
یا انکی مدد کرے - اگر کریگا تو بحکم ” من حمل علینا السلاح فلیس منا “

اور نص قرانی ” من یقتل مومنًا متعمداً فجزاءہ جہنم خالدًا فیہا وہ اسلامی  
جماعت سے خارج ہو جائیگا - اس کا ٹھکانا درزخ ہے -

(۶) جب کسی اسلامی حکومت یا جماعت پر غیر مسلم حملہ کریں  
یا حملہ کا قصد کریں ، یا انکی آزادی و خود مختاری کو کسی دوسری  
طرح نقصان پہونچانا چاہیں ، تو ہر ملک کے مسلمانوں پر یکے بعد دیگرے  
انکی مدد کرنا ، اور حملہ کرنے والوں سے لڑنا ، فرض ہو جاتا ہے -  
علی الخصوص ایسی حالت میں جب کہ حملہ آور زیادہ طاقتور  
ہوں ، اور ان کے مقابلہ کی کافی طاقت ان مسلمانوں اور رہاں کی اسلامی  
حکومت میں نہ ہو - اس صورت میں جہاد کی فرضیۃ علی الکفایہ نہ ہوگی -  
مثل نماز روزہ کے فرض عین ہوگی -

(۷) اگر خلیفۃ اسلام کو دشمنوں کا ایسا طاقتور گروہ گھیر لے کہ ان کا  
مقابلہ کرنا اس کی طاقت سے باہر ہو ، اور بلا تمام مسلمانان عالم کی فوری  
مدد و نصرت کے اسلامی ممالک کی حفاظت نہ ہو سکے ، تو اُس صورت میں  
تمام دنیا کے مسلمانوں کا بہ یک وقت فرض ہوگا کہ جس طرح بھی ممکن  
ہو ، اس کی مدد کریں - اور اُس کے دشمنوں پر حملہ آور ہوں -

(۸) اسلام کا حکم شرعی ہے کہ جزیرہ عرب کو غیر مسلم اثر سے محفوظ  
رکھا جائے - اُس میں عراق کا ایک حصہ اور بغداد بھی داخل ہے - پس اگر  
کوئی غیر مسلم حکومت اس پر قابض ہونا چاہے ، یا اُس کو خلیفۃ اسلام کی  
حکومت سے نکال کر اپنے زیر اثر لانا چاہے ، تو یہ صرف ایک اسلامی ملک  
کے نکل جانے ہی کا مسئلہ نہ ہوگا ، بلکہ اُس سے بھی بڑھ کر ایک  
مخصوص سنگین حالت پیدا ہو جائیگی - یعنی اسلام کی مرکزی سرزمین  
پر کفر کا اثر چھا رہا ہے - پس اس حالت میں تمام مسلمانان عالم کا

# باب

( خاتمۂ سخن )

## فصل

( نتائج بحث )

گذشتہ مباحث و تفصیلات کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

( ۱ ) اسلام کا قانون شرعی یہ ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا ایک خلیفہ و امام ہونا چاہیے۔ ”خلیفہ“ سے مقصود ایسا خود مختار مسلمان پادشاہ اور صاحب حکومت و مملکت ہے جو مسلمانوں اور انکی آبادیوں کی حفاظت اور شریعت کے اجراء و نفاذ کی پوری قدرت رکھتا ہو اور دشمنوں کے مقابلے کیلئے پوری طرح طاقتور ہو۔

( ۲ ) اسکی اطاعت و اعانت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اور مثل اطاعت خدا و رسول کے ہے۔ تارقذیکہ اُس سے کفر بواج ( صریح ) ظاہر نہو۔ جو مسلمان اسکی اطاعت سے باہر ہوا، وہ اسلامی جماعت سے باہر ہو گیا۔ جس مسلمان نے اسکے مقابلہ میں لڑائی کی۔ یا لڑنے والوں کی مدد کی، اُس نے اللہ اور اسکے رسول کے مقابلے میں تلوار کھینچی۔ وہ اسلام سے باہر ہو گیا، اگرچہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو، اور اپنے تئیں مسلم سمجھتا ہو۔

( ۳ ) ایک خلیفہ کی حکومت اگر جم چکی ہے، اور پھر کوئی مسلمان اسکی اطاعت سے باہر ہوا اور اپنی حکومت کا دعوا کیا، تو وہ باغی ہے۔ اسکو قتل کر دینا چاہیے۔

( ۴ ) صدیوں سے اسلامی خلافت کا منصب سلاطین عثمانیہ کو حاصل ہے، اور اسوقت از روئے شرع تمام مسلمانان عالم کے خلیفہ و امام وہی ہیں۔ پس انکی اطاعت و اعانت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ جو انکی اطاعت سے باہر ہوا، اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا، اور



اس اعلان جنگ کی اطلاع جب سرکاری طور پر ہندوستان میں مشترکہ کی گئی، تو ساتھ ہی حسب ذیل امور کا بھی اعلان کیا گیا تھا :

( ۱ ) ترکی حکومت کے ساتھ ہماری جنگ دفاعی ہے - نہ کہ حملہ آورانہ - ہم نے دو ماہ تک ہر طرح کا مخالفانہ اور جنگ جویانہ سلوک برداشت کیا، اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح یہ جنگ ٹل جائے، لیکن ترکی گورنمنٹ نے برابر اپنے حملے جاری رکھے - اب مجبوراً ہم کو بھی اعلان جنگ کرنا پڑا ہے -

( ۲ ) ہندوستان کے مسلمانوں کو پوری طرح بھروسہ رکھنا چاہیے کہ اس جنگ میں ہمارے یا ہمارے ساتھیوں کی جانب سے کوئی بات ایسی نہ ہوگی جو انکے مذہبی محسوسات کو صدمہ پہنچائے - اسلام کے تمام مقدس مقامات محفوظ رکھنے کے لیے عراق بھی داخل ہے - انکے احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا - اسلام کے مقدس مقام خلافت کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہ آئیگی - ہماری جنگ موجودہ ترکی وزارت سے ہے جو جرمنی کے زیر اثر کام کر رہی ہے - خلیفۃ المسلمین سے اور اسلام سے نہیں ہے - گورنمنٹ برطانیہ نہ صرف اپنی جانب سے بلکہ اپنے تمام حلیفوں کی جانب سے ان باتوں کی ذمہ داری لیتی ہے -

یہ خلاصہ اُس سرکاری اعلان کا ہے جو پہلی نومبر سنہ ۱۹۱۴ء کو اعلان جنگ کی اطلاع کے ساتھ ہی گورنمنٹ آف انڈیا نے شائع کیا تھا، اور پھر تمام صوبوں میں سرکاری طور پر اسکی اشاعت کی گئی تھی - حتیٰ کہ ہر کمشنری، ہر ضلع، ہر صدر مقام، ہر شہر کے مسلمانوں کو جمع کر کے مقامی حکام نے اسکی نقلیں بانٹی تھیں اور زبانی بھی پڑھکر سنایا تھا - برٹش انڈیا کا کوئی مسلمان گھر ایسا نہیں ملیگا جو اس اعلان سے بے خبر چھوڑ دیا گیا ہو - بعد کو ”نیر ایست“ وغیرہ اخبارات سے معلوم ہوا کہ مصر و سوڈان میں بھی بجنسہ یہی اعلان شائع کیا گیا تھا -

اس اعلان کے بعد بھی ہمیشہ ذمہ دار حکام ہند و انگلستان کی زبان سے یہ دونوں باتیں بار بار ظاہر ہوتی رہیں - اگر کسی اظہار و بیان کی مضبوطی میں اعلان کی تکرار و اشاعت کی کثرت و وسعت کو دخل ہے، تو بلا خوف رد کہا جاسکتا ہے کہ جس قدر کثرت و تکرار کے ساتھ یہ اعلان شائع کیا گیا، شاید ہی کوئی انسانی وعدہ اس قدر دہرایا گیا ہو -

ارلین فرض ہوگا کہ اس قبضہ کو وہاں سے ہٹانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں ،  
اور اپنی تمام قوتیں اس کام کے لیے وقف کر دیں ۔

( ۹ ) اسلام کے مقامات مقدسہ میں بیت المقدس اُسی طرح محترم  
ہے جس طرح حرمین شریفین ۔ اس کے لیے لاکھوں مسلمان اپنی جانوں  
کی قربانیاں ، اور یورپ کے اُٹھ صلیبی جہادوں کا مقابلہ کر چکے ہیں ۔  
پس تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس مقام کو دوبارہ غیر مسلموں کے قبضہ  
میں جانے نہ دیں ۔ علی الخصوص مسیحی حکومتوں کے قبضہ و اقتدار میں ۔  
اور اگر ایسا ہو رہا ہے ، تو اُس کے خلاف دفاع کرنا صرف وہاں کی مسلمان  
آبادی ہی کا فرض نہ ہوگا ۔ بلکہ بہ یک وقت و بہ یک دفعہ تمام مسلمانان  
عالم کا ۔

( ۱۰ ) اس صورت میں جو فرض شرعی مسلمانوں پر عائد ہوگا ، اس  
میں پہلی چیز ” ترک “ ہے ۔ دوسری ” اختیار “ ۔ ” ترک “ سے مقصود یہ  
ہے کہ تمام ایسے تعلقات ترک کر دینا پڑینگے جن میں برٹش گورنمنٹ کی  
اعانت و موالات ہو ۔ ” اختیار “ سے مقصود یہ ہے کہ وہ تمام وسائل اختیار کرنے  
پڑینگے ، جنکے ذریعہ فریضہ دفاع انجام پاسکے ۔  
و تلک عشرة کاملہ ۔

## فصل

( خلیفۃ المسلمین اور گورنمنٹ برطانیہ )

جب کہ اسلام کے اٹل اور اپنے پیروں کے لیے دائمی احکام کا یہ حال ہے ،  
تو یکایک ۴ ۔ اگست ۱۹۱۴ کو عالمگیر جنگ عالم کا شرارہ وسط یورپ میں  
چمکا ، اور دیکھتے ہی دیکھتے مغربی تمدن کا تمام آتشگیر مادہ جنگ  
بھڑک اُٹھا : نار اللہ الموقدۃ التي تطلع علی الإفئدة ! پھر تھوڑے ہی عرصہ  
کے بعد جنگ نے مسلمانان ہند کے لیے ایک ایسی نازک صورت اختیار  
کر لی ، جو برطانیہ کی حکومت ہند کی پوری تاریخ میں آج تک کبھی  
پیش نہیں آئی تھی ۔ یعنی خلیفۃ المسلمین کی فرجیں بھی میدان  
جنگ میں مشغول پیکار نظر آئیں ، اور ترکی کے برخلاف برطانیہ نے  
اعلان جنگ کر دیا ۔

شریف ثابت کریں ، لیکن بیسویں صدی کی تہذیب میں حکومتوں کیلئے شریف ہونا چنداں ضروری بات نہیں ہے ، اور اگر طاقت موجود ہے تو پھر اخلاقی صداقت کے مطالبہ کا رھم و گمان بھی نہیں کرنا چاہیے ۔ جب وعدوں کا ایفا اور عہد و پیمان کی پابندی کمزور حکومتوں کے ساتھ ضروری نہیں سمجھی جاتی ، تو پھر محکوم و بے سروسامان رعایا کے ساتھ کیوں ضروری سمجھی جائے ، جو اپنی وفاداری میں کتے کی طرح قابل تعریف مگر بے زبانی میں اُسی کی طرح بے بس بھی ہے ؟

انگلستان کی حکومت نے نپولین کے عہد سے لیکر آج تک اپنے وعدوں کو جس طرح پورا کیا ہے ، انکی عبور انگیز سرگزشت صفحات تاریخ پر ثبت ہے ۔

برطانی وعدوں کے اعتماد اور انکے ایفاء کی اخلاقی نمائش کا یہ پہلا ہی موقعہ نہیں ہے ۔ ۱۵ - جولائی سنہ ۱۸۱۵ء کو جب نپولین نے بلرافان نامی انگریزی جہاز پر قدم رکھا تھا تو اُس نے بھی انگلستان کے وعدوں پر اعتماد ہی کیا تھا ۔ کچھ بے اعتمادی نہ کی تھی ۔ لیکن خود اُسی کے لفظوں میں ” انگلستان نے ہاتھ بڑھا کر اپنا مہمان بنانے کیلئے بلایا ، اور جب وہ آگیا تو اسکا خاتمہ کر دیا “

سینٹ ہلینا کی سنگلاخ چٹانیں آج تک سمندر کے طوفانوں کے اندر انگریزی مواعید کی اخلاقی قدر و قیمت کا اعلان کر رہی ہیں !

۴ - اگست سنہ ۱۸۱۵ء کو جنگ وائٹر لو کے بعد جب شہر پیرس متحدہ افواج کے حوالے کیا گیا ، اور اس عہد نامہ کو فرانسیسیوں نے عہد نامہ سمجھا جس پر انگلستان کے نامور ہیرو دیوک آف ویلنگٹن کے دستخط تھے ، تو یقیناً انہوں نے بھی انگلستان پر اعتماد ہی کیا تھا ۔ لیکن قبضہ کے بعد جو نتیجہ نکلا ، اس پر تاریخ کا اتل فیصلہ صادر ہو چکا ہے ، اور خود انگریز مورخوں کی زبانی اُسکا افسانہ خونیں سن لیا جاسکتا ہے ۔

خود ہندوستان کے گذشتہ سو سالوں کی تاریخ ہی اسکے لیے کافی ہے ۔ دوسرے ملکوں کی سرگزشتوں کی طرف نظر اُٹھانے کی ضرورت کیا ہے ؟

شمشاد خانہ پرور ما از کے کمترست ؟



یہ کہنا ضروری نہیں کہ اسوقت میدان جنگ کا کیا حال تھا ؟ برٹش گورنمنٹ کو اپنی زندگی کیلئے لاکھوں سپاہیوں اور توپوں کی جسقدر ضرورت تھی ' اس سے کہیں زیادہ اس اعلان اور اسکی کامیابی کی ضرورت تھی - اگر اسوقت ہندوستان کے مسلمانوں میں ذرا بھی بے چینی پیدا ہو جاتی ' تو نہیں معلوم جنگ کی تاریخ کیسا پلٹا کھاتی ' اور آج نتائج کا کیا حال ہوتا ؟

اس اعلان کا نتیجہ بھی نکلا جو مطلوب تھا - یعنی مسلمانان ہند پر صورت حال مشتبہ ہو گئی - نادان و حیلہ جو علماء اس خیال میں پڑ گئے کہ جب ترکوں نے انگلستان و دل متحدہ پر حملہ کیا ہے ' تو شرعاً صورت دفاع کی نہیں ہے بلکہ حملہ و ہجوم کی ہے ' اور اسلئے اسکی شرکت فرض کفایہ کا حکم رکھتی ہے - نہ کہ فرض عین کا - پس شرعاً ضروری نہیں کہ مسلمانان ہند بھی اسمیں حصہ لیں - عام مسلمانوں پر یہ اثر پڑا کہ برٹش گورنمنٹ صرف اپنا بچاؤ کر رہی ہے - اسکا مقصود اسلامی ممالک پر قبضہ و تصرف کرنا یا خلیفہ اسلام کی حکومت کو نقصان پہنچانا نہیں ہے - نیز اسلام کے مقدس مقامات یعنی جزیرہ عرب اور بیت المقدس وغیرہ ہر حال میں محفوظ رہینگے - ان تمام باتوں کا نہ صرف انگلستان کی جانب سے وعدہ کیا جاتا ہے ' بلکہ تمام حلیف حکومتوں کی جانب سے بھی -

نہایت افسوس اور رسیاہی کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا نہ یہ مذہبی فیصلہ صحیح تھا - نہ وعدوں اور اعلان پر اعتماد - انہوں نے اپنی سیزدہ صد سالہ تاریخ حیات میں شاید ہی کوئی ایسی قومی و مذہبی غلطی کی ہوگی ' جیسی اس موقع پر کی ' اور جسکے نتائج کی پہلی قسط آج آنکے سامنے ہے - " وما تخفی فی صدور ہم اکبر "

فما کان اللہ لیظلمہم - لیکن کانوا انفسہم یظلمون !

تھوڑی دیر کیلئے اس سے قطع نظر کرلو کہ احکام شرع کی بنا پر یہ رائے کھانتک صحیح تھی ؟ صرف اس پہلو سے دیکھو کہ جن وعدوں پر بھروسہ کیا گیا ' انکا حال کیا تھا ؟

پرانے وقتوں کی طرح موجودہ زمانے کی سوسائٹی بھی اشخاص کے لئے ضروری سمجھتی ہے کہ ایفائے عہد میں اپنے تئیں

احکام شرعیہ اور گذر چکے ہیں - پس اگر موجودہ حالت میں تبدیلی نہ ہوئی اور صلح کے نام سے اسلامی خلافت کے خلاف بھی حملہ آورانہ جنگ عمل میں لائی گئی جسکا اظہار ہو رہا ہے ' تو نتائج حسب ذیل ہونگے :

( ۱ ) جس رقت خلیفۃ المسلمین نے جنگ میں شرکت کی ہے تو برٹش گورنمنٹ نے اعلان کیا تھا کہ حملہ انکی جانب سے ہے - انگلستان و حلفاء کی جانب سے نہیں ہے - لیکن اب موجودہ حالت بالکل اسکے برعکس ہے - یعنی خلیفۃ المسلمین کسی غیر مسلم ملک و حکومت پر حملہ آور نہیں ہیں بلکہ غیر مسلم حکومتیں مسلمان آبادیوں اور خلیفۃ اسلام کی حکومت پر قابض ہو رہی ہیں ' اور خلیفۃ المسلمین پر حملہ آور ہیں - پس اگر اس حالت میں تبدیلی نہ ہوئی اور عارضی صلح کے بعد بھی یہی حال رہا ' تو مسلمانوں کیلئے قطعاً صورت دفاع اور نغیر عام کی پیدا ہو جائیگی جب جہاد ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے - حملہ و هجوم کی صورت نہ ہوگی کہ فرض علی الکفایہ ہو - لہذا ہندوستان کے ہر مسلمان کا یہ شرعی فرض ہوگا کہ خلیفۃ المسلمین ' اور ان تمام اسلامی آبادیوں کی اعانت کیلئے اُتھہ کھڑا ہو ' جہاں سے اسلامی حکومت متاثر ہو رہی ہے -

( ۲ ) یہ حقیقت پہلے سے آشکارا تھی ' مگر چار سال کی جنگ اور اسکے نتائج نے آخری درجہ یقین تک ظاہر کر دی کہ نہ تو خلیفۃ المسلمین کی موجودہ طاقت غیر مسلم حریفوں کے مقابلے کیلئے کافی ہے - نہ موجودہ اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی - یعنی وہ شکست کھا چکے ہیں اور بعض مقامات کے مسلمانوں کی درماندگی و تباہی غایت درجہ ہلاکت تک پہنچ چکی ہے - جیسے ولایت سمرنا وغیرہ کے مسلمان - پس اس بنا پر بھی مسلمانان ہند کا فرض شرعی ہوگا کہ انکی مدد کیلئے اُتھہ کھڑے ہوں - کیونکہ اگر ایک مقام کے مسلمان دشمن کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے تو دیگر ممالک کے مسلمانوں پر دفاع میں شریک ہونا فرض ہو جاتا ہے -

( ۳ ) جن بلاد اسلامیہ پر غیر مسلم دخل و تصرف کرنا چاہتے ہیں ' یا کرچکے ہیں - مثلاً ایدریا نوپل ' تھریس ' ایشیائے کوچک ' سمرنا ' عراق ' فلسطین ' انکے قرب و جوار میں مسلمانوں کی کوئی ایسی جماعت موجود نہیں جو دشمنوں کے دفاع میں مددگار ہو سکے ' اور اسکی اعانت کی وجہ سے مسلمانان ہند بری الذمہ ہو جائیں - پس اس بنا پر بھی ساری شرعی



تاہم بدبخت مسلمانوں نے بہرہ رسہ کیا اور جنگ کے نتائج کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ اُنکا رویہ، اُنکی جانیں، اُنکے ملک کی تمام قوتیں، بے دریغ خرچ کی گئیں۔ دنیا کی آخری اسلامی حکومت و خلافت کے مٹانے میں اُنکی ہر چیز نے پورا پورا کام دیا۔ یہاں تک کہ برٹش گورنمنٹ اپنی تاریخ حیات کے سب سے بڑے مہلک وقت سے بچ گئی، اور وہ فتح مندی مکمل ہو گئی جسکا پہلا نتیجہ اسلامی خلافت کی بربادی و تباہی ہے۔

اثناء جنگ ہی میں اس اعتماد کے تمام نتائج ظاہر ہو گئے تھے۔ بغداد پر انگریزی فوج قابض ہو گئی تھی جو جزیرہ عرب کی مقدس سرزمین میں داخل ہے۔ عین حدود حرم مکہ کے اندر سازشیں کر کے بغاوت کرائی گئی اور اسکی وجہ سے جسقدر توہین اس مقدس مقام کی ہوئی تھی وہ ہو کر رہی۔ پھر بھی مسلمانان ہند اپنے اعتماد سے دست بردار نہ ہوئے اور اس انتظار میں رہے کہ یہ جنگ کی عارضی حالتیں ہیں۔ صلح کے بعد ہی برطانی اعلان و مواعید کی مقدس صداقت تمام عالم پر آشکارا ہو جائیگی۔

## فصل

( موجودہ و آئندہ حالت اور احکام شرعیہ )

بحث کے اس ٹکڑے کو ہم دانستہ حذف کر دیتے ہیں کہ جنگ کے بعد ان وعدوں اور اعلانات کا کیا نتیجہ نکلا؟ نہ ہم اُن پیہم اعلانات کا یہاں ذکر کریں گے جنکا سلسلہ برابر اثناء جنگ میں بھی جاری رہا۔ مثلاً وزیر اعظم کی تقریر ۵ - جنوری سنہ ۱۹۱۸ - کیونکہ یہ تمام باتیں دنیا کے سامنے ہیں۔ اور سورج کی روشنی جن چیزوں کو دکھلا دے، اُنکے لیے بحث و نظر کی روشنی سے مدد لینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

ہم کو یہاں صرف ایک بات کا فیصلہ کرنا ہے۔ اسکے علاوہ نہ اب کوئی بات ہمارے لیے سونچنے سمجھنے کی باقی رہی ہے۔ نہ گورنمنٹ کیلئے۔ نہ صرف موجودہ و آئندہ حالت کا سوال ہے۔

نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں ہر قوم کی طرح مسلمان بھی روزمرہ اپنے مذہبی فرائض انجام دے رہے ہیں - انکی مسجدیں قائم ہیں - پانچ وقت اذان کی صدائیں بلند ہوتی ہیں - کوئی حاکم مسلمانوں سے یہ نہیں کہتا کہ نماز نہ پڑھو -

لیکن اگر برٹش گورنمنٹ بلاد اسلامیہ کے خلاف اپنے موجودہ طرز عمل پر قائم رہی، اس کے جہاز اسلامی حکومت کے ٹکرے ٹکرے کر دینے کیلئے سمندروں میں دوڑتے رہے، اسکی فوجیں عراق کی سرزمین پر قابض رہیں جو مقدس جزیرہ عرب میں داخل ہے، اور ساتھ ہی وہ اس کی بھی متوقع رہی کہ ہندوستان کے بد بخت مسلمان اس کے وفادار بنے رہیں، تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے مذہب کے چھوٹے چھوٹے حکموں میں تو آزادی دینے کیلئے طیارہ ہے، لیکن جو احکام اسلام کے بنیادی عقائد ہیں اور ان سے حکموں میں داخل ہیں جن کے ترک کر دینے سے مسلمان مسلمان نہیں رہتا، ان کے لیے چاہتی ہے کہ حق و آزادی کا نام بھی زبان پر نہ لائیں، اور برطانیہ کی وفاداری کی خاطر اپنے اسلام سے باغی ہو جائیں !

وہ مسلمانوں کو آزادی دیتی ہے کہ نماز پڑھیں جو مذہبی احکام میں شاخ کا حکم رکھتی ہے، لیکن ساتھ ہی اسلامی خلافت و امامت پر حملہ آور بھی ہے جو شاخ نہیں بلکہ بنیاد اور جڑ کے حکم میں داخل ہے ؟

وہ نماز پڑھنے میں مداخلت نہیں کریگی جس کے نہ پڑھنے سے مسلمان گناہگار ہو جاتا ہے، لیکن خلیفۃ المسلمین کو انکی حکومت و مملکت سے محروم کر دیگی جنکی مدد نہ کرنے سے مسلمان گناہگار ہی نہیں بلکہ اسلامی جماعت سے باہر ہو جاتا ہے ؟

وہ مسلمانوں کو حج کے سفر سے نہیں روکتی کیونکہ انکا مذہبی عمل ہے - لیکن وہ خلیفۃ المسلمین کو اپنی فوجی طاقت سے محصور کر کے مجبور کریگی کہ اسلامی مملکتوں کو غیر مسلموں کے حوالہ کر دیں - اسوقت مسلمان دفاع کیلئے اٹھیں گے تو کہیں گے کہ یہ بغارت ہے - پھر کیا دفاع مسلمانوں کا مذہبی عمل نہ ہوگا ؟ اور کیسا مذہبی عمل ؟ ایسا عمل کہ شرعاً ہزاروں حج سے بڑھکر - حج اس کے لیے چھوڑ دیا جا سکتا ہے، لیکن حج کی خاطر وہ نہیں چھوڑا جا سکتا -

ذمہ داری مسلمانان ہند ہی کے ذمے عائد ہوتی ہے، جنکی تعداد دنیا کی تمام اسلامی آبادیوں سے زیادہ، اور جو بہت سی باتوں میں دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے بہتر حالت رکھتے ہیں۔

( ۴ ) عراق کا تمام خطہ دریائے دجلہ تک جزیرہ عرب میں داخل ہے۔ پس اگر انگریزی قبضہ وہاں قائم رہا، یا کسی طرح کا بھی انگریزی اقتدار حکم برداری اور نگرانی کے نام سے حاصل کیا گیا، تو یہ صریح جزیرہ عرب پر غیر مسلم اقتدار ہوگا، اور از روئے شرع مسلمانان ہند کا فرض ہوگا کہ اس اقتدار کے دور کرنے کیلئے حریف کا مقابلہ کریں۔

( ۵ ) بیت المقدس اسلام کے مقامات مقدسہ میں داخل ہے۔ اگر اسپر غیر مسلم اقتدار قائم رکھا جائیگا، تو تمام دنیا کے مسلمانوں کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کا بھی فرض ہوگا کہ دفاع کیلئے مستعد ہوجائیں۔

( ۶ ) غرضکہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک وفادار برٹش شہری کی زندگی بسر کرنا شرعاً ناجائز ہوجائیگا۔ اور یہ فرائض کی سب سے بڑی کشمکش ہوگی جسمیں کوئی انسانی جماعت مبتلا ہو سکتی ہے۔ یعنی بمجرد ان حالات کے برٹش گورنمنٹ کی حیثیت از روئے شرع یہ ہوجائیگی کہ وہ ”اسلام اور مسلمانوں کی حملہ آور دشمن ہے“ اور اسلیئے اس سلوک کی مستحق ہے جو از روئے شرع مسلمانوں کو حملہ آور حریف کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ جب ایسا ہوا، تو مسلمان مجبور ہونگے کہ در راہوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرلیں۔ یا برٹش گورنمنٹ کا ساتھ دیں، یا اسلام کا۔ یہ ناممکن ہوگا کہ دونوں تعلق ایک وقت میں جمع کیے جاسکیں۔

کیا چہہ کرور سے زائد انسانوں کو اس کشمکش میں مبتلا کر دینا کوئی عاقبت اندیشانہ فعل ہو سکتا ہے؟ فرصت کی آخری گھڑیاں گزر رہی ہیں۔ اگر عارضی فتح مندی کا گھنمڈ مہلت دے، تو گورنمنٹ اس سوال پر غور کرے۔

اگر انگلستان کے رزرا (نپولین کے لفظوں میں) وعدہ اسلیئے نہیں کیا کرتے کہ وفا کیا جائے، تو کم از کم اُس ایک وعدہ کو تو اس اخلاقی کلیہ سے مستثنیٰ کر دینا چاہیئے جسکو ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کا بنیادی اصول سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کامل مذہبی آزادی کا وعدہ۔ اسی وعدہ کا

# باب

ترک و اختیار

## فصل

( ترک موالات )

اس صورت میں مسلمانوں پر ترک و اختیار، دونوں طرح کے احکام شرعاً عائد ہونگے۔

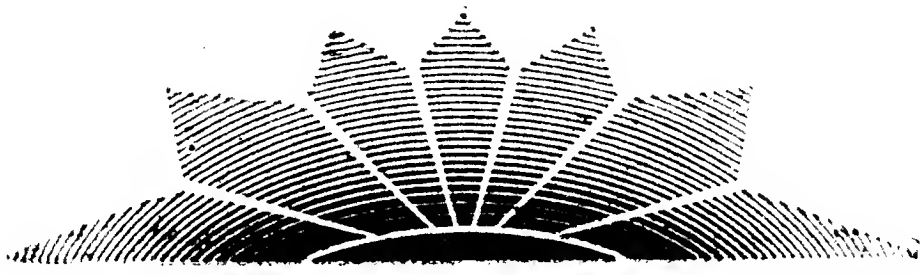
”ترک“ سے مقصود یہ ہے کہ بہت سی باتیں جو اس وقت کر رہے ہیں، ترک کر دینی پڑیں گی۔

”اختیار“ سے مقصود یہ ہے کہ بہت سی باتیں جو اس وقت نہیں کر رہے، کرنی پڑیں گی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز وہ ہے جس کو شریعت نے ”ترک موالات“ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جو غیر مسلم مسلمانوں کے حریف و دشمن اور حملہ آور فریق کا حکم رکھتے ہوں، ان سے تمام ایسے تعلقات ترک کر دینا جو محبت، خدمت، اور اعانت پر مبنی ہوں۔ اگر کوئی مسلمان ایسا تعلق رکھے گا، تو اس کا شمار بھی شریعت کے نزدیک انہی غیر مسلموں میں ہوگا۔ مسلمانوں میں نہ ہوگا۔

قرآن حکیم نے اس بارے میں ایک اصولی تقسیم کر دی ہے۔ تمام غیر مسلم اقوام و افراد کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو نہ تو مسلمانوں سے لڑتے ہیں۔ نہ انپر حملہ آور ہیں، نہ ان کی آبادیوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ دوسری قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو یہ ساری باتیں کر رہے ہیں۔ یعنی لڑتے ہیں، حملہ آور ہیں، اسلامی ممالک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ یا کرچکے ہیں۔

مسلمان ہندوستان کی مسجدوں اور اُنکے اندر کی نمازوں کو لیکر کیا کرینگے جنکی اجازت دیدینے پر برتس گورنمنٹ کی آزادی کو ناز ہے ' جبکہ شریعت کے وہ احکام اُن کے سامنے آجائینگے جنکی تعمیل ہزار نمازوں سے بھی بڑھکر اور ہزار روزوں سے بھی اشد و اہم ہے ' اور جنکی نا فرمانی کے بعد نہ تو اُنکی نمازیں ہی اُن کے لیے سود مند رہینگی - نہ اُن کے روزے ہی اُن کو نجات دلا سکیں گے ؟





بلکہ ایک خاص قسم کے محارب غیر مسلموں سے اور ایک خاص حالت جنگ میں - اسی طرح سورہ عمران میں ہے : لا تتخذوا بطانة من دونکم لا یالونکم خبالا - ودر ما عندکم ' قد بدت البغضاء من افواههم ' و ما تخفی فی صدرهم اکبر - ( ۱۱۸ : ۳ )

یہاں ضمناً یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کو شرعاً کیسا تعلق رکھنا چاہیے ؟ سو معلوم ہوگیا کہ قرآن کی اس تقسیم کی بموجب وہ دوسری قسم میں داخل ہیں - پس ان کے ساتھ برور احسان اور نیکی و ہمدردی کرنے سے شریعت ہرگز ہرگز نہیں روکتی - آج تک انہوں نے نہ کبھی اسلامی ممالک پر حملہ کیا ، نہ مسلمانوں سے قتال فی الدین کیا ، نہ کسی اسلامی ملک سے مسلمانوں کے اخراج کا باعث ہوا -

## فصل

( راقعہ حاطب بن ابی بلتعہ )

سورہ ممتحنہ کے شان نزول کا واقعہ اس بارے میں مسلمانوں کیلئے بڑا ہی عبرت انگیز ہے -

بخاری و مسلم میں حضرت علی سے مروی ہے کہ حاطب بن ابی بلتعہ مہاجرین صحابہ اور شرکاء بدر میں سے تھے - آنحضرت صلعم نے مکہ پر چڑھائی کا قصد کیا تو انہوں نے اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے خیال سے ایک خط لکھ کر مکہ میں اطلاع دیدینی چاہی - وحی الہی سے آنحضرت اس پر مطلع ہو گئے اور راستے ہی میں سے خط پکڑا منگوایا - جب حاطب سے پرچھا گیا تو انہوں نے معذرت کی ” ما فعلت هذا کفرا ولا ارتدادا “ میں نے کفر و ارتداد اور اسلام کی مخالفت کے خیال سے ایسا نہیں کیا - صرف اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے خیال سے خط بھیج دیا تھا - میری نیت بری نہ تھی - حضرة عمر نے چاہا کہ انہیں قتل کر دیں اور کہا : ” انه منافق - قد خان الله ورسوله “ یہ منافق ہے - اس نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کی !

اسلام کا حکم یہ ہے کہ پہلی قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کو نیکی و محبت اور ہر طرح کے احسان و خیر خواہی کا سلوک کرنا چاہیے۔ اسلام اس سے ہرگز مانع نہیں۔ عالمگیر محبت اس کی دعوت حق کا اصل اصول ہے۔ البتہ دوسری قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ وہ اجازت نہیں دیتا کہ اس طرح کا کوئی علاقہ بھی مسلمان رکھیں۔ اگر رکھینگے تو ان کا شمار بھی اللہ اور اس کی شریعت کے دشمنوں میں ہوگا۔ ایک مسلمان کے سارے گناہوں سے شریعت درگزر کر لے سکتی ہے، لیکن اگر دوسری قسم کے غیر مسلموں سے محبت کرتا ہے، یا کسی طرح کا واسطہ رکھتا ہے، تو یہ گناہ نہیں ہے۔ نفاق ہے۔ اور منافق مومن نہیں ہے۔

قرآن نے یہ تقسیم سورۃ ممتحنہ میں کر دی ہے : لا ینہا کم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین و لم یخرجوکم من دیارکم ، ان تہربوہم و تقسطوا الیہم ، ان اللہ یحب المقسطین ۔ انما ینہا کم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین و اخرجوکم عن دیارکم و ظاہروا علی اخرجکم ، ان تولوہم ، و من یتولہم فارلئک ہم ، الظلمون ۔ [ ۱۰ : ۶۰ ]

اور اسی سورۃ کے اوائل میں فرمایا : یا ایہا الذین آمنوا ! لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء ، تلحقون الیہم بالمودۃ و قد کفروا بما جاءکم من الحق ؟ الخ مسلمانو ! جو غیر مسلم تمہارے اور تمہارے خدا کے دشمن ہیں ، انکو اپنا دوست نہ بناؤ ۔ اور سورۃ مائدہ میں ہے : لا تتخذوا الیہود و النصارى اولیاء ،

بعضہم اولیاء بعض ۔ و من یتولہم منکم فانہ منہم ( ۵ : ۵۴ ) ان یہود و نصاریٰ کو جو مسلمانوں کی دشمنی اور نقصان رسانی میں سرگرم ہوں ، اپنا دوست نہ بناؤ ۔ اور جو مسلمان بنائیگا ، خدا کے حضور اسکا شمار بھی انہی میں

ہوگا ۔ اس سے بھی زیادہ واضح فرمایا : لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء من

دون المومنین ( ۳ : ۲۸ ) اور لا تتخذوا الکافرین اولیاء من دون المومنین

( ۴ : ۱۴۳ ) یعنی جبکہ غیر مسلموں اور مسلمانوں میں باہم جنگ ہو ،

تو مسلمانوں کو نہیں چاہیے کہ اپنے بھائیوں کو چھوڑ کر ان کے دشمنوں کو

اپنا دوست بنائیں ۔ ” من دون المومنین “ جہاں جہاں آیا ہے ، اس نے

واضح کر دیا ہے کہ مقصود ہر قسم کے غیر مسلموں سے ترک موالات نہیں ہے ،

الذین یتخذون الکافرین  
ارلیاء من دین المومنین  
ایبتغون عندهم العزة ؟  
فان العزة لله جمیعا !  
( ۴ : ۱۳۸ )

جو مسلمان ' مسلمانوں کو چہرہ زکرائے  
مخالف غیر مسلموں کو اپنا دوست بنا  
رہے ہیں ' تو کیا وہ چاہتے ہیں کہ انکی  
بارگاہوں سے عزت حاصل کریں ؟ اگر عزت  
ہی کی طلب ہے تو یاد رکھیں کہ  
اصلی عزت دینے والے وہ نہیں ہیں - عزت اللہ کیلئے ہے اور ایک مسلمان  
کو مل سکتی ہے تو اسی کی چوکھٹ سے -

سورۃ نساء میں یہ تمام خصلتیں منافقوں کی قرار دی ہیں ' جن میں  
آج ہمارے برے برے مدعیان علم و مشیخت مبتلا ہیں - ان کا حال یہ  
ہوتا ہے کہ ایک ہی وقت میں اسلام و کفر ' دونوں سے ساز باز رکھنا چاہتے  
ہیں - یعنی وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی رہیں ' اور اسلام کے مخالفوں سے  
بھی رسم و راہ جاری رہے - مذہبیین بین ذالک - لا الیٰ ہا ارلاء ' ولا الیٰ  
ہا ارلاء ( ۴ : ۱۴۳ ) تو ایسے لوگوں کی نسبت فرمایا : یا ایہا الذین آمنوا  
لا تتخذوا الکافرین ارلیاء من دین المومنین - اتریدون ان تجعلوا لله علیکم  
سطانا مبینا ؟ ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار ( ۴ : ۱۴۳ )

اسلام تو ایک مسلمان کے لیے یہ بات بھی جائز نہیں رکھتا کہ اگر اس کے  
ماں باپ ' بھائی بہن ' مسلمانوں سے لڑ رہے ہوں ' تو ان سے بھی کسی  
طرح کا واسطہ رکھے : لا تتخذوا آباءکم و اخوانکم ارلیاء ان استحبوا الکفر علی  
الایمان ' و من یتولہم منکم فاولئک ہم الظالمون ( ۹ : ۲۳ ) اور جو مسلمان ایسے  
رقتوں میں محارب غیر مسلموں سے محبت و اعانت کا تعلق رکھیں ' خواہ وہ  
انکے ماں باپ ہی کیوں نہ ہوں ' ان کے مومن ہونے کی صاف صاف نفی کر رہا ہے :  
لا تجد قوما یؤمنون با اللہ و الیوم الآخر ' یوادون من حاد اللہ و رسولہ ولو  
کانوا آباءہم ( ۵۸ : ۲۲ ) مہاجرین صحابہ نے اس حکم کی تصویر بنکر دنیا کو  
دکھلا دیا کہ ایمان کے معنی کیا ہیں ؟

پس اب فیصلہ کرلو کہ ان لوگوں کا حکم کیا ہونا چاہیے جو ایسے رقتوں  
میں بھی محارب غیر مسلموں کے دیے ہوئے خطابوں سے پیار کرینگے ' ان کے  
دیے ہوئے تمغوں کو ( جن میں سے اکثر اسلام فررشی ہی کے صلے میں ملے  
ہیں ) اپنے سینوں پر جگہ دینگے ' انکی بارگاہوں میں جا کر اطاعت و تعبد

اسپر سورۃ ممتحنہ کا نزول ہوا :

یا ایہا الذین آمنوا لاتخذوا  
عدوی و عدوکم اولیاء  
تلقون الیہم بالمودہ و قد  
کفرا بما جاء کم من الحق -  
مسلمانو! خدا کے اور خود اپنے دشمنوں کو  
ایسا دوست نہ بناؤ کہ محبت و الفت کے  
آنسے تعلقات رکھو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو  
اسلام سے انکار کرچکے ہیں اور اللہ اور اس کے  
دین برحق کے دشمن ہیں۔

اس واقعہ میں ہمارے لیے بڑی ہی عبرت ہے۔ حاطب بن ابی  
بلتعہ مہاجرین و بدریہین میں سے تھے۔ انہوں نے صرف اپنے اہل و عیال  
کی حفاظت کے خیال سے خط لکھا تھا۔ دشمنان اسلام کی مدد کرنا مقصود  
نہ تھا۔ اسپر بھی اللہ کی جانب سے یہ عتاب نازل ہوا اور حضرت عمر قتل  
کر دینے کیلئے آئے کہ یہ منافق ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ جب باوجود علاقہ  
قربت، مخالف و محارب فریق کے ساتھ اتنا تعلق بھی گوارا نہیں کیا گیا،  
تو پھر ان مسلمانوں کا شرعاً کیا حکم ہونا چاہیے جو برتیش گورنمنٹ  
کے محارب فریق ہونے پر بھی ہر طرح کی محبت و موالات اور اعانت و  
مشارکت کے تعلقات اس کے ساتھ رکھتے ہیں۔ اور جنکا اب تک یہ حال ہے کہ  
اس کے درباروں کے دے دیے ہوئے سود خطابوں کو بھی ترک کر دینا ان کے  
نفس حق فراموش پر گراں گزر رہا ہے؟

علی الخصرص ان مدعیان علم و تقدس کا حال قابل تماشا ہے جنکو  
انکی بارگاہوں سے ”شمس العلماء“ کے خطابات ملے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں  
جو اپنے تئیں اسلام کی دینی ریاست کا اولین حقدار اور مسلمانوں کی  
مذہبی پیشوائی کا سب سے زیادہ مستحق ظاہر کرتے ہیں۔ یا سبحان اللہ!  
مسلمانوں پر انکی قومی بدبختی کا اس سے بڑھکر اور کونسا وقت آسکتا ہے؟  
جن لوگوں کو اسلام اور اسکی کتاب قطعاً منافق قرار دے رہی ہو اور جو  
اللہ کے نزدیک اس کے بھی حقدار نہوں کہ مسلمانوں کی صف میں جگہ پائیں،  
انکو مسلمانوں کی ریاست و پیشوائی کا دعویٰ ہو، وہ مسلمانوں کی  
بڑی درسگاہوں کے مالک ہوں جہاں صبح شام قال اللہ اور قال الرسول  
کا چرچا رہتا ہو اور پھر اس سے بھی عجیب تر یہ کہ بہت سے مسلمان  
ہوں جو انکی پیشوائی کو جان و دل سے مان رہے ہوں اور ان کے آگے عقیدت  
و ارادت کا سر جھکا کر اللہ اور اس کے رسول سے گردن موڑ رہے ہوں!

مدار روزگار سفلہ پرور را تماشا کن!



امام بخاری کا یہ استدلال نہایت واضح اور صاف ہے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کو حکم دیدیا تھا کہ کسی طرح کا واسطہ ان لوگوں سے نہ رکھیں - نہ سلام کریں - نہ کلام کریں - نہ ملیں جلیں - یہاں تک کہ انکی بیویوں تک کو تعلقات زوجیہ رکھنے کی اجازت نہ تھی - بالآخر یہ حالت ہوگئی کہ ”ضاقت علیہم الارض بما رحبت“ پس اس سے ثابت ہوا کہ جب کبھی اسلام اور امت کی حفاظت اور دفاع کا وقت آجائے اور تمام مسلمانوں کا اسمیں شریک ہونا ضروری ہو، تو جس مسلمان کی طرف سے اسمیں سستی و کاهلی ہو، یا انکار و تخلف ہو، اسکا جرم عند اللہ نہایت شدید و عظیم ہے اور مسلمانوں کی جماعت کو حق پہنچتا ہے کہ زجر و تنبیہ کیلئے اسے ساتھ رہی سلوک کریں جو ان تینوں شخصوں کے ساتھ کیا گیا تھا - اور جب تک وہ اپنے رویہ سے باز نہ آجائیں، کوئی مسلمان ان سے کسی طرح کا علاقہ نہ رکھے - جب ان مسلمانوں کیساتھ یہ سلوک جائز ہوا جو سابقین انصار اور شرکاء بدر میں سے تھے اور جنکا قصور بجز سستی و کاهلی کے اور کچھ نہ تھا، تو جو لوگ صریح طور پر اعداء اسلام کے ساتھ اطاعت و اعانت کے تعلقات رکھیں، اور دفاع اسلام کی سعی و تدبیر میں شامل ہونے سے صاف صاف انکار کر دیں، انکے لیے تو ایسا حکم دینا نہ صرف جائز و مشروع ہوگا، بلکہ یقیناً واجب و الزم ہوگا -

ابن ابی حاتم نے امام حسن بصری کا کیا خوب قول نقل کیا ہے - قال ”یا سبحان اللہ! ما اكلها الاة مالا حراماً، ولا سفکوا دماً حراماً، ولا افسدوا فی الارض، اصابهم ما سمعتم، وضاقت بهم الارض بما رحبت، فكيف بمن يواقع الفواحش و الكبائر؟“

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں ”و فیہا ترک السلام علی من اذنب و جواز ہجرہ اکثر من ثلاث - و اما الذہبی عن الہجر فرق الثلاث فمحمول علی من لم یکن ہجرانہ شرعیاً“ (۱) یعنی اس واقعہ سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مجرمین شرع سے ترک سلام و کلام کرنا جائز ہے اور تین دن سے زیادہ

(۱) امام بخاری اپنی عادت کے مطابق حدیث کعب کو مختلف ابواب میں لائے ہیں - باب متذکرۃ متن کتاب الاحکام کا آخری باب ہے، اور مفصل حدیث کتاب المغازی میں ہے - کتاب المغازی کی شرح میں حافظ مرصوف کی یہ عبارت ملیگی - (جلد ۸ - ۹۴)



کا سر جھکاؤینگے ، ارر آہ ، ان سب سے بھی بڑھکر رہ ، جو انکی راہوں میں  
غلاموں کی طرح بچھینگے ، انکے حکموں پر کتوں کی طرح لوٹینگے ، انکی خدمت  
و چاکری کے عشق میں اپنے دین و ایمان تک کو نثار کردینگے ؟ فیما للہ  
و للمسلمین ! من هذه الفاقة التي هي اعظم فواقر الدين ، والرزية التي  
ما رزي بمثلها سبيل المومنين !

لمثل هذا يذوب القلب من كمد

ان كان في القلب اسلام و ايمان !

## فصل

هل للامام ان يمنع المتخلفين والقاعدين من الكلام معهم و الزيارة و نحوه ؟

ایک اہم سوال شرعاً یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو مسلمان باوجود تبلیغ  
و تفہیم ، محارب غیر مسلموں سے ترک موالات نہ کریں ، ارر انکی مروت  
و اعانت سے باز نہ آئیں ، انکے ساتھ مسلمانوں کو کیا سلوک کرنا چاہیے ؟

حضرة كعب بن مالك اور غزوة تبوك کے متخلفین کا واقعہ گذشتہ باب  
میں گزر چکا ہے ۔ اس موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طرز عمل  
اختیار کیا تھا ، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو مسلمان مصالح امت کے خلاف  
روش اختیار کریں ، اور دشمنان ملت کے دفاع میں باوجود استطاعت حصہ  
نہ لیں ، انسے بھی مسلمانوں کو ترک موالات کردینا چاہیے ۔

امام بخاری نے کتاب الاحکام میں باب باندھا ہے ” هل للامام ان  
يمنع المجرمين و اهل المعصية من الكلام معه و الزيارة و نحوه ؟ “ یعنی  
کیا مسلمانوں کے امام کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ جو لوگ شرعی جرائم  
کے مرتکب ہوں ، انسے ملنے ، بات چیت کرنے ، اور اسی طرح کے تعلقات  
رکھنے سے لوگوں کو روک دے ؟ ارر پھر اسمیں حضرت كعب بن مالك کی  
روایت درج کی ہے ۔ گویا اس واقعہ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ امام کو  
ایسا کرنے کا حق پہنچتا ہے ، ارر زجر و تذبذبه اور عبرت پذیری کے لیے  
ایسا کرنا اعمال نبوت کے تھیک تھیک مطابق ہوگا ۔

سزا اسلیے دی گئی کہ انصار میں سے تھے اور انصار نے آنحضرت کی حمایت کا خاص طور پر وعدہ کیا تھا۔ انپر دوسروں سے کہیں زیادہ معیت و نصرت فرض تھی۔ اسمیں کوتاہی ہوئی تو مستحق تعزیر ہوئے۔

ہم کو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ شبہ جسقدر تعجب انگیز ہے اس سے کہیں زیادہ ان اکابر و اعلام کے جوابات و تعلیلات تعجب انگیز ہیں۔ سخت حیرانی ہوتی ہے کہ ایک نہایت صاف و واضح معاملہ کی نسبت کیوں اسقدر غیر ضروری کاوشیں کی گئیں، اور کیوں اصلی علت سامنے نہ آگئی؟

حضرت ہلال اور مرارہ کا بدری ہونا مسلم ہے۔ بخاری کی روایت میں خود حضرت کعب کہتے ہیں ”رجلین صالحین قد شهدا بدرا“ اور حاطب بن ابی بلتعہ کے واقعہ اور اس معاملہ میں کسی طرح کی منافات نہیں ہے۔ دونوں معاملے اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ اس واقعہ پر جن لوگوں کو تعجب ہوا، انہوں نے حکم دفاع کی اہمیت پر نظر نہ ڈالی۔ اگر اسپر غور کر لیتے تو یہ شبہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ نہ ان کمزور توجیہوں کی ضرورت پیش آتی۔

ایک صورت عام طور پر حفظ ملک و نصرت قوم کی ہے۔ اور ایک صورت خاص دشمن کے حملہ و هجوم کی ہے۔ پہلی حالت میں اگر جنگی احکام کی تعمیل میں سستی و کاهلی ہو، تو اس درجہ سنگین نہیں ہوتی جسقدر دوسری حالت میں۔ پہلی حالت اندرونی امن کی ہے۔ دوسری بیرونی حملہ و جنگ کی۔ جنگ و دفاع کی حالت میں ایک ذرا سی سستی اور کاهلی بھی اتنا بڑا جرم ہوتی ہے کہ اسکی پاداش میں موت کی سزا کو بھی سخت نہیں کہا جاسکتا۔

اسی بنا پر شریعت نے ایک حالت تہیۃ جہاد و رباط خیل و استعداد کار کی قرار دی ہے۔ دوسری حالت ”دفاع“ اور نفیر کی بتلائی۔ جب کسی دشمن نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا ہو اور مسلم و غیر مسلم جنگ کی حالت پیدا ہو گئی ہو، تو وہ حالت دفاع کی ہے۔

حاطب بن ابی بلتعہ کا واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں امن تھا۔ قریش یا کسی دوسرے دشمن کی طرف سے اسوقت حملہ کا خوف نہ تھا۔ خود مسلمان مکہ پر حملہ کرنے والے تھے۔ کیونکہ قریش نے اپنا عہد و میثاق توڑ دیا تھا۔

اُن سے ترک تعلق کیا جا سکتا ہے - باقی رہی حدیث - ” لا یحل لرجل ان یمجر اخاه فوق ثلاث“ یعنی کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی مسلمان سے جدا رہے - تو اُس سے مقصود وہ جدائی ہے جو بلا سبب شرعی ہو، اور اس واقعہ میں جدائی کا حکم جرم شرعی کے ارتکاب کی بنا پر ہوا - پس زیادہ عرصہ تک ترک علائق جائز ہے -

حافظ ابن قیم نے بھی ہدی میں اس واقعہ سے یہ حکم مستنبط کیا ہے اور اپنے مخصوص طرز میں شرح بحث کی ہے -

## فصل

( ایک شبہ اور اُسکا ازالہ )

بیجا نہ ہوگا اگر یہاں ایک شبہ درر کر دیا جائے جو اس معاملہ کی نسبت ہوا ہے اور ہو سکتا ہے - حافظ ابن حجر لکھتے ہیں ” استدلال بعض المتأخرین لكونهما لم يشهدا بدرا بما وقع في قصة حاطب“ ر ان النبي صلعم لم يهجرة ولا عاقبه مع كونه جس عليه بل قال لعمر لما هم بقتله : لعل الله اطلع علي اهل بدر فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لكم : قال - ر این ذنب التخلف من ذنب الجس ؟“ یعنی بعض متأخرین نے اس سے انکار کیا ہے کہ مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ شہداء بدر میں سے تھے - کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو انکو یہ سزا نہ دی جاتی - حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش مکہ سے خط و کتابت کی اور وہ جرم بڑا ہی سخت جرم تھا - یعنی جاسوسی کا تھا - اسپر بھی بوجہ بدری ہونے کے آنحضرت نے معاف کر دیا اور لوگوں کو انکے ساتھ ترک تعلق کا حکم نہیں دیا - کعب اور انکے ساتھیوں کا اس سے بڑھکر تو قصور نہ تھا ؟ پھر اتنی بڑی سخت سزا انکو کیوں دی گئی ؟ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حاطب کی معافی انکے بدری ہونے کی وجہ سے تھی، اور یہ لوگ اسلیے ماخوذ ہوئے کہ بدری نہ تھے - انتہی -

پھر حافظ موصوف نے اسکا جواب دیا ہے کہ یہ لوگ ضرور بدری تھے - حاطب کو اسلیے کوئی سزا نہیں دی گئی کہ انہوں نے اپنے اہل و عیال کی حفاظت کا عذر پیش کیا تھا - لیکن ان لوگوں کے پاس کوئی عذر نہ تھا - پھر آگے چلکر سہیلی کا جواب نقل کیا ہے کہ ان لوگوں کو سخت

مرتب ہیں اور مدرسوں کے اندر شب و روز زیر درس و تدریس رہتے ہیں ۔  
پس گورنمنٹ کو چاہیے کہ صرف اس بات کی جانچ کرے کہ واقعی اسلام  
کے شرعی احکام ایسے ہی ہیں یا نہیں ؟

اگر ثابت ہو جائے کہ ایسا ہی ہے، تو پھر صرف درہی راہیں گورنمنٹ  
کے سامنے ہونی چاہئیں :

یا مسلمانوں کیلئے انکے مذہب کو چھوڑ دے اور کوئی بات ایسی نہ کرے  
جس سے انکے مذہب میں مداخلت ہو اور وہ اپنے مذہبی احکام کی بنا پر  
برٹش گورنمنٹ کے خلاف ہوجانے پر مجبور ہو جائیں ۔

یا پھر اعلان کر دے کہ اس کو مسلمانوں کے مذہبی احکام کی کوئی  
پرہیز نہیں ہے ۔ نہ اس پالیسی پر قائم ہے کہ ان کے مذہب میں مداخلت  
نہوگی ۔ اس کو صرف زیادہ سے زیادہ زمین چاہیے ، زیادہ سے زیادہ  
حکومت چاہیے ، موصل کے تیل کے چشمے چاہئیں ، عراق کی زر خیز زمین  
کی دولت چاہیے ، اور اسلامی خلافت کا خاتمہ ، تاکہ دنیا میں اس کا  
کوئی اسلامی حریف باقی نہ رہے ۔ اگر ایسا کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کے  
مذہبی احکام متصادم ہوتے ہیں ، تو ہوں ۔ اگر انپر طرح طرح کے اشد فرائض  
عائد ہوجاتے ہیں ، تو ہوا کریں ۔ انکو ہر حال میں برٹش گورنمنٹ کا وفادار  
غلام بنا رہنا چاہیے ، اگرچہ اسکی خاطر اپنے مذہب سے بھی دست  
بودار ہو جانا پڑے ۔

اسکے بعد مسلمانوں کیلئے بھی نہایت آسان ہو جائیگا کہ اپنا وقت بے  
سود شور و فغاں میں ضائع نہ کریں ، اور برٹش گورنمنٹ اور اسلام ، ان  
دونوں میں سے کوئی ایک بات اپنے لیے پسند کر لیں ۔





لیکن حضرت کعب بن مالک کا معاملہ دوسرا تھا ۔ انہوں نے اس وقت اداء فرض میں سستی کی جب دشمن کے حملہ و هجوم کا اعلان ہو چکا تھا اور چالیس ہزار رومیوں کے اجتماع کی خبریں آچکی تھیں ۔ وہ حملہ کا وقت نہ تھا ۔ دفاع کا تھا ۔ امام نے حکم دیدیا تھا ، اور نفیر عام کی صورت پیدا ہو گئی تھی ۔ اس وقت اداء فرض میں غفلت کرنا ایسا سنگین جرم ہے کہ کسی طرح معاف نہیں کیا جاسکتا ۔ پس ضروری تھا کہ عبرت کیلئے کوئی سخت طرز عمل اختیار کیا جاتا ، تا کہ آئندہ ایسی غفلتوں کی کسی کو جرأت نہ ہو ۔

تعجب ہے کہ حافظ ابن قیم کو بھی ہدی میں یہی شبہ لاحق ہوا اور اسی لیے انہوں نے ہلال اور مزارع کے بدری ہونے سے انکار کر دیا ہے ۔ والغلط لا یعصمہ الانسان ۔

## فصل

( گورنمنٹ کے لیے اصلی سوال )

گورنمنٹ صرف اپنے فوائد و اغراض ہی سامنے رکھ کر غور کر لے کہ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو جو دنیا اور زندگی کی ساری چیزوں سے زیادہ اپنے مذہب کو محبوب رکھتے ہیں ، ایک ایسی اٹل اور لا علاج کشمکش میں ڈال دینا بہتر ہوگا جس میں ایک طرف ان کے مذہبی احکام ہیں ، دوسری طرف برٹش گورنمنٹ ؟ اور دونوں باتیں اس طرح آپس میں لڑ گئی ہیں کہ کسی طرح بھی جمع نہیں ہو سکتیں ؟

اگر انسان کے ہاتھ اشارے کر کے طوفانوں اور بجلیوں کو بلا سکتے ہیں ، تو یقیناً برٹش گورنمنٹ اس وقت اس آدمی کی طرح سمندر کے کنارے کھڑی ہے جو اپنا ہاتھ ہلا ہلا کر طوفانوں کو دعوت دے رہا ہو ۔

في الحقیقت یہ نہ تو کوئی الجھاؤ ہے نہ کوئی مشکل مسئلہ ۔ بالکل صاف اور سیدھی سی بات ہے ۔ بشرطیکہ حاکمانہ غرور اور طاقت کا نشہ چند لمحوں کے لیے عقل و انصاف کو کام کرنے دے ۔

مسلمانوں کا مطالبہ شرعی احکام کا مطالبہ ہے ۔ اسلام کے احکام کوئی راز نہیں ہیں جن تک گورنمنٹ کی رسائی نہ ہو ۔ چھپی ہوئی کتابوں میں



کوئی قوم اس نظام کو ترک کر دیتی ہے تو گو اس کے افراد فرداً فرداً کتنے ہی شخصی اعمال و طاعات میں سرگرم ہوں، لیکن یہ سرگرمیاں اس بارے میں کچھ سود مند نہیں ہوسکتیں، اور قوم جماعتی معصیت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

قرآن و سنت نے بتلایا ہے کہ شخصی زندگی کے معاصی کسی قوم کو یکایک برباد نہیں کر دیتے۔ اشخاص کی معصیت کا زہر آہستہ آہستہ کام کرتا ہے۔ لیکن جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعتی کا نہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔

شخصی اعمال کی اصلاح و درستگی بھی نظام اجتماعی کے قیام پر موقوف ہے۔ مسلمانان ہند جماعتی زندگی کی معصیت میں مبتلا ہیں۔ اور جب جماعتی معصیت سب پر چھا گئی ہے تو افراد کی اصلاح کیونکر ہوسکتی ہے؟

کتاب و سنت نے جماعتی زندگی کے تین رکن بتلائے ہیں :  
تمام لوگ کسی ایک صاحب علم و عمل مسلمان پر جمع ہو جائیں، اور وہ انکا امام ہو۔

وہ جو کچھ تعلیم دے، ایمان و صداقت کے ساتھ قبول کریں۔  
قرآن و سنت کے ماتحت اس کے جو کچھ احکام ہوں، انکی بلا چون و چرا تعمیل و اطاعت کریں۔

سب کی زبانیں گونگی ہوں۔ صرف اسی کی زبان گویا ہو۔ سب کے دماغ بیکار ہو جائیں۔ صرف اسی کا دماغ کار فرما ہو۔ لوگوں کے پاس نہ زبان ہو نہ دماغ۔ صرف دل ہو جو قبول کرے، صرف ہاتھ پاؤں ہوں جو عمل کریں!

اگر ایسا نہیں ہے، تو ایک بھیڑ ہے، ایک انبوہ ہے، جانوروں کا ایک جنگل ہے، کنکر پتھر کا ایک ڈھیر ہے، مگر نہ تو ”جماعت“ ہے نہ ”امت“۔ نہ ”قوم“ نہ ”اجتماع“۔ اینٹیں ہیں مگر دیوار نہیں۔ کنکر ہیں مگر پہاڑ نہیں۔ قطرے ہیں مگر دریا نہیں۔ کڑیاں ہیں جو ٹکرے ٹکرے کر دی جاسکتی ہیں، مگر زنجیر نہیں ہے جو بڑے بڑے جہازوں کو گرفتار کر لے سکتی ہے۔

# باب

( نظام عمل )

## فصل

( مسلمانان ہند اور نظام جماعت )

لیکن ہمارے لیے اصلی سوال اب یہ نہیں رہا ہے کہ گورنمنٹ کو کیا کرنا تھا ؟ صرف یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے ؟

اس بارے میں مسلمانوں کیلئے راہ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے ' اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک ہی ہے - یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اُس معصیت سے باز آجائیں جس میں ایک عرصہ سے مبتلا ہیں ' اور جسکی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے انپر بند ہو گئے ہیں -

”جماعتی زندگی کی معصیت“ سے مقصود یہ ہے کہ ان میں ایک ”جماعت“ بنکر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے - وہ بالکل اُس گلے کی طرح ہیں جسکا انبوه جنگل کی جھاڑیوں میں منتشر ہو کر گم ہو گیا ہو - وہ بسا اوقات یکجا اکٹھے ہو کر اپنی جماعتی قوت کی نمائش کرنی چاہتے ہیں - کمیٹیاں بناتے ہیں - کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں - لیکن یہ تمام اجتماعی نمائشیں شریعت کی نظروں میں ”بہیڑ“ اور ”انبوه“ کا حکم رکھتی ہیں - ”جماعت“ کا حکم نہیں رکھتیں - ”بہیڑ“ اور جماعت ”میں فرق ہے - پہلی چیز بازاروں میں نظر آجاتی ہے جب کوئی تماشہ ہو رہا ہو - دوسری چیز جمعہ کے دن مسجدوں میں دیکھی جاسکتی ہے جب ہزاروں انسانوں کی منظم و مرتب صفیں ایک مقصد ' ایک جہت ' ایک حالت ' اور ایک ہی کے پیچھے مجتمع ہوتی ہیں -

شریعت نے مسلمانوں کیلئے جہاں انفرادی زندگی کے اعمال مقرر کر دیے ہیں ' وہاں اُنکے لیے ایک اجتماعی نظام بھی قرار دیدیا ہے - وہ کہتی ہے کہ زندگی اجتماع کا نام ہے - افراد و اشخاص کوئی شے نہیں - جب

اسلامی زندگی اختیار کر لینی چاہیے ” اس ایک کام کے انجام پانے پر سارے کام خود بخود انجام پا جائیں گے ۔ سوال حکومتوں کے نکل جانے کا نہیں ہے ۔ ایمان کی گم گشتگی اور محرومی کا ہے :

درازی شب و بیداری من این همه نیست  
ز بخت من خبر آرید تا کجا خفتست !

اسی مسئلہ خلافت کو دیکھو ! شرعی اور سیاسی ، دونوں پہلوؤں سے کس قدر اہم اور نازک معاملہ ہے ؟ اگر آج مسلمانوں میں انکے ائمہ و مشاہیر موجود ہوتے ، تو انہیں سے بھی ہر شخص زبان نہ کھولتا ۔ کسی ایک صاحب نظر و عمل کے احکام پر سب کار بند ہو جاتے ۔ لیکن اسکے مقابلہ میں آج تمہارا حال کیا ہو رہا ہے ؟ کمیٹیوں اور تجویزوں کی عادت برسوں سے پڑی ہوئی ہے ۔ اسی قینچی سے اس پہاڑ کو بھی کترنا چاہتے ہو ۔ ہر زبان تجویزیں پیش کر رہی ہے ۔ ہر قلم امام و مجتہد کی طرح احکام نافذ کر رہا ہے ۔ کوئی کچھ کہتا ہے ۔ کوئی کچھ کہتا ہے ۔ کوئی دھنہ بلاتا ہے ۔ کوئی بائیں ۔ کیا اس طوائف الملوک کی اور ذہنی انارکی کے ساتھ جو عالم فکر و نظر کا ایک پورا پورا غدر ہے ، یہ مہم سر ہو سکتی ہے ؟

شرعی پہلو سے مسئلہ کا یہ حال کہ ایک صاحب نظر و اجتہاد دماغ کی ضرورت ہے جس کا قلب کتاب و سنۃ کے معارف و غوامض سے معمور ہو ۔ وہ اصول شرعیہ کو مسلمانان ہند کی موجودہ حالت پر ، انکے توطن ہند کی حدیث العہد نوعیت پر ، ایک ایک لمحہ کے اندر متغیر ہو جانے والے حوادث جنگ و صلح پر ، ٹھیک ٹھیک منطبق کرے ، اور پھر تمام مصالح و مقاصد شرعیہ و ملیہ کے تحفظ و توازن کے بعد فقہی شرع صادر کرتا رہے ۔ نہ ہر عالم اسکا اہل ہے ۔ نہ ہر مدرسہ نشین اس کا اسرار شناس ۔

سیاسی پہلو سے دیکھا جائے تو جو کام فوجوں اور حکومتوں کی طاقت سے انجام پا سکتا ہے ، اسکو تم صرف اپنی جماعتی قوت کے استعمال سے حاصل کرنا چاہتے ہو ۔ پھر کس قدر نامرادی ہے کہ وہ قوت بھی ناپید ؟

بلاشبہ لوگوں میں احساس اور طلب کی کمی نہیں ۔ نہ جوش و سرگرمی کی کمی ہے ، اور یہ بڑی ہی قیمتی چیز ہے ۔ لیکن اگر صحیح راہ عمل اختیار نہ کی گئی تو یہی بات سب سے زیادہ مضر بھی ہو جاسکتی ہے ۔ جذبات کی مثال استیم کی سی ہے ۔ بغیر استیم کے کچھ نہیں ہو سکتا ، لیکن وہ بھی بغیر مشین اور سائق ( ڈرائیور ) کے کچھ نہیں کر سکتی ۔ مشین اسکی

کسی گذشتہ فصل میں بہ ضمن شرح حدیث حارث اشعری ”جماعت“ کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے - اس موقعہ پر رہ پیش نظر رہے -

یہ وقت فصل کاٹنے کا تھا، نہ کہ دانہ ڈالنے کا - لیکن مسلمانوں نے اپنی جد و جہد کی تمام گذشتہ زندگی گم گشتگی و بے حاصلی میں ضائع کر دی - حتیٰ کہ سچ میچ رہ وقت آ گیا جسکی تباہیوں کا تخیل پیدا کرے کبھی ڈرانے والے ڈرایا کرتے تھے : فقد جاء اشراطها - فانی لہم ان جاء تم ذکراہم ؟ (۲۱ : ۴۷) اب بھی اگر کام ہے تو یہی کام ہے اور غم ہونا چاہیے تو اسی کا - سچے کام کے کرنے میں کتنی ہی دیر ہو جائے، مگر جب کبھی کیا جائے، سچائی ہے - اس کے لیے نہ تو کوئی وقت ناموافق ہے نہ کوئی جگہ مخالف - اس کے کرنے میں جس قدر دیر کی جائیگی، معصیت اور ہلاکی ہے - لیکن جب کبھی کر دیا جائے، سچائی اور نیکی ہے، اور اس کا ثمرہ زندگی اور کامرانی -

تمہاری سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ خاص خاص وقتوں میں خاص خاص کاموں کا نام سن پاتے ہو، اور پھر چیخنے چلانے لگتے ہو، اور جس طرح اونگھتا ہوا آدمی ایک مرتبہ چونک اُٹھتا ہے، یکایک اعتقاد اور عمل، دہروں تمہیں یاد آ جاتے ہیں - حالانکہ نہ تو خاص خاص وقتوں ہی میں تمہاری مصیبت وجود میں آتی ہے - نہ کامیابی کی راہ کسی خاص کام کے پڑ جانے پر موقوف ہے - تمہاری مصیبت دائمی، تمہارا ماتم ہمیشگی کا، تمہارا رنگ تمہاری ہڈیوں کے اندر سمایا ہوا، اور تمہاری نحوست چوبیس گھنٹے تمہاری ساتھی ہے - اور ٹھیک اُسی کی طرح تمہاری کامیابی و خوشحالی بھی ہر وقت تمہارے سایے کے ساتھ ساتھ درز رہی ہے - اور ہر آن و ہر لمحہ تمہارے وجود کے اندر سمائی ہوئی ہے -

تم وقت پر سامنے آ جانے والی چیزوں کے غم میں کیوں گھلے جاتے ہو؟ اپنا ہمیشہ کا معاملہ ایک مرتبہ درست کیوں نہیں کر لیتے؟ جب تک دل و جگر کا علاج نہ ہوگا، روز نئے نئے رنگ لگتے رہینگے - خلافت کا مسئلہ کل سے سامنے آیا ہے، مگر تمہاری بربادی کا مسئلہ کل ہی سے نہیں شروع ہوا - پس تمہارا اصلی کام کوئی خاص مسئلہ اور کوئی خاص تحریک نہیں ہو سکتی - ہمیشہ سے اور ہمیشہ کیلئے صرف یہی ہے کہ ”ہندوستان کے مسلمانوں کو مسلمان بننا چاہیے“ اور قوم و فرد، دہروں اعتباروں سے ٹھیک ٹھیک



سب سے بڑھکر یہ کہ اعمالِ مہمۂ اُمت کی راہ میں منہاجِ نبوت پر اسکا قدم استوار ہوگا، اور ان ساری باتوں کے علم و بصیرۃ کے بعد ہر وقت 'ہر تغیر' ہر حالت 'ہر جماعت کے لیے احکامِ شرعیہ کا استنباط کرسکے گا۔

## فصل

زبان ز نکتہ فرو ماند و راز من باقیست !

بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست !

عزیزانِ ملت ! اس طولِ طویلِ صحبت میں جو کچھ بیان کیا گیا، اُس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو میری زبان پر نئی ہو۔ یہ تمام رہی افسانۂ کہن ہے جو پچھلے دس سالوں سے برابر دھراتا رہا ہوں، اور اگر "الہلال" و "البلاغ" کی پیہم صدائیں تمہارے حافظہ میں فراموش نہیں ہوگئی ہیں، تو تم اُسکی تصدیق کرو گے۔ تمہارے رہبروں اور پیشواؤں کی رائیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں، لیکن میری طرف دیکھو ! میں ایک انسانِ تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوتِ بلند کر رہا، اور صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر بلا رہا اور لوت لوت کر پکار رہا ہوں۔ و لکن لا تعبرون الناصرین (۲۸ : ۷) افسوس ! کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ تم نمائش کے پجاری، شور و ہنگامہ کے بندے، اور رقتی جذبات و انفجارِ ہیجان کی مخلوق ہو۔ تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر۔ نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو۔ تم جس قدر تیز دُرّ کر آتے ہو، اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی کر جاتے ہو۔ تمہاری اطاعت جس قدر سہل ہے اور تمہاری ارادت جتنی سستی، اتنا ہی تمہارا انحراف آسان ہے، اور اُسی نسبت سے تمہاری مخالفت بھی آسان ہے۔ پس نہ تو تمہاری تحسین کی کوئی قیمت، نہ تمہاری توہین کا کوئی وزن۔ نہ تمہارے پاس دماغ ہے نہ دل۔ و سارس ہیں جنکو تم افکار سمجھتے ہو، خطرات ہیں جنکو تم عزائم کہتے ہو۔ خدا را بتلاؤ ! میں تمہارے ساتھ کیا کروں ؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آج جن باتوں کے لیے تم رو رہے ہو، یہ وہی باتیں ہیں جو ایک زمانے میں میری زبان سے فریاد کا اضطراب اور طلب



طاقت کو ترتیب دیتی اور ڈرایور اس سے کام لیتا ہے ۔ اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں ، تو اس سے زیادہ کوئی خطرناک اور مہلک چیز بھی نہیں ہوسکتی ۔ کاش وہ نہ ہوتی ۔ وہ ترین کو منزل مقصود پر پہنچاتی ہے ، مگر انجنوں کو تکرار ہزاروں انسانوں کو ہلاک بھی کر دیتی ہے !

” جذبات “ اسی وقت کام دے سکتے ہیں ، جب انکو مرتب کرنے اور آلپرحکم و قضاء کیلیے ” ادراک “ اور ” دماغ “ بھی موجود ہو ۔ و ذلک من عمل الذبوة ، و لکن لا یعقلها الا العالمون ۔

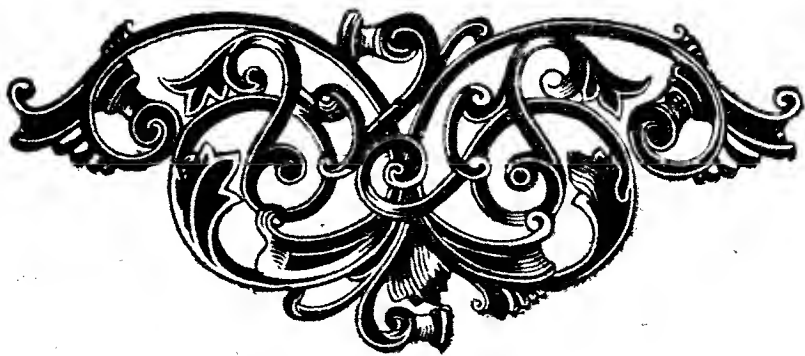
بہر حال اسوقت ، اور ہمیشہ سے ، اور ہمیشہ کیلیے ، ” راہ عمل “ یہی ہے کہ مسلمان سب سے پہلے اسلام کی جماعتی زندگی اختیار کر لیں ۔ اسی پر مسئلہ خلافت اسلامی کے بھی تمام مہمات و اعمال موقوف ہیں ۔ تمام مسلمانوں کو ان ہمدردان ملت کا شکر گزار ہونا چاہیے جنہوں نے آل اندیا خلافت کمیٹی کی بنیاد ڈالی اور تمام ملک میں اسکی شاخوں کے قیام کا سر سامان کیا ۔ لیکن خلافت کمیٹی کا نظام مسلمانوں کو نظام جماعتی و شرعی کے قیام سے مستغنی نہیں کر دے سکتا ۔ خلافت کمیٹی روپیہ جمع کریگی ۔ ایجی ٹیشن جاری رکھیگی ۔ تبلیغ و اشاعت کریگی ۔ لیکن نہ تورہ قوم کو سنبھال سکتی ہے ، نہ کمیٹیوں سے ” جماعت “ پیدا ہوسکتی ہے ، نہ شرعی نظام کی قائم مقامی ہوسکتی ہے ۔ وہ خود احکام شرعیہ کے علم کیلیے ، اپنے قیام و تکمیل کیلیے ، دفع تفرقہ و انتشار کیلیے ، اور روح اجتماع و قوام کے نفوذ کیلیے ایک بالاتر قوت حاکمہ و نافذہ کی محتاج ہے ۔ اور اگر وہ قوت نہیں ہے تو پھر اسکی ہستی بھی قائم نہیں رہسکتی ۔

نظام شرعی یہ نہیں ہے کہ ہر شخص فرداً فرداً سونچتا رہے کہ مسئلہ خلافت کیلیے کیا کرنا چاہیے ؟ اور اخباروں میں آرٹیکل لکے جائیں کہ عملی راہ کیا ہونی چاہیے ؟ اور نہ ہر شخص یا چند آدمیوں کی گڑھی ہوئی کمیٹی کو یہ حق ہے کہ لوگوں کو کسی خاص راہ کی طرف دعوت دینا شروع کر دے ۔ یہ کام صرف ایک صاحب نظر و اجتہاد کا ہے جسکو قوم نے بالاتفاق تسلیم کر لیا ہو ۔ وہ وقت اور حالت پر اصول و احکام شریعت کو منطبق کریگا ۔ ایک ایک جزئیہ حوادث و واقعات پر پوری کار دانی و نکتہ شناسی کے ساتھ نظر ڈالیگا ، امت و شرع کے اصولی مصالح و مقاصد اس کے سامنے ہونگے ۔ کسی ایک گوشے ہی میں ایسا مستغرق نہوجائیگا کہ باقی تمام گوشوں سے بے پروا ہوجائے :

حفظت شیئاً و غابت عنک اشیاء !

قیاسوں میں ہوسکتی ہیں ' پولیٹیکل حکمت عملیوں میں ہوسکتی ہیں ' انسانی تقلید اُسکا سرچشمہ ہے ' اور انسانوں اور قوموں کا اتباع اسکا منبع ' لیکن اُن عقائد میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی جو وحی و تنزیل کی اِتل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہوں - الحمد للہ کہ میں جو کچھ کہتا اور کرتا رہا ' وہ میرے عقائد و معلومات تھے ' تمہارے بزرگ کی طرح آراء و مظنونات نہ تھے - و ان الظن لا یغنی عن الحق شیئاً ( ۵۴ : ۳ ) اسوقت تم میں سے اکثرین نے اعراض کیا ' بہتوں نے استہزاء کیا ' کتنوں ہی نے کہدیا کہ یہ تو ایک طرح کی مذہبی بذات اور مافوق الفطرت دعویٰ کا اعلان ہے : یوید ان یتفضل علیہا - بعضوں نے تو فیصلہ ہی کردیا کہ یہ صرف فصاحت و بلاغت کی ساحری اور ایک طرح کی ادیبانہ افسونگری ہے : اکتتبھا فہی تملی علیہ بکرۃ و اصیلا ( ۲۵ : ۷ ) لیکن دیکھو ! بالآخر رفتہ رفتہ سب نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں - سب اُسی راہ پر چل پڑے - بہتوں نے دانستہ ' اور بہتوں نے نادانستہ ' مگر راہ سب نے وہی اختیار کی - آج تم سب اُسی " مافوق الفطرت دعویٰ " اور " ساحرانہ فصاحت طرازیوں " کو اپنا اصل الاصول بنائے ہوئے ہو ' اور " قیام شریعت " اور " تقدیم و اتباع شریعت " اور " حفظ و دفاع ملت " کے ناموں سے موسوم کرتے ہو -

پس جبکہ یہ پہلا تجربہ و مشاہدہ تمہارے سامنے ہے ' تو آج میں اعلان کرتا ہوں کہ دوسرے تجربہ کا وقت آگیا - راہ عمل کیلیے تمہارا رخ وہ ہے جسکی طرف تم دوڑ رہے ہو - اور میری راہ وہ ہے جسکی طرف پچھلے صفحوں میں بلا چکا ہوں - تم بارش کے وجود سے انکار تو نہیں کرتے ' مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں ' لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھ لینے کا عادی ہوں ' اور صرف بادلوں ہی کو دیکھہ لینا میرے علم کیلیے کافی ہوتا ہے - پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو ' اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو : فستذکرون ما اقول لکم ' و افوض امری الی اللہ - ان اللہ بصیر بالعباد ( ۴۰ : ۴۷ )



کی چیخ بذر نکلتی تھیں، مگر تمہارے سینے کے اندر پتھر کا ایک ٹکرہ ہے، اس سے ٹکرا ٹکرا کر واپس آجاتی تھیں؟ اور تم یقیناً انکار و اعراض میں غرق تھے؟ تم نے ہمیشہ اعراض کیا - تم نے اعراض ہی نہیں کیا، بلکہ

جعلوا اصابعهم فی اذانہم، واستغشوا ثیابہم، واصرروا، واستکبروا استکبارا [ ۷ : ۷۱ ] کی ساری سنتیں غفلت و انکار کی تازہ کردیں - میں نے تم میں سے ہر گروہ کو تولا - میں نے دلوں اور رروحوں کا ایک ایک گوشہ چھان مارا - جب کبھی کوئی بھیڑ دیکھی، فریاد کی - جب کبھی انسانوں کو دیکھا اپنی طرف بلایا - لیکن فلم یزد ہم دعائی الا فرارا ( ۷ : ۷۱ ) بہت کم روحیں ایسی نکلیں جنکو حقیقت کا فہم ہو، اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں - یہاں تک کہ میں تمہاری آبادیوں سے الگ ہو کر اونچی کے گوشہ قید و بند میں چلا گیا، اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں بھی میری صبحیں اور میری شامیں کن فکروں اور کاموں میں بسر ہوتی رہیں - اب میں پھر تم میں واپس آ گیا ہوں - لیکن تمہاری بھیڑوں اور غلوں میں سچی جستجو کا چہرہ اسی طرح مفقود ہے، جیسا کہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے - اب تک حقیقت شناسی کی کوئی گیرائی تم میں نظر نہیں آتی - تم مجھے بلاتے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے ریلوے اسٹیشنوں پر آناؤ، اور ایسے پر جوش انسانوں کے نعرے سناؤ جنکے ہاتھوں میں فتح مند فوجوں کی طرح جھنڈیاں ہوں، اور پھر اٹنے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے کر دو کہ انکے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ہو جائے، مگر آہ! میں تمہاری ان بھیڑوں کو لیکر کیا کروں جب تمہارے دلوں میں سناٹا چھایا ہوا ہے، اور تمہارے اس جوش استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو جب تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہیں - افسوس! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو - تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو - میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں :

من بہر جمعیتے نالان شدم \* جفت خوشحالان و بد حالان شدم  
ہر کسے از ظن خود شد یار من \* روز درون من نہ جست اسرار من  
سر من از نالۂ من دور نیست \* لیک کس را گوش آن منظور نیست

میری رایوں میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی، نہ میرے سفر میں کبھی  
یمین و یسار کا تذبذب پیش آیا ہے - تبدیلیاں فکروں میں ہوسکتی ہیں،

|      |     |                               |    |
|------|-----|-------------------------------|----|
| ٧٧٤  | ١٥٨ | المهدي بن منصور               | ٢١ |
| ٧٨٥  | ١٦٩ | الهادي بن المهدي              | ٢٢ |
| ٧٨٦  | ١٧٠ | هارون الرشيد بن المهدي        | ٢٣ |
| ٨٠٨  | ١٩٣ | محمد الامين بن هارون          | ٢٤ |
| ٨١٣  | ١٩٨ | المامون بن هارون              | ٢٥ |
| ٨٣٣  | ٢١٨ | المعتصم بن هارون              | ٢٦ |
| ٨٤٢  | ٢٢٧ | الواثق بن المعتصم             | ٢٧ |
| ٨٤٧  | ٢٣٢ | المتوكل علي الله بن المعتصم   | ٢٨ |
| ٨٦١  | ٢٤٧ | المستنصر بالله بن المتوكل     | ٢٩ |
| ٨٦٢  | ٢٤٨ | المستعين بالله بن المعتصم     | ٣٠ |
| ٨٦٦  | ٢٥٢ | المعتز بالله بن المتوكل       | ٣١ |
| ٨٦٩  | ٢٥٥ | المهدي بالله بن الواثق        | ٣٢ |
| ٨٧٠  | ٢٥٢ | المعتمد بالله بن المتوكل      | ٣٣ |
| ٨٩٢  | ٢٧٩ | المعتضد بالله بن الموفق       | ٣٤ |
| ٩٠٨  | ٢٩٥ | المقتدر بالله بن الموفق       | ٣٥ |
| ٩٣٣  | ٣٢٢ | الراضي بالله بن المقتدر       | ٣٦ |
| ٩٤٠  | ٣٢٩ | المقتفي بالله بن المقتدر      | ٣٧ |
| ٩٤٤  | ٣٣٣ | المستكفي بالله بن المقتفي     | ٣٨ |
| ٩٤٦  | ٣٤٣ | المطيع بالله بن المقتدر       | ٣٩ |
| ٩٧٤  | ٣٦٣ | الطائع لله بن المطيع          | ٤٠ |
| ٩٩١  | ٣٨١ | القادر بالله بن المقتدر       | ٤١ |
| ١٠٣١ | ٤٣٢ | القائم بامر الله بن القادر    | ٤٢ |
| ١٠٧٥ | ٤٦٧ | المقتدي بالله بن القائم       | ٤٣ |
| ١٠٩٤ | ٤٨٧ | المستظهر بالله بن المقتدي     | ٤٤ |
| ١١١٨ | ٥١٢ | المسترشد بالله بن المستظهر    | ٤٥ |
| ١١٣٦ | ٥٥٩ | الراشد بن المسترشد            | ٤٦ |
| ١١٣٦ | ٥٣٠ | المقتفي بن المستظهر           | ٤٧ |
| ١١٦٠ | ٥٥٥ | المستنجد بالله بن المقتفي     | ٤٨ |
| ١١٨٠ | ٥٦٦ | المستضي بنور الله بن المستنجد | ٤٩ |
| ١١٨٠ | ٥٧٥ | الناصر لدين الله بن المستضي   | ٥٠ |





## جدول سنین خلافت اسلامیہ



| عدد            | خلفاء                       | سنہ ہجری | سنہ مسیحی |
|----------------|-----------------------------|----------|-----------|
| ۱              | ابوبکر الصديق               | ۱۱       | ۶۳۲       |
| ۲              | عمر بن الخطاب               | ۱۳       | ۶۳۴       |
| ۳              | عثمان بن عفان               | ۲۳       | ۶۴۴       |
| ۴              | علي بن ابي طالب (رض)        | ۳۵       | ۶۵۲       |
| سلسلہ بنو امیہ |                             |          |           |
| ۵              | معاویہ بن ابي سفیان         | ۴۱       | ۶۶۱       |
| ۶              | یزید بن معاویہ              | ۶۰       | ۶۸۰       |
| ۷              | معاویہ بن یزید              | ۶۴       | ۶۸۳       |
| ۸              | مروان بن الحكم              | ۶۴       | ۶۸۳       |
| ۹              | عبد الملك بن مروان          | ۶۵       | ۶۸۴       |
| ۱۰             | الولید بن عبد الملك         | ۸۶       | ۷۰۵       |
| ۱۱             | سليمان بن عبد الملك         | ۹۶       | ۷۱۴       |
| ۱۲             | عمر بن عبد العزيز           | ۹۹       | ۷۱۷       |
| ۱۳             | یزید بن عبد الملك           | ۱۰۱      | ۷۱۹       |
| ۱۴             | هشام بن عبد الملك           | ۱۰۵      | ۷۲۳       |
| ۱۵             | الولید بن یزید بن عبد الملك | ۱۲۵      | ۷۴۲       |
| ۱۶             | یزید بن الولید              | ۱۲۶      | ۷۴۳       |
| ۱۷             | ابراهيم بن الولید           | ۱۲۶      | ۷۴۳       |
| ۱۸             | مروان بن محمد بن مروان      | ۱۲۷      | ۷۴۴       |
| سلسلہ عباسیہ   |                             |          |           |
| ۱۹             | ابوالعباس سفاح              | ۱۳۲      | ۷۴۹       |
| ۲۰             | ابوجعفر منصور               | ۱۳۷      | ۷۵۴       |



|      |      |                                |    |
|------|------|--------------------------------|----|
| ۱۹۲۳ | ۱۰۳۲ | مراد رابع                      | ۷۸ |
| ۱۹۴۰ | ۱۰۴۹ | ابراهیم اول                    | ۷۹ |
| ۱۹۷۳ | ۱۰۵۳ | محمد رابع                      | ۸۰ |
| ۱۹۸۷ | ۱۰۹۹ | سلیمان ثانی                    | ۸۱ |
| ۱۹۹۱ | ۱۱۰۲ | احمد ثانی                      | ۸۲ |
| ۱۹۹۵ | ۱۱۰۶ | مصطفی ثانی                     | ۸۳ |
| ۱۷۰۳ | ۱۱۱۵ | احمد ثالث                      | ۸۴ |
| ۱۷۳۰ | ۱۱۴۲ | محمود اول                      | ۸۵ |
| ۱۷۵۴ | ۱۱۲۸ | عثمان ثالث                     | ۸۶ |
| ۱۷۵۷ | ۱۱۷۱ | مصطفی ثالث                     | ۸۷ |
| ۱۷۷۳ | ۱۱۸۷ | عبد المجید اول                 | ۸۸ |
| ۱۷۸۹ | ۱۲۰۳ | سلیم ثالث                      | ۸۹ |
| ۱۸۰۷ | ۱۲۲۲ | مصطفی رابع                     | ۹۰ |
| ۱۸۰۸ | ۱۲۲۳ | محمود ثانی                     | ۹۱ |
| ۱۸۳۹ | ۱۲۵۵ | عبد المجید                     | ۹۲ |
| ۱۸۶۱ | ۱۲۷۷ | عبد العزیز                     | ۹۳ |
| ۱۸۷۶ | ۱۲۹۳ | مراد خامس                      | ۹۴ |
| ۱۸۷۶ | ۱۲۹۳ | عبد الحمید ثانی                | ۹۵ |
| ۱۹۰۸ | ۱۳۲۴ | محمد خامس                      | ۹۶ |
| ۱۹۱۸ | ۱۳۳۶ | امیر المومنین السلطان محمد خان | ۹۷ |

سادس - خلد الله ملكه و شوكته



|      |     |                            |    |
|------|-----|----------------------------|----|
| ١٢٢٥ | ٢٩٢ | الظاهر بالله بن الناصر     | ٥١ |
| ١٢٢٣ | ٢٩٣ | المستنصر بالله بن الظاهر   | ٥٢ |
| ١٢٤٣ | ٢٩٥ | المستعصم بالله بن المستنصر | ٥٣ |

## عباسية مصر

|      |     |                  |    |
|------|-----|------------------|----|
| ١٢٥٨ | ٢٩٦ | المستنصر بالله   | ٥٤ |
| ١٢٦٢ | ٢٩١ | الحاكم بأمر الله | ٥٥ |
| ١٣٠١ | ٧٠١ | المستكفي بالله   | ٥٦ |
| ١٣٣٩ | ٧٤٠ | الرائق بالله     | ٥٧ |
| ١٣٤١ | ٧٤٢ | الحاكم بأمر الله | ٥٨ |
| ١٣٥٢ | ٧٥٣ | المعتضد بالله    | ٥٩ |
| ١٣٦١ | ٧٦٣ | المتوكل على الله | ٦٠ |
| ١٣٨٣ | ٧٨٥ | الرائق بالله     | ٦١ |
| ١٤٠١ | ٨٠٨ | المستعين بالله   | ٦٢ |
| ١٤١٢ | ٨١٥ | المعتضد بالله    | ٦٣ |
| ١٤٤١ | ٨٤٠ | المستكفي بالله   | ٦٤ |
| ١٤٥٠ | ٨٥٤ | القائم بأمر الله | ٦٥ |
| ١٤٥٤ | ٨٥٩ | المستنجد بالله   | ٦٦ |
| ١٤٧٩ | ٨٨٤ | المتوكل على الله | ٦٧ |
| ١٤٩٧ | ٩٠٣ | المستمسك بالله   | ٦٨ |
| ١٥٠٦ | ٩١٢ | المتوكل على الله | ٦٩ |

## سلسلة عثمانية

|      |      |              |    |
|------|------|--------------|----|
| ١٥١٧ | ٩٢٣  | سليم خان اول | ٧٠ |
| ١٥٢٠ | ٩٢٦  | سليمان اول   | ٧١ |
| ١٥٦٦ | ٩٧٤  | سليم ثاني    | ٧٢ |
| ١٥٧٤ | ٩٥٢  | مراد ثالث    | ٧٣ |
| ١٥٩٦ | ١٠٠٤ | محمد ثالث    | ٧٤ |
| ١٦٠٤ | ١٠١٢ | احمد اول     | ٧٥ |
| ١٦١٨ | ١٠٢٧ | مصطفى اول    | ٧٦ |
| ١٦١٨ | ١٠٢٧ | عثمان ثاني   | ٧٧ |

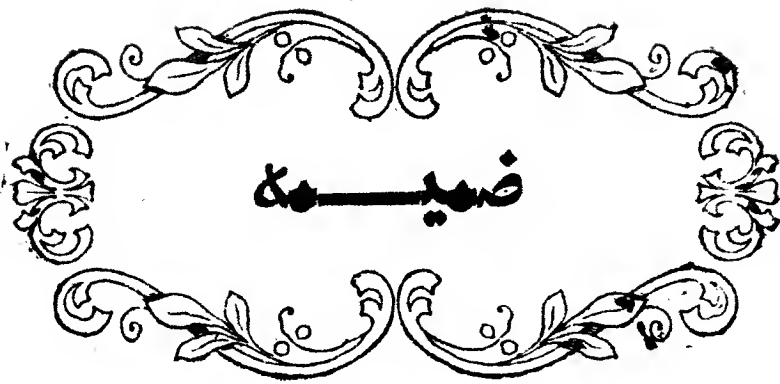
( ۲ ) - ۵ - جنوری سنہ ۱۸ ۱۹ - کو مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے اپنی مشہور تقریر میں کہا :

” ہم اس لیے جنگ نہیں کر رہے ہیں کہ ترکی کو اس کے دارالخلافہ سے محروم کر دیں - یا ایشیائے کوچک اور تھریس کے زرخیز و شہرہ آفاق علاقے لے لیں جن میں ترکی النسل آبادی کا جزء غالب ہے -

ہم اس بات کے بھی مخالف نہیں کہ جن علاقوں میں ترکی نژاد آبادی ہے ، وہاں ترکوں کی سلطنت قائم رہے ، یا قسطنطنیہ اس کا پایہ حکومت ہو - البتہ بحیرہ روم اور بحیرہ اسود کے درمیانی راستہ کو بین الاقوامی ضبط و نگرانی میں لانے کے بعد ہماری رائے میں عرب ، آرمینیا ، عراق ، شام ، اور فلسطین اپنی اپنی جداگانہ قومی حکومتوں کے مستحق ہیں “

وزیر اعظم نے یہ جو کچھ کہا تھا ؟ کیا محض انکی ذاتی رائے تھی جسکی ذمہ داری صرف انپیرعائد ہوتی ہے ، یا برطانیہ کا سرکاری اعلان تھا ؟ اور اگر سرکاری اعلان تھا تو صرف وزارت اور اسکی گورنمنٹ کا تھا ، یا تمام برٹش قوم اور امپائر کا ؟ اسکا جواب اس تمہید سے ملتا ہے جو اس تقریر کے ابتدا میں موجود ہے :

” اس تمام بحث و گفتگو کے بعد جو قلمرو کے مختلف الخیال اور مختلف الرائے طبقوں کے نمایندگان کے ساتھ ہوئی ہے ، میں خوشی سے اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ آج میں جو کلمات کہونگا ، انکے لیے گو تنہا حکومت ہی ذمہ دار ہوگی ، مگر ہمارے جنگی مقاصد ، شرائط صلح کی نوعیت ، اور اسکی غرض و غایت کے متعلق میرے جو بیانات آپ سے اور آپکی معرفت تمام دنیا سے ہونگے ، انسے تمام قوم متحد و متفق ہے - میں دلیری کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں صرف گورنمنٹ کے مافی الضمیر ہی کی نہیں بلکہ تمام قوم اور تمام قلمرو کی بحیثیت مجموعی ترجمانی کر رہا ہوں “



## ۲

متوااعد ر عہود

اس کتاب میں گورنمنٹ انگلستان و ہند کے جن وعدوں اور سرکاری اعلانات کی طرف جا بجا اشارہ کیا گیا ہے، ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں :

( ۱ ) گورنمنٹ آف انڈیا کا اعلان جو ترکی کے شامل جنگ ہونے کے بعد ۲ - نومبر سنہ ۱۹۱۴ع کو شائع ہوا :

برطانیہ عظمیٰ اور ترکی میں جنگ چھڑ گئی ہے ۔  
 برطانیہ کو اسکا سخت افسوس ہے کہ یہ برے مشورے سے اور بلا کسی اشتعال کے اور خوب سونچ سمجھ کر دولت عثمانیہ کی طرف سے عمل میں آئی ہے ۔ لہذا ہزیکسلنسی وایسرائے ہند ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کے حکم کے مطابق عرب کے مقامات مقدسہ کے بارے میں جن میں عراق کے متبرک مقامات اور بندرگاہ جدہ بھی شامل ہے، مندرجہ ذیل اعلان کرتے ہیں تا کہ ہز مجسٹی کی نہایت وفادار مسلم رعایا کو غلط فہمی پیدا نہ ہو ۔ اس جنگ میں مذہبی جنگ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے ۔

ان مقامات مقدسہ اور بندرگاہ جدہ پر برطانی بری و بحری طاقتوں سے کبھی حملہ نہ ہوگا، نہ ان کو ستایا جائیگا جب تک کہ حجاج و زائرین ہند سے جو ان مقامات مقدسہ میں جائیں، کوئی چھیڑ نہ کی جائے ۔  
 ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کی استدعا پر گورنمنٹ فرانس و روس نے بھی اسی طرح کا یقین دلایا ہے ۔

(۶) ۵ - جون سنہ ۱۹۱۶ء کو خاص سرزمین حجاز میں سازش کی بنی اور شریف مکہ سے بغاوت کرائی گئی۔ اس بغاوت کی وجہ سے اس محترم دارالامن میں کشت و خون کا بازار گرم ہوا اور حدود حرم میں گولہ باری ہوئی۔

(۷) حسب تصریح نامہ نگار لندن ٹائمس بندرگاہ جدہ پر گولہ باری کی گئی۔

(۸) میجر راس نے ہوائی جہاز نے عین مدینہ طیبہ کی فضا میں چکر لگائے (جیسا کہ ڈاکٹر ہاگرتھ نے فروری سنہ ۱۹۲۰ء کو تارن ہال اکسفورڈ کی تقریر میں بیان کیا)

(۹) کوفہ، کربلائے معلیٰ، نجف اشرف پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی مشہور زیارت گاہیں ہیں۔

(۱۰) ترکی کو تھریس کے کل علاقہ سے مع ایڈریا نوپل کے محروم کر دیا گیا جہاں مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی ہے۔

(۱۱) صلح نامہ ترکی کی دفعہ ۳۶ کے مطابق ترکی سے اس کے دارالسلطنت کی خود مختارانہ فرمان روائی بھی سلب کر لی گئی اور اس پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دی ہیں۔

(۱۲) سمرنا جو ایشیاء کوچک کا مشہور زر خیز مقام ہے، ترکی سے علحدہ کر دیا گیا۔ وہاں کی مسلمان آبادی پر یونانیوں نے اس قدر ظلم و ستم کیے کہ بے شمار جانیں ہلاک و تباہ ہو گئیں اور ہو رہی ہیں۔

(۱۳) صلح نامہ کی شرائط نے بقیہ ایشیاء کوچک کے مالی اور ہر طرح کے فوجی اختیارات کی خود مختاری سے بھی ترکی کو محروم کر دیا ہے۔ وہ ایک محدود تعداد سے زیادہ فوج نہیں رکھ سکتی۔ چند چھوٹے جنگی جہازوں کے علاوہ کوئی بحری قوت حاصل نہیں کر سکتی۔ اپنی عیسائی رعایا پر اسے کوئی اختیار نہیں رہا۔ اس کی حیثیت بالکل ایک ماتحت ریاست کی سی ہو گئی ہے جو برائے نام پادشاہت سے ملقب کر دی گئی ہے۔

(۱۴) صلح نامہ کی دفعہ ۳۹ کے بموجب سلطان المعظم کے وہ تمام دینی و اسلامی اختیارات سلب کر لیے گئے ہیں جو بحیثیت خلیفۃ المسلمین انہیں حاصل تھے، اور جن کے الگ کر دینے کے بعد خلافت کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس دفعہ کا منشاء یہ ہے کہ:



پھر ۲۶ - فروری سنہ ۱۹۲۰ کو ہارس اف کا مندر میں تقریر کرتے ہوئے  
اسی اعلان کی نسبت وزیر اعظم کہتے ہیں :

” ہمارا یہ اعلان بہت وسیع المعنی تھا ، اور بہت  
کچھ سونچ سمجھ کر کیا گیا تھا - تمام جماعتوں کی  
مرضی کے مطابق تھا - مزدوروں کی جماعت بھی  
اس سے متفق تھی “

( ۳ ) پریسڈنٹ امریکہ مسٹر ولسن نے ۸ - جنوری سنہ ۱۹۱۸ - کو چودہ  
شرطوں کا اعلان کیا تھا جو بہ اتفاق فریقین صلح کیلئے بنیادی شرطیں قرار  
پائی تھیں - ان میں بارہویں شرط یہ تھی :

” موجودہ سلطنت عثمانیہ میں ترکی کا جو حصہ  
ہے ، اسکو یقین دلایا جائیگا کہ اس کی وہ سلطنت  
محفوظ رہیگی - لیکن دوسری اقوام جو ’ انت ترکی  
کے زیر حکومت ہیں ، انکو بھی اسکا اطمینان دلادیا جائے  
کہ انکی جان و مال محفوظ ہے ، اور انکی ترقی میں  
کوئی رکاوٹ نہ ہوگی “

#### ایفاء عہد

یہ وعدے جس طرح پورے کیے گئے ، انکی مختصر تفصیل یہ ہے :

( ۱ ) گورنمنٹ ہند نے عراق پر حملہ کیا جس کا بڑا حصہ جزیرہ عرب  
کے مقدس حدود میں داخل ہے -

( ۲ ) ۲۶ - نومبر سنہ ۱۹۱۴ - کو بصرہ پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی  
بندرگاہ اور زیارت گاہ ہے -

( ۳ ) ۲۲ - نومبر سنہ ۱۹۱۵ - کو عراق کی مشہور زیارت گاہ سلمان پاک  
پر حملہ کیا گیا جہاں حضرت سلمان فارسی ( رض ) کا مزار ہے -

( ۴ ) مارچ سنہ ۱۹۱۷ - کو بغداد پر قبضہ کیا گیا جو عراق کی مشہور  
زیارت گاہ ہے -

( ۵ ) ۹ - دسمبر سنہ ۱۹۱۷ - کو بیت المقدس میں برطانیہ فوجیں داخل  
ہوئیں اور انگریزی قبضہ کا اعلان کیا گیا ، جو اسلام کی مقدس زیارت گاہ اور  
تین مقدس مقامات میں سے ایک ہے -

# استندار

براہ عنایت پلے ان اغلاط کی تصحیح کرلیں ، پھر مطالعہ فرمائیں ۔

| صفحہ | سطر | غلط        | صحیح         |
|------|-----|------------|--------------|
| ۱    | ۱۴  | و غیر ذلک  | و غیر ذلک    |
| ۵    | ۱۳  | خلفہ       | خلیفہ        |
| ۱۱   | ۱۰  | الامرء     | الامر        |
| ۱۸   | ۲۲  | فکر ز نظر  | فکر و نظر سے |
| ۱۹   | ۳   | ہو دور     | ہر دور       |
| ۲۵   | ۹   | پس جو شخص  | جو شخص       |
| ۳۳   | ۱۹  | قوتوں کے   | قوتوں کو     |
| ۳۶   | ۱۵  | سمجھتے     | سمجھتے ہو    |
| ۳۸   | ۲۴  | Selection  | Selection    |
| ۷۱   | ۱۰  | عدارت      | عدارت        |
| ۷۲   | ۲۸  | گئے        | گئے تھے      |
| ۸۲   | ۲۵  | تویہ       | توبہ         |
| ۱۲۳  | ۱۲  | Couflict   | Conflict     |
| “    | “   | Religiun   | Religion     |
| “    | “   | Seince     | Science      |
| “    | “   | Dalambert  | Dalembert    |
| ۱۵۰  | ۲۵  | کی کو جرأت | کی جرأت      |
| ۱۰۸  | ۷   | روایت      | رأیت         |
| ۱۵۱  | ۳   | میں میں    | میں          |
| ۱۶۲  | ۱۰  | چلی        | چلی          |
| ۱۶۳  | ۲   | جو حصول    | کہ حصول      |
| “    | ۶   | فراموش     | یکقلم فراموش |
| “    | ۸   | ارر        | ارر          |
| “    | ۹   | نہیں رہا   | نہ رہا       |
| “    | ۱۹  | بکفی       | یکفی         |

”حکومت ترکی اپنے اُن تمام اختیارات سے جو حکم برداری کے یا دوسری طرح کے مسلمانوں پر رکھتی ہے، بالکل دست بردار ہوتی ہے“

”ترکی بلا واسطہ یا بالواسطہ کسی طرح کے اختیارات اُن ممالک پر نہ رکھیگی جو ترکی سے علحدہ ہو گئے ہیں“

حالانکہ شرعاً منصب خلافت کے معنی ہی یہ ہیں کہ تمام دنیا کے مسلمانوں اور تمام دنیا کی اسلامی حکومتوں پر اسکو ایک بالا تر اختیار حاصل ہو، اور وہ تمام اسلامی دنیا میں ایک مرکزی اسلامی اقتدار کی حیثیت رکھے۔ لیکن اس دفعہ بے ترکی کو ان تمام اختیارات خلافت سے محروم کر دیا، اور اسلامی خلافت اپنے کامل معنوں میں پارہ پارہ ہو گئی۔

(۱۵) شام کو ترکی سے الگ کر کے آزادی نہیں دی گئی بلکہ فرانس کی حکم برداری و بالادستی ماننے پر مجبور کیا گیا۔ شام کی تمام آبادی انسانیت و صداقت عہد کے نام پر فریاد کرتی رہی اور فرانس کی فوجوں نے اُس پر جبراً قبضہ کر لیا۔

(۱۶) عراق کی آبادی کو خود مختاری و آزادی نہیں دی گئی بلکہ برطانیہ نے اُسکی حکم برداری کا دعویٰ کیا اور اسپر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ وہاں کی آبادی ایفائے عہد کا مطالبہ کرتے کرتے مایوس ہو گئی اور اب بزور شمشیر اپنا حق حاصل کرنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اب اُنکو ”باغی“ کہا جا رہا ہے۔ حالانکہ اگر برطانیہ کے اعلانات سچے تھے، اور اسکی فوجیں ”رعایا“ بنانے کے لیے نہیں بلکہ آزاد کرانے کیلئے گئی تھیں، تو وہ ”باغی“ کیونکر ہو سکتے ہیں؟ بغارت کا اطلاق رعایا کی شورش پر ہوتا ہے۔ نہ کہ کسی آزاد جماعت کی شمشیر زنی پر۔

(۱۷) یہ تمام نتائج صلح نامہ ترکی کے ہیں۔ لیکن قبل اسکے کہ ترکی اپنی مرضی اور آزادی کے ساتھ صلح کرے، برٹش فوجوں نے دار الخلافہ قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا، اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت بالکل ایک نظر بند قیدی کی سی ہو گئی۔ اس قبضہ کی وجہ سے اسلام کے دار الخلافہ میں جو درد انگیز واقعات و حوادث پیش آئے، اور عثمانی خلافت عظمیٰ کی متصل پانچ صدیوں میں پہلی مرتبہ جو توہین ہوئی، اُسکی تفصیل کا یہ مرقعہ نہیں۔ یہ وہ سلوک ہے جو نہ تو جرمنی کے ساتھ کیا گیا، نہ آسٹریا کے ساتھ، اور نہ کسی دوسرے فریق جنگ کے ساتھ۔

# الہلال

جلد سوم مکمل - قیمت چھ روپیہ  
صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں -

---

## البلاغ

کی پہلی جلد ( جس میں صرف پہلا اور دوسرا نمبر نہیں ہے )  
قیمت - چار روپیہ آٹھ آنہ -

---

## تذکرہ

( جلد اول )

مصنفہ مولانا ابوالکلام  
تاریخ ، تفسیر قرآن ، فقہ و حدیث ، ادب و محاضرات کے  
مباحث کا ایک نادر مجموعہ  
قیمت تین روپیہ

---

## جامع الشواہد

غیر مسلموں کا مسجد میں داخلہ ، احکام شرعیہ کی تفصیل ، ہندوؤں  
کی نسبت اسلامی احکام کی تحقیق - ” آیۃ انما لمشرکون نجس فلا  
یقرّبوا المسجد الحرام “ کی محققانہ تفسیر  
قیمت ایک روپیہ

---

منیجر البلاغ پریس نمبر ۴۵ رین لین کلکتہ

---



|             |            |    |     |
|-------------|------------|----|-----|
| ہوتا ہے     | ہے ہوتا    | ۱  | ۱۶۵ |
| ہوں         | ہو         | ۱  | ۱۶۹ |
| دریا        | دریا       | ۳  | ۱۷۰ |
| Westenfeild | Wustenfeld | ۲۵ | ۱۸۱ |
| کیلے        | کتے        | ۲۸ | ۱۸۸ |
| سلطانا      | سلطانا     | ۱۵ | ۱۹۹ |
| معہ         | معہم       | ۸  | ۲۰۰ |

( ۱ ) صفحہ ۳۲ - سطر ۲۷ میں ” ہجرۃ “ کے معنی ” الہجرۃ الہجران مفارقتۃ الانسان غیرہ “ الخ نقل کیے ہیں - یہ عبارت مفردات راغب اصفہانی کی ہے -

( ۲ ) صفحہ ۶۸ میں ہے ” فصل : من حمل علیہنا السلاح فلیس منا “ در اصل یہ فصل نہیں بلکہ ایک مستقل باب ہے - صحیح یوں ہے ” باب : حکم حمل سلاح علی المسلم “ پھر اسکے بعد اس باب کی پہلی فصل ہے ” من حمل علیہنا “ الخ -

( ۳ ) صفحہ ۸۶ میں فصل ہے ” واقعہ امام حسین علیہ السلام “ اسکر

باب حمل سلاح سے پہلے پڑھنا چاہیے - غلطی سے اسکے بعد درج ہو گئی -

( ۴ ) صفحہ ۲۱ سطر ۴ - میں حدیث ہے ” اذا اصلحت صلحت کلہا “ و اذا فسدت فسدت کلہا “ لیکن امام بخاری کے الفاظ یہ ہیں ” اذا اصلحت صلحت الجسد کلہ “ و اذا فسدت فسدت الجسد کلہ - الا “ رہی القلب ! “

( ۵ ) صفحہ ۲۱۵ سلسلہ عباسیہ کے جدول سنین میں نمبر ۳۳ کا

سنہ ہجری ۶۵۴ کے بجائے ۶۵۶ - نمبر ۴۶ کا سنہ ہجری ۵۵۹ کے بجائے

۵۲۹ اور سنہ مسیحی ۱۱۳۶ کے بجائے ۱۱۳۵ - اور نمبر ۴۹ میں

سنہ مسیحی ۱۱۸۰ کے بجائے ۱۱۷۰ پڑھیے -

Printed and published by F. D. Ahmed Mirza  
at the “Albalagh” printing & publishing House  
45, Ripon Lane, Calcutta.

( 2nd EDITION, OCTOBER 1920 )





اخرجوا اليهود والنصارى من جزيرة العرب (الحدیث)

